ماہنامہ
کرن

دسمبر 2017



DECEMBER 2017

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

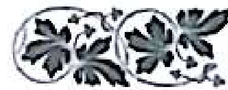
خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براوزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ







زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری	
پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے







چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی ـــــ محمود بابر فیصل
نگران ـــــ محمود ریاض
مدیرہ ـــــ نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ـــــ عامر محمود
نائب مدیرہ ـــــ شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور
اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

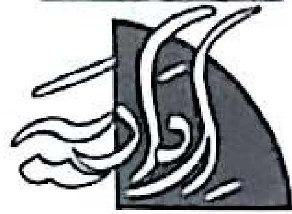
دسمبر 2017
جلد 40 شمارہ 9
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ



ایک بار پھر وحشت کا مظاہرہ کیا گیا۔

عید میلادالنبیؐ وہ دن جب کائنات کی سب سے عظیم ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں رونق افروز ہوئے۔ اس دن پشاور یونی ورسٹی پر حملہ کیا گیا، جس میں کئی غریب گھرانوں کے چراغ بجھا دیے گئے۔ نہ جانے کتنے خواب آنکھوں میں لیے وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ کتنے گھرانوں کی امیدیں ان سے وابستہ تھیں، کتنی آنکھیں ان کے روشن مستقبل کی راہ تک رہی تھیں۔ والدین نے نہ جانے کن مشکلوں سے پیٹ کاٹ کر ان کو پروان چڑھایا، انہیں تعلیم دلائی تھی۔ سارے خواب، سب امیدیں تہہ خاک سلا دی گئیں۔

کچھ عرصے کے لیے حالات سنبھلے تھے کہ ایک بار پھر ہم وہیں جا کھڑے ہوتے ہیں، جہاں سے چلے تھے۔

ایک بار پھر ملک کے افق پر خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ آئے دن ہونے والے احتجاج، دھرنے عوام کو نفسیاتی مریض بنا رہے ہیں۔ معاشرے میں بڑھتے عدم برداشت کے رویے سے وہ عدم تحفظ کا شکار ہو رہے ہیں۔

عید میلادالنبیؐ کے مبارک موقع پر دہشت گردی نے ثابت کر دیا ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ان کا تعلق کسی فرقے، کسی مسلک، کسی جماعت سے ہو، یہ قابل مذمت ہیں اور اس کا مقابلہ ہم سب کو متحد ہو کر کرنا ہے۔

اس وقت ہم جس اخلاقی پستی اور بگڑتی ہوئی صورت حال کا شکار ہیں، ان کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے۔

آئیے دعا کریں، یہ وقت دعا ہے۔

اس شمارے میں،

- فنکار "اسد محمود" سے شاہین کی ملاقات،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "جمیل احمد"،
- اداکارہ "حنا الطاف" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "آمنہ" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- نگہت عبداللہ کا نیا سلسلے وار ناول "ہوائیں رخ بدل گئیں"،
- "من مور کھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول اپنے اختتام کی طرف،
- صدف ریحان کا مکمل ناول "مزدوری تو نہیں"،
- "جنوں مائل" نادیہ احمد کا مکمل ناول،
- مصباح علی سید کا مکمل ناول "مہجور نشیمن" اپنے اختتام کی طرف،
- "احساس سے گندھے لوگ" ام ایمان قاضی کا ناولٹ،
- یمنیٰ اختر کا ناولٹ "حصار ذات میں اترے تو"
- نظیر فاطمہ، نزہت جبیں ضیاء، انعم خان اور آسیہ مظہر چوہدری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

- کرن کا دستر خوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔



تلاش میں ہیں تری بحر و بر، کہاں ہے تو!
جمالِ دیدۂ شمس و قمر، کہاں ہے تو!

لگی ہوئی ہیں قطاریں سی رہگزاروں کی
مرے ندیم، مرے راہبر، کہاں ہے تو!

ہواؤں میں، مہ و خورشید میں سنا تجھ کو
کبھی تو قریۂ جاں میں اتر، کہاں ہے تو!

تو رشکِ خواب سہی، آنسوؤں کی آب سہی
پلٹ بھی جاتی ہے تھک کر نظر، کہاں ہے تو!

اب ایسا شوق بھی کیا بے نشاں رہنے کا
صدف کے ساتھ ہے آبِ گہر، کہاں ہے تو!

بجا کہ عالمِ موجود ہے تیری تخلیق
اس آئینے میں مرے نقش گر، کہاں ہے تو!

امجد اسلام امجد



عصیاں سے تطہیر ملی
آپ آئے توقیر ملی

ٹوٹا گمراہی کا فسوں
وحدت کو تکبیر ملی

قول و عمل سے آقا کے
قرآں کو تفسیر ملی

دھڑکن دھڑکن نعت بسی
نفس نفس تنویر ملی

کاسۂ فکر و فن کو مرے
مدحت کی جاگیر ملی

جو ان کا ہے اس کو صبیح
شہرتِ عالمگیر ملی

صبیح رحمانی

اسد محمود سے ملاقات

شاہین رشید



ڈھیر سارے چینلز آنے اور بے شمار ڈرامے بننے کا فائدہ ہماری نوجوان نسل کو بہت ہوا ہے کہ وہ نوجوان جو اپنی صلاحیتوں کو منوانا چاہتے تھے انہیں ایک فورم مل گیا ہے۔ اسد محمود بھی ایک ایسے ہی اچھے فنکار ہیں جو کئی ڈرامے کر چکے اور ان کے کئی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں۔

☆ ''جی اسد محمود صاحب...... کیسے ہیں؟''

♥ ''اللہ کا شکر ہے۔''

☆ ''کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟''

♥ ''ماشاءاللہ مصروفیات تو بہت ہیں۔ آج کل ''بول'' انٹرٹینمنٹ کے لیے ایک سوپ کر رہا ہوں ''ربا دے'' کے عنوان سے اور اس کی 100 اقساط ہوں گی۔ لیڈ رول میرا ہے، شاہد یونس اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ دوسرا پروجیکٹ ''کیفِ بہاراں'' کے نام سے کر رہا ہوں اور ندیم صدیقی کا یہ اے این بی کا پروجیکٹ ہے اور یہ جیو سے آن ایئر آئے گا، میرا تیسرا پروجیکٹ ''کنو'' کے نام سے ہے اور اس کی 100 اقساط ہوں گی۔ اسے ''زوہا حسن'' نے لکھا ہے جنہوں نے معروف سوپ محمود آباد کی ماکئیں لکھا تھا۔ اس میں بھی میرا لیڈ رول ہے اور یہ بھی شاید ''اے آر وائی'' سے آن ایئر آئے گا۔ اے آر وائی زندگی سے آن ایئر آئے گا...... اس طرح ایک اور سوپ ''ایور ریڈی'' کا جو کہ ٹی وی ون سے آن ایئر آئے گا۔ اس کا نام ''محبت کھیل تماشا'' شفقت شاہ اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ اور ایک سب سے اچھی نیوز آپ کو دے رہا ہوں جو میرے لیے بہت گڈ نیوز ہے اور میرے پرستاروں کے لیے بھی کہ میں جاوید شیخ صاحب کے ساتھ ایک فلم کر رہا ہے، جس کا نام ''وجود'' ہے۔ جس کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی جاوید شیخ صاحب ہیں۔ یہ ان شاءاللہ عیدالفطر پہ ریلیز ہوگی اور دانش تیمور اور میں لیڈ ہیروز ہیں اس فلم کے۔ اس کے علاوہ ہمارے پرانے اور سینئر اداکار شاہد صاحب، جاوید شیخ صاحب، ندیم بیگ صاحب، علی سلیم انڈیا سے ادیتی سنگھ اور سائرہ امتیاز، فائزہ خان اور فریحہ الطاف اس کی کاسٹ میں شامل ہیں۔''

☆ ''اسد آپ کا فیس ماشاءاللہ ایسا ہے کہ اگر آپ گیٹ اپ والے رول کریں تو بہت سوٹ کریں

گے آپ پر؟"

♥ "اصل میں میرا قد کاٹھ اور میری شکل ایسی ہے جیسے گھر کے کسی بڑے سربراہ کی ہوتی ہے...... جس کی شخصیت بہت پرکشش ٹائپ کی ہوتی ہے...... اور۔"

☆ "بالکل...... فنکار وہ ہی ہے جو اپنی شخصیت کے برعکس نظر آئے؟"

♥ "جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں جب بھی کوئی کردار کرتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ کردار میں اسد کا عکس نظر نہ آئے بلکہ اصل کردار نظر آئے کہ یہ واقعی ڈاکٹر ہے یہ واقعی پائلٹ ہے اور یہ واقعی ایک فقیر ہے۔ کام تو بہت لوگ کر رہے ہیں مگر کام کو سمجھ کر کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں، پھر مزید سوالات کرتے ہیں؟"

♥ "میرا پورا نام اسد محمود ہی ہے اور ابھی تک کوئی پیار کرنے والا ملا نہیں اس لیے پیار کا کوئی نام نہیں ہے۔ سب اسد ہی بلاتے ہیں...... اور میں 16 جنوری 1990ء کو لاہور میں پیدا ہوا اور الحمدللہ پنجابی ہوں۔ قد تقریباً چھ فٹ ہے اور اسٹار کیپری کورن ہے میں گھر میں بڑا ہوں اور مجھ سے چھوٹا ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ اور گریجویٹ ہوں۔"

☆ "فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

♥ "میرا فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میرے والد نیشنل بنک آف پاکستان کے ریٹائرڈ منیجر ہیں...... اور میں اپنی فیملی میں واحد ایسا بندہ ہوں جو میڈیا میں ہے۔ میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔"

☆ "شوق نہیں ہوگا؟"

♥ "جی شوق بھی نہیں ہے اور اصل میں یہ کام ہے ٹیلنٹ کا تو پورے خاندان میں، میں ہی ایسا تھا کہ جو شوق اور ٹیلنٹ کی بنیاد پہ اس فیلڈ میں آیا ہے۔"

☆ "اچھا...... گویا خاندان میں کسی میں ٹیلنٹ ہی نہیں ہے؟ یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"



♥ قہقہہ...... "ایسا نہیں ہے۔ کسی کسی میں اداکاری کا ٹیلنٹ ہوتا ہے اور ہمارے خاندان میں سب کا رجحان بزنس کی طرف ہے تو سب میں بزنس کا ٹیلنٹ ہے...... پیسا کمانے کا ٹیلنٹ ہے، کھانے پینے کا ٹیلنٹ ہے۔ مگر اداکاری کا ٹیلنٹ نہیں ہے۔"

☆ "ابھی آپ اپنے آنے والے پروجیکٹ کے بارے میں بتا رہے تھے تو آپ نے زیادہ سوپ کیے اور کر رہے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

♥ "میں نے ایک سیریل کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ ندیم صدیقی کا ہے اور "کیفِ بہاراں" اس کا نام ہے جو جیو سے آن ایئر ہوگا اور مجھے فرق نہیں پڑتا سیریل ہو یا سوپ ہو، مجھے تو کام کرنا ہے اور اداکاری تو دونوں میں ہی کرنی ہوتی ہے جہاں اچھا کردار ملتا ہے اسے پرفارم کرنا پڑتا ہے...... ایک سیریل "دو تولہ پیار" ہے جو کہ جلد آن ایئر آنے والا ہے۔"

☆ "بچپن کے کیا خواب تھے کہ کیا بننا ہے؟"

♥ "بچپن کا صرف یہی خواب تھا کہ بڑے ہو کر ایکٹر بننا ہے۔ میگزین دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ تصاویر کیسے بنتی ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے۔ لوگ ماڈل کیسے بن جاتے ہیں۔ اداکار کیسے بن جاتے ہیں

تو بس 13،14 سال کا تھا تو یہ لگن شروع ہوئی اور الحمدوللہ کہ کامیاب ہوا اس فیلڈ میں.......لوگ پوچھتے ہیں کہ شادی کب کرنی ہے تو بس جی ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ابھی تو بہت آگے تک جانا ہے۔ کچھ بن کے دکھانا ہے۔ اور جب بھی شادی کروں گا والدین کی پسند سے کروں گا۔ کیونکہ پسند کی شادی کو میں نے کچھ زیادہ کامیاب ہوتے نہیں دیکھا ہے۔"

☆"بچپن سے شوق تھا اداکار بننے کا، تو پھر شوبز میں آئے کیسے؟"

❤"میں تو اصل میں بہت شرمیلا بچہ تھا یا نوجوان تھا اور خود اعتمادی کا تو بہت فقدان تھا...... بہت تھا تو اسکول میں نعتیں پڑھ لیا کرتا تھا۔ ڈرامے کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملا.......لیکن چونکہ مجھے شوق تھا تو میں نے "ناپا" سے پڑھا اور اداکاری کا کورس کیا میں نے "ناپا" سے اور وہاں کے تمام سینئر آرٹسٹ جو ہمارے استاد بھی تھے ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا.......راحت کاظمی، ضیاء الدین خالد سعید بٹ وغیرہ استادوں میں سے تھے ہمارے...... اور یوں "ناپا" میرا ذریعہ بنا شوبز میں آنے کا۔"

☆"گھر والوں نے تو کہا ہوگا کہ سب بزنس مین ہیں۔تم اس لائن میں کیوں آئے ؟"

❤"میرے ابو ان سب باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے تو مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ مجھے سپورٹ کرتے تھے.......امی ضرور کبھی کبھی بولتی تھیں کہ بیٹا یہ کوئی کام نہیں ہے.......گھر کیسے چلے گا۔ پیسے کہاں سے آئیں گے.......تو امی بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں، کیونکہ اس فیلڈ میں نام بنانے کے لیے بڑا ٹائم لگتا ہے اور لگا بھی۔ پھر کہیں جا کر اچھا کمانے کے قابل ہوا.......ابھی بھی امی کبھی کبھار بولتی ہیں کہ جاب کرلو.......یہ بھی بھلا کوئی کام ہے تو میں اب امی کو کیا بتاؤں کہ جتنے جاب میں ایک مہینے میں ملتے ہیں اتنے ایک دن میں بھی مل جاتے ہیں۔"

☆"اتنا کچھ ماشاءاللہ آپ سب کماتے ہیں مگر پھر بھی لوگ یہ ضرور پوچھتے ہوں گے کہ اس کے علاوہ کیا کرتے ہیں ؟"

❤ قہقہہ......"جی جی ......بالکل یہی سوال کرتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے.......کیونکہ اداکاری بھی ایک طرح سے جاب ہے اور محنت والا کام ہے۔"

☆"شروعات کس سے کی، ماڈلنگ سے یا اداکاری سے؟"

❤"میں نے شروعات ماڈلنگ سے کی اور یہ بات ہے 2010ء کی۔ میگزین شوٹس زیادہ کرتا تھا......مگر اداکاری میں میرا پہلا پروجیکٹ Love life of lahore تھا جو کہ "اے پلس" میں چلا ،اور یہ سوپ تھا اور اس میں خالد بٹ، معمر رانا، نیر اعجاز، فرحانہ مقصود اور کافی دیگر آرٹسٹ تھے۔ جو کہ تقریباً سال ڈیڑھ سال چلا۔ ساتھ ساتھ جاب بھی کرتا رہا ہوں۔ مختلف کمپنیز میں اور جب دیکھا کہ کراچی میں کام زیادہ ہے تو پھر میں لاہور سے کراچی شفٹ ہوگیا۔"

☆"پیسے اچھے مل جاتے تھے ؟"

❤"بالکل بھی نہیں......تین تین مہینے کے بعد چیک ملا کرتے تھے۔ وہ بھی کرایوں میں ہی لگ جاتے تھے......پیسے کمانے کی باری تو اب آئی ہے۔اب اچھا معاوضہ ملتا ہے۔"

☆"تو کیسا پایا شوبز کو؟ اور کیسا لگتا ہے؟"

❤"زندگی میں ایک ہی خواہش بہت شدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کی تھی اور الحمدللہ اس نے میری یہ خواہش پوری کی۔ اور اب جبکہ لوگ پہچان کر کہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ تصویر بنوانی ہے یا لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ کبھی ہم بھی فنکاروں کو اس طرح دیکھا کرتے تھے......اور چونکہ میں نے بہت محنت کی ہے اور بہت نیچے سے اوپر آیا ہوں تو مجھے یہ چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں اور مزے کی بات تو یہ کہ گھر والوں نے تو سپورٹ کی مگر

خاندان والوں نے بالکل بھی نہیں ـــــ اور ابھی بھی میں کبھی کبھی ان کی باتیں سنتا ہوں کہ تمہیں پتا نہیں ہم اہل حدیث ہیں تمہیں کام نہیں کرنا چاہیے ـــــ لیکن میں خوش ہوں کہ میرے والد خوش ہیں ـــــ اور ویسے بھی میں جب کچھ کرنے کی ٹھان لیتا ہوں تو پھر کر کے رہتا ہوں۔ سوچا تھا کہ فیلڈ میں آنا ہے تو بس آنا ہے ـــــ اور سب کو آ کے دکھایا۔"

☆ "مزاج گرم نہیں ہوتا خاندان والوں کی باتیں سن کر؟"

♥ "بہت، بہت، بہت زیادہ ٹھنڈے مزاج کا ہوں ـــــ مگر غصہ اس وقت بہت شدت کے ساتھ آتا ہے جب کوئی غلط بیانی کرتا ہے سب کچھ برداشت ہے غلط فہمی برداشت نہیں ہے ـــــ اور ہمارے گھر میں والد صاحب کا غصہ بہت تیز ہے۔"

☆ "باپ کمائی اور خود کمائی میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟"

♥ قہقہہ ـــــ "خوب سوال ہے۔ اب جب پیسہ خرچ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ والد صاحب کے پیسے ہوتے تھے تو کتنے مزے سے خرچ کرتا تھا، اب خود کماتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کمانا کتنا مشکل ہے۔"

☆ "کون سے سین بہت مشکل سے "اوکے" ہوتے ہیں؟"

♥ "بہت مشکل سے تو نہیں، لیکن تھوڑے مشکل سے ہوتے ہیں جیسے کہ غصے والے سین، یا ایسے سین جس میں بہت لاؤڈ بولنا ہوتا ہے۔ اور لاؤڈ ہونے میں ڈائیلاگ ڈلیوری ذرا آگے پیچھے ہو جاتی ہے تو ایسے سین ذرا مشکل سے اوکے ہوتے ہیں۔"

☆ "ڈراموں کی وجہ سے شہر سے باہر جانے کا بھی موقع ملتا ہوگا ـــــ تو گھومنا پھرنا کیسا لگتا ہے؟"

♥ "گھومنا پھرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے ـــــ اس لیے اس فیلڈ میں آ کر مزا بھی بہت آ رہا ہے۔ ویسے بھی مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے مجھے



سمندر بہت پسند ہے، پھر ہمارے ناردرن ایریاز بہت خوب صورت ہیں وہاں جا کر بہت انجوائے کرتا ہوں اور اگرچہ فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بہت مزا ہے ـــــ مگر میں تھوڑا اتنہائی پسند آدمی ہوں۔"

☆ "کافی کچھ کر چکے ہیں آپ اس فیلڈ میں ـــــ مگر اندر کی کیا خواہش ہے آپ کی؟"

♥ "کردار تو کوئی بھی مل جائے مگر میں کر لوں گا ـــــ لیکن میری شدت سے خواہش ہے کہ کسی سیریل میں میں "نعمان اعجاز" صاحب کے بیٹے کا کردار کروں ـــــ کیونکہ مجھے نعمان اعجاز بہت پسند ہیں۔"

☆ "کس کردار کو لینے سے انکار کیا؟"

♥ "ایسے بہت سے کردار ہیں جنہیں کرنے سے میں نے انکار کیا ہے۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے لیکن جب بعد میں وہی ڈرامہ بہت ہٹ ہو جاتا ہے تو پھر افسوس ہوتا ہے کہ کیوں انکار کیا تھا۔ پچھتاوا ہوتا ہے، پھر تسلی دیتا ہوں کہ نصیب میں نہیں تھا اور کردار تو آتے جاتے رہتے ہیں۔"

☆ "جی ـــــ کردار تو آتے جاتے رہتے ہیں ـــــ مگر کوئی کردار ایسا بھی کیا جس کے لیے آپ کو یہ کہنا

پڑا ہو کہ یہ تو میں ہی ہوں؟"

♥ "نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ابھی تک ایسا کوئی کردار نہیں ملا۔۔۔بالکل مختلف رولز ملے ہیں۔۔۔ بعض کردار بہت زیادہ غصے والے ہوتے ہیں اور بعض اوقات بہت ہی cool ہوتے ہیں۔ جبکہ میں "جولی ٹائپ" شخصیت کا مالک ہوں۔ بہت ہی ہنسنے ہنسانے والا، کامیڈی ٹائپ کا بندہ ہوں۔"

☆ "پھر تو آپ کو کامیڈی رول کرنے چاہئیں؟"

♥ "نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ میں کامیڈی کردار کروں۔۔۔ ہاں مل گئے تو ضرور کرلوں گا۔"

☆ "آج کل کے ڈراموں کے معیار سے مطمئن ہیں آپ؟"

♥ "ہمارے ڈرامے تو آج بھی دنیا میں نمبرون ہیں اور کہا جاتا ہے کہ عورت کو بہت مظلوم دکھایا جارہا ہے تو ڈرامے دیکھتی بھی تو عورتیں ہی ہیں ان کو ایسے ڈرامے اچھے لگتے ہیں تو پھر انہی کے پسند کے بنائے بھی جاتے ہیں۔ ڈرامہ "عورت" کا ہوتا ہے اور فلم "مرد" کی ہوتی ہے۔"

☆ "آج کی عورت اسٹرونگ بھی بہت ہے تو ایسی کہانیاں کیوں نہیں دکھائی جاتیں؟"

♥ "میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے ڈراموں میں ہر طرح کی عورت دکھائی جاتی ہے۔ کمزور بھی اور طاقت ور بھی۔۔۔اور چونکہ ایک خاندان میں عورت کا ہی بنیادی کردار ہوتا ہے تو اس لیے ہر طرح کی خواتین دکھائی جاتی ہیں۔۔۔تو ڈرامے ہمارے یہاں ماشاءاللہ بہت اچھے بن رہے ہیں۔"

☆ "فیوچر کے لیے کیا پلان کرتے ہیں؟"

♥ "کچھ خاص نہیں۔۔۔بس خواہش ہے کہ اس فیلڈ میں اچھے سے اچھا کام کروں اور بہت آگے تک جاؤں۔"

☆ "آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں کھانا وغیرہ پکا لیتے ہیں؟"

♥ "میں یہاں اکیلا نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے ایک انکل کی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔۔۔اور کھانا نہیں پکا سکتا کیونکہ ایسی ذمہ داری پڑی نہیں۔۔۔ ویسے چائے بنا لیتا ہوں یا پھر انڈا۔۔۔لیکن دیکھا جائے تو مجھے اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے۔۔۔اور کبھی وہ ناراض ہوجائیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے دنیا ختم ہوگئی ہے۔"

☆ "رومانٹک رولز کیسے لگتے ہیں اور کس فنکارہ کے ساتھ کرنے کی خواہش ہے؟"

♥ "بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر مشکل ہوتی ہے کہ اکثر فنکارائیں سپورٹ نہیں کررہی ہوتیں اور مجھے اسمارٹ اور خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ کام کرنے میں مزا آتا ہے۔ اور۔۔۔اریج فاطمہ" کے ساتھ رومانٹک رول کرنے کی خواہش ہے اور "صبا قمر" کے ساتھ۔"

☆ "اپنے ڈرامے دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟"

♥ "یہی کہ اس کردار کو میں اور بھی اچھا کرلیتا۔۔۔تو یہ اور بھی اچھا ہوجاتا۔"

☆ "اس فیلڈ میں نہیں تھے تو کیسا لگتا تھا؟"

♥ "جب میں اس فیلڈ میں نہیں تھا تو مجھے یہ کام آسان لگتا تھا بلکہ بہت آسان لگتا تھا اور پھر میں سوچتا تھا کہ میں اس جگہ پہ کیوں نہیں ہوں تب میں غصے میں یا مایوسی میں ٹی وی بند کردیا کرتا تھا۔"

☆ "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

♥ "کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔بس آپ میں ٹیلنٹ ہونا چاہیے ٹیلنٹ ہو تو کام خود ہی مل جاتا ہے۔"

☆ "زندگی بدلی اس فیلڈ میں آکر؟"

♥ "بالکل بدلی۔۔۔وہ کچھ مل جاتا ہے جو نارمل لائف میں نہیں ملتا تو میری زندگی تو واقعی بدل گئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے اسد محمود سے اجازت چاہی۔

☆☆

آواز کی دنیا سے

جمیل احمد

شاہین رشید

ریڈیو کے سامعین کے لیے ''جمیل احمد'' کی آواز بالکل بھی نئی نہیں ہوگی۔ کیونکہ جمیل احمد صاحب کی ریڈیو سے وابستگی تقریباً 14 سال سے ہے اور اب تو یہ کہیں پہ بھی، کسی سے بھی مخاطب ہوں گے، پہچانے جائیں گے۔ تو اس بار ملیے، جمیل احمد صاحب سے۔

☆ ''جی...... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

♥ ''الحمد للہ...... آپ سنائیں۔''

☆ ''اللہ کا شکر ہے...... یہ بتایئے کہ ریڈیو سے وابستگی کو 14 سال ہوگئے ہیں تو کب جوائن کیا تھا آپ نے؟''

♥ ''ریڈیو سے میرا رشتہ تقریباً تیرہ، چودہ سال پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ 2004ء میں، میں نے ریڈیو جوائن کیا تھا۔ بہ حیثیت ایک اناؤنسر اور اس دور میں ''محمد نقی'' اسٹیشن ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ ایک محفل میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ تمہاری آواز اچھی ہے، تم ریڈیو پہ کیوں نہیں آجاتے، تو میں نے کہا کہ ''سر میں نے تو آج تک ریڈیو سنا بھی نہیں۔'' تو کہنے لگے۔ ''نہیں سنا تو اب سننا شروع کردو۔'' تو جناب اس دن کے بعد ریڈیو سننا شروع کردیا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد جب نقی صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ریڈیو اسٹیشن آؤ اور آڈیشن دو۔ آڈیشن دیا تو اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوا، تو یہ سفر جب شروع ہوا تو چلتا ہی چلا گیا۔ لوگ ساتھ ملتے رہے اور کارواں بنتا گیا۔ بہت سارے چینلز میں ڈبنگ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''جیو'' میں، ''اردو ون'' میں، پھر کمرشلز بھی ملنا شروع ہوگئے اور اب 'بول



انٹرٹینمنٹ'' اور ''بول نیوز، پاک ٹی وی'' میں بہ حیثیت اردو وائس اوور آرٹسٹ کام کررہا ہوں۔''

☆ ''دیگر کیا مصروفیات ہیں آج کل؟''

♥ ''آج کل ایف ایم پہ تو شوز چل ہی رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ''بول'' چینل اور ''پاک نیوز'' چینل پہ اردو وائس اوور آرٹسٹ کے کام کررہا ہوں۔ ترکش ڈراموں کی ڈبنگ بھی آج کل چل رہی ہے اور کمرشلز وغیرہ اور ڈراموں کے جو Teaser اور پرومو چلتے ہیں ان میں اکثر میں میری آواز ہوتی ہے۔''

☆ ''سب کام کیمرے کے بیک میں رہ کر کیے یا آگے بھی کیے آپ نے؟''



♥ ''جی بالکل...... کیمرے کے سامنے بھی کچھ کام کیے۔ ''جاگ'' ٹی وی کے لیے دو ڈراموں میں کام کیا اور ''ہم'' ٹی وی کا مشہور ڈراما ''اڈاری'' میں بھی کام کیا بہ حیثیت پولیس سرجن کا۔''

☆ ''ریڈیو کے لیے کام کرنے کے لیے کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟''

♥ ''سب سے پہلے تو آواز اچھی ہونا بہت ضروری ہے۔ پھر آپ کے اندر معلومات کا ذخیرہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو آپ ریڈیو میں داخل بھی نہیں ہوسکیں گے۔ کیوں کہ بغیر نالج کے آپ کوئی پروگرام نہیں کر سکتے۔ پھر اردو سے محبت ہونا بہت ضروری ضروری ہے اور مجھے تو ہمیشہ سے اردو سے بہت محبت رہی ہے۔ اردو اچھی تو تھی مگر مزید سیکھ کر اسے اور بھی اچھا کیا اور اس دور کا ریڈیو واقعی ریڈیو تھا۔ بہت قابل اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ جو آج کے دور میں کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جو ابھی بھی باقی ہیں ان کے ساتھ تو کام کرنے کا موقع مل ہی رہا ہے، لیکن اب جو نئے لوگ آ رہے ہیں ان میں اس چیز کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جو پروڈیوسر ہے یا براڈ کاسٹر ہے اس کی اردو کتنی اچھی ہے؟ اردو سے محبت کرتا ہے یا نہیں کرتا، آج کل دیکھا جائے تو لوگ اردو سے محبت کم کرتے ہیں اور انگریزی سے زیادہ محبت کرتے ہیں شاید اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل ہوجائے گا۔ جبکہ میرا نظریہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں مقام آپ کو اپنی زبان سے حاصل ہوتا ہے۔ آج اگر میں بول چینل اور پاک نیوز چینل پر میں ہوں تو اپنی اردو زبان کی بدولت ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بول چینل گیا تو انہوں نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ ''اردو'' میں اپنے آپ کو کتنے نمبر دیں گے تو میں نے کہا کہ دس میں سے دس...... تو بڑے حیران ہوئے کہ واقعی آپ کو اتنا اعتماد ہے اپنے اوپر...... تو میں نے کہا جی بالکل...... اور پھر جب انہوں نے مجھے آڈیشن کے لیے بلایا تو کچھ چیزیں دیں پڑھنے کے لیے، ان میں مشکل الفاظ بھی تھے تو انہوں نے جب دیکھا کہ میں نے مشکل الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا ہے تو پھر مجھے منتخب کرلیا۔''

☆ ''آپ کے سامعین کا تعلق کسی خاص ایج گروپ سے ہے یا سب ہی سنتے ہیں آپ کے پروگرام؟''

♥ ''میرے سامعین میں ماشاء اللہ جوان بھی ہیں اور بزرگ بھی ہیں میرے رات کے دس سے بارہ بجے کے پروگرام میں آپ کو ہر ایج گروپ کے لوگ ملیں گے اور جو اردو سے محبت کرتے ہیں، زیادہ تر وہی کالز کرتے ہیں اور جب صبح کے وقت پروگرام کرتا تھا تو اس میں کالز نہیں لیا کرتا تھا وہ معلومات عامہ پر مبنی پروگرام ہوتا تھا اس لیے ایج گروپ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایف ایم 93۔ کا ایک بہت مشہور پروگرام ہوتا تھا۔ ''صبح پاکستان'' وہ قومی نشریاتی رابطے پر چلا کرتا تھا تو وہ اتنا زیادہ مشہور تھا کہ پاکستان کے چپے چپے سے ہمیں کالز آیا کرتی تھیں۔ خطوط بھی آتے تھے اور ہم ان کے نام بھی نشر کرتے تھے، تو اس ایک گھنٹے کے پروگرام میں اتنے نام ہوتے تھے کہ ہم سب نشر نہیں کر سکتے تھے، پھر مجبوراً ہمیں دوسرے دن نشر کرنا پڑتے تھے۔ اور چونکہ میرا تعلق حیدر آباد سے ہے اور میر پور خاص میں میرا

ننھیال بھی ہے اور سسرال بھی ہے تو ایک بار جب میں میر پور خاص گیا اور رشتے داروں سے ملنے گیا اور انہوں نے وہاں کے لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ ریڈیو پہ کام کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ وہ فرمائشی پروگرام آپ کرتے ہیں تو میں نے کہا، جی..... تو کہنے لگے کہ ارے ہم تو وہ پروگرام بہت شوق سے سنتے ہیں اور پھر میری تعریف شروع کر دی۔ تو مجھے بہت اچھا لگا..... اور جب میں میر پور خاص جاتا ہوں تو لوگ خاص طور پر مجھ سے ملنے آتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ آواز کی وجہ سے لوگ ہمیں جانتے ہیں۔''

☆ ''آپ نے کہا کہ سسرال میر پور خاص میں ہے۔ تو اپنی فیملی کے بارے میں بتایئے؟''

♥ ''جی..... میرا سسرال میر پور خاص میں ہے۔ شادی شدہ ہوں۔ دو بیٹے ہیں میرے اور ماشاء اللہ ایک بیس سال کا ہے اور دوسرا اٹھارہ سال کا ہے اور جب میں بیس سال کا تھا تو میری شادی ہو گئی تھی۔ تین بہن، بھائی ہیں۔ ایک بہن ہے اور ایک بھائی اٹلی میں رہتا ہے، جبکہ میں یہاں کراچی میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں اور مادری زبان ہماری اردو ہے۔''

☆ ''اتنی مصروفیات میں سے فیملی کے لیے وقت نکال لیتے ہیں؟''

♥ ''مصروفیات تو واقعی بہت ہوتی ہیں اور فیملی کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دن جو چھٹی کا ملتا ہے، بس وہی فیملی ڈے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تو بہت مشکل ہو جاتی ہے اگر بہت اہم کہیں جانا ہوتا ہے تو پھر چھٹی لے لیتے ہیں۔ یا پھر سال میں کچھ دنوں کی چھٹیاں لے کر فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتے ہیں۔''

☆ ''بیگم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟ خود بھی پکا لیتے ہیں؟ گھر کے کھانے اچھے لگتے ہیں یا باہر کے؟''

♥ ''کوکنگ تو مجھے بالکل نہیں آتی، البتہ کھانے



کا بہت شوقین ہوں۔ مگر اتنا نہیں کہ ہر وقت باہر ہی کھاؤں۔ گھر کی دال بھی اچھی بنی ہوئی ہوتی ہے تو بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ باہر کے کھانے تو مجبوری کے تحت یار دوستوں کے ساتھ کھانے پڑتے ہیں، اور فیملی کے ساتھ بھی باہر کے کھانے کھا لیتا ہوں، مگر باہر کی بریانی سے گھر کی دال مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے۔''

☆ ''ریڈیو کی جاب کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟''

♥ ''جی..... ڈبنگ، کمرشلز اور آواز کے حوالے سے سب کام کرنے کے علاوہ ایک چھوٹا سا بزنس بھی کرتا ہوں جو کہ فیشن ڈیزائننگ کا بزنس ہے اور مختلف بوتیکز کے لیے لیڈیز کپڑے ڈیزائن کرتا ہوں۔ وہ مجھے آرڈر کر دیتی ہیں اور میں انہیں بنوا کر بھیج دیتا ہوں۔ اس بزنس کے لیے بڑی مشکل سے ٹائم نکالنا پڑتا ہے اور نکال لیتا ہوں کہ یہ میرا شوق بھی ہے اور اس کام کے لیے میں نے کچھ لوگ بھی ہائر کیے ہوئے ہیں، لیکن بوتیکز میں جا کر خود میٹنگ کرتا ہوں اور ڈیزائن سمجھتا ہوں..... تو اس شوق میں اللہ کا شکر ہے کہ آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔''

☆ ''کھیلوں سے لگاؤ ہے؟''

♥ ''کھیلوں سے دلچسپی بھی کافی رہی ہے۔ سیاست سے بھی دلچسپی رہتی ہے اور اس حد تک کہ کون کیا کر رہا ہے یا کیا کرنے جا رہا ہے۔ پارٹی کیا چاہ رہی ہے۔ ان کا منشور کیا ہے اور بہ حیثیت ایک آر جے کے ہمیں اس کی نالج ہونی بھی چاہیے اور بچپن میں، میں نے کرکٹ بھی کافی کھیلی ہے اور اب بھی دل چاہتا ہے کہ کھیلوں، مگر اب نوجوانوں والی عمر نہیں رہی، اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے، ورنہ مشکل ہو جائے گی۔''

☆ ''آپ بتا رہے ہیں کہ اداکاری سے بھی شغف رہا ہے اور ہے اور نیوز چینلز کے لیے تو آپ کام کرتے ہی ہیں۔ کبھی اینکر بننے اور باقاعدہ اداکاری کا شوق ہوا؟''

♥ ''نیوز اینکر بننے کا شوق رہا اور اداکاری بھی شوق ہے، مگر ان کاموں میں وقت بہت لگ جاتا ہے۔ پورا پورا دن لگ جاتا ہے اور بندہ پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔''

☆ ''سب سے پہلا پروگرام جو کیا اس وقت کیا کیفیت تھی اور اچھا ہوا تھا یا بہت اچھا ہوا تھا یا نارمل ہوا تھا؟''

♥ ''سب سے پہلے پروگرام میں تو صورت حال بہت مشکل تھی۔ ہاتھ پاؤں تو کانپ ہی رہے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ توجہ بھی کہیں اور ڈائیورٹ ہو رہی تھی اور جو پڑھنا تھا وہ اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی پہلا پروگرام اچھا ہو گیا تھا۔''

☆ ٹینشن، موڈ خراب، گھریلو مسائل...... تو پھر پروگرام پر کیا اثر پڑتا ہے۔''

♥ ''جی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موڈ نہیں ہوتا، پروگرام کرنے کا ٹینشن یا کوئی بھی وجہ ہو اور گلا خراب ہو تو پروگرام پہ اثر نہیں پڑنے دیتا کہ یہ ہی ایک اچھے براڈ کاسٹر کی خوبی ہے کہ وہ اپنی ٹینشن دوسروں پہ ظاہر نہ کرے...... ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا، لیکن مجھے اسٹوڈیو آنا تھا اور میں گیا، حالانکہ کمر پہ چوٹ آئی تھی، مگر میں نے محسوس بھی نہیں کیا، کیوں کہ ہمیں اپنی گفتگو سے دوسروں کا موڈ اچھا کرنا ہوتا ہے، دوسروں کے لبوں پہ مسکراہٹ لاتی ہوتی ہے۔''

☆ ''کیا ریڈیو اسی طرح مقبول ہے، جس طرح ٹی وی اور ڈھیر سارے چینلز کے آنے سے پہلے تھا؟''

♥ ''ریڈیو کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ اگر ریڈیو مقبول نہ ہوتا تو آج اتنے سارے ایف ایم ریڈیو نہ ہوتے، تو مقبولیت کی وجہ سے ہی اتنے سارے ایف ایم کھلے ہیں اور اس کی وجہ سے سامعین کی تعداد بھی بڑھی ہے اور مجھے بہت سے ایسے سامعین بھی ملے ہیں جن کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے ریڈیو کی وجہ سے اردو سیکھی ہے۔''

☆ ''آپ کو ریڈیو سے وابستہ ہوئے چودہ سال ہو گئے ہیں تو اس وقت کے ماحول اور اب کے ماحول میں کوئی فرق پایا آپ نے؟''

♥ ''جب میں نے چودہ سال پہلے ریڈیو جوائن کیا تھا تب سامعین کی تعداد تو زیادہ تھی ہی، مگر میڈیم ایک ہی تھا، یعنی صرف ریڈیو پاکستان تھا اور ایف ایم کا اجرا نہیں ہوا تھا اور پروگرامنگ بھی بڑی ''نپی تلی'' تھی اور بڑا اچھا انداز اور اردو کی صحیح ترویج بھی اسی دور میں ہوا کرتی تھی، لیکن جیسے جیسے ایف ایم آتے گئے تو تعداد تو بڑھ گئی ریڈیو کی، مگر پروگراموں کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔ اردو سے محبت کرنے والے کم ہیں، انگریزی کو فالو کرنے والے یا محبت کرنے والے زیادہ ہیں۔ لہٰذا اردو کے ساتھ انگریزی کے استعمال نے پروگراموں کے معیار کو گرایا ہے۔ پہلے دور کے اردو کے اساتذہ انگریزی کے ایک لفظ کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے اور پورا اسکرپٹ خوب صورت اردو میں ہوتا تھا، مگر اب ایسا نہیں ہے۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے جمیل احمد صاحب سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆☆

میری بھی سنیے

حنا الطاف

شاہین رشید



1:- ''نام ؟''

''حنا الطاف۔''

2:- ''پکاری جاتی ہوں؟''

''حنی ،حنو اور ہنی۔''

3:- ''دنیا میں آئی ؟''

''2 جنوری 1994ء کو۔ کراچی میں پیدا ہوئی۔

4:- ''میرا قد ہے؟''

'' 5 فٹ 2 انچ۔ اسٹار بھی بتا دیتی ہوں۔ کیپری کورن ہے۔ ویسے ستاروں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔''

5:- ''لاڈلی ہوں؟''

''اپنے والدین کی اور اپنے دو بڑے بھائیوں کی کیونکہ میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔''

6:- ''تعلیمی میدان سر کیا؟''

''بیچلر ہے۔''

7:- ''شادی......؟''

''جب اللہ کو منظور ہوگا۔''

8:- ''کس کا ہاتھ پکڑ کر شوبز میں آئی؟''

''کسی کا نہیں......خالصتاً اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں اور یقین مانیے کہ بہت جدوجہد کے بعد اپنے آپ کو منوا سکی کیونکہ میرے ہاتھ میں سفارش کی پرچی نہیں تھی۔''

9:- ''میری ضد کس کے آگے چلتی ہے؟''

''صرف گھر والوں کے آگے......عام لوگوں سے نہ ضد کرتی ہوں اور نہ ہی میری ضد چلتی ہے۔''

10:- ''مجھے ہنسی آتی ہے؟''

''ان لوگوں پر جو بہت شو آف کرتے ہیں کہ مجھے یہ بھی آتا ہے۔ وہ بھی آتا ہے۔ میں ایسا ہوں ویسا ہوں......مگر درحقیقت وہ اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں آتا۔''

11:- ''لڑکوں کے لیے کوئی نصیحت؟''

''کہ لڑکیوں کی عزت کیا کریں دل سے، یہ نہیں کہ ان کے منہ پر کچھ ہیں اور ان کی بیک پر کچھ ہیں۔ کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائیاں کرنے والے مرد مجھے بہت برے لگتے ہیں۔''

12:- ''بحث نہیں کرتی جب......؟''

''جب مجھے غصہ آیا ہوا ہوتا ہے۔ بلکہ

خاموش رہنا ہی پسند کرتی ہوں۔''

13:- ''مستقبل میں کسی دوسرے ملک میں رہنا پڑے تو؟''

'' برطانیہ بہت پسند ہے۔ برطانیہ بہت خوب صورت ہے۔ مگر اپنا ملک بھی کسی سے کم نہیں ہے۔''

14:- ''مجھے سکون ملتا ہے؟''

'' اپنے کمرے میں ...... بہت پرسکون ہوتی ہوں اپنے کمرے میں تھکن دور کرنے کے لیے گوشہ عافیت ہے۔''

15:- ''بھروسا کس پر کیا جا سکتا ہے؟''



'' صرف اور صرف اپنے والدین اور بھائی بہنوں پر۔''

16:- ''اٹھتے ہی پہلا کام؟''

'' موبائل چیک کرتی ہوں کہ کس کس نے یاد کیا؟''

17:- ''میری نظر میں بہترین تحفہ؟''

'' دعائیں۔''

18:- ''بچت کرتی ہوں؟''

'' ہرگز بچت نہیں ہوتی، بلکہ خرچ کرنے کے بعد یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ پتا نہیں اگلا چیک کب ملے گا کہ میں خرچ کر سکوں گی۔''

19:- '' بہ حیثیت '' وی جے'' کے کون سا پروگرام کرنے میں مزا آتا تھا؟''

'' قومی تہوار 14 اگست ...... بہت جوش و خروش ہوتا ہے اور بہت مزا آتا ہے۔''

20:- ''لاڈ اٹھواتی ہوں؟''

'' اپنی ''ماں'' سے ...... اکثر بیڈ پر لیٹے لیٹے امی سے فرمائش کرتی ہوں کہ امی کچھ کھانے کو دیں۔ ورنہ آپ کی بیٹی کو کچھ ہو جائے گا اور پھر سب من پسند چیزیں آ جاتی ہیں۔ ماں سے بڑھ کر کوئی نہیں اس دنیا میں۔''

21:- ''گھر سے نہیں نکلتی جب تک؟''

'' ناشتا نہ کر لوں تب تک گھر سے نہیں نکلتی۔ فریش رہنے کے لیے ناشتا بہت ضروری ہے۔''

22:- ''دنیا میں کیا چیز بہت حسین ہے؟''

'' ساری دنیا بہت حسین ہے۔ بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ اور والدین ہماری زندگی کو حسین بنا دیتے ہیں۔''

23:- ''وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں؟''

'' جو منافق اور دوغلے ہوتے ہیں ...... اور جو دوسروں کی دوستی اور شہرت کو کیش کراتے ہیں۔''

24:- ''چڑچڑی ہو جاتی ہوں؟''

'' جب مجھے کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو۔''

25:- ''وہ دن بہت حسین ہوگا جب؟''

'' جب میرے والدین کہیں گے کہ ہمیں اپنی بیٹی پہ بہت فخر ہے۔ ہماری بیٹی دنیا کی بہترین بیٹی ہے۔''

26:- ''مجھے شوق ہے؟''

'' کپڑوں اور میک اپ کا۔''

27:- ''گھر میں اچھا کک کون ہے؟''

'' امی ابو دونوں ...... میں امی کے ہاتھ کا ناشتا

بہت شوق سے کھاتی ہوں اور کھانا ابو کے ہاتھ کا ...... کیونکہ وہ بہت اچھا پکاتے ہیں۔''

28:- ''شادی میں اس لیے جاتی ہوں کہ؟''

''کہ مجھے مہندی کی رسمیں بہت پسند ہیں۔ انجوائے کرتی ہوں شادی کی رسومات کو۔''

29:- ''کھانے میں کس چیز کی کمی برداشت نہیں؟''

''کیچپ اور اچار کی۔''

30:- ''دوسروں کی مدد کس انداز میں کرتی ہوں؟''

''عموماً آپ نے راہ چلتے بچوں کو چیزیں بیچتے دیکھا ہوگا تو مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے...... جب وہ میرے پاس آتے ہیں تو مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں بھی ہوتی تو بھی میں وہ چیزیں خرید لیتی ہوں۔ تاکہ اس بہانے ان محنت کش بچوں کی مدد ہو جائے۔''

31:- ''غصے میں بے ساختہ بولتی ہوں؟''

''چلیں جائیں یہاں سے، مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔''

32:- ''ڈراموں کے کردار انسان کا عکس ہوتے ہیں؟''

''میرے نزدیک تو کردار کا انسان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہم تو بس کردار کو اپنے اوپر طاری کر کے پرفارم کرتے ہیں ہم جو نہیں ہوتے وہ ہم بن جاتے ہیں۔''

33:- ''انسان کی زندگی کا اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟''

''جو دور ہم گزار رہے ہوتے ہیں اگر وہ اچھا گزر رہا ہے تو وہی دور اچھا ہوتا ہے یا پھر آنے والا دور جس کے لیے ہم محنت کر رہے ہوتے ہیں کہ اچھا گزرے...... جو گزر گیا اسے اچھا یا برا کیا کہنا۔''

34:- ''تحفے دیتی ہوں یا لیتی ہوں؟''



''لیتی بھی ہوں اور دیتی بھی ہوں۔ دینے کا مجھے زیادہ شوق ہے اور بہت اچھی پیکنگ میں دینے کا شوق ہے۔''

35:- ''اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدتی ہوں؟''

''چہرے پہ لگانے والی کریم جو کہ بہت مہنگی ہوتی ہے مگر میرے چہرے پہ سوٹ کرتی ہے۔''

36:- ''گھر میں کھانا کھانے کو ترجیح دیتی ہوں یا باہر؟''

''مجھے گھر سے باہر جا کر کھانا کھانا پسند نہیں۔ اس لیے عموماً آرڈر دے کر گھر پہ بھی منگوا لیتی ہوں۔''

37:- ''موبائل سروس آف ہو جائے تو؟''

''بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔ بندہ کسی کام کا نہیں رہتا۔''

38:- ''میری بری عادت؟''

''کہ میں سوچتی بہت ہوں۔ اتنا زیادہ سوچنا



نہیں چاہیے فیصلے میں مشکل ہوتی ہے۔''

39:- ''کون سی جگہ ہر وقت جانے کو تیار رہتی ہوں؟''

''کوئی خاص نہیں۔ جو سکون گھر میں ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ کام سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں ہی سکون ملتا ہے۔''

40:- ''میرا صبح کا سورج نکلتا ہے؟''

''اگر کوئی کام نہ ہو تو میرا سورج بارہ بجے دوپہر نکلتا ہے۔''

41:- ''پسندیدہ مشروب؟''

''مشروب نہیں..... پانی بہت پسند ہے اور جب صبح اٹھتی ہوں تو پہلا کام پانی پینے کا ہی کرتی ہوں اور پانی کی پوری بڑی بوتل خالی کر دیتی ہوں۔''

42:- ''گھر سے نکلتے وقت کیا دل چاہتا ہے کہ؟''

''کہ کوئی مجھ سے یہ نہ پوچھے کہ کہاں جا رہی ہو، کب آؤ گی۔ تمہارا پروگرام کب آن ایئر ہو گا۔ حالانکہ سب کو پتا ہے کہ میں فضول میں گھر سے باہر نہیں رہتی۔''

43:- ''کسی کی خوشی میں کس طرح اظہار کرتی ہوں؟''

''مجھے اظہار کرنا بہت اچھا آتا ہے۔ اتنا اچھا کہ جس کی خوشی میں خوش ہوتی ہوں وہ بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ ارے واہ انہیں تو لگتا ہے کہ ہم سے بھی زیادہ خوشی ہے اور میں واقعی دوسروں کو خوشی میں خوش ہو کر بہت اچھا محسوس کرتی ہوں۔''

44:- ''موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟''

''جب کوئی سچ میں بناوٹ سے پاک میری تعریف کر رہا ہوتا ہے تو میرا موڈ بہت اچھا ہو جاتا ہے۔''

45:- ''میرے بیگ میں جو چیزیں لازمی ہوتی ہیں؟''

''میرا موبائل، میرا میک اپ، پانی کی بوتل اور کچھ دیگر چیزیں۔''

46:- ''جو چیز میں دو منٹ میں پکا لیتی ہوں؟''

''قہقہہ..... دو منٹ میں تو کوئی چیز نہیں بنتی، ہاں میں نوڈلز بہت آسانی کے ساتھ بنا لیتی ہوں..... اور فی الحال یہی بنانا بہت اچھا آتا ہے۔''

47:- ''گھر میں لذیذ کھانا کون بناتا ہے؟''

''میرے ابو..... ان کے ہاتھ میں بہت لذت ہے۔''

48:- ''میں ''ان'' رہتی ہوں؟''

''سوشل میڈیا پہ..... فیس بک پہ..... اپ ڈیٹ رہتی بھی ہوں اور اپ ڈیٹ رکھتی بھی ہوں۔''

49:- ''سینما میں جو پہلی فلم دیکھی تھی؟''

''گوڈزیلا۔''

50:- ''خدا کی بے شمار نعمتوں میں ایک بڑی نعمت؟''

''زندگی..... بہت خوب صورت تحفہ ہے اللہ کا جو اگر سکھ چین سے گزرے تو۔''

☆☆

مقابل ہے آئینہ

آمنہ

اِدارہ

س۔ ''اصلی نام کیا ہے۔ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج۔ ''میرا نام آمنہ ہے اور گھر والے پیار سے بہت کچھ پکارتے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں۔''

س۔ ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج۔ ''آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے غالب اِرے مذاق کر رہی ہوں۔ آئینہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ تعالٰی نے بہت سوں سے اچھا بنایا۔''

س۔ ''حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟''

ج۔ ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں یہ شعر گردش کرتا ہے۔

نہ تجھ سے غرض نہ تیری ذات سے
ہم تو مصور کا قلم دیکھتے ہیں

س۔ ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج۔ میں پرس نہیں پاؤچ رکھتی ہوں جس میں صرف پیسے ہوتے ہیں۔''

س۔ ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج۔ ''بالکل ڈرتی ہوں۔ وہ کون سا میری سہیلیاں ہیں جو میں انہیں ڈرادوں گی۔''

س۔ ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج۔ ''مہمان بہت اچھے لگتے ہیں۔ اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ لیکن جو کوئی انکل آنٹی پسند نہ آئے تو زیادہ بات نہیں کرتی پھر اور اگر کوئی زیادہ پسند آئے تو ان سے بھی بات نہیں کرتی کہ کہیں کوئی بات بری نہ لگ جائے۔''

س۔ ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج۔ ''کھانا ماما بناتی ہیں (مزے مزے کے) اور ہم مزے مزے سے کھاتے ہیں۔ کڑاہی گوشت۔ بریانی۔ اچار گوشت۔ دیگی حلیم اور آلو قیمہ۔''

س۔ ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج۔ ''حکومت کی کرسی پر جو بیٹھ جائے وہ اسے چھوڑنے کے لیے ہی نہیں تیار ہوتا۔ ہمیں کیا ملے گی۔ پر میری وش ہے کہ جو کوئی بھی بھیک مانگتا ہے انہیں روزگار ملے۔''

س۔ ''پسندیدہ شاعر؟''

ج۔ ''کوئی بھی مخصوص شاعر اچھا نہیں لگتا، بہت سے شاعروں کے بہت سے شعر پسند ہیں۔''

س۔ ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج۔ ''مزاجاً لڑاکا ہوں لیکن صرف گھر کی حد تک۔ باہر تو نیک پروین، معصوم بچی بن کے رہتی ہوں۔''

س۔ ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج۔ ''مجھے مزاجاً ہنس مکھ اور سادہ لوگ اچھے لگتے ہیں۔ شوخیاں مارنے والے چھچھورے لوگ زہر لگتے ہیں۔''

س۔ ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہیں کہ لوڈشیڈنگ نہ ہوتی یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ساس نے بہو کے لیے ڈنر تیار کیا ہو۔ نہ نو من تیل ہوگا۔ نہ رادھا ناچے گی۔''

س۔ ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج۔ ''مجھے سب سے زیادہ مزا اس وقت آتا

ہے۔ جب سب سو رہے ہوں۔ وہی بہترین وقت لگتا ہے۔"

س۔" آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج۔" نہ بہت کفایت شعار ہوں اور فضول خرچ بالکل نہیں۔ سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔"

س۔" کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

ج۔" میرا نام تو میری شخصیت پر اثر انداز نہیں ہوا ہے۔"

س۔" وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟"

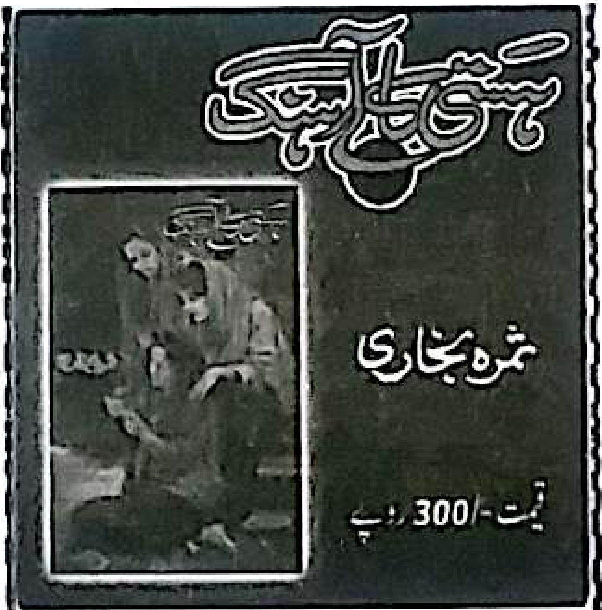
ج۔" دنیا کی تو عادت ہے ہر کام میں کیڑے نکالنے کی۔ تو جس کام سے آپ کا ضمیر مطمئن ہے وہ کرلیں چاہے دنیا جتنی بھی بک بک کرے۔"

س۔" آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہو اور کتا پیچھے لگ گیا تو؟"

ج۔" کتا پیچھے لگ جائے تو مؤدبانہ ایک طرف کھڑے ہو کر اسے آگے نکلنے کا راستہ دوں گی۔ ویسے کافی خوف ناک پچویشن نہیں ہے۔ سنسان اکیلی رات اور پھر پیچھے لگا ہوا کتا۔"

س۔" آپ کی نظر میں محبت؟"

ج۔" ایک پر خلوص جذبہ۔"



س۔" کن لوگوں کی احسان مند نہیں؟"

ج۔" احسان مند کسی کی بھی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں تو زندگی اچھی گزر رہی ہے۔"

س۔" اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے کیا؟"

ج۔" ہاں! تعریف سے حوصلہ بڑھتا ہے۔"

س۔" ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

ج۔" جی! دیکھتی ہوں جس کی (کہانی) جان دار ہو۔"

س۔" اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟"

ج۔" میں دوستیں نہیں بناتی۔ ہاں، اگر آس پاس کی کوئی کلاس فیلو ناراض ہو جائے تو کہہ دیتی ہوں سوری! اگر آپ کو برا لگا تو۔"

س۔" حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"

ج۔" جب خشوع و خضوع سے نماز ادا کروں۔"

س۔" زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"

ج۔" زندگی غم اور خوشی کے امتزاج کا نام ہے۔ سب لوگ مطلبی ہوتے ہیں۔ سوائے والدین کے سو کسی پر اعتماد نہ کرو۔"

س۔" ستاروں پہ یقین رکھتی ہیں؟"

ج۔" نہیں میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتی کہ ستاروں کو گردش میں رکھنے والا بھی اللہ ہے اور اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

س۔" کوئی آخری بات؟"

ج۔" ارے پہلی بات تو کی نہیں آخری تک پہنچ بھی گئے۔"

س۔" کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہو؟"

ج۔" میری ماما مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں تو اللہ کتنا کرتا ہوگا۔ یہ بات ذہن میں رہتی ہے۔"

☆☆

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدرعلی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے' چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی' مدد کرتے ہیں۔
حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں' وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اس قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں
حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ' خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔
سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ' حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں' ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

دوسری قسط



خزینہ اور شہرینہ گھر آئیں تو آگے سبینہ موجود تھی غالباً ابھی آئی تھی جب ہی دونوں کو دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔
''تم دونوں کہاں سے آرہی ہو۔؟''
''ہم چچی جان کے ہاں گئی تھیں۔'' خزینہ نے اب جھوٹ نہیں بولا اور سچ نے حمیدہ بیگم کو آگ لگا دی۔
''ہائیں۔ تم تو مارکیٹ جانے کا کہہ گئی تھیں۔''
''ہاں پھر راستے میں ارادہ بدل گیا۔ سوچا سبینہ آپا آرہی ہیں کہیں مارکیٹ میں دیر نہ ہو جائے اس لیے ہم چچی جان سے ملنے چلے گئے۔'' خزینہ اطمینان سے بول رہی تھی۔
''اچھا کیا بیٹا! ٹھیک تو ہیں تمہاری چچی جان!'' حیدر علی نے گویا حمیدہ بیگم کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔
''جی ابو۔'' وہ انہیں جواب دے کر سبینہ سے مخاطب ہوگئی۔ ''آپ اکیلی آئی ہیں آپا، طارق بھائی نہیں آئے۔''
''وہی چھوڑ گئے ہیں۔ کسی کام سے گئے ہیں تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔'' سبینہ کا جواب سنتے ہی حمیدہ بیگم بول پڑیں۔
''چلو طارق کے آنے سے پہلے کھانا تیار کرلو۔''
شہرینہ جو اس دوران حمیدہ بیگم کی چبھتی نظروں سے بچنے کی خاطر سبینہ کے بچے میں مصروف ہوگئی تھی فوراً اٹھ کر کچن میں بھاگ آئی اور ابھی فریج سے گوشت نکالا تھا کہ خزینہ بھی آگئی۔
''تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔؟''
''کیا کروں دیکھا نہیں امی کیسے گھورتی ہیں مجھے جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہو۔'' شہرینہ یکلخت روہانسی ہوگئی تھی۔
''امی کی تو عادت ہے تھوڑی ڈھیٹ بن جاؤ کیونکہ تمہیں اسی گھر میں جانا ہے۔'' خزینہ نے اس کے ہاتھ سے گوشت کا شاپر لیتے ہوئے کہا تو وہ شکستہ لہجے میں بولی تھی۔
''یہ تو امی کو سوچنا چاہیے۔''
''ہوں۔ کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ امی کو سوچنا چاہیے۔ ابھی سے بیٹی کا گھر خراب کررہی ہیں۔'' خزینہ نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ مزید خائف ہوگئی۔
''مجھے بہت ڈر لگتا ہے خزی۔''
''خیر ایسی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ امی کی عادت سے سب واقف ہیں۔ چچی جان اور حمزہ بھی.....'' خزینہ اب اسے تسلی دینے لگی تھی۔ اور جب تک دونوں کچن میں مصروف رہیں خزینہ اس موضوع سے نہیں ہٹی، اسے خدشات سے نکال کر ہی دم لیا تھا۔
پھر کھانے کے بعد حیدر علی اور طارق سیاست پر باتیں کرنے لگے تو حمیدہ بیگم سبینہ کو لے کر خزینہ اور شہرینہ کے کمرے میں آگئیں۔
''آپا آج رہ جائیں ناں۔'' شہرینہ نے سبینہ کی گود سے اس کے چھ ماہ کے بیٹے طلحہ کو لیتے ہوئے کہا تو وہ نخوت سے بولی۔
''نہ بھئی میرے بچے اے سی کے بغیر نہیں سوتے۔''
''بچوں کو کیوں بدنام کررہی ہیں یوں کہیں آپ سے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ چربی جو اتنی چڑھالی ہے۔'' خزینہ کی صاف گوئی پر سبینہ سلگ گئی۔
''دیکھ رہی ہیں ابھی کتنی بدلحاظ ہوتی جارہی ہے''
''اس میں بدلحاظی کی کیا بات ہے آپا!''
''اچھا بس چپ۔'' حمیدہ بیگم نے ٹوک دیا۔ ''بہن اتنے دنوں بعد آئی ہے کچھ خیال کیا کرو۔''

''سوری آپا! آپ تو بدگمان ہو گئیں۔'' خزینہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔
''ہم تو آپ کی محبت میں آپ کو روکتے ہیں۔ دعا کریں ہم بھی اے سی والے ہو جائیں تاکہ آپ کو یہاں رکنے میں پرابلم نہ ہو۔''
''مجھے روکنے کے بجائے اپنا بوریا بستر سمیٹنے کی بات کرو۔'' سبینہ نے کہا تو وہ سمجھی نہیں۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب، کیوں شادی کو منع کر رہی ہو۔ امی نے بتایا ہے تم نے شرجیل کو ریجیکٹ کر دیا ہے کیوں؟'' سبینہ نے سوالیہ نشان بن کر اسے الجھن میں ڈال دیا۔
''جواب دو۔ کیا برائی ہے شرجیل میں؟''
''بس کریں آپا۔ میں نے کسی انتہائی برائی کی وجہ سے منع نہیں کیا بس مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ جھنجلائی تھی۔
''پھر کس سے کرنی ہے؟'' سبینہ کا سوال بے ساختہ تھا۔
''پتا نہیں۔ جس کے ساتھ ہونی ہوگی ہو جائے گی۔ بس وہ شرجیل نہیں ہوگا۔'' وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ حمیدہ بیگم گہری سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ اس وقت جھنجلانے کے ساتھ اچانک غصے میں بھی آ گیا تھا۔ نسیم صاحب جس کا وہ ہمیشہ سے احترام کرتا رہا تھا انہیں بے نقط سنا ڈالیں کہ اتنے اہم پیپر جنہیں ایک ہفتہ پہلے فلیکس کرنا تھے وہ اس کی ٹیبل پر رکھے تھے۔ حالانکہ اس میں غلطی نسیم صاحب کی نہیں تھی۔ وہ اس کے سائن کے بغیر کیسے پیپرز آگے بھیج سکتے تھے۔ انہوں نے جب بھی پیپرز سائن کے لیے اس کے سامنے رکھے اس نے منع کر دیا تھا کہ ابھی انہیں ہٹائیں یہاں سے۔ اس کے باوجود نسیم صاحب نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔
''آپ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں جائیں اپنا کام کریں۔ اور ہاں مس خزینہ کو یہاں بھیج دیں۔'' وہ کہہ کر اپنے سامنے رکھے پیپرز چیک کرنے لگا۔
''یس سر۔'' خزینہ کی آواز پر اس نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر تمام پیپرز سائن کر کے خزینہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کی بیل پر اس نے بلاارادہ ریسور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔
''یس۔''
''ہاں غزنی پھر تم نے کیا سوچا۔'' ادھر سے اس کی سونیا آپی نے چھوٹتے ہی پوچھا لیکن وہ سمجھا نہیں۔
''کس بارے میں؟''
''ارے وہ جو میں نے تمہیں شادی کا مشورہ دیا تھا۔'' سونیا نے کہا تو وہ سلگ گیا۔
''اوفو! آپی میں اس وقت آفس میں ہوں۔''
''پتا ہے مجھے جب ہی تو میں نے اس وقت فون کیا ہے کیونکہ گھر میں تو تم سے اس موضوع پر بات ہو نہیں سکتی۔'' سونیا بھی ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن وہ بھی اس وقت اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''آپی پلیز! میں اس وقت میٹنگ میں ہوں۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر مجھے کال کرنا۔'' سونیا نے کہہ کر فون رکھ دیا تو وہ جو اس وقت ساری ٹینشنز ایک طرف رکھ کر صرف آفیشل معاملات دیکھنا چاہتا تھا اس کا ذہن پھر چٹخنے لگا تھا۔ ریسور رکھ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ یہ بھی خیال نہیں رہا کہ سامنے خزینہ منتظر بیٹھی ہے۔ خود کو ریلیکس کرنے کی سعی میں وہ

مزید نڈھال ہو رہا تھا کہ سماعتوں پر نرم آواز کی تھاپ پڑی تھی۔
"ایکسکیوزمی سر......" اس نے بے اختیار ہاتھ نیچے گرا کر دیکھا خزینہ اس کے لیے اورنج جوس لیے کھڑی تھی۔
"تھینکس......" اس نے گلاس لے کر خزینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر گھونٹ گھونٹ جوس پیتے ہوئے وہ بلا ارادہ بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔ جو بظاہر اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔
"تھینکس اگین خزینہ! مجھے واقعی اس کی ضرورت تھی۔" اس نے گلاس خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا تو خزینہ نے مسکرا کر یوں ہی کہہ دیا۔

"جی سر۔"
"آپ کو کیسے پتا چلا۔" اس نے پوچھا تو وہ شپٹا گئی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو ذرا سے کندھے اچکا دیے۔
جواباً اس نے بھی کندھے اچکائے' انداز سراہنے والا تھا۔ پھر کہنے لگا۔
"میں نے آپ کو شاید کسی کام سے بلایا تھا۔"
"جی سر یہ پیپرز......" خزینہ نے اس کے سامنے رکھے پیپرز کی طرف اشارہ کر دیا۔
"اوکے...... اس نے پیپرز کا از سر نو جائزہ لیا پھر اس کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ یہ پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ انہیں ابھی فوراً فیکس کر دیں۔
"جی سر۔" خزینہ پیپرز لے کر چلی گئی تو چیئر کی بیک پر سر ٹکاتے ہوئے اس کی نظر ٹیلی فون سیٹ پر پڑی اور یوں لگا جیسے ابھی وہ بج اٹھے گا۔ سونیا باز آنے والی نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر پھر کال کرتی وہ فوراً آفس سے نکل آیا اور گاڑی میں بیٹھا تو اپنا سیل فون بھی پاور آف کر دیا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ شادی کے موضوع سے بچنا چاہتا تھا بلکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے ایک عورت اپنا بچہ دوسری عورت کی گود میں ڈال دے۔ اس کا مسئلہ شادی نہیں بچہ تھا جو سارہ اسے نہیں دے سکتی تھی۔
سارہ سے اس کا ڈبل ٹریل رشتہ تھا۔ وہ اس کی چچا زاد، خالہ زاد اور سب سے بڑھ کر اس کی محبت تھی۔ تین سال پہلے بہت دھوم دھام سے اس کی اور سارہ کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بے انتہا خوش تھے۔ پہلا سال تو گھومنے پھرنے میں ہی گزر گیا پھر جب زندگی معمول پر آئی تو دونوں بچے کا خواب دیکھنے لگے۔ گھر میں ماما اور بابا بھی معصوم قلقاریاں سننے کو بے چین تھے۔ اور انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی انہیں یہ خوش خبری مل گئی کہ وہ دادا دادی بننے والے ہیں۔
ان دنوں سب ہی سارہ کا بے حد خیال رکھتے تھے اور وہ تو پہلے ہی اس پر جان نچھاور کرتا تھا آپ تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ لیکن پھر جانے کس کی نظر لگ گئی کہ وہ اور سارہ صرف چھ ماہ ہی خواب سجا سکے تھے کہ ایک دن سیڑھیاں اترتے ہوئے سارہ کا پاؤں پھسل گیا۔ اس کی حالت بے حد تشویش ناک ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے یا پھر خدا کو سارہ کی زندگی منظور تھی کہ وہ بچ گئی لیکن اس محرومی کے ساتھ کہ وہ پھر کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔
اس وقت اس کے لیے یہی بہت تھا کہ سارہ کو اللہ نے نئی زندگی دے دی تھی۔ رہی اولاد کی خواہش تو اس سانحے کے بعد اس نے اسے دل سے نکال پھینکا اور اس نے سارہ سے بھی کہہ دیا کہ جو چیز ان کے مقدر میں نہیں ہے اس کی خواہش چھوڑ دے۔ یوں وقتی طور پر سارہ بہل گئی لیکن پھر کچھ وقت گزرا تھا کہ وہ بے چین رہنے لگی۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ کوئی بچہ گود لے لیا جائے اور وہ جو اس کی ہر بات مانتا تھا اس ایک بات پر نالاں ہو گیا۔ اس کا دل اور ذہن دونوں ہی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی اور کے بچے کو اپنا مان سکتا ہے۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ سارہ کی ضد زور پکڑتی جا رہی تھی اور ماما بابا بھی اس کا ساتھ دینے لگے

تھے کیونکہ ان دونوں کو سارہ بہت عزیز تھی۔ بابا کی بھتیجی تو ماما کی بھانجی۔ گو کہ اس کی چاہت میں بھی کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ اس کی ضد سے نہ صرف عاجز بلکہ پریشان رہنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سارہ کو یہ خدشہ بھی ہے کہ اولاد کی خاطر کہیں وہ دوسری شادی نہ کرے۔ اس لیے وہ بچہ گود لینے پر مسلسل اصرار کر رہی تھی۔

''میں کسی اور کا بچہ نہیں اپنا سکتا پایا۔ آپ سمجھائیں سارہ کو۔'' ایک دن جب سارہ میکے گئی ہوئی تھی وہ ماما سے الجھ پڑا۔ اس وقت سونیا وہیں موجود تھی اس کی بات سن کر کہنے لگی۔

''ضرورت بھی نہیں ہے کسی اور کا بچہ لینے کی۔ تم دوسری شادی کرلو۔'' ماما نے ابھی چونک کر دیکھا ہی تھا کہ بابا جو کمرے میں آتے ہوئے سونیا کی بات سن چکے تھے انتہائی غضب ناک ہو کر دھاڑے تھے۔

''سونیا! ابھی تو تم نے یہ بات کی ہے آئندہ اگر ایسا کچھ کہا تو میں تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔''

''بابا۔ میں تو بچہ......'' سونیا بری طرح خائف ہو گئی تھی۔

''جب اللہ کو منظور نہیں ہے تو نہ سہی۔ سارہ پر سوتن لانے کا سوچنا بھی مت۔ تم بھی سن لو تیمور اگر کبھی ایسی غلطی کی تو۔''

''بابا پلیز! آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچتا اور نہ میں بچہ ایڈاپٹ کرنا چاہتا ہوں آپ سارہ کو سمجھائیں۔'' وہ جھنجلا کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

''بابا بھتیجی کی محبت میں بولتے تھے اور ماما بھانجی کی۔ لیکن اسے سمجھا نہیں سکتے تھے۔ جس سے اس کی زندگی عذاب ہو رہی تھی۔ مستقل ٹینس رہنے لگا تھا اور اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے ہی سونیا اسے مشورہ دے رہی تھی کہ وہ خفیہ شادی کرلے۔

☆☆☆

کالج گیٹ سے نکلتے ہی اس کی نظر حمزہ پر پڑی تھی جو تپتی دھوپ میں دونوں بازو سینے پر لپیٹے اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک لمحہ کو دونوں کی نظریں ملیں پھر فوراً وہ اپنے راستے پر چل پڑی لیکن پھر اسے رکنا پڑا کیونکہ وہ بائیک قریب لے آیا تھا۔

''سنو...... میں تمہارے لیے آیا ہوں۔''

''بہت غلط حرکت ہے یہ......'' اس نے فوراً ٹوکا۔

''جانتا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ دل نے مجبور کیا آ گیا۔ اب جلدی سے بیٹھ جاؤ ورنہ بائیک کسی ٹرک پہ دے ماروں گا۔''

''پاگل ہو گئے ہو۔'' وہ غصے سے کہتے ہوئے اس کے پیچھے بیٹھ گئی تو حمزہ نے اسپیڈ سے بائیک بھگا دی۔

''حمزہ۔ حمزہ......'' وہ چیخے جا رہی تھی لیکن اس نے مطلوبہ مقام پر ہی جا کر بائیک روکی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ اس کے حواس ٹھکانے آتے اس کا ہاتھ پکڑ کر ریسٹورنٹ کے اندر ٹھنڈے ماحول میں لا بٹھایا کتنی دیر تک وہ پلکیں جھپکتی رہی پھر نظریں اس پر جما دیں۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں۔'' وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

''بات مت کرو مجھ سے......'' شہرینہ نے روٹھ کر چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

''دیکھو اگر موڈ آف رکھو گی تو میں قیامت تک تمہیں یہاں سے اٹھنے نہیں دوں گا۔'' اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر اسے دھمکی دی تو وہ فوراً اسے دیکھنے لگی۔

''مقصد کیا ہے تمہارا......!''

''باتیں کرنا چاہتا ہوں تم سے اچھی اچھی۔ گھر میں تو صرف ہیلو ہائے ہوتی ہے۔'' اس نے کہا تو وہ منہ پھلا کر بولی۔

''ایسا بھی نہیں ہے۔''

''چلو جیسا بھی ہے جلدی بتاؤ کیا کھاؤ گی۔'' وہ کہنے کے ساتھ مینو پر نشان لگانے لگا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ جان گئی تھی کہ وہ کچھ سننے ماننے والا نہیں ہے۔

''ہاں......'' وہ مینو کارڈ ویٹر کو تھما کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کل اتنی جلدی کیوں چلی گئی تھیں۔''

''آ گئی تھی اسی کو بہت سمجھو۔'' اس نے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''بہت تو تب سمجھوں گا جب تم ہمیشہ کے لیے آ جاؤ گی میرے گھر' میرے پاس سمجھیں اور ابھی مجھے تم سے یہی بات کرنی ہے۔''

''یہی بات......مطلب۔؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مطلب میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جلدی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اماں اور بیلا بھی یہی چاہتی ہیں۔ اور اسی سلسلے میں اماں ایک دو دن میں تمہارے ہاں آئیں گی تایا جان اور تائی جان سے بات کرنے۔''

حمزہ بہت سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ وہ الجھ گئی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''کیوں......کیوں نہیں ہو سکتا۔'' قدرے جارحانہ انداز تھا۔

''کیونکہ ابھی خزینہ......'' اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

''خزینہ کے لیے میری نظر میں ایک اچھا پرپوزل ہے۔''

''سوری! خزینہ نہیں مانے گی۔'' وہ بے اختیار بول کر پھر وضاحت دینے لگی۔ ''میرا مطلب ہے اس نے شرجیل بھائی کے لیے بھی منع کر دیا ہے۔''

''شرجیل۔ وہ تمہارا خالہ زاد۔''

''ہاں......''

''کیوں وہ تو اچھا خاصا ہے۔ پڑھا لکھا ہینڈسم۔''

''بس چھوڑو یہ باتیں۔'' وہ وضاحتیں نہیں دینا چاہتی تھی جب ہی ٹوک دیا تو وہ کندھے اچکا کر کہنے لگا۔

''چھوڑ دیں۔ لیکن اپنی بات پر قائم ہوں۔ اماں ایک دو دن میں تمہارے ہاں آئیں گی شادی کی بات کرنے۔''

''ضرور آئیں لیکن......'' ویٹر کے آنے پر وہ خاموش ہو گئی اور کھانا دیکھ کر تو اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ بمشکل ویٹر کے جانے تک صبر کیا پھر فوراً کھانا شروع ہو گئی۔

''کب سے بھوکی ہو۔؟'' حمزہ نے شرارت سے ٹوکا۔

''صدیوں سے......'' وہ اطمینان سے بولی تھی۔

''لگ رہا ہے۔'' وہ اسے کھاتے دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

''سنو......'' وہ اچانک کسی خیال سے اسے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''تم جو شادی شادی کر رہے ہو۔ ابھی میرے امتحانوں میں بہت ٹائم ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ بعد میں دیتی رہنا امتحان۔''

''جی نہیں۔ بعد میں کوئی پڑھائی وڑھائی نہیں ہوتی۔'' اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر کولڈ ڈرنک اٹھالی۔

''میں پڑھا دوں گا۔ نہیں بھی پڑھو گی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے کون سا تم سے نوکری کروانی ہے۔'' وہ ہنوز لاپروا تھا۔

''اگر کبھی ضرورت پڑ گئی تو......''

شٹ اپ! ایسی فضول بات کبھی سوچنا بھی مت۔" حمزہ نے اتنی سنجیدگی سے ٹوکا کہ وہ خائف ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ربیکا سارے آفس میں چکراتی پھر رہی تھی۔ خود اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے' کسے کھوج رہی ہے۔ حسان صاحب کے روم میں بھی جھانک کر دیکھا پھر پلٹ کر دوسرے فلور پر جانے کا سوچا تھا کہ حمزہ کو آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل نے اعتراف کیا کہ وہ اسے ہی تو کھوج رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" بے اختیاری چھپائے نہ چھپی۔ جواباً وہ سنبھل کر بولا تھا۔

"میں لنچ کے لیے گیا تھا۔"

"آپ لنچ کرنے باہر جاتے ہیں۔"

"اکثر نہیں' کبھی کبھی۔" وہ قصداً مسکرایا پھر پوچھنے لگا۔ "کیا میں بہت لیٹ ہوگیا ہوں۔"

"نہیں ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔" وہ ذومعنی انداز میں کہتے ہوئے اپنے روم میں آگئی اور اپنی ہی بات پر نہ صرف محظوظ ہوئی بلکہ اس کے اندر ایک الوہی خوشی رقص کرنے لگی تھی۔ دل چاہا اپنے سب دوستوں کو بتائے کہ اس کی زندگی میں وہ شخص آگیا ہے جس کا اسے سب سے زیادہ ان سب کو انتظار تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ خود اس نے بھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ کوئی ایک پل میں اس کی پوری ہستی پر چھا جائے گا۔ جبکہ اس کے دوست جن میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل تھے' سب کا یہی کہنا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہی کوئی حادثہ ہوگا اور وہ سب شدت سے اس دن کے منتظر تھے۔ اس لیے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کو ایک جگہ جمع کرکے کہے کہ تم سب کا انتظار ختم ہوا میرے ساتھ واقعی یہ حادثہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد وہ حمزہ کا ہاتھ تھام کر سب کے سامنے لے جائے۔

وہ اس تصور سے خوش ہو رہی تھی کہ اچانک اسے جھٹکا لگا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کے تمام فرینڈز اس پر ہنس رہے ہوں۔ مذاق اڑا رہے ہوں اس کا کہ ربیکا حسان جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اس کا دل اٹکا بھی تو کہاں۔ مڈل کلاس میں۔

"نہیں......" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر پہلے سینے میں دبی سانس بحال کی اس کے بعد چاہا کہ اس کا خیال جھٹک دے' لیکن یہ کہاں ممکن تھا۔ دل نے اول روز ہی اسے اپنا مان لیا تھا اور پھر اس نے تو ہمیشہ اپنی اب تک کی زندگی میں جو چاہا تھا پایا تھا۔ کبھی اپنی کسی خواہش سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔ اب کیسے ہوسکتی تھی اور حمزہ صرف اس کی خواہش نہیں تھا وہ تو یوں اچانک اس کے دل پر قابض ہوگیا تھا کہ وہ خود حیران تھی اور اب قدرے الجھ بھی رہی تھی۔ اسی الجھن میں وہ گھر آئی تو آگے ممی کے ساتھ شہنیلا کو بیٹھے دیکھ کر وہ ہمیشہ کی طرح بے ساختہ خوشی کا اظہار نہیں کرسکی۔ رسمی انداز میں ہیلو ہائے کرکے سامنے بیٹھی اور پیروں سے سینڈل نکالنے لگی۔

"ممی......" شہنیلا اسے دیکھتے ہوئے ممی سے کہنے لگی۔ "ڈیڈی نے کہاں اسے آفس کے جھمیلوں میں الجھا دیا ہے۔ شادی کریں اس کی۔"

"ہاں' میں بھی تمہارے ڈیڈی سے یہی کہتی ہوں۔ ویسے وہ خود بھی یہی چاہ رہے ہیں بس فیصلہ نہیں کرپا رہے۔" ممی کی بات پر وہ انہیں دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں جبکہ شہنیلا نے فوراً پوچھا تھا۔

"کیسا فیصلہ......؟"

"یہی کہ کس کا انتخاب کریں۔ اتنے پرپوزل ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کس کے حق میں فیصلہ دیں۔"

"فیصلہ ڈیڈی نہیں میں کروں گی۔" اس کے سخت انداز پر ممی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"ہاں ظاہر ہے ڈیڈی بھی تمہاری مرضی کے بغیر تو فیصلہ نہیں کریں گے بلکہ ایسا کرو کہ تم اپنی مرضی بتادو تاکہ جلدی تمہاری شادی ہو۔" شہنیلا نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"رابی......!" شہنیلا غالباً اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ اس نے ٹوک دیا۔

"پلیز شہنی، میں ابھی کوئی بات نہیں کرسکتی۔ ایک تو ٹریفک میں بندے کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے اوپر سے آپ......" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

یہ نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حقیقتاً وہ پریکٹیکل لڑکی تھی خود اسے احساس تھا کہ شادی کے لیے یہی مناسب عمر اور وقت ہے اور اس کے لیے جتنے پرپوزل آئے ہوئے تھے وہ سب سے واقف تھی۔ اچھے گھرانوں کے اچھے لڑکے تھے۔ اگر کچھ عرصہ پہلے ممی ڈیڈی اس کی رائے پوچھتے تو وہ آرام سے ان پر چھوڑ دیتی کہ وہ جسے چاہیں اس کے لیے پسند کریں کیونکہ کسی کے ساتھ بھی اس کا دل کا معاملہ نہیں تھا اور اب دل نے اچانک جسے اپنا مان لیا تھا اس کے بعد وہ کسی اور کے بارے میں سوچنا چاہتی بھی تو نہیں سوچ پا رہی تھی۔

"حمزہ......" اس رات وہ کتنی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے جو وہ اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہو جاتی ہے۔ ایسی بے اختیاری جو اس نے بہت سوں میں اپنے لیے دیکھی تھی، لیکن کبھی پذیرائی نہیں کی تھی تو اب یہ خود اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ جتنی بے اختیار ہوتی' حمزہ اس قدر محتاط۔ وجہ وہ جانتی تھی کہ غالباً حیثیتوں کے فرق کے باعث وہ محتاط رہنے پر مجبور ہے لیکن اس کے دل میں کیا ہے یہ جاننے کے لیے ہی اگلے دن لنچ ٹائم میں وہ خاص طور سے حمزہ کو انوائٹ کر کے اپنے ساتھ لے آئی تھی اور حمزہ نادان نہیں تھا اس کی بے اختیاریوں کے ساتھ مہربانیاں اسے پریشان کرتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ اس سے کیا چاہتی ہے۔ ابھی بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ربیکا پوچھنے لگی۔

"آپ کے گھر میں کون کون ہے؟" وہ چونک کر سنبھلا تھا۔

"زیادہ افراد نہیں ہیں۔ میں، میری مدر اور بہن۔"

"بہن آپ سے بڑی ہے؟" وہ بظاہر سرسری انداز اختیار کیے ہوئی تھی۔

"نہیں چھوٹی ہے۔ ابھی انٹر میں پڑھتی ہے۔"

"پھر تو اسے آپ کی شادی کا بہت شوق ہوگا۔" وہ اب مسکرا کر اسے دیکھنے لگی تھی جواباً حمزہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو پوچھنے لگی۔

"اور آپ کا کیا ارادہ ہے۔ آئی مین، پہلے بہن کی شادی کریں گے یا......"

"بہن ابھی چھوٹی ہے۔ گریجویٹ کرنے پر ان شاء اللہ اس کی شادی کا سوچوں گا۔ میری مدر بھی یہی چاہتی ہیں۔ البتہ میں......" وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ......؟" وہ سوالیہ نشان بن گئی تو حمزہ نے ایک پل میں سوچ ڈالا کہ یہ لڑکی اس سے ایسی کوئی امید وابستہ کیے بیٹھی ہے تو اسے یہیں روک دینا چاہیے جب ہی خوش ہو کر بولا تھا۔

"میری شادی تو طے ہے۔"

"شادی طے ہے......!" ربیکا خود حیران تھی کہ اس کے اندر کیسا محشر برپا ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا زوردار چیخ کے ساتھ کہے "نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ تم میرے ہو صرف میرے۔"

"شہرینہ میرے تایا کی بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی ہمارے ماں باپ نے ہمیں منگنی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ پھر وقت نے اس بندھن کی آبیاری یوں کی کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔" وہ اب شہرینہ کی محبت میں بولے جا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ربیکا حسان کی پوری ہستی زلزلوں کی زد میں تھی۔

☆☆☆

فاخرہ کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح حمیدہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے، لیکن فاخرہ نے برا نہیں مانا کیونکہ وہ اس رویے کی عادی ہو چکی تھیں جبکہ بیلا سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ جب ہی وہ سلام کر کے فوراً اندر شہرینہ کے پاس چلی گئی تھی۔

''آج کیسے ہمت کر لی تم نے آنے کی۔ ہمیشہ سنتی رہتی ہوں گھٹنوں میں درد کی وجہ سے تم سے چلا نہیں جاتا۔'' حمیدہ بیگم نے نخوت سے ٹوکتے ہوئے کہا تو فاخرہ سانس کھینچ کر بولیں۔

''بس بھابھی گھٹنوں کا درد جاتا ہی نہیں۔''

''کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ......''

''جی! بچیاں نظر نہیں آ رہیں۔'' فاخرہ نے پوچھا تھا کہ اس وقت خزینہ آ گئی۔ آفس سے آ رہی تھی۔ فاخرہ چچی کو دیکھتے ہی ساری تھکن دور ہو گئی۔ بیگ ایک طرف پھینک کر بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔

''السلام علیکم چچی جان! کیسی ہیں آپ؟'' حمیدہ بیگم کے برعکس اس محبت بھرے انداز نے فاخرہ کے اندر ٹھنڈک اتار دی تھی۔

''خوش رہو بیٹی۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ آفس سے آ رہی ہو......؟''

''جی چچی جان! آپ کب آئیں............؟'' خزینہ فاخرہ کے ساتھ بیٹھ گئی تو حمیدہ بیگم نے فوراً ٹوک دیا۔

''تم یہاں کہاں بیٹھ گئی جاؤ شہرینہ سے کہو چائے بنائے۔''

''ارے نہیں بھابھی میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔'' فاخرہ نے کہا تو خزینہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے شہرینہ کو پکار لیا۔

''شہرینہ! باہر آؤ۔'' شہرینہ بیلا کے ساتھ کمرے سے نکلی تو آواز سن کر حیدر علی بھی اپنے کمرے سے نکل کر آ گئے اور فاخرہ کو دیکھ کر خوش دلی سے کہنے لگے۔

''ارے فاخرہ بہن آئی ہیں۔ کیا حال چال ہیں فاخرہ بہن۔''

''اللہ کا شکر ہے بھائی صاحب۔''

''السلام علیکم تایا جان......'' بیلا نے سلام کیا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''خوش رہو۔'' پھر بیٹھتے ہوئے خزینہ اور شہرینہ کو یوں دیکھا جیسے کچھ خاطر مدارات کے لیے لے آؤ۔

''ہاں شہرینہ، چچی جان تو اس وقت چائے نہیں پیتیں۔ یوں بھی گرمی ہے جلدی سے کوئی شیک وغیرہ بنا لاؤ اور چچی جان آپ اتنے تکلف سے کیوں بیٹھی ہیں۔ اوپر ہو جائیں آرام سے بیٹھیں۔'' خزینہ کی لگاوٹ میں حمیدہ بیگم کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھیں۔ دل پر پتھر رکھ کر بولیں۔

''ہاں ہاں فاخرہ آرام سے بیٹھو۔''

''حمزہ کس وقت آتا ہے آفس سے؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''ویسے تو اس وقت تک آ جاتا تھا لیکن آج کل آفس میں کچھ کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔'' فاخرہ بتا کر کہنے لگیں۔ ''بھائی صاحب ابھی میں حمزہ ہی کی بات کرنے آئی ہوں۔''

''کیا بات۔ جاب میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' حیدر علی نے اچنبھے سے پوچھا۔

''نہیں نہیں جاب تو ماشاء اللہ اچھی ہے۔ ترقی بھی ہونے والی ہے، میں اصل میں اب اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' فاخرہ نے کہتے ہوئے حمیدہ بیگم کو دیکھا جن کا ردعمل خلاف توقع نہیں تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی تھا۔

''کیا...... تمہارا مطلب ہے ہم شہرینہ کی شادی کر دیں۔''

''ظاہر ہے بھابھی شادی تو ہونی ہی ہے۔''

''ہونی ہے تو وقت پر ہوگی۔ ابھی اس سے بڑی بیٹھی ہے۔ جب تک میں اس کے ہاتھ پیلے نہ کر لوں

شہرینہ کا نام مت لینا۔" حمیدہ بیگم کے ہتھے سے اکھڑنے پر حیدر علی بوکھلا گئے۔
"آرام سے بیگم۔ یہ بات تم آرام سے بھی کر سکتی ہو۔"
"ہاں میں تو پاگل ہوں مجھے تو بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ خود کر لو بات، لیکن یہ یاد رکھنا میں بڑی سے پہلے چھوٹی کی ہرگز نہیں کروں گی۔" حمیدہ بیگم بل کھا کر اٹھیں اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں تو حیدر علی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ خزینہ نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا پھر فاخرہ کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔
"چچی جان! آپ امی کی باتوں کا برا نہیں مانیے گا۔"
"ارے نہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔"
"کوئی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں تو خود ان سے کہتی ہوں شہرینہ کی شادی کر دیں۔" وہ فاخرہ سے کہہ کر حیدر علی سے مخاطب ہو گئی۔ "ابو آپ سمجھائیں امی کو خواہ مخواہ ضد کر رہی ہیں۔" حیدر علی اسے دیکھ کر رہ گئے۔ تب ہی شہرینہ ملک شیک لے کر آ گئی۔ بیلا اس کے ساتھ تھی۔ خزینہ نے فوراً ٹرے تھام لی اور پہلے گلاس فاخرہ پھر حیدر علی کو تھمایا۔
"امی کہاں ہیں؟" شہرینہ نے پوچھا تو وہ ایک گلاس اس کی طرف بڑھا کر بولی۔
"امی اندر ہیں لو یہ انہیں وہیں دے دو۔" شہرینہ گلاس تھام کر نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ تب اسے آنکھوں سے اشارہ کر کے اس نے دوسرا گلاس بیلا کو تھما دیا۔
"چچی جان! جانے کی جلدی مت کیجیے گا۔ حمزہ ادھر ہی آئے گا ناں؟" خزینہ نے ماحول کی کشیدگی دور کرنے کی غرض سے باتیں شروع کر دیں تو کچھ دیر میں حیدر علی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جب کہ حمیدہ بیگم فاخرہ اور بیلا کے جانے تک کمرے سے نہیں نکلی تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا حمزہ ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا ورنہ ماں کا چہرہ دیکھتے ہی بہت کچھ سمجھ جاتا اور جو نہ سمجھتا وہ بیلا نے بتا دینا تھا۔ جب کہ فاخرہ ایسا نہیں چاہتی تھیں جب ہی گھر آتے ہی بیلا کو سمجھا رہی تھیں۔
"بیٹا بھائی کے سامنے کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔"
"لیکن امی......!"
"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" فاخرہ فوراً ٹوک کر کہنے لگیں۔ "تمہاری تائی جان کا مزاج شروع سے ایسا ہی ہے اور یہ حمزہ بھی جانتا ہے اس لیے اسے مزید بھڑکانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"اچھا جب بھائی پوچھیں گے کہ تایا جان اور تائی جان نے کیا جواب دیا تو آپ کیا کہیں گی......" بیلا حمیدہ بیگم کی بدسلوکی سے تلملائی ہوئی تھی۔
"کچھ بھی کہہ دوں گی۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ اب جاؤ جلدی سے روٹی ڈالو۔ حمزہ آنے والا ہوگا۔" فاخرہ اسے کام سے لگا کر خود سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

سارہ کا خوش گوار موڈ دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ورنہ پچھلے کئی دنوں سے وہ بات بے بات الجھ رہی تھی جس سے اسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ مستقل ذہنی مریضہ نہ بن جائے۔ بہر حال اس وقت اس کی ساری تھکن دور ہو گئی جب اسے چائے کا کپ تھماتے ہوئے سارہ نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ اس کی نذر کی تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس پر وہ ہمیشہ سے فدا تھا۔ جان دینے کا دعوا نہیں جان دے بھی سکتا تھا۔
"سارو!" اس نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سارہ کا ہاتھ تھام لیا اور مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔
"ٹیمی۔ اگر تم تھکے ہوئے نہیں ہو تو کہیں آؤٹنگ پر چلیں۔"

''جان میری، تھکن تو تمہیں دیکھتے ہی دور ہو جاتی ہے۔ چلتے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے محبت سے سارہ کا ہاتھ دبایا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جب تک چائے پیو میں چینج کرلوں۔'' سارہ عجلت میں ڈریسنگ روم میں بند ہو گئی تو اس نے چائے کا کپ اٹھالیا۔ سارہ تیاری میں وقت لگاتی تھی اس لیے اس نے سکون سے چائے پی پھر فریش ہو کر نیچے آ گیا، بابا حسب معمول نیوز چینل دیکھنے بلکہ سننے میں مصروف تھے ماما کے ہاتھ میں تسبیح تھی لیکن نظریں ان کی بھی ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا کہ سارہ کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر بیٹھنے کا ارادہ ترک کردیا۔ سارہ نے غضب کی ڈریسنگ کرتی تھی، ساتھ میچنگ جیولری اور ہلکے میک اپ میں اس وقت بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔

''چلیں......'' سارہ نے قریب آ کر کہا تو ماما اور بابا دونوں چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''ہم ذرا باہر جا رہے ہیں۔'' تیمور غزنی نے کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہا تو ماما نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا جبکہ بابا زور دے کر بولے تھے۔

''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔''

''او کے ماما! آپ لوگ کھانے پہ ہمارا انتظار مت کیجیے گا۔'' سارہ نے کہہ کر اسے دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

گو کہ موسم خوش گوار نہیں تھا۔ سارا دن جھلسا دینے والی گرمی کے بعد ابھی بھی ہوا ساکن تھی۔ لیکن وہی بات کہ سارے موسم ہمارے اندر ہوتے ہیں تو تیمور غزنی اتنے دنوں بعد سارہ کی کھلکھلاتی ہنسی میں سب بھول گیا تھا۔ نہ گرمی کا احساس تھا، نہ جام ٹریفک سے کوفت ہو رہی تھی۔ اور شام ڈوبنے سے پہلے وہ سارہ کا ہاتھ تھامے ساحل کی گیلی ریت پر چلتے ہوئے بے خود سا ہو گیا تھا۔

''یوں ہی ہنستی مسکراتی رہا کرو سارہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''تو اور کیا کرتی ہوں میں سارا وقت ہنستی ہی تو رہتی ہوں...... ہاں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہیں میری ہنسی کو نظر نہ لگ جائے کسی دشمن کی، جب ہی خاموش ہو جاتی ہوں۔'' سارہ بڑے ترنگ میں بول رہی تھی۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو۔'' سارہ کے انداز میں اولین دنوں والی اتراہٹ تھی۔ وہ اطراف کا خیال کیے بغیر نرمی سے اس کے گال پر چٹکی کاٹ کر بولا۔

''پاگل کر دیتی ہو۔''

''سچ مچ۔!'' وہ کھلکھلائی۔

''اور کیا......''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ ابھی کوئی سرکش لہر مجھے اپنے ساتھ بہا لے جائے تو تم کیا کرو گے۔'' وہ ابھی بھی مسکرا کر پوچھ رہی تھی جبکہ وہ خائف ہو گیا۔

''سارہ۔ چلو واپس چلو۔''

''ارے میں نے تو یوں ہی ایک بات کی ہے۔''

''نہیں بس چلو......'' تیمور اسے کھینچتے ہوئے گاڑی تک لایا۔ وہ ہنسے جا رہی تھی۔

''کہاں چلنا ہے......؟'' تیمور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

''بھوک لگ رہی ہے۔ کہیں دور نہیں وہ سامنے میکڈونلڈ میں بیٹھتے ہیں۔'' تیمور نے گاڑی وہیں لے جا کر روکی اور اندر داخل ہو کر والٹ اسے تھمایا اور خود ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ گلاس وال سے سمندر دیکھتے ہوئے آپ

اسے خوف آنے لگا تھا۔ فوراً چہرہ دوسری طرف موڑلیا۔ پھر سارہ کو دیکھنے لگا جو ٹرے اٹھائے چلی آرہی تھی۔
''زنگر اینڈ چکن رول کچھ اور لو گے۔؟'' سارہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''نہیں بس ٹھیک ہے۔ بیٹھو......''
''اف یمی مجھے نہیں پتا تھا تم اتنے ڈرپوک ہو......'' سارہ نے بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولا۔
''تمہارے معاملے میں تمہارے تصور سے بھی زیادہ۔''
''سچ یمی تمہاری اتنی محبت پر کوئی اور تو کیا کبھی کبھی میں خود جیلس ہونے لگتی ہوں۔''
''کیا مطلب۔ خود کیسے جیلس ہوتی ہو......'' وہ اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔
''یہ سوچ کر کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی تو تم اس سے بھی ایسی محبت کرتے'' سارہ کی وضاحت پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔
''بے وقوف......''
پھر ایسے ہی کھٹی میٹھی باتیں کرتے ہوئے سارہ جیسے اچانک یاد آنے پر کہنے لگی۔
''ارے ہاں یمی۔ وہ میری فرینڈ ہے ناں زوبی۔ اس کے ہاں تیسرا بے بی آنے والا ہے۔''
''اچھا......'' تیمور نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تو وہ قدرے رک کر پھر کہنے لگی۔
''یمی، میں نے زوبی سے کہا ہے کہ اس بار وہ اپنا بے بی مجھے دے دے اور وہ مان بھی گئی ہے۔''
''سارہ......'' اس کی کنپٹیوں میں درد کی ایسی لہر اٹھی جیسے ابھی نسیں پھٹ جائیں گی۔
''ٹھیک ہے ناں یمی......'' سارہ کا اشتیاق ہنوز تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ایک دم اٹھ کر باہر نکل آیا اور تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑا۔
''یمی...... تیمور......'' سارہ اس کے پیچھے آرہی تھی۔ وہ کچے میں اتر کر بھاگنے لگا۔ جانے وہ کس سے بھاگ رہا تھا کہ اچانک سارہ کی چیخ نے اس کے قدم روک دیے۔ پلٹ کر دیکھا سارہ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گری تھی۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ سارہ اٹھنے کی کوشش میں پھر گری تھی۔ تب وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا۔ اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سارہ کی پیشانی اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔
''سارہ......'' اس کی پکار میں ایسی تڑپ تھی کہ سارہ بند ہوتی آنکھیں کھول کر بمشکل بول پائی تھی۔
''بے بی...... مجھے بے بی چاہیے۔''

☆☆☆

جانے کیوں اس کا دل اتنا بوجھل ہو رہا تھا۔ کوئی کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ چند پیپرز فلیکس کر کے باقی ایک طرف رکھ دیے۔ پھر نظریں بظاہر کمپیوٹر اسکرین پر جم گئیں لیکن ذہن بالکل خالی تھا۔ نمرہ نے ایک دو بار اسے دیکھا پھر پکارا بھی لیکن اس نے سنا ہی نہیں۔
''اے......'' اب نمرہ اونچی آواز میں اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔'' کیا ہوا ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔''
''ہاں بس۔'' اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہو گئی۔
''کیا بس۔ کوئی پرابلم ہے۔ آئی مین گھر میں۔'' نمرہ کو اس کی دل گرفتگی محسوس ہوئی تھی۔
''نہیں یار گھر میں کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' اس کے جھنجلانے پر بھی نمرہ باز نہیں آئی۔
''پھر......؟''
''پھر کیا......؟''
''کیوں ایسے گم صم بیٹھی ہو۔ کوئی بات ہے تو بتاؤ۔ شیئر کرو۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔'' نمرہ نے اپنائیت کا

احساس دے کر اسے اکسایا تو وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

''بتاؤ ناں......''

''کچھ نہیں بس یہ کہ اس وقت میرا کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے کہا تو نمرہ ہنسنے لگی۔

''ہنس کیوں رہی ہو؟'' اس کے شاکی انداز پر نمرہ نے پہلے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر ہنسی روکی پھر کہنے لگی۔

''مائی ڈیئر یہ آفس ہے اور یہاں دل سے زیادہ دماغ سے کام ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنا دل گھر رکھ کر آیا کرو۔''

''یہاں سے دل ساتھ جائے تب ناں۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''چلو شاباش کام کرو۔'' نمرہ نے پچکار کر کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''موڈ نہیں ہے میں گھر جارہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''کوئی فارسی نہیں بولی میں نے۔ باس تو ہیں نہیں۔ میں نسیم صاحب سے کہہ کر چلی جاؤں گی۔'' وہ بولنے کے ساتھ اپنا پرس بھی چیک کر رہی تھی پھر اسے مزید ٹوکنے کا موقع دیے بغیر جلدی سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

اس وقت دن کے بارہ بجے تھے۔ سورج سوا نیزے پر جیسے ٹھہر گیا تھا۔ وہ اسٹاپ پر کھڑی ضرور ہوئی لیکن وین کا انتظار کرنے کے بجائے رکشا کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اچانک اسے لگا جیسے دنیا ویران ہوگئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جانے تیز دھوپ کا اثر تھا یا کیا تھا' وہ نہ صرف پریشان بلکہ وحشت زدہ بھی ہوگئی تھی کہ ایک خالی رکشا دیکھ کر اس کی طرف بھاگ پڑی اور رکشا والے کو مطلوبہ مقام بتا کر فوراً بیٹھ گئی۔

''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے سوچا پھر رکشا ڈرائیور پر بگڑ گئی۔

''یہ کیا رینگ رینگ کر چل رہے ہو۔ تیز چلاؤ۔'' ڈرائیور نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ تو وہ تلملا کر تیز رفتار موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ جو آگے نکلتی چلی جارہی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ کہیں پیچھے رہ گئی ہو۔ پھر گھر کا موڑ مڑتے ہی وہ پرس میں سے پیسے نکالنے لگی۔

''بس یہیں روک دو۔'' اس نے اترتے ہی ڈرائیور کو پیسے تھمائے پھر پلٹتے ہی ٹھٹک گئی۔ گھر کا مین گیٹ پورا کھلا تھا۔

''یا اللہ......'' وہ ابھی کچھ سوچ نہیں پائی تھی کہ اندر سے آتے حمزہ کو دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔

''تم فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟'' حمزہ نے قریب آکر پوچھا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ایک دم اس کا بازو تھام لیا۔ ''کیا ہوا ہے حمزہ......؟''

''اندر چلو......'' جواب دینے کے بجائے حمزہ نے اسے سہارا دے کر چلنا چاہا تو یکلخت وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر بھاگتے ہوئے اندر آتے ہی ڈھے گئی تھی۔

''ابو جی......''

''ابو چلے گئے خزی۔ ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' شہرینہ تڑپ کر اس کے گلے لگی تو پھر دونوں کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیے تھے۔

☆☆☆

ایک فرد کے جانے سے لگتا ہے سارا گھر خالی ہوگیا ہو۔ حالانکہ اس وقت باقی لوگ رخصت ہوگئے تھے لیکن قریبی عزیز موجود تھے۔ فاخرہ آہستہ آہستہ حمیدہ بیگم کا سر دبا رہی تھیں۔ بیلا سینہ کے بیٹے کو کندھے سے لگائے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ عالیہ' خالہ حمیدہ بیگم کے قریب نیم دراز تھیں اور ان کی بیٹی سعدیہ' خزینہ اور

شہرینہ کے پاس بیٹھی تھی۔ حمزہ، شرجیل اور سبینہ کا شوہر طارق ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ پھر بھی خاموشی ٹوٹ کے نہیں دے رہی تھی۔

خزینہ پچھلے آدھے گھنٹے سے چھت پر نظریں جمائے ساکت لیٹی تھی۔ اس کی نظروں میں صبح کا منظر بار بار جیسے گھوم رہا تھا۔ روزانہ کی طرح آفس جاتے ہوئے جب اس نے حیدر علی کو خدا حافظ کہا تو انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی تھی۔ اس وقت وہ یہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ اس کے ابو کی طرف سے اس کے لیے آخری تحفہ ہوگا۔

''کیا ہوا تھا ابو کو صبح تو بالکل ٹھیک تھے۔'' خزینہ اس صبح کے منظر میں گم رہ کر بولی تھی۔

''ہاں آفس بھی گئے تھے۔ پھر گھنٹے بھر بعد ہی ان کے آفس سے کسی نے فون کر کے بتایا کہ ابو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ شاید ہارٹ اٹیک...... میں نے فوراً حمزہ کو فون کیا تھا۔ پھر بس حمزہ انہیں ایمبولینس میں لے کر آیا تھا۔'' شہرینہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''بس کرو شہرینہ۔ مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔ اتنا نہیں روتے۔'' سعدیہ اپنے دوپٹے سے شہرینہ کے آنسو صاف کرنے لگی۔ ''سعدیہ آپا۔ اتنا اچانک یہ سب......''

''اللہ کی مرضی ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' سعدیہ ان دونوں کو تسلی دینے کے ساتھ سونے کی تلقین کرنے لگی۔ تو خزینہ نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے آنسو کناروں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

صبح سعدیہ اور عالیہ خالہ نے زبردستی سب کو ناشتا کرایا اس کے بعد پھر دریاں بچھنے لگیں تو خزینہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اتنا اچانک سانحہ تھا کہ ذہن کسی بات کو تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہیں دور بھاگ جائے جہاں کوئی نہ ہو اور وہ چیخ چیخ کر روئے۔ بہت مشکل ہو رہا تھا اپنی چیخوں کا گلا گھونٹنا۔ حمیدہ بیگم اور زیادہ شہرینہ کی وجہ سے وہ خود پر بہت ضبط کر رہی تھی۔ کیونکہ اب وہی بڑی تھی۔ جب عزیز و اقارب آنا شروع ہوئے تو وہ واش روم میں بند ہو گئی۔ اور ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ جما کر کتنی دیر گھٹ گھٹ کر روتی رہی پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر واش روم سے نکلی تو آگے نمرہ کھڑی تھی۔ وہ اس کے گلے لگ کر پھر رو پڑی۔ نمرہ کے آنسو چھلک گئے۔ کچھ بول نہیں سکی۔ آہستہ آہستہ اس کا کندھا تھپکتی رہی پھر اسے بٹھا کر پانی لے آئی اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا کر کہنے لگی۔

''مجھے رات جب تمہارا میسج ملا میں تب سے تمہارے پاس آنے کو تڑپ رہی تھی۔'' پھر پوچھنے لگی۔ ''کل تم اس لیے جلدی گھر آ گئی تھی۔ کیا تمہیں وہیں آفس میں اطلاع مل گئی تھی۔''

''نہیں۔ بس پتا نہیں کیسے۔'' وہ اس قدر کہہ سکی۔

''شاید تمہاری چھٹی حس نے کسی انہونی کا اشارا دیا ہوگا۔'' نمرہ نے کہا تو وہ ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر پوچھنے لگی۔ ''تم گھر سے آ رہی ہو؟''

''نہیں پہلے آفس گئی تھی۔ وہاں تمہارے ابو کا بتایا اور ہاں پاس نے یہ لفافہ دیا ہے۔'' نمرہ نے اپنے پرس میں سے لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''رکھ لو ناں ایسے وقت میں ضرورت تو پڑتی ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ دینا۔'' نمرہ نے لفافہ اسے تھما کر کہا تھا۔

پھر تین دن عزیز و اقارب کا آنا جانا رہا اس کے بعد گھر بالکل خالی ہو گیا تو آئندہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا ذہن چٹخنے لگا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں) ☆☆

نظیر فاطمہ



''**جب** تک یہ چڑیل ہمارے سروں پر ہے تمہارا کچھ نہیں ہونے والا...... میں بتا رہی ہوں تمہیں۔'' بڑی باجی روبینہ نے اپنی چھوٹی بہن عالیہ کو دیکھا۔

''بس کردیں باجی...... اب اس موضوع کو ختم کریں۔'' عالیہ نے بڑے خراب موڈ میں جواب دیا۔ حالانکہ دل سے وہ بھی اپنی باجی کی باتوں سے سو فی صد متفق تھی۔ بس اس وقت وہ ایسی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''ارے میرا بس چلے تو اس جادوگرنی کو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کروں...... مگر ہمارا بھائی ہی کاٹھ کا الو ہے جس نے زن مریدی کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔'' عالیہ نے دوپٹا منہ پر ڈال کر کروٹ بدل لی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم میری طرف سے...... میں تمہاری فکر میں گھل رہی ہوں اور تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' روبینہ تن فن کرتی چلی گئی۔

☆☆☆

عالیہ صبح سویرے نماز پڑھ کر چھت پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس کی بھابھی نورین اپنے اور اپنی دو سالہ بیٹی کے دھلے ہوئے کپڑے اوپر پھیلانے آئی۔ وہ ایسی ہی پھرتیلی تھی۔ نماز کے بعد جب اس کی بچی اور شوہر سو رہے ہوتے تو وہ اپنے چھوٹے بڑے کئی کام نمٹا لیتی تھی۔ اسے نماز کے بعد دوبارہ سونے کی عادت نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد دیگر کام جلدی نمٹا کر وہ سلائی مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ اس کے ہاتھ میں بہت صفائی تھی۔ وہ اپنے اور اپنی بیٹی کے سارے کپڑے خود ہی سیتی تھی۔ بلکہ اب تو محلے کی کئی عورتوں نے بھی اس سے سلائی کروانی شروع کردی۔ وہ یہ سارے کاموں کا اس طرح بندوبست کرتی تھی کہ اس کا گھر اور گھر والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ عالیہ نے اس کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

''عالیہ! میں پھر یہی کہوں گی کہ اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اور اللہ جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔'' نورین نے اس کے پاس رک کر کہا، مگر عالیہ نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ نورین تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''ہے ہی میسنی اور کٹنی...... خود ہی رشتے کے لیے آنے والوں کو بھگا دیتی ہے اور خود ہی ہمدرد بن کر آجاتی ہے۔'' عالیہ نے روبینہ باجی کو صبح والی بات بتائی تو وہ شروع ہوگئی۔ وہ آواز بھی دھیمی رکھنے کی قائل نہ تھی۔ بقول ان کے جس کو سنانا ہو اس تک آواز پہنچنی چاہیے۔ اب بھی ان کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ برآمدے سے گزر کر کچن میں جاتی نورین نے ان کے زہر زہر الفاظ اپنے اندر اتارے تھے، مگر پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا۔

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ نہ جانے ہمارے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔'' نورین اپنے گھر کے ماحول کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتی۔ وہ بیاہ کر آئی تو سب

کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ اس گھر کی سب سے بڑی بہو تھی۔ اس کے شوہر تنویر سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ دونوں بیاہی ہوئی تھیں۔ بڑی بہن روبینہ فیصل آباد میں رہتی تھی اور اس سے چھوٹی یاسمین اسی محلے میں کرائے کے گھر میں۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر تھی۔ اس کا شوہر بھی گورنمنٹ ملازم تھا۔ تنویر سے چھوٹی ایک بہن اور بھائی تھے۔ تنویر کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ نورین نے آتے ہی پورے گھر کو سجاؤ سے سنبھال لیا۔ وہ نیک فطرت لڑکی تھی۔ چھوٹی نند عالیہ بھی بھابھی سے گھل مل گئی اور دیور بھی۔ تنویر کی بہن یاسمین کی تین چار مہینے کی بچی تھی۔ جسے وہ عالیہ کے پاس چھوڑ کر اسکول جاتی تھی۔ میاں بیوی دونوں نوکری پیشہ تھے اور پیچھے گھر میں کوئی ہوتا نہیں تھا جو بچی کو سنبھالتا۔ دونوں گھر کو تالا لگا کر چابی بھی عالیہ کو دے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں روبینہ باجی کے شوہر کی نوکری ختم ہوگئی تو انہوں نے وہاں کا گھر بیچ کر لاہور شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اتنی جلدی مناسب قیمت میں



گھر ملنا مشکل تھا سو فیصلہ یہ ہوا کہ وہ کچھ عرصہ اپنی فیملی سمیت تنویر کے گھر رہے گی۔ گھر کے اوپری پورشن میں دو کمرے، باتھ روم اور کچن موجود تھا۔ سو روبینہ اپنے شوہر اور تین بچوں سمیت وہیں شفٹ ہوگئی۔ ابھی تک ان کے شوہر کو نوکری نہیں ملی تھی تو وہ ان کے ہاں مہمان تھے جو رہتے تو اوپر تھے، لیکن کھانا پینا سب کچھ نیچے تھا۔ نورین ان دنوں امید سے تھی۔ اس کے لیے اتنی اتنی دیر کچن میں کھڑا ہونا بہت مشکل تھا۔ عالیہ بھی مدد کروانی تھی، مگر پھر بھی گھر میں پانچ افراد کے اضافے سے عجیب سی افراتفری مچ گئی۔

''باجی! اب تو بھائی صاحب کو نوکری مل گئی ہے۔ اب آپ لوگ اپنا کچن الگ کرلیں۔ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اچھا نہیں لگتا ان پر اتنا بوجھ ڈالنا۔'' روبینہ کے شوہر کو نوکری ملے مہینہ ہونے کو آیا تھا جب عالیہ نے ایک دن محتاط انداز میں بہن سے کہہ دیا۔

''تمہیں بھابھی کی بڑی پروا ہے...... کسی کو کیا تکلیف ہے میں اپنے بھائی کا کھاتی ہوں۔'' اس وقت وہ یہ بات بھول گئی کہ بھائی بھی عام سی نوکری والا پرائیویٹ ملازم تھا کوئی لینڈ لارڈ نہیں۔ جب نوکری ملنے کے دو مہینے بعد بھی صورت حال جوں کی توں رہی تو تنویر اور چھوٹے بھائی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ روبینہ نے خاموشی سے کچن الگ کرلیا۔

''تم کیا اس کی نوکرانی ہو جو ہر وقت کام میں لگی رہتی ہو۔'' روبینہ آتے جاتے عالیہ کو ٹوکنے لگی۔

''بھابھی کی حالت آپ کے سامنے ہے۔ ان سے جتنا ہوسکتا ہے وہ کرلیتی ہیں، مگر سارا کام نہیں ہوتا اب ان سے۔'' عالیہ نرمی سے وضاحت دیتی۔

''ہاں تم جو نظر آتی ہو مہارانی کو، مفت کی نوکرانی تو وہ کیوں کچھ کرے۔''

''بس کریں باجی، یاد ہے کہ آپ کے تینوں بچوں کی دفعہ بھی میں ہی آپ کے پاس گئی تھی اور یاسمین باجی بھی تو اپنی بیٹی میرے پاس چھوڑ کر اسکول جاتی ہیں۔''

''ہماری تو تم بہن ہو۔'' عالیہ نے خاموشی میں عافیت جانی۔

پھر اکثر وہ ان کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کرنے لگی۔ نورین زیادہ تر خاموش رہتی۔ ذرا جو وضاحت بھی دیتی تو روبینہ وہ محاذ کھڑا کرتی کہ اللہ کی پناہ۔ ان ہی دنوں نورین ایک بیٹی کی ماں بن گئی تو اس کی مصروفیات میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ پہلا بچہ...... ناتجربہ کاری اور سب سے بڑھ کر گھر میں کسی بڑے کا نہ ہونا۔ وہ زیادہ تر کمرے کی ہو کر رہ گئی۔

''دیکھا اب تو بیٹی بھی ہوگئی۔ اب بھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔'' یاسمین روبینہ کی طرف آئی تو دونوں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ عالیہ یاسمین کی بیٹی کو اوپر چھوڑنے آئی تو دونوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی برین واشنگ شروع کردی۔

''ایسے ہی تم اس کی چاکری کرتی رہی تو یہ کبھی تمہاری شادی نہیں ہونے دے گی تم لکھ کر رکھ لو میری بات۔'' یاسمین نے اسے سمجھایا اور پانی اگر مسلسل پتھر پر بھی گرتا رہے تو اس میں بھی سوراخ کردیتا ہے وہ تو پھر بائیس تیئس سال کی لڑکی تھی۔ ویسے بھی بار بار بولا گیا جھوٹ سچ بن کر نظر آنے لگتا ہے۔ عالیہ کو بھی اب بہت کچھ سچ بن کر نظر آنے لگا تھا۔

''روبینہ اور یاسمین باجی ٹھیک کہتی ہیں...... یہ سب کچھ کیا دھرا نورین بھابھی کا ہی ہے۔'' باہر رات اپنی آنکھوں میں اندھیرے کا گہرا کاجل لگائے، سر پر سیاہ بادلوں کی ردا سجائے دنیا پر راج کررہی تھی اور اندر کمرے میں عالیہ، نورین کے لیے اپنے دل میں قطرہ قطرہ بدگمانی جمع کررہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ دوسروں کے بارے میں بدگمانی پالنا خود کو ایسے منہ زور گھوڑے پر بٹھا دینے کی مانند ہے جس کی لگام ہی نہیں رکابیں بھی ٹوٹی ہوتی ہیں اور وہ ہر چیز کو روند کر گزر جاتا ہے۔

''ہر وقت کمرے میں گھس کر مصلے پر بیٹھی نہ جانے کیا پڑھتی رہتی ہے۔ جادو کرتی ہے تم لوگوں پر۔'' اس کی پانچ وقت کی نماز کی پابندی کو لے کر

تھوڑے دن بعد روبینہ نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔ اب تو عالیہ کو بھی اپنی بہنوں کی باتوں پر تھوڑا تھوڑا یقین ہونا شروع ہو گیا تھا کہ پچھلے چھ مہینوں میں اس کے تین چار رشتے آئے تھے۔ دو تو آئے دیکھ کر جو گئے تو پھر بالکل خاموشی چھا گئی کہ پلٹ کر انکار تک نہ بھجوایا۔ ایک تو پسند بھی کر گئے اور ان کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ جس روز ان لوگوں نے جانا تھا اس روز صبح ان لوگوں نے فون کر کے معذرت کر لی۔

☆☆☆

عالیہ کا رویہ نورین کے ساتھ بدلنے لگا۔ یہ صورت حال نورین کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ وہ جو سارے گھر کو ایک ماں کی طرح لے کر چل رہی تھی۔ اس کو دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔

''تنویر!'' بہت سوچنے سمجھنے کے بعد نورین نے تنویر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ہوں۔'' وہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا۔

''آپ...... پہلے وعدہ کریں آپ میری بات سن کر غصے نہیں ہوں گے۔'' تنویر ٹی وی آف کر کے اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ پریشان کیوں ہو؟'' تنویر نے اس کے چہرے کو نظروں کی زد میں لیا۔

''پریشان تو ہوں...... آپ گھر کا ماحول دیکھ رہے ہیں آج کل؟''

''ہوں''

''مجھے لگتا ہے کہ اب باجی کو یہاں سے شفٹ ہو جانا چاہیے۔'' نورین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''سوری اگر میری بات آپ کو بری لگی تو۔'' نورین نے اس کی خاموشی کو دیکھ کر معذرت کی۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں ہے...... میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں...... مگر وہ بڑی بہن ہے ہماری...... ایسے کیسے کہہ دوں...... برا نہ مان جائے۔'' تنویر نے کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''آپ بھائی صاحب سے بات کریں۔''

''اچھا دیکھتا ہوں۔''

''میری امی کہتی ہیں کہ شادی شدہ بیٹیوں کو اپنے گھروں میں ہی رہنا چاہیے...... شادی شدہ بیٹیاں میکے میں آباد ہو جائیں تو بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔'' نورین اانداز اب بھی محتاط تھا۔

''اچھا دیکھتا ہوں۔'' کھڑکی سے کان لگائے روبینہ نے ان کی ساری گفتگو سنی تھی۔

''دیکھا کیسے بھڑ کاتی ہے ہمارے الو کے کان والے بھائی کو ہمارے خلاف۔'' اگلے روز روبینہ اور یاسمین کڑھ رہی تھیں اور عالیہ پاس بیٹھی سب سن رہی تھی۔

''یہ جو عالیہ کا رشتہ نہیں ہو رہا نا کہیں، تو یہ سب بھی اسی کا کیا دھرا ہے۔ جادو ٹونے تو جادو ٹونے، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جو پچھلا رشتہ ہاتھوں سے نکلا ہے تو اسی نے کوئی فون وغیرہ کر کے کچھ الٹا سیدھا کہا ہے۔'' یاسمین نے عالیہ کی طرف دیکھا جس کا دل تو یہ سب قبول نہیں کر رہا تھا، مگر حالات اسی بات کی گواہی دے رہے تھے۔

''عالیہ! آؤ میں نے تمہاری قمیص سی دی ہے۔ پہن کے دیکھ لو۔'' اسی وقت نورین اوپر آئی۔ عالیہ نے سنی ان سنی کر دی۔ روبینہ اور یاسمین نے بھی اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

''بات سنو بی بی! یوں چھپ چھپ کر ہماری جاسوسیاں نہ کیا کرو۔ پہلے ہمارے بھائی کو کم الو نہیں بنایا ہوا تم نے۔'' روبینہ سے اس کا خاموشی سے چلے جانا برداشت نہ ہوا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ وہ تھوڑا سا کچھ کہے تو وہ لڑائی شروع کرے، مگر نورین کی برداشت کی عادت کام آ گئی۔

☆☆☆

نورین کی بیٹی سال کی ہونے کو آئی تھی۔ گھر کا ماحول پہلے سے زیادہ کشیدہ ہو گیا تھا۔ تنویر نے اپنے بہنوئی سے گھر چھوڑنے کے بارے میں بات کی تھی۔ جس پر اس نے تو کچھ نہ کہا، مگر روبینہ نے وہ واویلا

مچایا کہ سب کی بولتی بند کروادی۔

''ہاں ہاں...... ماں باپ مر گئے ہمارے تو اب یہی سلوک ہوگا ہمارے ساتھ...... تمہاری بیوی کا بس چلے تو دھکے دے کر ہمیں اس گھر سے نکال دے...... مگر کان کھول کر سن لو...... میرے ماں باپ کا گھر ہے...... جب تک میرا دل چاہے گا میں یہاں رہوں گی۔''

نورین اپنی بیٹی کو حلوا کھلا رہی تھی۔ یاسمین کی بیٹی بھی اس کے کمرے میں آ گئی تو اس نے حلوے کے دو تین نوالے اسے بھی کھلا دیے۔ یاسمین اسکول سے سیدھا ادھر ہی آئی تھی۔ وہ چیل کی طرح آئی۔ انگلی ڈال کر بچی کے منہ سے حلوا نکالا اور اسے گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئی۔

''عالیہ...... عالیہ...... تم سے نہیں سنبھالی جاتی تو بتادو مجھے...... وہ جادوگرنی نہ جانے کس کا پڑھا ہوا حلوا اسے کھلا رہی تھی۔'' یاسمین کی آواز نورین کے کانوں کے پردے پھاڑ گئی۔ آنسو اس کے گال بھگونے لگے۔ اسے اپنا قصور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ روبینہ کے جیٹھ کے بیٹے کی شادی تھی وہ لوگ پندرہ دن کے لیے فیصل آباد چلے گئے۔ یاسمین بھی دس پندرہ روز کے لیے سرگودھا اپنی سسرال چلی گئی۔ گھر میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ عالیہ اپنے حصے کا کام نمٹا کر چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ نورین کی بیٹی اب پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی وہ ہمک ہمک کر اس کی طرف جاتی تو وہ اسے کمرے سے نکال کر دروازہ بند کر لیتی۔ نورین کا دل دکھ سے بھر جاتا۔

☆☆☆

''عالیہ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' نورین عالیہ کے پاس جا بیٹھی۔

''تنویر کا دوست اپنے چھوٹے بھائی کے رشتے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔ وہ ان کی بیوی بس دو لوگ ہی ہوں گے۔ شام کو تم تیار رہنا۔''

''آپ یہ ڈھکوسلے بند کریں...... آپ کب چاہتی ہیں کہ میرا رشتہ کہیں طے ہو جائے۔'' عالیہ نے ایک دم بپھر کر کہا۔

''عالیہ! خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھا ہے اور میں کبھی تمہارا برا نہیں چاہوں گی۔'' نورین رندھی ہوئی آواز میں کہہ کر چلی گئی اور عالیہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

وہ لوگ آئے اور عالیہ کو پسند کر گئے۔ تنویر کو وہ لوگ سالوں سے جانتے تھے۔ تنویر نے سوچنے کو تھوڑا وقت مانگا اور پھر اگلے ہفتے ان کو ہاں کر دی۔ وہ لوگ کسی منگنی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ دو ماہ بعد شادی کرنا چاہتے تھے۔ لڑکے کے ماں باپ نہیں تھے۔ اچھا کماتا تھا۔ بھائی بھابھی کے ساتھ رہتا تھا۔ شادی بھی وہی کر رہے تھے۔ عالیہ حیران تھی کہ اس دفعہ تو نورین اکیلی تھی۔ وہ جو چاہتی کہہ کر یہ رشتہ بھی نہ ہونے دیتی تو پھر اب یہ رشتہ کیسے طے ہو گیا۔

''عالیہ تم میری بیٹی جیسی ہو...... اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے اور ہاں...... روبینہ یا یاسمین باجی کا فون آئے تو انہیں کچھ مت بتانا...... یہ ان کے لیے سرپرائز ہے۔'' تنویر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو عالیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ تھا...... کوئی ایسا پردہ جو چیزوں کو واضح ہونے سے روک رہا تھا۔ اب اسے نورین اور تنویر کے ساتھ اپنے رویے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

روبینہ اور یاسمین ایک ہی شام واپس پہنچی تھیں۔ ان تک عالیہ کی بات پکی ہونے کی خبر پہنچی تو پہلے تو دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔

''ارے ہمارے جاتے ہی نہ جانے کس ایرے غیرے سے عالیہ کا رشتہ طے کر دیا۔ ہمارے آنے کا انتظار تو کیا ہوتا...... ہم مر تھوڑی گئے تھے۔'' یہ روبینہ تھی۔

''ہاں سر سے بوجھ اتار کر پھینک دیا ہوگا...... کسی نکھے نکھٹو کے پلے باندھ کر اپنی جان چھڑا لی ہوگی۔'' یاسمین نے زہر میں بجھا تیر پھینکا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں...... میں نے پوری تسلی کے بعد ہاں کی ہے......لڑکے والے میرے پرانے جاننے والے ہیں۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ گریڈ چودہ کا سرکاری ملازم ہے اور اپنی زمینیں بھی ہیں۔ وہ لوگ ہماری عالیہ کو بہت خوش رکھیں گے۔ میں اگلے ہفتے آپ سب کو ان سے ملوادوں گا۔" اب اعتراض کی کوئی وجہ نہ رہی، تو وہ دونوں خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

"بھابھی میں ذرا ناز کے گھر جارہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔" عالیہ نے نورین کو مخاطب کر کے کہا۔ بہت مہینوں بعد اس کے لہجے میں نورین کے لیے پہلے سی مٹھاس اور احترام تھا۔

"اچھا، پہلے میرے ساتھ یہ گدا ذرا چھت پر رکھوا جاؤ، میں اس کا نیا کور سی رہی ہوں، تب تک اسے دھوپ لگ جائے گی ذرا۔" دونوں گدا اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ گدا چھت پر رکھ کر وہ سیڑھیاں اتر کر روبینہ کے پورشن میں آئیں تو یاسمین اور روبینہ کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ دونوں بے ساختہ رک گئیں۔

"میرے تو چلو جیٹھ کے بیٹے کی شادی تھی، جانا ضروری تھا، تم تو رک جاتیں۔" روبینہ نے یاسمین کو لتاڑا۔

"مجھے کیا معلوم تھا یہ لوگ آنا فانا عالیہ کی بات پکی کردیں گے۔ مجھے تو خود بہت پریشانی ہورہی ہے۔ میری بیٹی کو کون سنبھالے گا۔ میں تو سوچ رہی تھی ایک آدھ بچہ اور پیدا کرلوں۔ عالیہ پال لے گی، مگر یہاں تو......"

"میں تو چاہ رہی تھی کہ ابھی تین چار سال تک عالیہ کی شادی نہ ہو۔ کیوں کہ اگر اس کی شادی ہوگئی تو پھر فرحان کی شادی کا رولا اٹھ جائے گا، تو مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ تم تو جانتی ہو ابھی میں یہ گھر چھوڑنا افورڈ نہیں کرسکتی۔ فیصل آباد سے آکر ہم نے جو گھر خریدا تھا وہ تو کرائے پر ہے اور اسی کے کرائے سے ہم نئے پلاٹ کی قسطیں بھرتے ہیں۔ پلاٹ کی دو سال کی قسطیں رہتی ہیں ابھی، یہاں سے اپنے گھر شفٹ ہوگئی تو قسطیں کیسے بھریں گے۔ تمہارے بھائی کی تنخواہ میں تو بہت مشکل ہوجائے گی۔" روبینہ باجی نے اپنا دکھڑا رویا۔ نورین اور عالیہ ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں۔

"تو اور کیا، ہر آنے والے رشتے کو بھگانے کے لیے ہم دونوں نے کیسے کیسے بہانے گھڑے تھے۔ اس سے پہلے جو رشتہ آیا تھا اور وہ لوگ پیچھے ہی پڑ گئے تھے، تو میں نے فون کر کے عالیہ کے پاگل پن کے جھوٹے قصے سنائے، تو کہیں جا کر ان لوگوں سے جان چھوٹی تھی، مگر اس بار تو ہمیں موقع ہی نہیں ملا کہ ہم کچھ کر پاتیں۔"

یاسمین نے رونا رویا۔ نورین کے ضبط کی انتہا ختم ہوگئی، تو وہ خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

"اف...... میری بہنوں کی ایسی سوچ، بڑی بہنیں تو ماں برابر ہوتی ہیں۔ یہ کیسی بہنیں ہیں جو اپنے فائدے کے لیے اپنے چھوٹے بہن، بھائیوں کی زندگی خراب کرنے جارہی ہیں، اور بھابھی...... جسے یہ پرائی پرائی...... جادوگرنی اور نہ جانے کیا، کیا کہتی تھیں۔ وہ کیسے اس کے لیے ایک ماں کی طرح چھاؤں بن گئی۔ سچ ہے کہ بڑے سے بڑا ڈاکو بھی کسی کا نصیب نہیں چھین سکتا۔" عالیہ نے گہری سانس بھری اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی، تاکہ نورین بھابھی سے سچے دل سے معافی مانگ سکے۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیہا علی
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

صدف ریحان گیلانی

ضروری نہیں

مکمل ناول

ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اس پر کسی نے ڈیک بھی آن کر دیا تو چنگھاڑتے شور نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کان پڑی آواز سمجھنا کار دشوار ہو گیا۔
آج تو اس کا کمرہ باغ کے کنج سا لگ رہا تھا۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ، چیزیں ہی چیزیں، چمک ہی چمک، پھر لڑکیاں ہی لڑکیاں اس پر سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کسی کو عین وقت پر اپنے جھمکے مناسب نہیں لگ رہے تھے، وہ کسی اور کے جیولری باکس میں گھسی بیٹھی تھی۔ کسی کا ہیئر اسٹائل الجھ گیا تھا۔ وہ پھر سے بال بکھرا کے ڈرانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ تو کوئی آدھا میک اپ کیے میچنگ لپ اسٹک ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کسی قسم کا بھی تراہ نکال سکتی تھی اگر جو کوئی شامت اعمال کا مارا متوجہ ہوتا تو......
ابھی کوئی دو سیکنڈ پہلے ہی محمود نے ادھ کھلے دروازے سے سر اندر ڈال کر اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔ آج گھر میں بہن کی مہندی کی تقریب تھی۔ باہر سو کام کرنے والے پڑے تھے۔ اور وہ تھی کہ ابھی تک اپنی تیاری ہی مکمل نا کر سکی تھی۔ جبکہ لڑکے والوں کی طرف سے بھی فون آچکا تھا کہ وہ مقررہ وقت پر پہنچ رہے ہیں۔
اور بس یہ سننا تھا کہ ہارر مووی کا سین پیش کرتیں تھوبڑوں پر نیلے پیلے ماسک لتھیڑے بیٹھی لڑکیاں یوں متحرک ہوئیں کہ کیا ایک گھنٹا بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے بعد ہماری قوم حرکت میں آتی ہو گی۔
سب ہی نے واش روم کی جانب دوڑ لگائی اب بے چارہ دروازہ ایک اور لڑکیاں بے شمار۔ اللہ جھوٹ نا بلوائے تو ہماری قوم نے پہلے کہیں ڈسپلن کا مظاہرہ کیا ہے جو یہاں کیا جاتا تو بس پھر وہ ہوا جو ناقابل بیان......
"جازمہ کو سب سے پہلے باری اس لیے مل گئی کہ ایک تو کمرہ اس کا تھا۔ دوسرے مہندی بھی اس کی بہن کی تھی اور تیسرے سب سے اہم بات کہ باہر بہت سے کام پڑے تھے کرنے والے تو اب کوئی کزن غلطی سے بھی اس سے پہلے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔
اور وہ سب سے پہلے تیار ہو کر دہائیاں دے رہی تھی۔ وہ کیوں...... تو جناب وہ اس لیے کہ اس ہڑبونگ میں اس کی سنہری سینڈل کہیں ادھر ادھر منہ چھپا گئی تھی۔ اب ایسے عالم قیامت میں کسی کی فریاد بھلا سنے کون۔ وہ ایک پیر میں سینڈل پھنسائے لنگڑاتی، لڑکھڑاتی کبھی صوفے کے نیچے تو کبھی پردے کے پیچھے جھانک رہی تھی۔ کہ پٹاخ سے کمر پر کوئی چیز پڑی وہ تڑپ کر مڑی۔
" تمہاری سینڈل " وہی بنا لپ اسٹک والی ہونق کزن مسکرا رہی تھی۔ اک پل کو تو اس کا دل ہی دہل گیا۔ کمر پر بلنک کرتی سرخ بتی بھی بجھ گئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ وہ بھرے مجمع میں تھی آگر جو کوئی ویرانہ ہوتا تو ضرور ایک دل دوز چیخ فضا کی نظر ہو جاتی۔ اس کا

شکریہ تو کیا ادا کرتی زیرلب ناقابل اشاعت قسم کی گالی دیتے لپک کر سینڈل میں پیر پھنسا جھپٹ کر باہر کی راہ لی۔

"بہت خوب آج بھانجی کی مہندی ہے اور لاڈلی خالہ صاحبہ ہیں کہ عین وقت پر مہمانوں کی طرح تشریف لا رہی ہیں۔ اب بھی سوچ لیتیں کوئی دو چار گھنٹے گزر جاتے تو پھر جلوہ نما ہوتیں آپ۔" محمودہ کو آج کچھ زیادہ ہی نزلہ ہو رہا تھا جواب بے چاری شامت کی ماری شیریں خالہ پر جا گرا۔ اور وہ ٹھہریں سدا کی اِسم بامسمّیٰ جلال خالو جیسے جلالی شوہر کے ساتھ زندگی کے پچیس سال گزار کر بھی اب تک ان کے اندر شیرینی باقی تھی تو یہ واقعی ان کا ہی کمال تھا۔ وہ مسکراتی گلے آ لگیں۔

"میں اپنی اس غلطی پر معافی چاہتی ہوں۔ سچ پوچھو تو میرا اپنا اتنا دل تھا کہ میں صبح ہی آ جاتی لیکن کیا کروں اچانک سے غزالہ کی ساس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجبوری



تھی ادھر جانا بہت ضروری تھا۔ بس وہیں کچھ وقت لگ گیا۔ دوسرے خیام بھی دفتر سے لیٹ ہوگیا، میں اسی کے انتظار میں تھی۔ وہ آیا تو اسے چائے پانی بھی نہیں پوچھا اور کہا کہ مجھے چھوڑ آؤ خالہ کی طرف۔ پھر پتا ہے نا اس کا یونہی خفا ہو جاتی ہے۔"

"ہاں ہاں۔۔ پاگل ہوں نا میں۔ جو یونہی خفا ہوتی پھروں۔ دماغ خراب ہے میرا۔ دور پرے کا سارا خاندان گھر میں جمع ہے۔ ایک بس آتے ہیں تو اپنے ہی قریبی مہمان بن کر آتے ہیں۔ پھر اس پر بھی کہتے ہیں کہ گلہ نا کروں۔ واہ بھئی کیا کہنے میرے اپنوں کے۔" محمودہ کا غصہ جوں کا توں تھا۔

شیریں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں اپنی کزن پلس بچپن کی سہیلی کو۔ جتنا وہ تاویلیں پیش کریں گی اتنا ان کا پارہ چڑھتا جائے گا۔ سو چپ ہی بھلی۔

اس نے جھک کر سینڈل کی اسٹرپ بند کی۔ سی گرین اور ڈل گولڈن کام والا دلکش و نفیس سوٹ زیب تن کیا، بھاری دوپٹا سنبھالتی آگے بڑھی اور ماں کے مزید کسی تیر و تلوار سے خالہ کو بچانے کے ارادے سے جھٹ سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ ارے ہماری گڑیا تو آج بالکل شہزادی لگ رہی ہے۔" انہوں نے بے اختیار گلے لگا کر پیشانی پر مہر محبت ثبت کی۔ "ماشاءاللہ...... ماشاء اللہ نظر بد سے بچائے۔ بھئی محمودہ تم سارے کام چھوڑ کر سب سے پہلے نظر اتارو میری بچی کی۔" ان کا انداز ہمیشہ ہی ایسا پیار بھرا ہوتا تھا۔ وہ ان کے دیے گئے مشورے پر جھینپ سی گئی۔ محمودہ اس سے کہہ رہی تھیں۔

"خالہ سے چادر پکڑ کر سنبھال کر رکھ دو۔ اور انہیں رملہ کے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کے بعد آکر دو چار لڑکیاں ساتھ لگا کر پھولوں کی ٹوکریاں سیٹ کر والو۔ میں ذرا باقی انتظامات دیکھ لوں۔"

"جی"۔ اس نے سر ہلا دیا۔ شیریں چادر اتارنے لگیں تو دھیان آیا دوپٹا تو ہاتھ میں ہے ہی نہیں۔

"اے لو۔۔ لگتا ہے دوپٹا میں وہیں سیٹ پر بھول آئی۔" انہوں نے ماتھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا۔ پھر جلدی سے ہینڈ پرس سے سیل فون نکال کر کال ملانے لگیں۔

"ہاں بیٹا خیام زیادہ دور تو نہیں گئے؟ اوہ اچھا...... یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔ بھائی صاحب سے مل لیے انہیں مبارک باد بھی دے دی۔ خوش ہوگئے وہ۔ اچھا سنو وہیں ٹھہرو میں دوپٹا گاڑی میں ہی بھول آئی ہوں جازمہ کو گیٹ تک بھیج رہی ہوں نکال کر اسے دے دو۔" انہوں نے کال ڈراپ کر کے اسے دیکھا۔

"سوری بیٹا زحمت تو ہوگی لیکن۔۔۔"

"کیسی بات کرتی ہیں خالہ زحمت کیسی۔ آپ رملہ آپی کے روم میں چلیں میں ابھی لے کے آئی۔" شیریں پیار سے اس کے گال تھپک کر کمرے کی جانب چلی گئیں۔ وہ گیٹ کی اور چلی آئی۔ خیام سامنے سے آرہا تھا۔ واقعتاً لگتا تھا۔ خالہ نے تو اس بے چارے کو منہ دھونے کا بھی وقت نہیں دیا۔ سارے دن کی تھکن اس کے چہرے پر رقم تھی۔ بے ترتیب سے بال، وہ ٹائی جو صبح اس نے خوب محنت سے باندھی ہوگی اب ڈھیلی سی ہو کر گلے میں جھول رہی تھی اور وہ بھی ایسا لاپرواہ ذرا جو اسے ٹھیک کیا ہو۔ اور یہ کوئی اب کی بات نہیں تھی جازمہ نے اسے ہمیشہ ایسا ہی دیکھا تھا۔ بے دھیان، بے فکر، سنجیدہ متین، خالہ کے سپوت نے اگر ماں سے مزاج نہیں لیا تھا تو صد شکر خالو کا انداز بھی نہیں اپنایا تھا۔ حالانکہ خالو بھی ایسے کوئی خوں خوار نہیں تھے۔ بس بچپن میں کہیں انہیں غصہ کرتے دیکھا تھا تب سے جازمہ کے دل پر ان کی ہیبت طاری تھی۔ اسی لیے وہ ان کی طرف بھی بہت کم جاتی تھی۔ ہاں خالہ اکثر ہی کچھ نا کچھ بنا کر خیام کے ہاتھ بھجوا دیتی تھیں۔ جو وہ گیٹ سے ہی

کھڑے کھڑے پکڑا کر نکل لیتا۔ اب بھی وہ نظر نیچی کیے اپنے دھیان میں تھا۔

"یعنی حسب روایت آج بھی آپ اندر نہیں آئیں گے۔" گیٹ سے لے کر دور تک لگے قمقموں کے سائے میں وہ سرخ بجری کی روش پر کھڑی تھی۔ خیام نے نظر اٹھائی۔ زرد، سبز، اودے، نیلے، کاسنی، نارنجی قمقمے ہر پل رنگ بدل رہے تھے۔ لیکن وہ صرف ایک رنگ دیکھ رہا تھا۔ سنہرا اور بس سنہرا۔ اس نے بوکھلا کر نظر پھیر لی۔ وہ تو اسے کبھی عام دنوں میں بھی نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔ آج تو پھر وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔ چاندنی میں نہائے، قوس قزح کے رنگوں سے سنگار کیے، پھولوں سے خوشبو مستعار لے کر بالکل اپسرا سی۔

"حد ہے ویسے آج آپ کی خالہ کی بیٹی کی مہندی ہے اور آپ اسی رف اینڈ ٹف حلیے میں ہیں۔ اور یہ آپ واپس کیوں جا رہے تھے۔ تقریب میں شرکت نہیں کریں گے؟ غزالہ آپی بھی نہیں آئیں تو ایٹ لیسٹ آپ تو شامل ہو جاتے۔" وہ بڑے مان سے گلا کر رہی تھی۔ خیام کو بے حد اچھا لگا۔ کاسئہ دل لبالب بھر گیا۔ ساری تھکن زائل ہوئی۔ متانت سے گویا ہوا۔

"سوری...... ان فیکٹ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی تقریب خالصتاً خواتین کی ہوتی ہے۔"

"اچھا اب شادی پر تو آئیں گے نا؟ یا اس دن بھی کوئی بہانہ کر دیں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"ضرور آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔" خیام نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔ اسے کسی نے آواز دی تھی وہ عجلت میں ادھر مڑ گئی۔ اور رنگ برنگے قمقموں کے درمیان کھڑے خیام کے اندر اجالا بڑھتا رہا۔

☆☆☆

کہنے کو تو صبح کے دس بجے تھے مگر یہاں تو ایسا سناٹا چھایا تھا کہ جیسے ابھی بھی گھڑی رات کے دو بجا رہی ہو۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ وہ سب اندر آ تو گئی تھیں کہ شکر ہے گیٹ کیپر جاگ رہا تھا۔ اگر وہ بھی سویا ہوا ہوتا تو...... اور اب وہ اک دو جے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ منہ سے آواز نکالتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ایویں کہیں اس خواب محل کی بے ادبی نا ہو جائے۔

"اب کیا یہ سب مال طعام اٹھائے کھڑی رہو گی جا کے خود ہی باورچی خانے میں رکھ دو۔" زرینہ مامی نے نرم گداز صوفے میں دھنستے ان سب کو آرڈر جاری کیا۔

"اوہو آہستہ تو بولیں امی" ان کی آواز تو عام حالات میں بھی سب سے الگ سنائی دیتی تھی۔ اب تو عالم ہی جدا تھا۔ رفعت نے بوکھلا کر ٹوک دیا۔

"اے کیا مطلب؟ اب کیا میں منہ پر سلنسر لگا لوں۔ مان لیا بھئی شادی والا گھر ہے۔ رات دیر تک جاگے ہیں سارے۔ مگر ایسا بھی کیا کہ رسم و رواج ہی بھول گئے۔ ہاجرہ کو یاد نہیں رہا کہ لڑکی والے صبح سویرے ناشتا لے کر آئیں گے۔ زندگی کے کچھ سال ملک سے باہر کیا گزار لیے ان کے تو طور طریقے ہی بدل گئے۔ ہمارے زمانے میں تو دولہا دلہن کی مجال نہیں تھی کہ دن چڑھے تک سو لیں کجا کہ سارا کنبہ۔ حد ہے بھئی۔ اور یہ تم سب وہیں کی وہیں ہو ابھی تک، میں نے کہا ہے جا کہ رکھ آؤ سارے برتن بھانڈے۔ میں خود جگاتی ہوں ہاجرہ کو۔" انہوں نے خوب موتی تارے لگی جوتی سے پاؤں نکال کر اوپر سمیٹ لیے تھے جو پھر سے نیچے اتارے۔

"اوہو مامی پلیز۔۔ رہنے دیں مت نیند خراب کریں کسی کی۔ غلطی ہماری ہے۔ ہمیں فون کر کے آنا چاہیے تھا۔" جازمہ نے جھٹ ان کے ہاتھ تھام کر مزید کی پیش قدمی سے روکا۔

"کیا مطلب ہے غلطی؟ اب کیا ان موقعوں پر بھی فون کر کر کے اجازت لی جاتی ہے۔ ارے تمہاری ماں بے چاری نے تو ساری رات آنکھ نہیں

جھجکی۔ ادھر بیٹی رخصت کی ادھر چولہا سنبھال لیا۔ اتنے چاؤ سے سارے حلوے مانڈے خود تیار کیے اتنے گھنٹوں کی محنت سے بنایہ سب، تم لوگ کیا جانو۔ جوڑ جوڑ دکھ گیا اس غریب کا۔ اوراب یہ سب پڑا ٹھنڈا ہوتا رہے گا نری رزق کی ناقدری۔ ارے گھر کی عورت جاگے گی تو سارا ٹبر جاگے گا نا۔ ہٹو پرے تم لوگ۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"بیٹھیں جی آپ سب کھڑی کیوں ہیں؟" وہ تو جوتی میں پیر پھنسا ہی چکی تھیں بھلا ہو ملازمہ کا جواللہ جانے آنکھیں ملتی کس کونے سے نکلی تھی۔

"لائیں جی یہ سب پکڑادیں مجھے۔"

"ارے کیا یہ سارے کے سارے اتنی ہی دیر تک سوتے ہیں؟" زرینہ مامی کا رخ آنے والی کی جانب ہوا۔

"نا جی یہاں تو سب نور کے تڑکے جاگنے کے عادی ہیں۔ زوار اور شجاع باؤ تو منہ انیرے (اندھیرے) جاکنک (جاگنگ) پر نکل جاتے ہیں فیر سورج چڑھے ان کی واپسی ہوتی ہے۔ بی بی جی خود سویرے ناشتا بناتی ہیں۔ جو اٹھ دو بجے تک سارے کر لیتے ہیں۔ فیر تیار ہو کے اپنے اپنے آفس چلے جاتے ہیں۔ پر کل رات تو تھی ہی جی بڑی کرماں والی۔ گھر میں بھورانی آئی تھی۔ سب کے سو سو ارمان تھے۔ ساروں نے خوب چاہ سے پورے کیے۔ ساری رسمیں، رنجیں پوری کیں۔ بہت مزا آیا تھا جی۔ صبح پانچ بجے ہی تو نماز پڑھ کے سوئے ہیں سارے جی۔" اس نے تفصیلاً بتایا۔

"اچھا اچھا۔ چلو تم سنبھالو یہ سب۔ جب تمہاری بی بی جی جاگیں تو انہیں بتا دینا۔ اب گھر والے تو آرام کررہے ہیں ہمارا بیٹھنا مناسب نہیں۔ ہم چلتے ہیں۔" زرینہ مامی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نا جی ایسے کیسے چلتے ہیں۔ آپ لوگ چلے گئے تو بی بی جی سخت خفا ہوں گی۔ ان کا حکم ہے جی گھر میں کوئی بھی مہمان آئے وہ سو بھی رہی ہوں تو انہیں جگا دیا جائے۔ آپ سارے تو جی پھر بھورانی کے گھر سے ہو۔ آپ ملے بنا نہیں جاسکتے۔ میں آپ سب کے لیے اچھی سی چائے بنا کے لاتی ہوں۔" اور جب تک وہ چائے لے کے آئی ہاجرہ بھی آ گئی تھیں۔ زرینہ مامی نے پھر نامناسب استقبال ہونے کا گلہ کیا۔ وہ شرمساری معذرت کیے گئیں۔

جازمہ کو شرمندگی ہونے لگی۔ کہا بھی تھا مما سے کہ کسی اور کو ساتھ بھیج دیں۔ مگر انہیں تو اپنے سارے خاندان میں اپنی بھابھی ہی زیادہ سمجھ دار لگتی ہیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کس طریقے سے ان کی زبان بند کرسکے۔ اور شاید کہ وہ کچھ بول ہی پڑتی کہ سامنے سے آتے شجاع عباس کو دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی۔ اچھی بھلی رفتار سے چلتا دل خواہ مخواہ ہی بے ربطگی پر اتر آیا۔ وہ بلیک ٹراؤزر پر ریڈ اینڈ وائٹ مائیکرو چیک شرٹ پہنے نکھرا ستھرا سا بالوں میں انگلیاں چلاتا آرہا تھا۔ ان سب کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ صبح سویرے اتنے مہمان اس کے گمان میں بھی نہیں ہوں گے۔

"آؤ شجاع۔۔ زوار کے سسرال والے ناشتا لے کر آئے ہیں۔" ہاجرہ نے اسے بتایا۔

"بٹ وائے۔ (لیکن کیوں)" وہ حیران سا پوچھ رہا تھا۔

"رسم ہوتی ہے بیٹا۔ پہلے دن دولہا اور گھر والوں کے لیے ناشتا دلہن کے گھر سے آتا ہے۔" زرینہ مامی نے اس کے سلام کا جواب دیتے اٹھ کر دونوں ہاتھ پھیر کر انگلیوں سے سنوارے بال ایک برابر کردیے۔ وہ جو ابھی ایک لمحے قبل ڈیشنگ ہیرو سا لگ رہا تھا کہ یکدم ہیئر اسٹائل کے بدل جانے سے سائڈ ہیرو سا نظر آنے لگا۔ لڑکیوں نے اس کی گت بننے پر بمشکل ہنسی ضبط کی۔ جازمہ نے تو بوکھلا کر نگاہ پھیرلی۔ مامی نے تو کوئی پرانا بدلہ نکالا تھا اس سے۔

"انٹرسٹنگ......اٹ مین کے سب خاص آئٹم

ہوں گے۔ یہاں کے ناشتے کے۔"

"ہاں ہاں...... بھئی ظاہر ہے۔ بیٹی کے گھر پہلا ناشتا بھیجنا ہوتا ہے تو سب کے سب روایتی کھانے ہوتے ہیں۔ اور یقین مانو بیٹا ہم نے تو تمام رات کمر ٹکا کر نہیں دیکھی۔ محمودہ کو تو چین ہی نہیں تھا۔ بس یہی فکر کہ اب صبح کی تیاری کرنی ہے۔ کوئی کمی نا رہ جائے۔ اور اپنی جازمہ بیٹی نے تو ایسی پوریاں تلی ہیں کہ کھاؤ گے تو سواد آجائے گا۔" مامی پورے شدومد سے تفصیل بتا رہی تھیں۔ اور اپنے بے وقت تذکرے پر اس نے چونک کر دیکھا۔

"میں نے پوریاں ہیں وہ کب؟" وہ تو بہن کی رخصتی کی بعد ہال سے گھر پہنچتے ہی بمشکل ڈریس چینج کرنے کی ہمت کرسکی تھی پھر جو بستر پر گری تو سورج نکلتے محمودہ نے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا کہ " کچھ اور نہیں کیا تو اب آ کر ناشتا ہی پیک کروادو۔"

"وری گڈ۔" شجاع کے ساتھ ہاجرہ نے بھی اسے توصیفی نگاہ سے دیکھا۔

سفید رنگ کی نفیس سی فراک پہنے وہ نازک سی لڑکی دیکھنے پر یک لخت گھبرا سی گئی۔ اگر ابھی جو ہاجرہ آنٹی پوریاں بیلنے کی ترکیب پوچھ لیں تو......؟ اف یہ مامی بھی ناں۔ پتا نہیں کیا سوچیں بیٹھی تھیں۔

عباس انکل، بابا کے چچازاد بھائی تھے۔ بہت سال پہلے غم روزگار میں الجھے کینیڈا چلے گئے تھے۔ جب خود سیٹ ہو گئے تو کچھ سال بعد فیملی کو بھی بلوا لیا۔ خوب کمایا، بچوں کو اعلا تعلیم دلوائی۔ اور جب کما کما کر تھک گئے۔ اولاد جوان ہوگئی تو سب سمیٹ کر وطن واپسی کی راہ لی۔ اپنے آبائی مکان کو نئے سرے سے بہترین جدید انداز سے تعمیر کروایا۔ کاروبار جمایا۔ چھ ماہ پہلے اپنوں میں ہی اچھا سالڑکا دیکھ کر بیٹی کی شادی کر دی۔ بیٹے کی باری آئی تو سارا خاندان ہی آس مند نظر آیا۔ تب فیصلہ بیٹے پر چھوڑ دیا۔ جس کی نگاہ انتخاب کومل سی رملہ پر جا ٹھہری۔

خاندان کا سب سے بڑھ کر کھاتا پیتا گھرانہ، کینیڈا کی بہترین یونیورسٹی کا ڈگری ہولڈر خوب صورت نوجوان جس نے سارے زمانے کی لڑکیاں چھوڑ کر رملہ کو چنا تھا۔ اور رملہ کی تو گویا لاٹری نکل آئی۔ وہ پہلے ہی اپنے حسن و خوب صورتی پر کم نازاں نہیں تھی۔ اس کا مزاج جو ہمیشہ سے آسمان پر رہتا تھا۔ اب یقین واثق تھا کہ مزید بلندی کا سفر طے کرلے گا۔

شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ جب ایک ماہ قبل شجاع تعلیم مکمل کر کے لوٹا۔ محمودہ نے ان سب کی شان دار ضیافت کا اہتمام کیا۔ اور تب جازمہ نے پہلی بار اسے دیکھا۔ اور وہ پہلی بار کا دیکھنا وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ سفید کلف لگے کرتا شلوار میں دراز قد اور دل فریب شخصیت کے ساتھ وہ انتہائی خوبرو لگ رہا تھا۔ زوار نے بھی اس روز شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔

کم پرکشش وہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے والوں پر مشرق اور مغرب کا ہی تاثر پڑ رہا تھا۔ زرینہ مامی نے تو دیکھتے ہی بے دریغ تبصرہ بھی کر ڈالا۔

"اے ہاجرہ...... تیرا چھوٹا تو بڑے سے بھی خوب صورت جوان نکلا ہے۔"

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ۔" ہاجرہ نے فوراً پڑھا تھا۔

"تمہارا یہ بچہ اصل میں لگ رہا ہے گوروں کے دیس سے آیا ہوا۔"

"اب آپ یہ مت کہہ دیجیے گا میں وہاں گوروں کا جھوٹا کھاتا رہا ہوں۔" ان کی اگلی گل افشانی سے پہلے ہی گھبرا کر وہ بول اٹھا تھا۔ اس کی بات پر ایک قہقہہ پڑا۔ وہ حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا۔ سب میں یوں گھل مل گیا کہ لگ ہی نہیں رہا تھا پہلی بار ملا ہے۔ مامی کو ایک ہی ملاقات میں بہت کم لوگ پسند آتے تھے۔ لیکن شجاع کے نام کی تو وہ تسبیح لے بیٹھیں۔

"اللہ نظر بد سے بچائے ایسا پیارا بچہ ہے ماشاء

اللہ خوش قسمت ہے ہاجرہ جو آج کل کے زمانے میں ایسی باادب اولاد ملی ہے۔ اے محمودہ میں تو دل لگتی کہوں گی۔ لڑکا بڑا اچھا ہے ہاتھ سے مت جانے دینا۔" اور محمودہ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہیں پاپ کارن اور اپنے فیورٹ ڈرامہ سے لطف اندوز ہوتی جازمہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ارے اب دیکھو نا۔ آج کل بچیوں کے اچھے رشتے ڈھونڈنا کس قدر مشکل کام ہے۔ سو سو چھان پھٹک کرنا پڑتی ہے۔ لوگوں نے کئی طرح کے پردے خود پر ڈالے ہوتے ہیں۔ کون اندر سے کیسا ہے کہاں پتا چلتا ہے جب تک واسطہ نا پڑے۔ تم تو بڑے بختوں والی رہی ہو جو اپنے ہی خاندان سے ایسا اعلا رشتہ آ گیا۔ دیکھا بھالا گھر ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ جہاں ایک بیٹی دے رہی ہو وہاں اگر دوسری بھی ٹھکانے لگ جائے تو اور کیا چاہیے تمہیں۔"

اور محمودہ ان کی بات پر مسکرا دیں۔ جبکہ جازمہ کا دل ایسے بے ہنگم انداز سے دھڑکا گویا کانوں میں گھس آیا ہو۔

"مشورہ تو آپ کا بہت اچھا ہے۔ لیکن ایسی باتیں بیٹی والے خود سے کہتے تو اچھے نہیں لگتے۔ یوں بھی جازمہ ابھی پڑھ رہی ہے ہمیں اس کی کوئی جلدی نہیں۔ اللہ رملہ کو اپنے گھر بار کا کرے۔ وہ سکھی رہے۔ پھر اس کے لیے سوچیں گے۔"

"کہیں یہ نا ہو کہ تم بیٹی کی پڑھائی کی فکر میں رہو اور ایسا اچھا رشتہ خاندان میں سے کوئی اور لے اڑے۔ ارے ایسے بی بے لڑکے تو لوگ اچکنے کے انتظار میں بیٹھے ہیں مانو۔ اچھا چلو تم چھوڑو میں خود ہی ہاجرہ کے کان میں بات ڈال دوں گی۔" انہوں نے ارادہ باندھا۔

"اللہ مالک ہے۔" محمودہ نے بات آئی گئی کر دی۔ لیکن اس کے دل پر تو نقش ہو گئی تھی جیسے۔ بارش کے اس پہلے قطرے کی طرح جو سمندر کنارے پڑے سیپ کے منہ میں چلا جائے تو موتی بن جاتا ہے بس ایسے ہی۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ نصابی کتابیں، پیاری سہیلیاں، دلچسپ ڈرامے، جدید فیشن یہ سب باتیں اسے مصروف رکھتی تھیں۔ فراغت کے لمحے تو مشکل ہی سے ملتے تھے۔ مگر اب صرف ایک خیال سب پر حاوی ہونے لگا تھا۔ جب چاہتا سارے لمحے چرا لیتا۔

"اس کا مطلب ہے کہ رملہ بھابھی بھی سب روایتی کھانے بنانا جانتی ہوں گی۔" شجاع کی پرجوش آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

رملہ اور روایتی کھانے ......؟ وہ روایتی تو کیا غیر روایتی کھانے تک بنانے کی روادار نا رہی تھی کبھی۔ کچن تو ہمیشہ ہی "نو گو ایریا" رہا تھا اس کے لیے۔ وہ ایسی لاڈلی اور نخریلی پلی تھی کہ بس آج کل کی نانوے فیصد لڑکیوں کی طرح جسے اپنے کمپلیکشن کی ہی فکر پڑی رہتی ہے۔ جو سن بلاک لگائے بغیر کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ ہاں اب تک مارکیٹ میں کوئی چولہا بلاک متعارف نہیں ہوا تھا۔ وگرنہ گمان غالب ہے کہ وہی لگا کر کچن کا رخ کر لیا کرتیں۔ لیکن واہ حسرت......

"ہاں بالکل...... محمودہ ماشاءاللہ سے بڑی سلیقہ مند خاتون ہیں۔ ضرور بیٹی کو بھی سب سکھایا ہوگا۔ اور بھئی میں تو خود اس بات کی قائل ہوں کہ گھر کے چاہے باقی سارے کام ملازموں سے کروا لو لیکن کھانا عورت اپنے ہاتھ سے بنائے۔ مجھے تو ایسی عادت پڑی ہوئی ہے کہ صبح کے ناشتے سے لے کر رات کا کھانا تک خود بناتی ہوں۔ یہاں تو خیر میڈ ہے ہاتھ بٹانے کے لیے لیکن وہاں کینیڈا میں سب خود ہی کرتی تھی۔ ہاں اکثر ویک اینڈ پر یہ بچے میرا پورا ساتھ دیتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زوار اور شجاع دونوں ٹھیک ٹھاک کوکنگ کر لیتے ہیں۔" ہاجرہ بڑے مزے سے بتا رہی تھیں۔ جازمہ کے حلق میں چائے

کا گھونٹ پھنس گیا۔

"لو جی پھر یہ تو بڑی اچھی بات ہو گئی۔ یعنی ہماری بٹی کو تو پھر کافی آرام رہے گا۔" زرینہ مامی نے ٹھٹھہ لگایا۔ رملہ کا "سگھڑاپا" ان سے ڈھکا چھپا تو نہیں تھا۔ ہاجرہ مسکرا دیں۔ جبکہ وہ جھٹ بولا۔

"جب ایک سلیقہ مند عورت گھر آجائے تو پھر مرد کچن میں کھڑا اچھا نہیں لگتا۔ اور زوار بھائی تو یوں بھی وہاں کی سردی میں کچن میں جانے سے الرجک تھے۔ تو یہاں کی گرمی میں تو کم از کم بھی دس گز کا فاصلہ رکھ کر گزریں گے۔"

"بی بی جی۔ ناشتا لگا دیا ہے۔" وہ شاید ابھی اور ان کے دل دہلاتا کہ ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔

"آجائیں جی سب۔ ناشتا کرتے ہیں" ہاجرہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ سب کریں ناشتا۔ ہم تو کر کے آئے ہیں۔" زرینہ مامی کہہ رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔ تھوڑا سا ہمارے ساتھ بھی کرلیں۔" ہاجرہ کے اصرار پر ان سب کو اٹھنا پڑا۔ ٹیبل پر مامی ایک ایک ڈش بطور خاص شجاع کو پیش کرتی رہیں۔ جیسے ٹھیکیدار عمدہ اور ناقص مال ملا کر تعمیرات کرتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی وہ سچ جھوٹ ملا کر تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔ جازمہ کو ہنسی آنے لگی۔ لگتا تھا وہ اپنے نیک ارادے کو عملی جامہ پہنا کر ہی رہیں گی۔

"اوہ...... مائی سوئٹ مامی۔" جازمہ نے تصور میں ان کی بلائیں لے ڈالیں۔

☆☆☆

"اف۔۔ بالشت بھر کا بچہ۔ اور نری آفت۔ تگنی کا ناچ نچا دیا اس نے مجھے۔ آپ نے کیا اسے پٹی پڑھا کر بھیجا تھا کہ ماموں کی ناک میں دھونی دے کر رکھنا۔ میں بازار تو سودا سلف لینے گیا تھا۔ لیکن میرا والٹ تو اس نے خالی کروا دیا۔ ہر چیز پر ہاتھ۔ اور اگر نا کروں تو وہ شور کہ الاماں۔ میں تو ڈر کے شہزادہ حضور کو کسی چیز سے انکار ہی نہیں کر سکا۔ آج کل حالات اتنے خراب ہیں اگر اس کے واویلے پر کڈنیپر سمجھ کر دھر لیا جاتا تو...... قسم سے جان نکالے رکھی اس نے میری۔ میری توبہ اگر آئندہ اسے ساتھ لے جانے کی آفر بھی کر دوں تو۔ میں تو اسے ابھی تک وہی ننھا منا سا گڈا ہی سمجھ رہا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی پورا افلاطون بن گیا ہے یہ۔" کپلو سا احد تازہ شاپنگ ماں کے آگے ڈھیر کیے اک اک چیز دکھا کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ اسے گھورتے بولے چلا گیا۔

"اگر پہلی بار یہ تمہارے ساتھ چلا گیا اور تم نے اس پر کچھ خرچ کر لیا تو کوئی احسان نہیں کیا۔ ماشاء اللہ اب اپنا کمانے لگے ہو۔ اور تمہاری اس اچھی جاب کے پیچھے امی، ابا کی دعاؤں کے ساتھ میری دعائیں بھی شامل ہیں۔ اس لیے تمہاری کمائی پر پورا پورا حق ہے ہمارا۔ دیکھ رہی ہیں امی اپنے لاڈلے کو۔ کیسی باتیں کر رہا ہے یہ۔" غزالہ نے خوب کلاس لی بلکہ ماں کے آگے بھی شکوہ کناں ہوئی جنہوں نے مسکراہٹ دباتے اسے تادیبی نگاہ سے گھورا۔

"بالکل جی بالکل۔ آپ ہی کی دعائیں ہیں اور آپ کے سب حق۔ اب نیکسٹ سیلری ملتے ہی امی کو دینے کے بجائے آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو کر ان شہزادہ حضور کے حوالے کر دوں گا اب خوش۔"

"ہک ہاہ...... ایسی قسمت تو شہزادے کی ماں کی بھی نہیں ہے۔ کبھی اس کے باپ نے سیلری لا کر اس کی ماں کے ہاتھ پر نہیں رکھی۔" وہ یک لخت ہی سنجیدہ ہوئی۔ شیریں نے اب کے بٹی کو گھورا۔

"بہت بری بات ہے۔ کیوں ایسے ناشکرے کلمات بول رہی ہو۔ ہر نعمت تو وہ اللہ کا بندہ لا کر دیتا ہے تمہیں۔ مہینے بھر دفتر میں سر کھپا کر پھر بازاروں میں بھاؤ تاؤ کی جگل خواری بھی خود کاٹتا ہے۔ گھر بیٹھے تمہیں سہولت کے سب سامان مہیا کرتا

ہے اور کیا کرے بے چارہ۔ ارے صرف سیلری لے کر گلے میں ہار ڈالنا ہوتا ہے تم نے۔ پتا نہیں یہ آج کل کی لڑکیاں سیر کیوں نہیں ہوتیں۔ زمانہ قدیم کی شہزادیوں سے زیادہ ٹھاٹ باٹ دے رکھے ہیں اللہ نے۔ مگر پھر بھی جب بات کرو افسردہ یوں ہوں گی جیسے کبھی اچھی چیز کا منہ نہیں دیکھا۔ اللہ ہی ہدایت دے تم لوگوں کو۔"

"اف۔۔۔ آپ کے سامنے تو بندہ تھوڑی سی برائی بھی نہیں کر سکتا۔" غزالہ منہ بنا رہی تھی۔

"ہاں تو خدا نا خواستہ کیوں کرو تھوڑی سی بھی برائی۔ اور پھر اس شخص کی جس کے گھر میں رہتی ہو۔ جس کے خون پسینے کی کمائی کھاتی ہو۔ ہم نے سدا مثال یہ سنی کہ جس کا کھاؤ اس کے گن گاؤ۔ ہماری نانی، دادی کے یہی اصول تھے اور ہم نے بھی انہی پر عمل کرتے عمر گزار دی۔ لیکن بھئی آج کی لڑکیوں کے تو رواج ہی الٹے ہیں۔ جس کا کھاتی ہیں اسی کی تھالی میں چھید کرتی ہیں۔ اور وہ اس طرح کرتی یکسر یہ بھول جاتی ہیں کہ وہ شوہر کی بے عزتی کم اور اپنی زیادہ کر رہی ہیں۔ احساس ہی نہیں ہے کہ......"

"اچھا اب آپ کیا بنا رہی ہیں کھانے میں......؟ فرحان بھائی بھی آئیں گے تو کچھ اچھا سا بنائیے گا۔ اور یہ سب سودا وغیرہ تو سمیٹ لیں۔"

شیریں تو اس موضوع پر بلا تکان ایک گھنٹہ اور بول سکتی تھیں۔ لیکن بہن کی مزید گت بنتے دیکھنا خیام کی برداشت سے باہر تھا۔ غزالہ نے بے اختیار متشکرانہ نظروں سے ماں جائے کو دیکھا۔ شیریں ٹیبل پر پڑے شاپرز میں جھانکنے لگیں۔ ننھا احد ہر طرف سے بے نیاز کھلونوں میں مگن تھا۔ وہ سیل فون نکال کر اس کی پکس بنانے لگا۔ اور شیریں کو یاد آیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ہم رملہ کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ تم نے بارات والے دن فوٹو بنائے تھے نا، وہ بہن کو دکھا دو، اسے بڑا شوق ہو رہا ہے رملہ کو دلہن بنے دیکھنے کا۔"

"ہاں۔ خیام دکھانا وہ پکس۔ مجھے تو دکھ ہی رہ گیا اس کی شادی میں شرکت نا کرنے کا۔ تائی اماں کو بھی انہی دنوں گیس ٹربل ہونا تھا۔"

"آپ رملہ سے ہی مل لیں۔ اس کے پاس تو ہر فنکشن کی پکس ہوں گی۔ پوچھ لیں خالہ سے اگر وہ ادھر آئی ہوئی ہے تو میں لے چلتا ہوں۔ ہو آتے ہیں وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے۔" خیام کے پردئے خیال پر کئی رنگ ایک ساتھ اترے تھے۔ لبوں پر گویا تمنا دل مچل اٹھی۔ پہلے تو مہینوں بعد آنکھوں کو اس کی اک جھلک نصیب ہوتی تھی اور وہ اس پر ہی قانع رہتا مگر جب سے رملہ کی شادی پر اسے پریوں کے روپ میں دیکھا تھا اندر دبی چنگاری بھڑک کر شعلہ بن چکی تھی۔ وہ اک دیرینہ آرزو جو کسی لمحے میں تارا بن کر آنکھ میں اتری تھی اب پورا چاند بن کر صحن دل کو اجال رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہی کہہ گیا اسی بہانے رخ یار کا دیدار کر لے گا۔

"ارے وہ تو میں اس کے سسرال بھی جا سکتی ہوں وہ لوگ کون سا پرائے ہیں۔ بس فرحان ہی وقت نہیں نکال پا رہے، نہیں تو میں تو اب تک ہو بھی آتی۔ اور پھر یوں بھی خالی ہاتھ ملنے تھوڑی چلی جاؤں گی اچھا سا گفٹ لے جانا تو بنتا ہے۔ ابھی تو مجھے تم صرف وہی دو چار پکس دکھا دو۔" غزالہ نے انجانے میں اس کی خواہش پر پانی پھیرا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اور اس شش و پنج میں کہ کیا کرے اور کیا نا کرے کیا کوئی بہانا بنا کر ٹال دے۔ اس روز دولہا دلہن، امی اور خالہ کی پکس بناتے بناتے اس کے سیل فون کی فلیش لائٹ کئی بار اس دلکش چہرے کو فوکس کر گئی تھی ایک بار تو بالکل اچانک اگلی بار کچھ جھجکتے ہوئے اور سہہ بار پورے ارادے کے ساتھ۔

گو کہ یہ ایک انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن کیا ہے کہ جس جذبے کے

شکنجے میں وہ پھنس چکا تھا وہ کم بخت تو ہے ہی ایسا ادب و آداب سے عاری کہ کسی بھی اصول کی دھجیاں اڑانے میں اس سے بڑھ کر زمانے میں اور کوئی نہیں پایا گیا۔

"افوہ اب دکھا بھی دو کس سوچ میں پڑ گئے۔" غزالہ نے مارے بے چینی کے فون جھپٹ لیا۔ اس نے بوکھلا کر واپس کھینچا۔

"آئے ہائے...... کیا بچے بن گئے ہو تم لوگ۔ آرام سے دکھا دو خیام تم بھی اسے۔ اور غزالہ یہ تصویریں دیکھ کر پھر کچن میں آؤ اور مشورہ دو کیا بنانا ہے۔"

"جی امی ابھی آئی۔ لاؤ اب دکھاؤ بھی۔" ماں کو تسلی دے کر غزالہ نے اس کے شانے پر چپت لگائی۔ ناچار اسے گیلری اوپن کرنا پڑی۔

"واؤ امیزنگ...... خوب صورت...... کتنی حسین لگ رہی ہے رملہ۔ ڈریس کتنا زبردست ہے۔ کلر کامبینیشن بھی کمال۔ زوار بھی گڈ لکنگ ہے۔ دونوں کی جوڑی خوب بچ رہی ہے...... اوہ! امی اور خالہ کتنی سوئٹ لگ رہی ہیں ایک ساتھ۔" غزالہ دیکھتے رواں تبصرہ بھی کر رہی تھی۔ "ارے یہ جازمہ ہے کتنی کیوٹ لگ رہی ہے بالکل پنک باربی ڈول۔ میں تو پہچانی ہی نہیں۔ کتنے ٹائم بعد دیکھا ہے نا۔ اور یہ......"

اپنے ہی دھیان میں کھڑی ہوئی لاپروا سی لڑکی...... اور یہ......

من چاہا نیگ ملنے پر ہنستی ہوئی پیاری سی پری...... اور یہ......

دوپٹے میں الجھا کنگن چھڑاتی ہوئی جھنجلائی ہوئی سی...... اور یہ...... اور پھر اس کے بعد اور......

غزالہ نے سر اٹھایا۔ آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھا...... وہ نظر چرا گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے چند لمحے دیکھتی رہی۔ رملہ کی فقط دو تصویریں اور جازمہ کی بے شمار۔ شاید اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی نظروں سے گھبرا کر خیام نے سیل لینا چاہا جو غزالہ نے اس کی پہنچ سے دور کر دیا۔

"کسی لڑکی کی یوں بے دھیانی میں پکس لینا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"وہ لڑکی کوئی پرائی تو نہیں ہے کزن ہے ہماری۔" جھٹ صفائی پیش کی۔ یعنی ڈھٹائی کا عملی مظاہرہ۔ غزالہ کی آنکھوں میں کچھ اور خشونت اتری۔

"بے شک کزن ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک انتہائی نازیبا حرکت ہے۔ اگر کوئی دیکھ لے تو کیا خیال کرے۔ میں ڈیلیٹ کر رہی ہوں اس کی سب پکس۔"

اور وہ ہاتھ بڑھانے کی چاہ میں ہی رہ گیا۔ غزالہ نے اس کے رنگ اڑے چہرے پر اگلی نظر بھی نا ڈالی۔ وہ سیل ٹیبل پر رکھے جا چکی تھی۔ وہ مہر بہ لب یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی بہت قیمتی متاع چھین کر لے گئے ہو۔ آخری پونجی بھی لٹ گئی۔ اور ایسا ہی تو تھا۔ وہ تو دن بھر میں کئی بار حکیم کی تجویز کردہ معجون کی طرح گیلری کی ڈبیا کھول کر دید کی ایک ایک چٹکی پھانک لیتا تھا۔ تو روح تک پر بہار رہتی تھی۔ دل سرشاریت سے لبالب بھرا رہتا تھا۔ اور اب......؟ جانے کتنے پل بیتے وہ مٹی کا مادھو بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ غزالہ واپس آئی۔ بغور اس کے دھواں دھواں چہرے کا جائزہ لیتے میز پر عین اس جگہ ٹرے رکھی جہاں اس کی نظریں گڑی تھیں۔

"چائے...... امی آپ بھی آجائیں پھر کرتے ہیں باقی کام۔" اسے متوجہ کرتے ماں کو بھی آواز دی۔

"آرہی ہوں۔ تم یہ چاول بھی بیٹھے بیٹھے صاف کر دو۔ میں کسٹرڈ کے لیے ہوائیاں کاٹ لیتی ہوں۔" وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھیں۔ غزالہ نے پرات پکڑ لی۔

"اف۔۔ امی کتنا کام کرنا پڑتا ہے آپ کو۔ اکیلے سارا گھر سنبھالتی ہیں۔ پھر جب کوئی آجاتا ہے تو کام اور بڑھ جاتا ہے۔ کتنا تھک جاتی ہوں گی نا آپ

؟اب تو آپ کا شہزادہ ماشاء اللہ سے برسرروزگار ہوگیا ہے آپ اس کی شادی کا کیوں نہیں سوچتیں۔ آپ کا بھی حق ہے کہ اب آپ آرام کریں۔"

"ارے تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ اب واقعی میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں رہا ہے۔ بہت جلد تھک جاتی ہوں اور خیام کی شادی کا ارمان تو کب سے دل میں کروٹیں لے رہا ہے۔ اللہ سے دعا تھی وہ میرے بچے کا رزق کھول دے۔ شکر ہے اس نے میری سن لی۔ میں نے تو اپنے ان تین کمروں میں بھی اچھے سے وقت گزار لیا لیکن آج کل کی لڑکیوں کا پہلا خواب ہی خوب صورت گھر ہوتا ہے۔ اس لیے اب خواہش ہے کہ اوپری منزل کو جدید انداز سے تعمیر کرواؤں۔ اسی نیت سے کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ جیسے ہی ہاتھ آتی ہے کام شروع کروادوں گی۔ میں چاہتی ہوں میری بہو کو کسی بھی قسم کی کمی نا ہو۔ وہ آئے اور خوش رہے بس۔" شیریں کہہ رہی تھیں۔

"واہ بھئی ...... آپ کی اس بات سے تو ثابت ہوا کہ آپ کتنی اچھی ساس ثابت ہوں گی۔ لیکن یہ سوچنا تو ابھی باقی ہے کہ کس کی؟ آخر کون خوش نصیب ہوگی وہ۔ کیا آپ نے ابھی تک کوئی لڑکی بھی دیکھی ہے یا نہیں؟" چاولوں میں ہاتھ مارتے وہ پوچھ رہی تھی۔

"میری نظر میں تو ہے اک پیاری سی لڑکی۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ میرے بیٹے کی خوشیوں کا ہے تو میں چاہوں گی پہلے یہ اپنی پسند بتادے اگر کوئی ہے تو!" آج موضوع چھڑ گیا تھا تو شیریں نے کھلے دل سے بیٹے کو آفر دی۔

"اور اگر میری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو کیا میں بتا سکتی ہوں؟" غزالہ نے کن انکھیوں سے بھائی کی اتری صورت کا جائزہ لیتے ہاتھ کھڑا کیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا ابھی تھوڑی دیر قبل وہ جو کر کے گئی ہے۔ اس کے اثرات کافی دردانگیز ہیں۔ وہ تو سمجھی تھی بات ابھی نکلی ہے لیکن یہاں تو صاف دکھ رہا تھا کہ وہ تو بہت دور تک جا چکی ہے۔ معاملہ یقیناً گھمبیر تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ چھوٹا بھائی ہے تمہارا حق رکھتی ہو تم۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو تم بتا دو۔ ہم پہلے اسے دیکھ لیں گے۔" شیریں نے بیٹی کا مان بڑھایا۔ خیام نے ٹپٹا کر نظر اٹھائی۔ غزالہ کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ اللہ جانے وہ اگلے لمحوں میں اپنی پٹاری سے کیا نکالنے والی تھی۔ کیسے برے موڈ سے اس نے جازمہ کی پکس ڈیلیٹ کی تھیں۔ اور اب یہ ذکر چھیڑ کر وہ ضرور اپنی کسی نند شند کا تذکرہ کرنے والی تھی۔ خیام اس لمحے کو پچھتایا جب سیل اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔ یہ بہنیں آخر ایسی تنگ دل کیوں ہوتی ہیں۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔ ادھر غزالہ پرات پرے کھسکاتی دونوں پاؤں اوپر سمیٹے خوب ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔

کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ پہلے ماں کے پر تجسس چہرے پر نگاہ کی پھر بھائی کی اتری صورت کو دیکھا۔ (ہاہ میرا سوہنا بھائی) اسے خیام کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ اور خوب ہنسی بھی۔ لیکن یوں ستانے کا بھی اپنا اک مزا ہے۔ جی تو چاہ رہا تھا ابھی اور لطف اٹھائے لیکن خود سے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سو بول پڑی۔

"یوں تو بہت پیاری پیاری لڑکیاں ہیں میری نظر میں۔ لیکن ابھی ایک لڑکی کا نام ذہن میں آرہا ہے۔ لڑکی خوب صورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ مزاج بھی اچھا ہے۔ سلیقہ مند بھی ہے۔ اس گھر کے لیے بالکل پرفیکٹ رہے گی۔" وہ خوبیاں گنوا رہی تھی۔

" کون ہے؟ یہ تو بتا دو پہلے۔" خیام کو تو بے چینی تھی ہی۔ شیریں کو بھی جاننے کی جلدی تھی۔

"جازمہ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ دونوں کا؟"

"ارے واہ! تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔" جہاں شیریں مسرت آمیز لہجے میں بولیں وہیں وہ متحیر رہ گیا۔ (اففف یہ بہنیں بھی نا۔۔۔ آخر اتنی کشادہ دل کیوں ہوتی ہیں)۔

"سچ کہوں تم نے میری خواہش کو لفظوں میں بیان کر دیا۔ بڑا دیرینہ ارمان ہے میرا تو۔ میں تو کئی بار محمودہ کے سامنے بات کرتے کرتے رک گئی۔ صرف اس خیال سے کہ پہلے میرا خیام کسی قابل ہو جائے پھر ذکر نکالوں گی۔ بہت سادہ مزاج اور پیاری بچی ہے جازمہ۔ مجھے تو بے حد پسند ہے۔ کیوں خیام تم کیا کہتے ہو۔" یہ نام تو ٹھاہ کر کے ان کے دل پہ لگا تھا۔ فوراً بیٹے سے صلاح چاہی۔ جس کا چند لمحے قبل ستا ہوا چہرہ اب سورج کی طرح جگمگا رہا تھا۔ لبوں پر پھوٹتی مسکراہٹ بمشکل چھپاتے بولا تو لہجے سے سرشاریت چھلکی پڑ رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں امی۔ جیسا آپ بہتر سمجھیں۔"

"اوئے ہوئے صدقے جاؤں اپنے ویر کے...... اللہ نظر بد سے بچائے اس خالص مشرقی لڑکے کو۔ کیسا تابعدار بچہ ہے۔" غزالہ ہنس ہنس کے دہری ہو گئی۔

☆☆☆

وہ ساری دوپہر سوتی رہی تھی۔ لیکن لگتا تھا نیند ابھی بھی آنکھوں میں بھری ہے۔ پلکیں ایسے بھاری تھیں گویا منوں وزن دھرا ہو۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ محمودہ نے زبردستی جگا کر کمرے سے باہر نکالا۔ بڑا سا منہ کھول کر جماہیاں لیتی وہ لاؤنج کے صوفے پر آ کر ڈھیر ہو گئی۔ کتابوں میں سر دیے بیٹھی جازمہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"بس کریں آپی۔ اب جاگ بھی جائیں۔ میں تو بات کرنے کو ترس گئی۔ یونی سے آئے بھی مجھے کئی گھنٹے ہو گئے۔ کوئی دس بار کمرے میں جھانک چکی ہوں۔" نوٹ بک پر تیزی سے قلم چلاتے وہ کہہ رہی تھی۔

"لو اب تم یہاں آ کر لیٹ گئی ہو۔ اٹھ جاؤ رملہ گڑیا۔ سستی اتارو میرے بچے۔ شام ہونے کو ہے کوئی خاندان میں سے ہی ملنے آ سکتا ہے۔ تمہارے بابا بھی آنے والے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے زوار ہی آ جائے۔ کیا کہے گا تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر۔" محمودہ ادھر ہی چلی آئی تھیں۔

"اف...... تو بہ ہے مما...... آپ بھی پیچھے ہی پڑ گئی ہیں میرے۔ اچھی بھلی سو رہی تھی کیا ضروری ہے میرا جاگنا۔ کم از کم یہاں تو سکون لینے دیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے میری تو نیند ہی پوری نہیں ہو رہی۔ اچھی مصیبت میں پڑ گئی ہوں میں تو......" وہ جھنجلائی سی اٹھ بیٹھی۔ گلابی آنکھوں میں خفگی بھری تھی۔ محمودہ نے بوکھلا کر پہلے جازمہ کو دیکھا پھر گھور کر اسے۔

"خدانا خواستہ...... مصیبت کیوں...... اب تو سمجھدار ہو جاؤ بیٹا۔ یہ بنا سوچے سمجھے بولنے کی عادت چھوڑ دو۔ شکر ادا کرو اللہ کا۔۔ اچھے لوگوں سے واسطہ ڈالا ہے اس نے تمہارا۔"

"ہونہہ اچھے لوگ......" اس نے بے زاری سے ماں کی بات قطع کی۔

پندرہ دن ہو گئے مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہتے۔ کتنے اچھے ہیں۔ پتا ہے مجھے۔ کہیں سے نہیں لگتا وہ زندگی کے اتنے سال دنیا کے ترقی یافتہ حصے میں گزار کر آئے ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے اتنا عرصہ انہوں نے کاکول کے آرمی ٹریننگ سینٹر میں چھپ کے گزارے ہیں۔ صبح پانچ بجے پورے کا پورا گھر بے دار ہو جاتا ہے۔ پھر گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ وہ سب یوں چلتے ہیں۔ کہ اگر ایک لمحہ بھی ادھر سے ادھر ہوا تو کہیں سے دو نالی بندوق چل جائے گی۔ مجھے تو وہ سب کے سب انسان نہیں بلکہ روبوٹ لگتے

ہیں۔" وہ حد درجہ اکتائی ہوئی تھی۔

" جبکہ میرے خیال میں تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ وقت کی قدر کرنا اور وقت کے ساتھ ساتھ چلنا تو ہمیں ہمارا دین بھی سکھاتا ہے۔ زندگی کے وہ اصول و قوائد جو ہم سب کو لازمی اپنانے چاہئیں اور اس پر وہ فیملی ڈٹ کر عمل کر رہی ہے تو ان کی یہ عادات تو لائق تحسین ہیں۔ اس میں تو ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ زندگی آسان اور پرسکون رہنے کے علاوہ صحت مند بھی رہتی ہے۔ آپ کو تو مطمئن ہونا چاہیے اس بات پر کجا کہ پریشان؟"

جازمہ بے اختیار بولی تھی۔ رملہ نے تیکھی سی ناک چڑھائی۔

جس کا واسطہ پڑتا ہے درد کی اصل نوعیت بھی وہی جانتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ ان لوگوں کی روٹین کتنی فائدہ مند ہے۔ میں تو جیسے کسی قید میں ڈال دی گئی ہوں۔ آخر میرے بھی کچھ خواب تھے۔ کچھ پلانز تھے۔ سوچا تھا شادی ہوگی تو ایسا ہوگا۔ یا ایسے کروں گی۔ مگر ویسا کچھ بھی نہیں ہو پارہا۔ ایک تو وہ لوگ زمانے بھر کے پنکچوئیل دوسرے بلا کے سوشل۔ وقت بے وقت مہمان آئے رہتے ہیں۔ اور کمال یہ کہ وہ لوگ تو جیسے گڈ مینرز میں بھی ڈگری ہولڈر ہیں۔ سب کو یوں پروٹوکول دیں گے گویا ان سے بڑھ کر دوجا کوئی عزیز نہیں۔ اور میں تو زوار کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی ہوں۔ میں نے جیسا انجن کیا تھا وہ بالکل ویسے نہیں۔ جب بھی گھر میں کوئی آجائے تو وہ مجھے فوراً کمرے سے باہر یوں بھیج دیتے ہیں جیسے اب میں ان کے لیے اچھوت ہوگئی ہوں۔ پھر اس پر یہ سختی کہ سب سے ملوں اور چائے بھی بنا کر پیش کروں۔" وہ سخت کبیدہ خاطر تھی۔ محمودہ کو اس کی بات سن کر جھٹکا لگا۔ یہاں ہل کر پانی نا پینے والی ان کی لاڈو رانی وہاں ہر آئے گئے کو چائے بنا بنا کر پیش کر رہی تھی۔ انہیں تو تصور ہی لرزا گیا۔ لیکن مصلحتاً چپ رہیں۔ ان کی کسی بھی طرح کی تائید یا تاویل کیا گل کھلا سکتی ہے خوب اندازہ تھا انہیں۔ جازمہ مزید کہہ رہی تھی۔

" لیکن آپی اگر نیگیٹو (منفی) کے بجائے آپ پوزیٹو وے (مثبت انداز) میں دیکھیں تو ایسا بھی ممکن ہے کہ زوار بھائی سب ریلیٹوز کو یہ بتانا چاہ رہے ہوں کہ وہ ایک اچھی، سلیقہ شعار، سگھڑ لڑکی کو بیاہ کر لائے ہیں۔ اس طرح آپ ہی کی عزت بنانا چاہ رہے ہوں گے وہ۔"

" بس...... بس...... تم زیادہ میری دادی اماں مت بنو۔ میری تکلیف سمجھنے کی بجائے ان لوگوں کی حمایت کرے جارہی ہو مسلسل۔ لوگ تو دو دو سال تک بہوؤں کو کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ اور میری سسرال ہے۔ ہونہہ......! سسرال نا ہوا نرا جنجال ہو گیا۔ زوار لینے آرہے ہیں آج مجھے۔ لیکن میرا قطعاً دل نہیں چاہ رہا وہاں جانے کو۔ میں بتا رہی ہوں امی آپ انہیں منع کردیں۔ کچھ بھی کہہ کر ٹال دیں پلیز...... "وہ بے زاری پھر سے لیٹ گئی۔

محمودہ کو اس کی سب باتوں میں ایک کی سمجھ آئی۔

" ہائیں...... زوار آرہا ہے تمہیں لینے...... اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ ارے دیکھو کیسی باؤلی لڑکی ہے۔ کتنا کم وقت رہ گیا ہے رات کے کھانے میں۔

اب کچھ خاص اہتمام نا ہوا تو کس قدر برا لگے گا۔ تم بھی حد کرتی ہو رملہ ادھر ادھر کی باتیں لیے بیٹھی ہو۔ اس کے آنے کا تو بتاؤ کم از کم۔"

" افوہ امی ایک تو آپ بھی نا۔ ایک دم گھبرا جاتی ہیں۔ آپ کو قطعاً بھی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ زوار کا پلان ہے پہلے ہم ڈنر پر جائیں گے پھر گھر۔ اور میرا پلان ہے میں ان کے ساتھ ڈنر پر چلی جاؤں گی اور وہاں سے واپس ادھر۔ میں نے تو انہیں فون پر ہی کہہ دیا تھا لیکن وہ اپنی ہی

بات پر اڑے تھے۔ عجیب لیچڑ انسان ہیں چاہتے ہیں
بس میں ہی ان کی ہر بات مانوں۔ ہونہہ...... جیسے
خرید لیا ہے مجھے۔ بس وہ آئیں گے تو آپ اور بابا
سمجھا دیجیے گا انہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کی بات نہیں
ٹالیں گے۔ اور ہاں کچھ دیر تک کوئی ڈسٹرب نا کرے
مجھے۔" اس نے کشن اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔ محمودہ گم صم
سی کشن کے ڈیزائن کو گھور رہی تھیں۔

اُفف...... ان کی یہ نازوں پلی۔ جس کا بچپنا
ابھی تک نہیں گیا تھا۔ اس کے یہ رونے کوئی پہلی بار
کے نہیں تھے وہ مزاج ہی ایسا لے کر آئی تھی۔ زندگی
میں کبھی کسی چیز سے مطمئن ہو کر نا دیا تھا۔ ہمیشہ اپنی
کوشش سے بڑھ کر اچھا پہنایا، کھلایا، برتایا۔ مگر وہ
ایسی مضطرب دبے چین کہیں نا کہیں سے خامی ڈھونڈ
ہی لاتی۔ نادیدہ نقص بیان کر کے خود تو تنگ ہوتی ہی
اگلوں کو بھی دق کرتی۔ وہ سب ہی کو پیاری تھی سو اس
کے ناقابل برداشت رویے بھی ہنس کر ٹال دیے
جاتے رہے۔ خیر وہ سب باتیں اس کے بچپنے کی تھیں
جو لاڈ پیار کی آڑ میں چھپتی چلی گئیں مگر اب وہ بچی
تو ہرگز نہیں رہی تھی۔ اب اس کی کسی بھی بات کو ضد یا
نخرے کے لبادے میں چھپانا ٹھیک نہیں تھا۔ یہ اس
کے ہی حق میں اچھا نا ہوگا۔ محمودہ یقیناً سخت متفکر ہو
چکی تھیں۔ جازمہ کی نظریں ماں کے سفید پڑتے
چہرے کی کیفیت بھانپ گئیں۔ اس نے قلم نوٹ بک
کے درمیان رکھ کر اسے بند کیا۔

" مما آج پکانا کیا ہے۔ آپ کو تو فکر ہی نہیں
ہے۔ ابھی بابا آجائیں گے تو بھوک بھوک کا شور مچا
دیں گے۔ چلیں آئیں کچن میں چلتے ہیں۔" محمودہ
نے چونک کر سر اٹھایا وہ کتابیں سمیٹ رہی تھی۔

"ہاں میں جا رہی ہوں کچن میں تم اپنے ٹیسٹ
کی تیاری کرو۔ میں صفیہ کو ساتھ لگا کر بنا لوں گی
کھانا۔"

" آپ کی دعا سے ٹیسٹ کی تیاری مکمل ہے۔
بس اسائمنٹ کے کچھ چیپٹرز رہ گئے ہیں۔ وہ میں رات
تک کر لوں گی۔ ابھی تو موڈ ہو رہا ہے کچھ کھانے کا وہ
بھی اپنے ہاتھ کا بنا ہوا۔ ساتھ ہی آپ کی ہیلپ بھی
ہو جائے گی۔ چلیں اٹھیں نا۔" اسے کسی بھی طور ماں
کو ان پر فکر لمحات سے نکالنا تھا۔ جتنا رملہ انہیں ستاتی
رہتی وہ اتنا ہی ان کا احساس کیا کرتی۔ جب بھی رملہ
ہرٹ کرتی وہ اپنے محبت اور معصومیت بھرے رویے
سے دھیان بٹانے کی سعی کرتی۔ گو کہ محمودہ اکثر رملہ پر
آیا غصہ بھی اس پر نکال دیا کرتیں۔ لیکن وہ اپنی
فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ ماں کے چہرے پر
چھائی اداسی کبھی اچھی نا لگی تھی۔ اب بھی رہا نہیں گیا وہ
انہیں کچن میں لے ہی آئی۔ لیکن محمودہ نے جلد ہی اسے چلتا
کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ" تمہارے بابا اور زوار آتے ہی
ہوں گے جا کر لاؤنج سے چیزیں سمیٹو۔" اور وہ آ گئی تھی
چائے کے فل سائز مگ سمیت۔ رملہ واپس کمرے میں جا
چکی تھی۔ وہ اسی صوفے میں دھنس کر مزے سے چائے پینے
لگی۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے ایل ای ڈی کی اسکرین
پر مناظر بھی بدلے جا رہے تھے۔ بیل کی چنگھاڑ بتا رہی
تھی۔ گیٹ پر کوئی آیا ہے۔ "زوار بھائی ہوں گے تو انہیں
ڈرائنگ روم میں بٹھا دینا۔" اس نے جاتی ہوئی صفیہ کو
تاکید کی تھی۔ لیکن چند لمحوں بعد فضا میں پھیلتی قیمتی مسحور کن
مہک نے بتایا صفیہ بے وقوف آنے والے کو ادھر ہی لا رہی
ہے۔ اس نے نظر گھمائی تھی اور ہونٹوں سے لگا مگ ہٹانا
بھول گئی۔ وہ نا بابا جان تھے۔ نا زوار بھائی بلکہ قطعاً غیر
متوقع مہمان شجاع عباس تھا۔ نکھرا ستھرا پروقار سا، پرتمکنت
چال چلتا سامنے سے چلا آرہا تھا۔ اس کا اچھی بھلی
رفتار سے دھڑکتا دل خواہ مخواہ ہی بے ربط ہو گیا۔ بوکھلا کر
کھڑی ہوئی۔ چائے چھلک گئی۔ صفیہ بے چاری گھبرا
کر وضاحت دینے لگی۔

''میں تو جی صاحب کو ڈرائنگ روم میں
بٹھانے لگی تھی پر وہ خفا ہونے لگے کہ میں مہمان نہیں
میں سب کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھوں گا۔ وہ خود ہی

ادھر آگئے۔" اور مہمان نے پوری طرح اس کی سٹپٹاہٹ ملاحظہ کی تھی۔ جو صوفے کی بیک پر ڈالا دوپٹا جھپٹ کر اوڑھتے اسی سے قمیص پر گری چائے صاف کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ہونق تھا جس سے پھر چائے چھلک پڑی تھی۔ صفیہ نے لپک کر مگ پکڑا۔

"ارے شجاع بیٹا آیا ہے۔" محمودہ کچن سے نکلیں۔ بڑھ کر خوش دلی سے استقبال کیا۔ جس نے سلام کرتے ان کے آگے سر جھکا دیا۔

"جیتے رہو۔" محمودہ کو اس کی ادا بڑی اچھی لگی۔ پیار سے سر تھپتھپایا۔

اس عرصے میں جازمہ نے موقع غنیمت جانتے غائب ہونے میں لحہ نہیں لگایا تھا۔ شجاع نے سر اٹھایا تو حیران ہی رہ گیا وہ سامنے کا منظر نظر کا دھوکا تو نہیں تھا کہیں لیکن نہیں صفیہ کے ہاتھ میں موجود چائے کا مگ بتا رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو دیکھا وہ گمان نہیں تھا۔ وہ زیر لب مسکرا دیا۔ محمودہ سب کی خیر خیریت پوچھ رہی تھیں۔

"جی سب ٹھیک ہیں۔ اکچوئیلی زوار بھائی آرہے تھے بھابھی کو لینے لیکن انہیں ایک نہایت ضروری میٹنگ میں جانا پڑ گیا۔ تو انہوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔"

"چلو اسی بہانے آئے تو سہی۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے بیٹا۔ جب چاہے آؤ۔ رملہ بھی زوار کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو اداس ہو گئی ہے آپ سب کے لیے۔ آج سارا دن آپ سب کی ہی باتیں کرتی رہی۔" محمودہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ (اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا)۔

"جی ہم سب بھی انہیں بے حد مس کر رہے ہیں۔ دو دن سے وہ ادھر ہیں اور سب کو ایسے لگ رہا تھا کہ بہت دن ہو گئے انہیں گئے۔ مما کو تو سارا گھر ہی سونا لگ رہا تھا اپنی بہو کے بنا۔ آج صبح سے وہ کئی بار کال کر چکی ہیں زوار بھائی کو اس یاددہانی کے لیے کہ انہیں رملہ بھابھی کو لینے جانا ہے۔" شجاع صوفے پر بیٹھنے لگا تو اک ضخیم کتاب پہلے سے براجمان تھی۔ جسے اٹھا کر میز پر رکھا جہاں پہلے ہی نوٹ بک پڑی تھی۔ اس کے علاوہ سائڈ پر ڈھیر کیے پورے لاؤنج کے کشن اور ان پر بکھری کتابیں بتا رہی تھیں کہ کوئی "لائق بچہ" ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔

محمودہ کو دلی خوشی ہوئی۔ بیٹی کو قدردان لوگ ملے تھے اور ایک ان کی بیٹی تھی جو شجاع کو بیٹھے دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔ شکر ہے شجاع کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی ورنہ جانے وہ کیا خیال کرتا وہ آس پاس بکھرے علم کا جائزہ لے رہا تھا۔

"جازمہ کی کتابیں ہیں۔ اس کی عادت ہے جب بھی پڑھنے بیٹھتی ہے تو یونہی پھیلاوہ ڈال دیتی ہے۔" (اف۔۔ ایک تو یہ لڑکیاں۔۔ ہر جگہ ہی شرمندہ کروا دیتی ہیں۔ کہا بھی تھا کہ جا کر سب کچھ سمیٹ لو۔) محمودہ کو غصہ آرہا تھا۔ شجاع نے فقط مسکرا کر سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد صفیہ ٹرالی دھکیلتی آرہی تھی پیچھے ہی جازمہ بھی تھی قدرے بہتر حلیہ میں۔ انہیں اٹھنے کا بہانہ مل گیا۔

"بیٹا آپ چائے پئیں میں ذرا دیکھوں رملہ کیا کر رہی ہے۔"

اور رملہ کیا کر سکتی تھی۔ علاوہ انہیں مزید پریشان کرنے کے۔ اک نئی بحث ان کی منتظر تھی۔

"کیا آپ یوں سب کے درمیان بیٹھ کر پڑھ لیتی ہیں"؟ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ متحیر سا پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں۔" جازمہ نے ہولے سے سر ہلایا۔

"ویری اسٹرینج۔ پہلی بار کسی میں ایسی عادت دیکھ رہا ہوں۔ یوں اتنی گہما گہمی میں بیٹھ کر اسٹڈی کرنا کمال ہی ہے۔ کیا آپ کو سب یاد رہتا ہے؟"

"جی۔ اور میں تو شروع سے اسی طرح ہی پڑھتی ہوں۔

"بہت خوب...... اور میں ہمیشہ اپنے روم میں اکیلے بیٹھ کر اسٹڈی کیا کرتا تھا۔ اگر اس دوران کوئی ڈسٹرب کرتا تو مجھے لگتا سب یاد کیا بھول گیا ہوں۔ ویسے تو میں بہت نہیں تو کسی حد تک لائق اسٹوڈنٹ رہا ہوں۔ بٹ آج آپ کو دیکھ کر لگ رہا ہے میں تو بالکل ڈفر تھا۔" اور اب کہ وہ ہنس پڑی تھی۔

وہ ایک بہترین شام تھی۔ جو جازمہ کی کتاب زیست کا یادگار صفحہ بن گئی۔

☆☆☆

رملہ اس روز شجاع کے ساتھ چلی تو گئی تھی لیکن کن تاثرات کے ساتھ کہ پھر محمودہ کو دھڑکا ہی لگا رہا۔ اس پر طرہ یہ کہ دو دن گزر گئے تھے اور وہ ان کی کال تک نہیں کر رہی تھی۔ ان کا دل سخت بے چین تھا اس لڑکی نے تو گویا قسم ہی کھالی تھی انہیں بے سکون سکیے رکھنے کی۔

کہیں وہ زوار سے ہی نا لڑ پڑی ہو؟ اس سے خفا نا ہو؟ وہ فون کیوں نہیں اٹھاتی؟ ہر وقت ایک ہی خیال ستا رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ ناشتے کی میز پر جازمہ کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

"تم آج ذرا بہن کی خیر خبر تو لے کر آؤ۔ میرا تو ارادہ تھا کہ میں اور تمہارے بابا چکر لگا لیتے لیکن کیا کروں وہ بھی رملہ کے ہی باپ ہیں ان کی اپنی مرضیاں ہیں ان کے خیال میں، میں فضول کی ٹینشن لے رہی ہوں۔ جبکہ اس دن خود بھی دیکھا تھا کہ......"

"بابا کی بات بالکل ٹھیک ہے مما۔ آپ یونہی خود کو ہلکان کیے ہوئے ہیں۔ آپی کی عادت کا آپ کو اچھی طرح اندازہ ہے۔ آپ نے انہیں زبردستی بھیج دیا تھا اب وہ غصہ بھی نا دکھائیں۔ لیکن اگر زوار بھائی سے ان کی لڑائی ہوتی تو کیا وہ آپ سے شکایت نہ کرتے۔" جازمہ نے اپنا خیال بیان کیا۔

"ارے نہیں زوار ایسا بچہ نہیں ہے۔ بڑی سلجھی ہوئی طبیعت ہے ماشاء اللہ۔ میں نے اسے ایک دو بار کال کی ہے مگر مجال ہے جو اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہو۔" وہ داماد کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھیں۔

" اوکے۔ میں چلی جاؤں گی۔ بس آپ ریلیکس رہیں۔" اس نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ محمودہ نے روشن پیشانی چوم لی۔

اور یونی کے بعد وہ "عباس ہاؤس" چلی آئی تھی۔ ملازمہ نے بتایا۔

"بڑی بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور بہو رانی آرام کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا انہیں شام سے پہلے ڈسٹرب نا کیا جائے۔"

رملہ کے کمرے کے دروازے کی ناب پر رکھا اس کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا۔ ڈور لاک تھا۔ اب اس حکم نامے کو سننے کے بعد وہ کیا خاک ناک کرتی۔ وہ چپ چاپ لاؤنج کے صوفے پر آ بیٹھی۔ میز کنارے چند میگزین پڑے تھے ایک اٹھا کر منہ کے آگے کر لیا۔ ملازمہ سوفٹ ڈرنک لے آئی تھی۔ کچھ دیر کھڑی رہی پھر مصروف دیکھ کر واپس مڑ گئی۔ جازمہ نے میگزین تقریباً میز پر پٹخا۔ اور نا چار گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

وہ اپنے آپ میں خفیف سی ہو رہی تھی۔ عجیب سا احساس تھا۔

"اوہ گاڈ۔۔۔۔ یہ آپی بھی نا حد کرتی ہیں۔ اب مجھے کتنا آکورڈ لگ رہا ہے یوں اکیلے بیٹھنا۔ اگر میں اٹھ کر چلی جاؤں تو بھی کتنا برا لگے گا؟ میں آئی ہی کیوں...... مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مما بھی نا بس خواہ مخواہ جذباتی ہو جاتی ہیں۔" اس نے اپنا سر کہیں دے نہیں مارا تھا ورنہ حالت تو کچھ ایسی ہی تھی۔ اعصاب پر جھنجلاہٹ بے طرح سوار ہو چلی

تھی۔ سامنے ہی اسکرین پر چلتا مشہور سڈ کام کا سین بھی اس کے موڈ پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ شولڈر پڑا لا بیگ اک جھٹکے سے اتار کر پھینکا۔ اور صوفے کی بیک پر سر گرا کر آنکھیں موند لیں۔

آج کی میٹنگ توقعات سے بھی بڑھ کر رہی تھی۔ وہ یہ گڈ نیوز سب سے پہلے مما سے شیئر کرنا چاہ رہا تھا اس لیے تو آفس سے جلدی اٹھ آیا وہ انتہائی سرشار سا اپنے ہی دھیان میں مگن چلتا آ رہا تھا اور قبل اس کے کہ جوش جذبات میں مما کو آواز لگاتا کہ نظر سامنے اٹھ گئی۔ پنک اور بلیک پرنٹ کی شرٹ پر پلین پنک دوپٹا لاپروائی سے شانوں پر ڈالے وہ شاید بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ چہرے پر دوپٹے کا عکس پڑ رہا تھا یا اس کا رنگ ہی اتنا گلابی ہو رہا تھا۔ شجاع اندازہ نا کر سکا۔ البتہ ماتھے پر پڑے بل کسی معصوم، روٹھے ہوئے بچے سا ہی تاثر دے رہے تھے۔ وہ تو خاموشی سے پلٹ رہا تھا کہ جازمہ نے ہلکی سی آہٹ پر پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ اور جو پہلا عکس پتلیوں پر اترا وہ وہی خوش نما چہرہ تھا جو آج کل وقت بے وقت دھیان کے پردے پر رہنے لگا تھا۔ وہ سمجھی اب بھی تخیل کی کارستانی ہے۔ پلک جھپکی تو تصور ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ سو وہیں ساکت ہو گئی۔

" سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔" وہ جو عین دروازے کے فریم میں ٹھہر گیا تھا۔ کان کی لو کھجاتا آگے بڑھ آیا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

اُفف...... یہ خود فریبیاں بھی نا کبھی کبھی سخت نادم کرواتی ہیں۔ وہ کیسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ کیا سوچتا ہو گا وہ؟۔ وہ نظریں جھکا گئی۔

" لگتا ہے آج یونی میں کافی مشکل لیکچر سننے کو ملے ہیں؟" اس کے چہرے پر اتری تھکن اور ٹیبل پر پڑی نوٹ بک بتا رہی تھی کہ وہ یونیورسٹی سے سیدھا ادھر ہی آ رہی ہے۔ جازمہ مسکرا کر رہ گئی۔

" اور سنائیں کیسی ہیں آپ؟" وہ ون سیٹر پر آن فروکش ہوا۔

" ٹھیک "۔ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

" آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔ بھابھی کہاں ہیں اور مما؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

ملازمہ اس کی آواز سن کر آئی تھی۔ اس کے بجائے وہ بتانے لگی۔

" وہ جی بیگم صاحبہ تو مارکیٹ تک گئی ہیں اور بہو......"

" وہ آپی آرام کر رہی ہیں۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" قبل اس کے کہ وہ ایک بار پھر رملہ کا فرمان دہراتی وہ جلدی سے بول پڑی۔

" اوہ...... اچھا...... اچھا......" شجاع نے سر ہلایا۔ پھر ملازمہ سے کہنے لگا۔

" ہماری معزز مہمان کی کوئی خاطر مدارات بھی کی ہیں کہ نہیں؟۔ جاؤ فٹافٹ کچھ مزیدار سا لے کر آؤ۔"

" کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے پلیز......!" ملازمہ حکم ملتے ہی جا چکی تھی۔ جازمہ نے اس سے کہا۔

" بے شک مزاج میں مروت کا عنصر پایا جانا ایک اچھی علامت ہے۔ لیکن یاد رکھیں ہر چیز اعتدال میں ہی اچھی لگتی ہے۔ بھابھی کو آپ نے بے آرام نہیں کیا چلیں ٹھیک۔ مگر کھانے پینے سے کیسا احتراز۔ جبکہ آپ یونی سے دماغ کھپا کر آ رہی ہیں۔ اور اگر میں اپنی بات کروں تو مجھے آدھ گھنٹے کی میٹنگ ہی نقاہت زدہ کر دیتی ہے۔ تو آپ نے تو پھر کئی گھنٹے کلاسز اٹینڈ کی ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھوک نا لگی ہو؟" وہ اپنا تجربہ اور تجزیہ ایک ساتھ پیش کرتا اپنے حلیے کے قطعاً برعکس لب و لہجے میں بولتا اسے اور منفرد اور اچھا لگا تھا وہ بے اختیار کہہ گئی۔

" اُفف۔۔۔ آپ تو کافی ثقیل اردو بول لیتے ہیں۔"

" جبکہ میرا نہیں خیال۔ میں نے نہایت عام فہم

الفاظ میں بات کی ہے۔ ہماری زبان تو بے حد دلکش اور سلیس ہے کیا آپ کو کوئی لفظ سمجھ نہیں آیا؟" وہ حیران ہوا تھا۔ وہ اس سے زیادہ متحیر ہوئی۔

"ویری اسٹرینج"۔ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ اس کی کیفیت بھانپتے جیسے جھنجلا سا گیا۔

"ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے ہاں آخر یہ عمومی رویہ کیوں بن گیا ہے کہ ہم اس بات پر ہی حیرت زدہ کیوں ہوتے ہیں جس پر حیران ہونا بنتا ہی نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں کم و بیش اسی طرح کی سچویشن کا سامنا ہے مجھے۔ فر فر انگریزی بولوں تو ٹھیک۔ لیکن جہاں کہیں اپنی زبان میں دو لفظ بول لوں تو سامنے والا شاکڈ ہو جاتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے میں کم سنی میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ زندگی کے بہت سے سال دیار غیر میں گزارے۔ تعلیم مکمل کی۔ لیکن کیا مجھے اس عرصہ میں اپنی شناخت کو بھلا دینا چاہیے تھا۔ اپنا رہن سہن، بول چال سب یکسر بدل لیتا؟" جازمہ کا سر نفی میں آیو آپ ہل گیا وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"ہر چیز ضرورت کے وقت پر ہی مناسب لگتی ہے۔ اگر آپ کو پانی کی طلب ہے تو اسے کوئی مہنگے سے مہنگا آرٹی فیشل جوس بھی پورا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب میرے پاس اپنے لفظ ہیں تو میں کیوں ان الفاظ کا سہارا لوں جو غیروں سے مستعار لیے گئے ہوں۔ میری پہلی ترجیح یہی ہوتی ہے کہ میں اس طریق سے بات کروں جس سے سامنے والا بھی سہولت محسوس کرے نا کہ وہ یہ سمجھے کہ میں اس پر اپنی قابلیت اور کینیڈا کی نیشنلٹی کی دھاک بٹھا رہا ہوں۔" آج کی میٹنگ میں بھی اس کی اردو ہی زیر بحث رہی تھی۔ بلکہ کئی ایک نے صرف نظروں سے ہی نہیں اس حیرت کا زبانی اظہار بھی کر ڈالا تھا۔ سو اسی بنا پر ایک دم سے خاصا جذباتی ہو گیا۔

جازمہ نے تو ابھی ایسا کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اس کی سندوری رنگت میں کچھ اور سرخی گھلی تھی۔ وہ معذرت خواہ ہوئی۔

"سوری...... آپ تو برا ہی مان گئے" اور اس کی لرزتی پلکیں دیکھ کر شجاع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔

"ارے نہیں...... نہیں۔ آپ کیوں سوری کر رہی ہیں۔ ایکچوئلی کیا ہے کہ آج......" وہ اسے میٹنگ میں پیش آنے والا قصہ سنانے لگا۔ اس کے علاوہ چند اور واقعات۔ اس کا انداز بیاں اتنا دلچسپ تھا کہ جازمہ سب خفت بھول گئی۔

ملازمہ ٹرالی لے آئی تھی۔ بہترین چائے کے ساتھ مزے دار کاٹیج چیز کیک، پیٹیز اور چکن رول کھاتے گپ شپ بھی چلتی رہی۔ اسی دوران زوار بھائی بھی آ گئے۔ (شجاع نے ہی انہیں میسج کیا تھا) اس سے مل کر وہ بیڈروم میں چلے گئے۔ کوئی دس منٹ بعد ہی سوئی سوئی آنکھوں سے اسے گھورتی رملہ باہر آئی تھی۔

"تم کب سے آئی ہوئی ہو؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ آنے سے پہلے ایٹ لیسٹ ایک فون کال ہی کر دیتیں۔؟" نا سلام نا دعا وہ تو گویا اس پر برس پڑی تھی۔ جازمہ ہکا بکا سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ پل قبل چمکتا چہرہ یک لخت ماند پڑا تھا۔ زوار اور شجاع کے سامنے ایسی عزت افزائی نے یقیناً اسے جھٹکا لگایا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیوں فون کر کے آتی یہ۔ جازمہ اس گھر کے لیے مہمان ہرگز نہیں ہے۔ یہ اس کی بہن کا ہی گھر نہیں بلکہ اس کے بھائی کا بھی گھر ہے۔ میرے لیے جیسی خولہ ویسی جازمہ۔ تم یہ دیکھو اس نے تمہیں بے آرام کرنا بھی اچھا نہیں سمجھا۔ اب مما بھی گھر پر نہیں ہیں اگر اس کی جگہ کوئی اور مہمان آ جاتا تو؟" زوار نے جھٹ اس کی حمایت کے ساتھ کوتاہی بھی جتائی جو ظاہر ہے رملہ کو بری لگی ہو گی اگر

جو اس منظر میں شجاع اور جازمہ نا ہوتے تو وہ ضرور کوئی جواب دیتی لیکن اب کڑوے گھونٹ پیتی یوں بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"اب یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے یا میرے روم میں چلو گی۔" وہ بڑی بہن تھی یقیناً جازمہ پر رعب بھی ہو گا۔ لیکن جانے کیوں شجاع کو بے حد برا لگا۔

وہ سر جھکائے رملہ کے پیچھے چل پڑی تھی۔ اس نے زوار کو دیکھا جو انہیں جاتے دیکھ رہا تھا پھر ادھر رخ کیا لیکن اس سے نظر ملنے سے پہلے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

زوار نے اسے دور تک جاتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی ہلکی ہلکی کن من ہو رہی تھی۔ قدرت کی اس عنایت نے فضا کا رنگ ہی بدل ڈالا تھا۔ ہر منظر نکھر گیا۔ مرجھائے پھول پودوں میں جان سی پڑ گئی۔ ہر چہرہ بھی تر و تازہ لگ رہا تھا۔ یونی میں کلاسز بھی برائے نام ہوئیں سب موسم انجوائے کرتے رہے۔

" کیا خیال ہے آج اچھا سا لنچ نا کیا جائے۔" ہتھیلی پر بوندیں سمیٹتی جازمہ نے تان اڑائی تو سب ہی متفق ہو گئیں۔ قریبی ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ بمشکل خالی ٹیبل مل سکا۔ وہ خوش گپیوں میں مگن آرڈر سرو ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کہ ادھر ادھر سفر کرتی اس کی نظر اک ٹیبل پر ٹھہر گئی۔ کسی بات پر بے ساختگی سے مسکراتا ہوا وہ شجاع عباس تھا۔ بلیک ٹو پیس میں ہمیشہ کی طرح دل موہ لینے کی حد تک خوبرو۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ تھا۔ شاید آفیشلی لنچ۔ یا پھر اس کے دوست۔ اور وہ اپنی دلفریب شخصیت کے سبب سب میں نمایاں سب سے الگ دکھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار دیکھے گئی۔ جازمہ کو لگا موسم کا حسن کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ باہر برستی بوندوں کی دل پذیر خنکی صحن دل میں اترنے لگی۔ روم روم مہک سا گیا۔ اک عجب جاں فزا احساس تھا جو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

"اے کہاں کھو گئیں؟۔" وہ بولتے بولتے یک لخت گم صم ہوئی تھی۔ سب کو اس کے انداز نے چونکایا۔ لاشعوری طور پر منبع نگاہ تلاشا گیا۔

" اوہ...... واؤ...... ڈیشنگ۔ ہینڈسم یار۔ " سب ہی تعریف کیے بنا نا رہ سکیں۔

اس کی نگاہوں کے ارتکاز نے شجاع کی توجہ بھی کھینچ لی تھی۔ نظر ملنے پر سٹپٹا کر رخ پھیر لیا۔

" گڈ لکنگ ہے۔ امپریسو۔ بالکل ہیرو۔" پر ہے کون؟۔" اجیا پوچھ رہی تھی۔ وہ شانے اچکاتی سیل فون پر جھک گئی۔

" دیکھ تو ایسے رہی تھیں۔ گویا گئیں کام سے۔" فلزا نے اک آنکھ دبائی۔ جازمہ نے نوٹ بک اس کے زانو پر دے ماری۔ سب ہنس رہی تھیں۔ کھانا آ چکا تھا۔ وہ سب اکٹھی ہوں اور تمیز نام کی چڑیا درمیان میں رہے ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی جو مزا چھین جھپٹ کر کھانے میں ہے وہ سلیقے میں کہاں۔ اور وہ اندر ہی اندر خائف ہو رہی تھی۔ آج سب کی حرکتیں چھچھوری اور فضول لگ رہی تھیں۔ اسے غصہ آئے جا رہا تھا کاش وہ لنچ کا مشورہ نا دیتی اور اب نا ایسی خفت اٹھانا پڑتی۔ شجاع نے اک دوبار دیکھا تھا کیا سوچتا ہو گا وہ۔ اسے یہی خیال تنگ کر رہا تھا۔ پھر غنیمت ہوا وہ اپنے ساتھیوں سمیت چلا گیا۔ اس نے اس عرصے میں پہلی بار سکھ کا سانس لیا۔ "اور وہ اسے دیکھ کر بھی اگنور کر گیا۔" اس سوچ نے چٹکی کاٹی تو اگلی ہر سانس بے سکون ہو گئی۔ ہر طرف سے جی اچاٹ ہو گیا۔ نا موسم دلکش رہا نا کھانا من پسند۔ وہ بے تحت بے زار نظر آ رہی تھی دل چاہ رہا تھا اٹھ کر بھاگ لے۔

" ہوا کیا ہے تمہیں؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟ ارے وہ ہیرو کہیں جاتے جاتے کچھ چرا کر تو نہیں لے گیا" فلزا کو شرارت سوجھی۔ اور اس کا دل چاہا

پوری میز الٹ دے یک دم یہ کیسی سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں کچھ دے ماروں گی اب اگر بکو اس کی تو۔۔" اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔

"او کے۔۔ او کے۔۔ یار یہ بل ہم نے خود پے کرنا ہے یوں رزق کی ناقدری مت کرو۔ کھانے کا جی نہیں چاہ رہا تو لاؤ اپنی پلیٹ مجھے دے دو۔" اس نے تو مذاق کیا تھا۔ جازمہ نے پلیٹ بیچ آگے کھسکا دی۔ پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اندر اٹھنے والی گرد پر یہ چھینٹے بھی کم ہوئے تھے۔ پھر سب کے اصرار پر چند ایک لقمے زہر مار۔۔ کیے یہ کہتے ہوئے کہ "آج یہاں کا کھانا ٹھیک نہیں۔" باقی اک دوجے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ کھانا تو ٹھیک تھا اور کچھ دیر قبل تو وہ بھی ٹھیک تھی۔ پھر یہ اچانک ہوا کیا؟۔ لیکن اس سے استفسار کرنا ایسا ہی تھا کہ "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟" سو سب ہی چپ رہیں۔

قلزا نے تو آفر کی تھی کہ اسے ڈراپ کر دے گی۔ لیکن وہی بے کل تھی۔

جانے کیوں دور تک پیدل چلنے اور راہ میں آتے ہر پتھر کو ٹھوکروں سے اڑانے کا جی چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی دھواں بھر گیا تھا گردن تک۔ بارش رک چکی تھی۔ ہوا چاروں اور چکراتی پھر رہی تھی۔ ہر شے دھل دھلا کر نکھر چکی تھی۔ بس اک غبار آلود رہ گیا تھا تو اس کا دل۔ وہ اپنے دھیان میں مگن چلتی جا رہی تھی جب قریب ہی کار آرکی۔

"کیا ہوا کیا سارا کھانا چھین کر کھا گئیں آپ کی فرینڈز؟" وہ متبسم سا پوچھ رہا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کر رکی۔ "اوہو...... چلیں کوئی بات نہیں۔ فرینڈز ہوتے ہی ایسے ہیں۔ غم نا کریں۔ آجائیں۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس کی شکل پر جو ہندسہ درج تھا اسے دیکھتے وہ بظاہر فکرمند مگر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا وہ مزید خائف ہوئی۔

"اسے تو اب تک چلے جانا چاہیے تھا۔ یہ یہاں کر کیا رہا ہے؟۔" اسے خیال آیا تھا۔ شجاع نے ڈور ان لاک کر دیا تھا وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"میں تو کب کا جا چکا ہوتا وہ تو اچھا ہوا کہ ضروری کال آگئی۔ یہاں کی ٹریفک کا جو حال ہے اسے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرتے سیل یوز کرنا ایسا ہی ہے کہ آپ موت کو آواز دے دیں۔ میں اس معاملے میں بے حد احتیاط کرتا ہوں۔ اور میرے ساتھ کچھ کاروباری لوگ تھے اس لیے میں نے آپ کو مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آئی ہوپ آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا؟۔"

دھیان سے موڑ کاٹتے وہ اس کے اندر کلبلاتے ہر سوال کا خود ہی جواب دے رہا تھا۔ اسے کچھ کہنا ہی نہیں پڑا۔ دل یک دم ہی فلک پر تیرتی سفید بدلی سا ہلکا پھلکا ہو گیا۔ بجھے چہرے کی رونق بحال ہوئی۔

"مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا آپ کا یوں فرینڈز کے ساتھ مل کر موسم انجوائے کرنا۔ بلیو می...... مجھے اپنے دن یاد آگئے۔ یونیورسٹی، پیارے ٹیچرز، شرارتی فرینڈز...... آہ کیا مزے کی ہوتی ہے اسٹوڈنٹ لائف بھی۔ اور جب وہ دن تھے تو بہت بھاری لگتے تھے۔ دل چاہتا تھا بس جلدی سے یہ لف روٹین ختم ہو۔ اور اب سمجھ آتی ہے کہ وہ کیسی نادانی تھی کہ ان دنوں سے بے زار ہوتے تھے۔ جبکہ زندگی کا وہ دور تو قدرت کا ایسا انمول تحفہ ہے۔" وہ گزرے دنوں میں سانس لیتا بولتا چلا گیا۔ وہ گویا کھلی آنکھوں سے سب دیکھتی سنے گئی۔ شجاع نے چہرہ اس کی جانب موڑا وہ مکمل انہاک سے متوجہ تھی۔ نظر ملنے پر سٹپٹا کر رخ سیدھا کیا۔

"کیا کھائیں گی آپ؟ کھانا تو سارا آپ کی فرینڈز کھا گئیں آپ کو یقیناً بھوک لگی ہوگی۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نو تھینکس...... میں نے کھایا تھا کھانا۔ اب

بالکل طلب نہیں۔"

"شیور۔" وہ تصدیق چاہ رہا تھا اس نے بچوں کی طرح سر ہلا دیا۔"او کے...... پھر ایسا کرتے ہیں آئسکریم کھاتے ہیں وہ تو بنا طلب کے کھائی جاسکتی ہے نا؟" اور جازمہ نے اب کہ بھی سر ہلا دیا۔ اس کا انداز ہی ایسا دوستانہ تھا کہ انکار بنتا ہی نا تھا۔

"فلیور کون سا پسند ہے آپ کو۔ اینڈ پلیز اب سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔"

اس نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی کہہ دیا وہ مسکرا دی۔

"آئسکریم آپ کھلا رہے ہیں تو پسند بھی آپ کی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ اور اب کہ شجاع نے سر ہلایا پھر دونوں کی نظر ملی تو بے اختیار ہنس دیے۔

☆☆☆

بہت خوبصورت ہینڈ بیگ تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی وہ اسے خریدنے کا ارادہ کر چکی تھا۔ سیلز مین نے قیمت بتائی تو بے اختیار محمودہ کی جانب نگاہ کی۔ آج کل کے ٹرینڈ مطابق اسے بھی "برانڈڈ" کا چسکا لگ گیا تھا۔

جب بھی شاپنگ کے لیے نکلتی مہنگی مہنگی چیزیں خرید لیتی۔ اور پھر محمودہ کے ہاتھوں خوب تواضع کرواتی۔ وہ اس بات کے سخت خلاف تھیں۔

جس مارکیٹ میں اشیاء پر فکسڈ پرائز کے ٹیگ لگے ہوں وہ اس طرف منہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ سب نرا دھوکے اور فراڈ کے علاوہ کچھ نہیں۔ جبکہ سیم وہی چیز آپ کو کم چمک دمک والی مارکیٹ سے مناسب داموں میں باآسانی مل سکتی ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے اتنے مہنگے داموں میں لینے کی۔

ہوا کچھ یوں کہ زوار کو اچانک اک آفیشلی میٹنگ آپڑی۔ چار روز کے لیے شارجہ جانا تھا۔ رملہ کو خبر ہوئی تو اس نے آفت اٹھا دی۔ یہ کہہ کر کہ شادی کے بعد گوں نہ گوں مصروفیات کی بنا پر وہ اسے ہنی مون پر نہیں لے جا سکا سو اب اس ٹرپ پر وہ تنہا ہرگز نہیں جا سکتا وہ اس کے ساتھ جائے گی۔ اور چونکہ زوار کا ٹف شیڈول اسے وہاں ایک لمحے کی فرصت نہیں بتا رہا تھا سو وہ صاف انکاری ہو گیا۔ بس پھر وہ رملہ ہی کیا جو بات سمجھ لے۔ زوار سے کھٹ پٹ ہوئی اور منہ پھلائے روتی دھوتی گھر چھوڑ آئی۔ زوار تو پہلے ہی غصے میں باہر جا چکا تھا۔ اس کی 'جرات' کی خبر بعد میں ہوئی۔ خوب غصہ آیا۔ اور اسی غصے میں اٹھا کر بابا کو فون گھما ڈالا۔ اور ان کی لاڈلی کے ہاتھوں بننے والے پھپھولے خوب خوب پھوڑے۔

بابا جان کو تو بے تحاشا دکھ اور رنج نے آگھیرا۔ رملہ اس حد تک نادانی کا ثبوت دے گی۔ انہیں اندازہ نا تھا۔ اور اس کی روتی صورت دیکھ کے وہ اسے کیا کہتے بس پھر انہیں سارا غصہ نکالنے کے لیے نظر آئی بھی تو اس ماں کی پتلی گردن جو پہلے ہی بیٹی کی حرکتوں پر نالاں ہوئی بیٹھی تھیں۔

اب اس میں ان کا تو کوئی قصور نا تھا۔ لیکن ہاں یہ زمانے کے چلن کہ سارا ملبہ ان کی جان ناتواں پر گرایا گیا۔ اور تب سے ان کا موڈ شدید آف تھا۔ رملہ کی طرف تو دیکھ بھی نہیں رہی تھیں باقی سب سے بات چیت قطعاً بند۔ بابا تو صبح اٹھ کر آفس چل دیے رملہ کے الگ مزاج نہیں مل رہے تھے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کسی سہیلی کے ہاں جا پہنچی۔ وہ یونی سے لوٹی تو گھر میں پھیلی کشیدگی جان کو آنے لگی۔ ہزار جتنوں سے بیڈ روم کا دروازہ کھلوایا۔ بصد اصرار انہیں کچھ کھانے پر آمادہ کیا۔ کہ پہلی اطلاع ہی صفیہ نے یہ دی تھی کہ انہوں نے صبح سے ناشتا بھی نہیں کیا۔ اسے رملہ پر بھی شدید غصہ تھا اسی کی وجہ سے مما کو اتنا کچھ سننے کو ملا اور وہ ایسی لاپروا کہ بھوکی پیاسی ماں کی خبر لینے کے بجائے منہ اٹھا کر باہر چل دی۔

خیر اس سے تو کوئی گلہ ہی بے کار تھا۔ محمودہ کو وہ زبردستی شاپنگ پر لے آئی تھی یہی سوچ کر کہ اسی طرح ان کا دھیان بٹ جائے۔

اور انہوں نے اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر نا چار منہ کھولا۔

"قیمت بہت زیادہ ہے۔" جازمہ نے تابعداری کی اعلا مثال قائم کرتے بیگ وہیں چھوڑ دیا۔ لیکن اب سیلز مین جان کیوں چھوڑتا۔ تین ہزار قیمت بتا کر اب وہی بیگ وہ اسے پچیس سو میں آفر کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے اٹھارہ سو نکلا اور پھر تھوڑی ردوکد کے بعد وہ مان ہی گیا۔

بارگیننگ بھی اچھا شغل ہے۔ گو کہ ہم چیز پھر بھی اصل پرائز سے کچھ اوپر ہی لے رہے ہوتے ہیں۔ لیکن دل کو تسلی تو ہو جاتی ہے نا کہ قیمت کم کروالی۔ وہ مطمئن بھی۔ مگر محمودہ کے چہرے کے تاثرات اب بھی نارمل نا ہوئے تھے۔ اور اسے اچانک ہی دھیان آیا۔ ڈرائیور سے سمن آباد چلنے کا کہا۔ محمودہ نے اسے دیکھا گویا پوچھ رہی ہوں۔

"ادھر کیوں"۔

"کتنے روز ہو گئے نہ شیریں خالہ آئیں نہ آپ ان کی طرف گئیں۔ اور نا ہی میں نے آپ کو ان سے فون پر بات کرتے سنا۔ اب گھر سے نکلے ہیں تو میں نے سوچا ان کی خیر خیریت ہی پوچھ لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"۔ اور وہ اس کے خیال سے متفق ہیں یا نہیں اب تک ان کے چہرے نے ایسا کوئی کلیو نہیں دیا تھا لیکن جازمہ کو پوری امید تھی شیریں خالہ سے ملنے کے بعد ان کا موڈ بدل جائے گا۔ گیٹ جلال خالو نے کھولا تھا۔ وہ تو بند گیٹ سے ہی ان کی آواز سن کر بلا ارادہ مما کے پیچھے ہو گئی تھی۔

"ارے محمودہ بہن...... آؤ...... آؤ...... بڑی عمر ہے بھئی۔ شیریں آج صبح سے ہی تمہارا ذکر خیر کر رہی تھی۔ ویسے اس بار زیادہ دن نہیں نکال لیے دونوں سہیلیوں نے اک دوجے کو دیکھے بغیر؟۔" وہ بڑے تپاک سے استقبال کرتے کہہ رہے تھے۔ اس پر نظر پڑی تو لہجہ مزید خوش گواریت سے مزین ہو گیا۔

"ارے یہ اپنی جازمہ بیٹی ہے؟ ماشاءاللہ...... گڑیا آج کیسے راستہ بھول پڑیں۔ ہمارے گھر کا؟" اور اس سے کوئی جواب نا بن پڑا۔ گڑبڑا کر سلام کر دیا۔

"وعلیکم السلام...... جیتی رہو۔ ارے بھئی شیریں کدھر ہو...... دیکھو تو کون آیا ہے؟"

ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہیں سے پکارتے آگے بڑھے۔

"یا اللہ...... ایسے کون سے خاص مہمان آگئے اس وقت؟" شیریں افتاں خیزاں کچن سے نکلیں۔ اور محمودہ کے سنگ جازمہ کو آتے دیکھ کر وہ بھی بے اندازہ خوش ہو گئیں۔

"بسم اللہ...... آج تو گویا رات سے پہلے ہی چاند اتر آیا ہمارے آنگن میں۔ بڑا ہی بھاگوں والا دن ہے میری شہزادی بیٹی آئی ہے۔" انہوں نے چٹا چٹ اس کی بلائیں لے ڈالیں۔ محمودہ کو گلے لگایا۔ جلال خالو انہیں اشارے سے کچھ کہتے پیچھے سے ہی غائب ہو گئے۔ وہ انہیں نفاست سے ترتیب دیے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ عجب سے سکون کا احساس تھا۔ محمودہ اور شیریں تو اک دوسرے سے حال احوال لینے میں مگن ہو گئیں اس نے ریلیکس ہو کر بیٹھتے اپنا سیل فون نکال لیا۔ پھر خیال آیا۔ انہیں تنہا چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے۔ مما خالہ سے کہہ سن کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیں گی۔ اور بس وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"افوہ! میں بھی باتوں میں لگ کر بھول گئی۔ چائے کا تو پوچھا ہی نہیں۔" اسی وقت شیریں خالہ بھی اٹھیں۔

"آپ بیٹھیں۔ چائے میں بنا لاتی ہوں۔" جازمہ نے کہا۔

"ارے نہیں میری چندا۔ قسمت سے تو آئی ہو آج۔ اور میں تمہیں لے جا کر کچن میں کھڑا کر دوں"

"کچھ نہیں ہوتا خالہ۔ آپ مما سے گپ شپ لگائیں وہ اسپیشل آپ سے ہی تو ملنے آئی ہیں۔ اور میں بہت اچھی چائے بناؤں گی آپ کو بالکل شکایت نہیں ہو گی۔ بلیو می۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شیریں نے نہال ہوتے اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

"وہ تو میں جانتی ہوں میری بیٹی بہت سلیقہ مند ہے۔ ہاتھ میں ذائقہ ہے۔ اچھا چلو میں کچن تک تمہاری راہ نمائی کر دوں۔"

"نہیں......نہیں......میں دیکھ لوں گی آپ فکر نہ کریں۔" وہ انہیں مطمئن کرتی کچن تک چلی آئی۔ گو کہ کافی ٹائم بعد آنا ہوا تھا۔ لیکن گھر کی ترتیب اسے اچھی طرح سے یاد تھی۔ اور پھر شیریں خالہ کا کچن تھا تو کسی بد نظمی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی جگہ پر سجی تھی۔ چائے کے لیے اسے تمام لوازمات با آسانی مل گئے تھے۔ ساس پین میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھایا۔ اور ریک سے کپ نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

اسی اثنا میں جلال خالو چلے آئے۔ خوب لدے پھندے۔ ڈھیر سارے شاپرز ان کے ہاتھوں میں تھے جانے کیا کیا اٹھا لائے تھے۔ اسے کچن میں دیکھ کر ٹھٹکے وہ یک دم گھبرا گئی۔ مبادا کہیں خالہ پر ہی نا غصہ ہوں۔ جلدی سے بول اٹھی۔

"وہ......وہ میں خود اپنی مرضی سے چائے بنا رہی ہوں۔ میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں خالو جان۔ مما اور خالہ کافی دن بعد مل رہی ہیں نا تو میں نے ہی خالہ کو اٹھنے نہیں دیا۔ وہ تو آ رہی تھیں چائے بنانے۔"

"گڈ......یہ تو بہت نیک کام کیا بیٹا۔ تمہاری خالہ کے ہاتھ کی پھیکی چائے پی پی کہ ویسے بھی میرے تو منہ کا ذائقہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ میں تو خوش ہو گیا ہوں تمہیں یہاں دیکھ کے۔ یعنی آج بہت اچھی چائے ملے گی۔" انہوں نے شاپرز کاؤنٹر پر رکھے اور کیبنٹ کھول کر برتن نکالنے لگے۔ اس کا "جی ضرور" حلق میں ہی اٹک گیا۔ بوکھلا کر ٹوکا۔

"ارے۔ ارے۔ خالو جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں سب کر لیتی ہوں۔ پلیز آپ رہنے دیں۔"

"ارے کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ آپ چائے پیالیوں میں چھانو۔ میں یہ سب پلیٹوں میں نکال لیتا ہوں۔ دو منٹ کا تو کام ہے کوئی ایسا مشکل نہیں۔ یوں بھی اب تو عادت سی ہو گئی ہے کچن میں آتا ہوں تو کوئی نا کوئی کام پکڑ لیتا ہوں۔ آپ کی خالہ میں اب وہ پہلے والی ہمت نہیں رہی گھر کے آدھے سے زیادہ کام تو وہ مجھ سے کرواتی ہیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بتا رہے تھے۔ (ایں۔۔۔ یہ وہی خالو جان ہیں؟)۔ وہ جو انہیں کچن میں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ تو اب ان کے انداز کی نرمی پر متحیر سی سوچ رہی تھی۔ وہ بڑے سلیقے سے سب چیزیں نکال کر ٹرالی میں لگاتے جا رہے تھے۔ وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"آپ نے تو تکلف کی حد ہی کر دی خالو جان۔ اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تکلف کیسا بیٹا۔ محمودہ بہن تو آتی رہتی ہیں لیکن آج ہماری بیٹی آئی ہے اب اس کے اعزاز میں اتنا اہتمام تو بنتا ہے نا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں اٹھا سکتا تو اور بھی اور کچھ لانے کو دل کر رہا تھا۔" انہوں نے نہایت شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا۔ وہ مسکرا دی۔ جلال خالو تو اپنا کپ اور پلیٹ لے کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ خیام جو یقیناً ابھی آیا تھا۔ جھک کر محمودہ سے پیار لیتا سیدھا ہوا تو خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔ قرمزی رنگ کے ایمبرائیڈ ڈ سوٹ میں اس کی

گلابی رنگت کچھ اور کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ چہرے پر ہمیشہ کی طرح تازگی اور معصومیت۔ کسی بھی مصنوعی رنگ سے پاک اس کی شاداب صورت سیدھا دل میں اتر گئی تھی۔ وہ اس کے گھر میں تھی۔ اور جس مگن انداز سے آ رہی تھی لگ رہا تھا اسی گھر کا حصہ ہو۔ یہ گمان ہی کس قدر دلکش تھا۔ روح کو معطر کر دینے والا۔ وہ اندر تک سرشار ہوا تھا۔

"واؤ......واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز......آج تو محترمہ جازمہ عتیق نے ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔ کمال ہی ہو گیا۔ مجھے تو یقین نہیں ہو رہا۔ یہ انہونی کیسے ہوئی خالہ جان؟" وہ محمودہ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔

"جازبہ نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی کہ خیام کے دیکھنے کا انداز آج کچھ مختلف تھا۔ شیریں تو رات کے کھانے تک رکنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں لیکن محمودہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور سنو اب رملہ سے مت الجھنا۔ لاڈوں میں پلی بچی ہے۔ پیار سے سمجھاؤ، سمجھ جائے گی۔ زوار اچھا لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ واپس آ کر خود ہی رملہ کو لے جائے گا۔ تم پریشان مت ہونا اچھا۔" شیریں کہہ رہی تھیں۔

"پریشانی کا تو پوچھو ہی مت۔ میری تو جان دق کر دی ہے اس لڑکی نے"۔ محمودہ چلتے چلتے رک گئیں۔ جازمہ کو پتا تھا۔ وہ دونوں ابھی مزید بات کریں گی۔ وہی خواتین والی عام عادت اک دوجے کو اللہ حافظ کہہ دیا رخصتی معانقہ بھی کر لیا اور پھر کچھ یاد آنے پر پھر سے گفتگو کا آغاز۔ وہ انہیں وہیں چھوڑ کر چھوٹے سے لان میں نکل آئی۔ جہاں کی رنگینی بتا رہی تھی کہ کتنے دل سے اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کیاریوں میں بہار دکھلاتے بے شمار پھول جن سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو نے ساری فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ اس نے اک لمبا سانس کھینچ کر اس مہک کو اندر اتارا۔

مشرقی دیوار کے ساتھ بنی کیاری پر نگاہ گئی تو یاد آیا یہ جگہ تو پنک روزز سے بھری ہوئی تھی۔ گو کہ ان پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی تھی لیکن اسے وہ پنک روز بے حد اچھے لگا کرتے تھے۔ اور بچپن میں شیریں خالہ کے گھر جانے کی واحد ایکسائٹمنٹ وہی روزز تھے جنہیں اپنے خوب گھیر دار فراک کے دامن میں بھرنا اسے پسند تھا۔

" کیا دیکھ رہی ہو۔" خیام کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا اسے پتا ہی نا چلا۔ وہ چونک کر مڑی۔

" وہ ادھر پنک روزز ہوا کرتے تھے۔ کہاں گئے؟"

"میں نے نکال پھینکے تھے۔" خیام نے اس کے چہرے کو مرکز نگاہ کرتے بتایا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھ لیے

"بٹ وائے۔ اتنے خوبصورت پھول کیوں اجاڑ دیے۔ اتنے اچھے لگتے تھے وہ اس جگہ......؟" وہ بے اختیار معترض ہوئی۔ اچھا خاصا صدمہ ہوا اس اطلاع سے۔

"وہ پھول اسی لائق تھے۔ بھول گئی ہو کیا، کیا تھا انہوں نے؟" خیام کی آنکھیں اب بھی اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اور کیا تھا ان آنکھوں میں۔ اور اس کا لہجہ۔ اور پھر وہ بھولی نہیں تھی اسے خوب یاد تھا غزالہ آپی کی مہندی تھی اس رات۔ اتنا ہلا گلا شور شرابا سب کے ساتھ وہ بھی انجوائے کر رہی تھی۔ پنک کلر کی تاروں بھری میکسی میں وہ نوعمری کا بانکپن لیے بے حد پیاری لگ رہی تھی بالکل دور دیس سے آئی کسی نازک سی پری جیسی۔ اس نے ساری کزنز کے ساتھ مل کے ڈھولک بھی بجائی۔ خوب تالیاں بھی پیٹیں۔ گانے بھی گائے۔ اور پھر وہ تھک گئی تھی اور ذراستانے کے لیے باہر لان میں چلی آئی تھی۔ اپنی اسی فیورٹ جگہ پر۔ پنک روزز کے پاس بیٹھنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ارادہ تھا خوب ڈھیر سارے پھول چننے کا۔

اور ابھی وہ اپنے ارادے پر عمل درآمد کا سوچ ہی رہی تھی کہ دو تین لڑکیاں اسے تلاشتی ادھر نکل آئیں۔

"اوہ یار تم یہاں بیٹھی ہو ہم تمہیں کتنی دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ چلو جلدی سے اٹھو اندر چلیں۔ عمارہ اور یسریٰ کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے ہم نے ڈانس کے لیے۔ سچ میں بڑا مزا آئے گا تم تو اویس چاچو کی شادی پر آئیں ہی نہیں تھیں بڑا زبردست ڈانس کرتی ہیں دونوں تم اب دیکھنا۔" وہ اس کے بازو پکڑے اسے وہاں سے اٹھا رہی تھیں۔

"اوہو۔ ذرا دم تو لو تم لوگ۔ چلتی ہوں بھئی۔ ایسی بھی کیا آفت آگئی۔" اس نے بازو چھڑائے اور اس خیال سے کہ دو چار پھول ہی توڑ لے کیاری کی جانب مڑی تھی کہ ایک دم کچھ بچے بھاگتے ہوئے اس طرف آنکلے وہ چونکہ جھکی کھڑی تھی اس لیے ایک ہی جھٹکے سے ان بیلنس ہوتی کیاری میں جاگری یہ سب اتنا اچانک سے ہوا کہ اسے سنبھلنے کا ذرا سا بھی موقع نا مل سکا۔ گلاب کے پھول ہوں اور بنا کانٹوں کے ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ وہ بے اختیار چیخی تھی۔ اور وہ ساری لڑکیاں الگ۔ اور وہ چیخ ہی رہی تھیں اتنا نا کیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے باہر کھینچ لیں۔ خیام قریب ہی تھا تیز رفتار سے بھاگتا وہ اس تک پہنچا تھا۔ سہارا دے کر اٹھایا وہ بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ چہرے، گردن اور ہاتھوں کے علاوہ جسم میں کئی جگہ کانٹے کھبے تھے۔ نئی میکسی پھٹ گئی وہ الگ۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے ہونے والی شرمندگی کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وہ خوب روئی تھی۔ خیام ہی جانے کہاں سے برنال لایا تھا جو اس کے روتے دھوتے اور بہتیرے ہاتھ مارنے کے باوجود اس کے چہرے اور ہاتھوں پر لگاتا رہا۔ اور وہ تو کب کی اس بات کو بھول بھال گئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے پنک روزز نکال پھینکے اس سے اگلے ہی دن۔ اور کس وجہ سے۔ کیوں کہ وہ اس کے لیے باعث آزار بنے تھے

جازمہ اسی جگہ کو تک رہی تھی۔ اس کے احساسات نہایت عجیب سے ہو رہے تھے بس نہیں چل رہا تھا ایک منٹ سے پہلے یہاں سے غائب ہو جائے۔ وہ اتنے عرصے بعد بھی آج نا آتی تو کیا ہو جاتا۔ وہ سخت پچھتا رہی تھی۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا خیام اتنا مسرور تھا گویا آج ہفت اقلیم مل گئی ہوں"۔ محبوب کا دیدار کیسی عظیم راحت ہے" اگر اسے کوئی اس عنوان پر مضمون لکھنے کو کہتا تو وہ بلا شبہ کھڑے کھڑے سو صفحات تو لکھ ہی ڈالتا۔

☆☆☆

"اب بس بھی کر دو میری جان۔ آج تو یونی سے آکر تم نے ذرا بھی ریسٹ نہیں کیا۔ کب سے یہ کتابیں لیے بیٹھی ہو۔ تھک گئی ہو گی۔ چھوڑو یہ سب۔ لو یہ دودھ پی لو۔" محمودہ گلاس لیے کمرے میں آئی تھیں۔ جازمہ نے قلم نوٹ بک پر رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں میں پھنسا کر ایک جھٹکے سے چٹخائیں۔

"اونہوں۔۔ کتنی بار منع کیا ہے ایسا مت کیا کرو۔ نحوست ہوتی ہے اور پھر انگلیوں کے جوڑ بھی کمزور پڑتے ہیں۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔

"اوہ سوری بھول گئی تھی۔ اور آپ نے دودھ میں یہ پھر تخم ملنگاں ڈال دیا۔ اتنا برا لگتا ہے مجھے۔" گلاس کو دیکھتے اس نے منہ بسورا۔

"اچھا ہوتا ہے صحت کے لیے۔ کھاتی کیا ہو سارا دن تم؟ صبح آدھا ادھورا ناشتا۔ باقی وقت یونی کے گندے سندے پیزا، برگر اور وہ نامراد کیمیکل ملا میٹھا پانی (کولڈ ڈرنک)۔ بس یہی تو خوراک رہ گئی ہے تمہاری۔ ذرا بھی خیال نہیں رکھتی ہو اپنا۔ اتنا اچھا کھانا بنایا تھا میں نے۔ سب نے خوش ہو کر کھایا تم سے تو وہ بھی ٹھیک سے دو نوالے نہیں لے گئے۔ اب کم از کم یہ دودھ چپ چاپ پی لو"۔ انہوں نے تو

لیتے ہی لے ڈالے۔ اسے گلاس اٹھاتے ہی بنی۔

''اور وہ چلی گئیں آپ کی بہن؟'' برا سا منہ بناتے ایک گھونٹ بمشکل نگل کر اس نے پھر سے قلم پکڑا اور نوٹ بک کھول لی۔ کل بے حد ضروری اسائنمنٹ جمع کرانی تھی۔ یونی سے واپسی پر وہ اسے ہی مکمل کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ جبکہ شام میں شیریں خالہ اور غزالہ آپی آگئی تھیں اور ان کے وہی پیار بھرے انداز۔

غزالہ بہت عرصے بعد ملی تھیں اور گویا بے تحاشا اداس۔ بازو کے گھیرے میں لیے بیٹھ گئی۔ بار بار والہانہ منہ چوم لیتی۔ کیا کرتی ہو کیا پڑھتی ہو؟ آگے کیا ارادہ ہے؟ تا محبت کم ہو رہی تھی نا سوال۔

وہ مارے باندھے کچھ وقت تو صبر سے بیٹھی رہی پھر جان چھڑاتی بھاگی تو پلٹ کر روم سے ہی نا نکلی تھی۔

"ہاں چلی گئیں۔ میں تو تمہیں بلانے لگی تھی شیریں نے ہی منع کر دیا کہ تمہیں ڈسٹرب نا کروں۔ خیام لینے آیا تھا انہیں۔ ماشاءاللہ بڑا ہی سعادت مند بچہ ہے۔ اللہ عمر دراز کرے۔ میں تو اسے دیکھتی ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ آج کل کے عام نوجوانوں کی طرح ذرا بھی شوشا نہیں ہے اس کی طبیعت میں۔ انتہائی سادہ اور منکسرالمزاج ہے۔ بات بھی کرے گا تو ایسے دھیمے اور شائستہ انداز سے کہ دل موہ لیتا ہے۔ اور تمہیں پتا ہے اس نے پہلے والی جاب چھوڑ دی ہے اب ایک بہترین ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ہو گئی ہے اس کی۔ جو اس کی اچھی کارکردگی کی بنا پر اسے کسی کورس کے لیے ماریشیس بھیج رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو خوب ترقی کرے گا۔" محمودہ کو بھانجے سے پیار ہے اسے علم تھا۔ مگر آج اس کے لیے ایسا اوصافی بیان کس لیے جاری کر رہی تھیں۔ اسے ذرا برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ حلق میں اترتے میٹھے گھونٹ ایک دم ہی کڑوے ہو گئے۔ گلاس سائڈ میز پر تقریباً پٹخ ڈالا۔

اور پھر سے نوٹ بک پر جھک گئی۔ لیکن اگلے ہی چند ثانیوں میں جھٹکے سے سر اٹھانا پڑا۔ وہ پوچھ رہی تھیں۔

"تمہیں کیسا لگتا ہے خیام؟"

"کیا مطلب؟" اس نے ہونق ہو کر ماں کی صورت دیکھی۔ جن کے ہونٹوں پر پھیلی پر سکون مسکراہٹ پورے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔

"مطلب یہ میری جان۔ مجھے اور تمہارے بابا کو تو خیام بے حد پسند ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے۔ اس کی عادات، اس کی قابلیت ہم سب جانتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس کے برابر کا کوئی نہیں۔ لائق فائق بچہ ہے۔ کسی طرح کا کوئی ابہام نہیں۔ جلال بھائی اور شیریں جس طرح ہم سے محبت رکھتے ہیں ہمیں اس پر بھی کوئی شبہ نہیں۔ ایکچوئلی شیریں آج اتنی ڈھیر ساری مٹھائی صرف خیام کی جاب کی خوشی میں ہی نہیں لائی تھی۔ بلکہ وہ تو ہمیں اپنی دیرینہ خواہش بتانے آئی تھی کہ وہ ہماری پیاری گڑیا کو اپنی بیٹی بنا کر لے جانا چاہتی ہے۔" یہ سب بتاتے محمودہ کی آنکھیں ان کے اندر کا حال بیان کر رہی تھیں وہ کس قدر خوش ہیں۔ ان کے لفظ لفظ سے امرت ٹپک رہا تھا۔ اور وہ...... وہ تو یہ سب سن کر فریز ہو گئی تھی۔ یعنی اس دن جو خدشہ لاحق ہوا تھا وہ غلط نا تھا۔ اور بات اس حد تک پہنچے گی یہ تو اندازہ ہی نا تھا۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔ مم۔۔۔۔ مماااا۔۔" کچھ کہنے کی کوشش بے کار گئی وہ صرف ہکلا کر رہ گئی۔

''ہاں۔۔ ہاں۔ میں سمجھتی ہوں۔ تمہارے ایگزام میں کم ٹائم رہ گیا ہے اس لیے تو تمہارے بابا نے کہہ دیا کہ جب تک جازمہ کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی وہ ایسا کوئی ذکر نہیں چھیڑنا چاہتے۔ وہ دھیان سے اپنی پڑھائی کرے پھر کچھ سوچیں گے۔ مت پوچھو بڑی مشکل سے ٹالا ہے شیریں کو۔ وہ تو اس بات پر مصر تھی کہ خیام کے ماریشیس جانے سے قبل

منگنی کی رسم کر لیتے ہیں۔" محمودہ اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہے گئیں۔

" میں تو رملہ کو ہی گھر سے بھیج کر اداس رہتی ہوں۔ تمہارے جانے کا تو سوچ کر بھی روح لرزنے لگی ہے۔ لیکن بیٹیوں کے والدین کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو گی کہ وہ وقت پر ان کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اب تو بس ایک ہی دعا ہے اللہ تم دونوں کی طرف سے ہمارا دل ٹھنڈا رکھے۔ بلکہ سب بیٹیوں کے والدین کے دلوں کو مطمئن رکھے۔ اچھا اب تم ساری رات یہ کتابیں لے کر مت بیٹھی رہنا۔ ٹائم سے سو جاؤ۔" وہ اس کا ماتھا چوم کر تاکید کرتیں کمرے سے جا چکی تھیں۔ اور بے خبری میں اس کا سارا سکون بھی لے گئی تھیں۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہونے لگا اور آخر کار اس نے سوچ لیا کہ صبح ہوتے ہی مما سے کہہ دوں گی مجھے خیام سے شادی نہیں کرنی۔ اور سکون سے سو گئی۔

☆☆☆

وہ بھور بن گیا ہوا تھا۔ وہاں کی حسن و خوب صورتی کے بے شمار قصے تھے اس کے پاس۔ جس رفتار سے اس کی زبان چل رہی تھی اسی تیزی سے وہ سامنے رکھے آئسکریم کپ سے بھی انصاف کر رہا تھا۔ جبکہ وہ ٹیبل پر کہنی رکھے مٹھی ٹھوڑی تلے دبائے اس وقت سے اب تک کپ میں صرف چمچہ گھما رہی تھی۔ اور اسے احساس ہوا تو بے اختیار کہہ گیا۔

" تمہارا کھیر کھانے کا موڈ تھا تو پہلے بتاتیں۔ میں آئسکریم آرڈر نا کرتا۔" وہ خفیف سا ہنستے گویا بادل ناخواستہ چمچہ منہ تک لے گئی۔

" اونہوں۔۔ مت کھاؤ۔۔ اب اس پگھلی ہوئی آئسکریم میں کیا خاک ٹیسٹ رہ گیا ہوگا۔ ٹھہرو۔ میں دوسری منگواتا ہوں۔"

" نہیں۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ میں کھا رہی ہوں۔" اب وہ دوسرا چمچہ بھر کر منہ میں ڈال رہی تھی۔

" لگتا ہے یونی میں پڑھاتے نہیں ہیں بلکہ تم سے پہاڑ تڑواتے ہیں۔ اتنی بے زار اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟"

" کچھ نہیں۔ اٹس آل رائٹ۔" شجاع نے شانے اچکائے جازمہ کا پورا دھیان کپ پر تھا اور اس کا جازمہ پر۔ جب اس نے چمچہ رکھ دیا۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کر لیے۔ تب پوچھا۔

" ہاں اب بتاؤ۔ اصل بات کیا ہے؟ تم نے مجھے کہا کہ آئسکریم کھانے کا موڈ ہے جب کہ ایک اسکوپ تم نے جس طرح کھایا ہے وہ میں بہت اچھے سے دیکھ چکا ہوں۔ سو کیری آن؟"

اور وہ صبح تک تو بالکل فریش تھی۔ کسی فکر کا احساس نہیں تھا۔ لیکن ناشتے کی میز پر محمودہ سے جو گفتگو ہوئی اس نے اچھا خاصا موڈ خراب کر دیا۔ یونی میں بھی کسی لیکچر پر توجہ نا دے سکی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ خیام آج رات کی فلائٹ سے ماریشیس جا رہا تھا۔ اور محمودہ کا خیال تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اسے سی آف کرنے جائے۔ اس نے صاف کہہ ڈالا۔

" سوری مما۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اینڈ آئی تھنک کہ آپ اور بابا کا جانا بھی ایسا کوئی ضروری نہیں ہے۔"

" کیا مطلب ہے تمہارا؟" انہیں اس کا یوں کہنا یقیناً اچھا نہیں لگا تھا۔ تنک کر پوچھا۔ " شیریں خالہ بے شک بہت اچھی ہیں۔ اور خیام بھی اچھا ہوگا لیکن آپ سب جو چاہ رہے ہیں میرا اس پر دل نہیں مان رہا۔" نظر چرائے، سر جھکا کر جھجکتے آخر کہہ ہی دیا۔ محمودہ کئی ثانیے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئیں۔ پھر جیسے اس کی ناسمجھی پر مسکرا دیں۔ دل کی بات پر زیادہ کان نہیں دھرتے۔ دل کے پاس کون سا آنکھیں ہوتی ہیں۔ ہاں آنکھیں دماغ کے قریب

ہوتی ہیں اور وہ دیکھتا بھی ہے، سوچتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ زندگی کے اہم فیصلے کبھی بھی صرف دل کی آواز پر قائم نہیں کرنے چاہئیں۔ کیونکہ ان کی پائیداری کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ اور پھر تم کیوں الجھ رہی ہو۔

ابھی تم صرف اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔ ہم ہیں نا۔ تمہارے لیے یقیناً بہتر سوچ سکتے ہیں۔ بس تم یونی سے واپسی پر پارلر کا چکر لگالینا۔ بال دیکھو کیسے جھاڑ جھنکار سے ہو رہے ہیں۔ ذرا خود پر بھی دھیان دے لو۔ اور ناشتا ٹھیک سے کرو۔ میں تمہارے بابا کو دیکھوں۔ ٹائم سے بستر خود نہیں چھوڑتے۔ آفس سے لیٹ ہو جاتے ہیں تو مفت میں شامت میری لے آتے ہیں۔"

"آپ میرے لیے بہتر ہی سوچیں گے مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ میری پوری زندگی کا معاملہ ہے اس میں میری رضامندی کی اہمیت بھی اسی قدر ہونی چاہیے یا نہیں؟" محمودہ کے اٹھتے قدموں کو اس کے سوال نے زنجیر کیا تھا۔ وہ پلٹ کر کرسی پر آ بیٹھیں۔

"بالکل میرے بچے بالکل۔ تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے تو تمہاری رائے بھی مقدم ہوگی۔ لیکن بات یہ ہے کہ تم ابھی اپنے بابا کی نظر میں اتنی سیانی نہیں ہوئیں کہ تم پر سوچ بچار کا بوجھ ڈالا جائے۔

بلکہ سچ پوچھو تو انہوں نے مجھ سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ان کا خیال ہے کہ رملہ کے وقت اس کی اور میری مرضی کے نتائج وہ بھگت رہے ہیں۔ سو اس بار ہر فیصلہ وہ خود کریں گے۔ اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ رملہ انہیں پیاری ہے تو تم ان کی جان ہو۔ تمہارے معاملے میں تو وہ مجھ پر بھی اعتبار کرنے کے حق میں نہیں رہے۔ لیکن اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو تم خود ان سے بات کر سکتی ہو۔ ویسے تمہیں اعتراض کیا ہے؟" اور ان کے سوال نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔ ابھی وہ اپنا اعتراض بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ بابا نے انہیں آواز دے لی۔ وہ لپک کر ادھر گئی تھیں۔

وہ بوجھل دل لیے یونی چلی آئی۔ کچھ اور نا سوجھا تو شجاع کو کال کر ڈالی۔ اور اب اس کے روبرو بیٹھی نئے سرے سے لفظوں کی ترتیب جوڑ رہی تھی۔ ان کی اچھی گپ شپ رہتی تھی۔ کبھی واٹس ایپ، کبھی فون کال۔ وہ اس کی پلکس پر ڈھیر سارے توصیفی جملے کہہ دیتی اور وہ اعزاز سمجھ کر وصول کرتا۔ وہ اس کی اسٹڈی کے بارے پوچھ لیتا۔ وہ اس کے بزنس کی خبر لے لیتی۔ موسم، فیشن، حتی کہ سیاست پر بھی لمبی بحثیں چلتیں۔

ان کی باتیں بے حد عام سی باتیں ہوتیں۔ کوئی بھی خاص بات تو نا ہی اس نے کہی تھی نا ہی وہ کر پائی تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس سے باتیں کرنا، اسے سوچنا، اس سے رابطے میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ مگر جب سے گھر میں خیام کا نام لیا جانے لگا تھا بے چینی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اب بھی اضطراب نوک زباں تک چلا آیا۔ شجاع نے اس کے مرمریں ہاتھوں سے اک پل کو نگاہ نہیں ہٹائی تھی جو اس دوران ایک ٹشو کو کھولتے اور تہ کرتے رہے تھے۔

"ہوں۔۔۔ تو یہ مسئلہ ہے۔" ساری رام کہانی سننے کے بعد اس نے پر سوچ انداز سے ٹیبل پر انگلیاں بجائیں۔ اور کئی لمحے بجاتا ہی گیا۔ وہ منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ اور پل بیتے۔ اس کی متحرک انگلیاں ساکت ہوئیں۔

"خیام...... ہوں...... زوار بھائی کی شادی پر ہی ملاقات ہوئی تھی۔ ایسا برا بھی نہیں ہے۔ آئی تھنک ہی از نائس پرسن۔" وہ یوں کہہ رہا تھا۔ جیسے اس نے اپنی پریشانی شیئر نا کی ہو بلکہ خیام کے لیے رائے مانگی ہو۔ جازمہ کا دماغ بھک سے اڑا۔ دل کی دھڑکن الگ بے ربط ہوئی۔ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھتی بلاشبہ وہ انتہائی ہونق لگ رہی تھی۔ شجاع

کان کی لو کھجاتا سامنے سے آتے ویٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھا ہی نہیں۔

" اور کیا کہہ رہی تھیں تم......؟" چند لمحوں بعد اس کی جانب رخ کیا۔ اور ایسی معصومیت سے پوچھا کہ وہ اس انداز پر تلملا اٹھی۔ انگلیوں میں دبا ٹشو مسل کر پرے پھینکا۔

" کچھ نہیں ایویں فضول بکواس کر رہی تھی میں۔ سوری تمہارا بہت سا قیمتی وقت لیا۔ تمہاری کوئی ضروری میٹنگ ہوگی تم نے وہاں جانا ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔ " اب اس سے زیادہ برداشت کا مظاہرہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی اور ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ شجاع پہل کرے۔ محبت نہایت خوب صورت احساس ہے۔ اور اس کی خوب صورتی مزید دو چند ہو جاتی ہے جب محبوب اس کے ماتھے پر اپنے حسین لفظوں کا جھومر سجا دے۔ اور ابھی اس کی محبت اس زیور سے آراستہ نہیں ہوئی تھی کئی بار جازمہ کو یہ مفلسی بے حد کھلتی تھی۔ مگر کیا کرتی جانے وہ ایسا لاپروا کیوں تھا۔ سارے زمانے کی کہانیاں سنا دیتا تھا مگر نہیں سناتا تھا تو وہ کہانی جو وہ سننا چاہ رہی تھی اور اب بحالت مجبوری حال دل سنانا پڑ ہی گیا تھا تو وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسے بے پناہ سبکی کا احساس ہوا۔ خوب رونا آیا جھپٹ کر بیگ اور نوٹ بک اٹھائی۔

" ارے...... ارے...... جازمہ...... یہ کیا کر رہی ہو؟ پلیز کول...... سٹ ڈاؤن۔ اینڈ لسن می۔ " شجاع نے بیگ پکڑ لیا۔

" چھوڑو میرا بیگ۔ کچھ نہیں سننا میں نے۔ " بیگ لینے کی کوشش میں ناکام ہو کر باوجود روکنے کے کئی آنسو چھلک کر سرخ پڑتے رخساروں پر پھسل آئے۔

" اوہ...... پلیز...... پلیز...... رونا نہیں۔ سنبھالو خود کو۔ مذاق کر رہا تھا بھئی۔ تم نے تو سیریس ہی لے لیا۔

تم نے آنٹی کو انکار کر دیا بالکل ٹھیک کیا۔ اور اب گھبراؤ مت۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ " وہ جلدی جلدی بول رہا تھا جازمہ ایک بار پھر شاکڈ ہوگئی۔ یعنی کیا صرف وہ چاہ رہی تھی اور وہ......اور اس کی آنکھوں کے پھیلاؤ کو دیکھ کر شجاع کو اپنے جملے کے الٹ پن کا احساس ہوا تو جھٹ تصحیح کی۔

" اوہ...... اکین سوری۔ آئی مین۔ جو ہم چاہ رہے ہیں وہی ہوگا۔ ڈونٹ وری۔ " جازمہ نے وہی بیگ اسے دے مارا۔ وہ چھ فٹا نوجوان اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ وہ اب میز پر سر رکھے چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔ اور شجاع کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے چپ کروائے۔ ذرا سا مذاق یوں گلے پڑے گا۔ اندازہ نا تھا۔ آخر کار سارا غبار نکال کر سیدھی ہو بیٹھی۔

" تھینکس گاڈ......! میں تو گھبرا ہی گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ فلڈ (سیلاب) آ جائے مجھے میز پر چڑھ کر بیٹھ جانا چاہیے۔ " اور جازمہ نے اس کے مسکراتے چہرے کو رج کے گھورا۔

" ویسٹ میں تو بہت عام سی بات ہے۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسٹ میں جہاں اور معاملات میں ترقی کر گیا ہے وہاں اس معاملے میں بھی خاصی بہتری آئی ہے۔ بلیو می۔۔ بہت اچھا لگا مجھے۔ " وہ جانے کس بات پر سر دھن رہا تھا۔ جازمہ استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شجاع نے کھلی آنکھوں میں پورے دھیان سے جھانکا۔

" رئیلی...... آئی ایم ویری امپریسڈ۔ اور اس کے چہرے پر پھیلی شرارت دیکھتے ہی اچھی طرح سمجھ آ گئی اس کا اشارہ کس بات کی طرف ہے۔ بری طرح جھینپتے جس ٹشو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی وہی کھینچ مارا۔

" ارے تم تو خوں خوار لڑکی ہو۔ ٹھہر جاؤ مجھے ایک بار پھر سوچ لینے دو۔ " شجاع نے شرارت سے کہا تو ایک دم ڈھنس پڑی۔

☆☆☆

" یہ لیں آپی! مما کے بنائے آپ کے فیورٹ کباب اور یہ ہے چائے وہ بھی میرے حسین ہاتھوں کی بنی پیجیے اور داد دیجیے۔" وہ دور سے ہی اعلان کرتی آرہی تھی۔ رملہ نے گھٹنے پر دھرے میگزین سے آنکھ اٹھا کر دیکھا وہ دونوں پاؤں اوپر سمیٹے صوفے پر بیٹھ گئی ٹرے درمیان میں رکھ لی۔ کباب کا ایک ٹکڑا توڑ کر ہری مرچ کی چٹنی میں ڈبوتے کہا۔

" دیکھو مت آپی کھاؤ۔ ایمان سے بہت مزے کے ہیں۔" رملہ نے میگزین ٹیبل پر اچھال کر ریموٹ پکڑ لیا۔

" سنا ہے شیریں خالہ ڈھیر ساری مٹھائی لائی تھیں۔ کیا سب ختم ہوگئی وہ تو ابھی تک تم نے چکھائی ہی نہیں مجھے۔ حالانکہ وہ مٹھائی تو پہلے لے کر آنا چاہیے تھی تمہیں۔ آخر اتنے خاص الخاص موقعے کی مٹھائی ہے۔"

" آئی ہیٹ مٹھائی۔ نا میں نے وہ دیکھی نا کھائی۔ سو مجھے نہیں پتا۔ آپ نے کھانا ہے تو مما سے پوچھ لیں۔"

" کیوں تم نے کیوں نہیں دیکھی اور کھائی۔ حد ہے بھئی۔ تمہاری زندگی سب سے بڑی خوشی کی مٹھائی۔ آج کل تو لڑکیاں اپنی شادی کے لڈو خود ہی بانٹنے نکل جاتی ہیں۔ اور تم نے کسی کو بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ کیا بات ہے کیا تم خوش نہیں ہو؟"

" میں نے مما کو بتا دیا تھا۔" اس نے فورک رکھ کر مگ اٹھالیا۔

رملہ نے ذرا سا ترچھا ہوتے رخ اس کی جانب کیا۔

" کیا بتا دیا تھا؟"

" یہی کہ مجھے خیام سے شادی نہیں کرنا۔"

" کیوں کیا برائی ہے خیام میں۔" رملہ کا لہجہ ہی نہیں بلکہ چتون بھی تیکھے ہوگئے۔ جازمہ نے مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔

" بولو۔۔ بتاؤ۔۔۔ خیام سے شادی نہیں کرنا تو کس سے کرو گی؟ کیا شجاع سے؟ سچ بتاؤ کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟"

اُف۔۔ چکر۔۔۔ کتنا واہیات لفظ ہے اسے تو سن کر ہی چکر آ گیا بلکہ تیزی سے گھونٹ نگلنے کے چکر میں اچھو لگ گیا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں حلق سے صرف کھوں کھوں ہی نکلا۔

" غضب خدا کا۔ میں تو حیران ہوں تم پر۔ ہاں ٹھیک ہے شجاع گڈ لکنگ ہے لیکن شادی کے لیے صرف صورت ہی میٹر نہیں کرتی اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔ میں رہتی ہوں اس فیملی میں۔ مجھے علم ہے وہ سب لوگ کیسے ہیں۔ جہاں میں خوش نہیں۔ جس گھر میں مجھے من چاہی خوشیاں نا مل سکی ہوں اسی گھر میں تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارا کیا خیال ہے میں کسی کو ایسی بے وقوفی کرنے دوں گی۔ نو۔۔ نیور۔ تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔"

" سوری ٹو سے آپی۔ اگر آپ اس گھر میں خوش نہیں ہیں تو اس میں سراسر قصوروار وہ فیملی نہیں ہے بلکہ اس میں ایٹی پرسنٹ مسٹیکس (غلطیاں) آپ کی طرف سے ہیں۔" وہ بے دھڑک کہہ گئی۔

" یہ...... یہ تم کہہ رہی ہو جازمہ......؟ تم میری غلطی نکال رہی ہو۔ تم جانتی ہی کتنا ہو ان لوگوں کو۔ تم میرے بجائے ان سب کی سائیڈ لے رہی ہو۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم اپنی بہن کو جھوٹا قرار دے رہی ہو۔ واٹ ربش......" مارے دکھ اور صدمے کے رملہ کے گال دہکنے لگے۔ محمودہ اس کی آواز سن کر آئی تھیں۔ اور حیران پریشان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف مڑی۔

" دیکھیں......مما دیکھیں اپنی لاڈلی کو......سنیں اس کی باتیں۔ اتنی بدتمیز ہو گئی ہے یہ۔ مجھے جھٹلا رہی ہے۔ ارے اگر زوار میرے ساتھ اچھے نا ہوتے نا تو

وہ گھر میں کب کی چھوڑ کر آ گئی ہوتی۔ کسی کو کیا پتا کیا سلوک ہوتا ہے وہاں میرے ساتھ۔"

"کیا سلوک ہوتا ہے آپ کے ساتھ؟ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں آپی۔ زوار بھائی کی خوبی آپ خود مان رہی ہیں۔ باقی بھی وہ سب بہت اچھے ہیں۔ بس آپ ذرا اپنے دل اور ذہن کو کشادہ کر لیں۔ اگر وہ لوگ آپ سے کچھ توقعات رکھتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ بڑی بہو ہیں آپ اس گھر کی۔ اور پھر دنیا کا وہ کون سا گھر ہے جہاں عورت خود کام نہیں کرتی۔ چلیں میں سارے زمانے کی مثالیں چھوڑ کر آپ کو صرف مما کی مثال دیتی ہوں۔ کیا مما کچن نہیں سنبھالتیں۔ کیا بابا فرمائشیں کر کر کے کھانے نہیں پکواتے۔ ہمارے ہاں تو کبھی کوئی کک نہیں رکھا گیا۔ میں نے ہمیشہ سے مما کو ہی کوکنگ کرتے دیکھا ہے۔ اب اگر آنٹی ہاجرہ کی خواہش ہے کہ آپ ایٹ لیسٹ کچن پر ہی توجہ دے لیا کریں تو اس میں غلط کیا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ رملہ کا غصہ دوچند ہو گیا۔ محمودہ کو بھی اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

"جازمہ بی ہیو یور سیلف۔ یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو بڑی بہن سے اور کیوں۔ تم ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں کہ اس سے کوئی سوال کر سکو۔ اس کے گھر کے معاملات ہیں وہ جانے اور اس کا گھر۔ تمہارا اس سے کیا لینا دینا۔"

"ہاں اب بتاؤ نا مما کو۔ تمہارا کیا لینا دینا۔ خیام کو ریجیکٹ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اور یہ آپ کو کیا بتائے گی مما۔ میں بتاتی ہوں۔ آپ کی اس شہزادی کی وجہ سے میرے پورے سسرال میں طوفان مچا ہوا ہے۔ میری ساس نے باتیں سنا سنا کر میرے ناک میں دم کر ڈالا۔ انہوں نے تو پہلے ہی مجھ سے خواہ مخواہ کا بیر باندھ رکھا ہے۔ میری ہر بات پر اعتراض ہے انہیں اور اب تو سولڈ ریزن مل گیا ہے۔ مجھے طعنے مارنے کا۔ وہ اپنے لاڈلے کے لیے اپنی کوئی بھتیجی منتخب کر بیٹھی تھیں اور آج کل میں ہی رشتہ لے کر جانے والی تھیں کہ اس ذکر پر شجاع نے جازمہ کا نام لے دیا کیونکہ بقول اس کے ان دونوں کی بہترین انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ اور وہ اس سے ہی شادی کرے گا۔ اور آنٹی تو یہ بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئیں اور صاف انکار کر دیا۔ جب میں ان کی ناک تلے نہیں آئی تو وہ پاگل ہیں جو میری بہن کو بھی اٹھا کر اپنے گھر لے جائیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کتنی ایمبیرس ہو رہی ہوں میں وہاں۔ صرف اس کی وجہ سے۔ کیا ضرورت تھی اسے شجاع سے پینگیں بڑھانے کی۔" وہ پھپھک کر رو دی۔ محمودہ بت بنی کھڑی تھیں۔ اور اس کے احساسات کیا تھے یہ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جن معاملات کو بہت ہلکا لے رہی تھی وہ اتنے بھی سیدھے نا تھے۔ اس کا خیال تھا اس نے خیام کے لیے انکار کر دیا ہے اب شجاع کا پرپوزل آئے گا۔ اور پھر زندگی ہنسی خوشی کی عملی تفسیر بن جائے گی۔

لیکن جہاں ہم اپنے فہم و ادراک کے مطابق تصویر زندگی میں رنگ بھرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسی مقام پر غلط اسٹروک لگنے سے ساری تھیم کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

کبھی کبھی ہم خوش گمانیوں کے غبارے میں ہوا بھرے اسے اتنا اونچا اڑا کر لے جاتے ہیں کہ پھر تلخ حقیقت کی فقط ایک سوئی ہمیں دھول چٹا دیتی ہے۔ تقدیر کی دکان پر تدبیر کا سکہ صرف قسمت والوں کا ہی چلتا ہے۔ اور وہ خوش قسمت ہے یا نہیں یہ فال ابھی باقی ہے۔ محمودہ کی نظروں میں کیسی بے یقینی تھی کہ اس سے ان کے سامنے ٹھہرا ہی نہیں گیا۔ اور یوں بھی جس طریقے سے رملہ نے داستان سنائی تھی۔ اب اس کے بعد اس کی ہر صفائی بے کار ہی جاتی فی الحال یہی بہتر تھا کہ وہ منظر سے ہٹ جائے۔ اور اس نے یہی کیا تھا باہر رملہ بپھر ہوئی محمودہ

کو رو رو کر دکھی پیتا سنا رہی تھی۔ اور کمرے میں اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ یہ ایک عجیب شام تھی جو اس گھر میں اتری تھی۔

☆☆☆

جانے رملہ نے کیا سوچ رکھا تھا۔ جب بھی آتی پلو میں اک فتنہ بندھا ہوتا۔ ادھر گرہ کھلی ادھر اثرات سارے گھر پر چھا جاتے۔ محمودہ ہر بار زیادہ زد میں آتیں کہ وہ ماں تھیں۔ جس کی ہر ہنسی اور اداسی اولاد سے ہی مشروط ہوتی ہے۔ دنیا والوں نے تو یونہی بات بنا رکھی ہے کہ بیٹی بیاہ کر والدین فارغ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تب ہی تو ان پر بوجھ بڑھتا ہے۔ خاص طور پر ماں کی ذمہ داری دہری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بیٹی کو اپنا ہر دکھ سکھ سنبھالنے کے لیے ماں کا دامن ہی درکار ہوتا ہے۔ رملہ تو رو دھو اپنا بوجھ ان کے کاندھوں پر ڈال خود ہلکی پھلکی ہو کر چلتی بنی۔ اور پہلے جب بھی ایسا ہوا کہ وہ اس کی طرف سے ذرا بھی ٹینشن لیتیں تو جازمہ کسی نا کسی طرح ان کا دھیان بٹا لیا کرتی مگر اس بار تو وہ اس سے سخت خفا تھیں۔ چار روز ہو گئے تھے ماں بیٹی کے درمیان بات چیت نا ہونے کے برابر تھی ضرور تا کوئی ایک آدھ جملے کا تبادلہ ہوا ہو تو ہو ورنہ وہ منہ پھیر کر گزر جاتیں۔ صبح ناشتے پر ہی ہزار تاکیدیں کرنے والی ماں یکسر غافل ہو جائے تو روح کس صدماتی کیفیت سے گزرتی ہے یہ کوئی جازمہ سے پوچھتا۔ اچانک سے جو حالات بن گئے تھے ایسا تو گمان کے ہزارویں حصے میں بھی نا تھا۔ وہ تو خوش رنگ خوابوں کی انگلی تھامے سیدھی سڑک پر چل رہی تھی کہ کسی نے اونچی نیچی پگڈنڈی پر دھکیل دیا تھا۔ پاؤں میں کانٹا کھب گیا تھا۔ اور اب نکلے گا کیسے کچھ خبر نا تھی۔

ادھر اس صورت حال سے شجاع بھی پریشان تھا مگر اسے تسلی دیے رکھتا۔

لیکن اسے قرار کہاں۔ محمودہ کے رویہ نے الگ جان نکال رکھی تھی۔ کب تک ان کی چپ سہتی۔ وہ کچھ کہیں تو چاہے برا بھلا ہی سہی وہ سن لے گی۔ وہ الماری میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب چپکے سے ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا پھر اسی رخ ہو گئیں۔ وہ انگلیاں چٹخاتے بولنے کی ہمت مجتمع کر رہی تھی۔ اور آج پہلی بار ہوا کہ انہوں نے فوراً رد کا نہیں بس مڑ کر اک سخت "گھوری" سے نوازا۔ اور زور سے پٹ بند کرتی بیڈ پر جا بیٹھیں۔ اب وہ سائڈ ٹیبل کی دراز کھنگال رہی تھیں۔ اور اس کی برداشت یہیں تک تھیں۔ آنسو قطار در قطار رخساروں پر بہتے چلے گئے۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟ رونا تو مجھے چاہیے۔ حیف ہے ایسی ماں پر جو دو بیٹیوں کی تربیت بھی ٹھیک سے نا کر سکی۔" اس کی سوں سوں نے نئے سرے سے کھولایا تھا تڑخ کر بولیں۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میرا کیا قصور ہے؟ آپ کیوں کہہ رہی ہیں ایسا؟ اگر آپی کا رویہ اپنی سسرال میں سب کے ساتھ اچھا ہوتا تو آنٹی کیوں خفا ہوتیں۔ تب کیا وہ انکار کرتیں؟" اسے تو اصل صدمہ ہی یہی تھا۔ جھٹ سے شکوہ کیا۔

"لو بھلا...... تمہیں تو آج کے سارا گناہ رملہ کا ہی نظر آ رہا ہے۔ چلو میں مان بھی لوں کچھ غلطی اس کی ہو گی تب بھی ہاجرہ بھابھی کو میں بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی۔ یہ سسرالی رشتے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ریشم سے زیادہ نرم، الجھنے میں تو ایک پل نہیں لگتا انہیں۔ یہاں مقابلے اناؤں کے چلتے ہیں۔ جس میں ہار کوئی نہیں مانتا۔ ہاجرہ بھابھی نے تو اللہ جانے کیوں میری بچی کے ساتھ دشمنی مول لے رکھی ہے۔ اس کے ہر ہر کام میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔ زچ کر چھوڑا ہے اسے۔ اور وہ تمہارے سامنے سب بتاتی بھی رہی ہے اور پھر بھی تم...... مجھے شدید دکھی کیا ہے تم نے جازمہ۔ مجھے تو تمہاری عقل پر افسوس ہے۔

تمہارے بابا نے جلال بھائی اور شیریں کو صرف اس لیے ٹالا کہ وہ تمہارے ذہن پر کوئی اضافی بوجھ نہیں ڈالنا چاہ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی میرا تمہیں بتانے کا یہی مقصد تھا کہ تم اپنا مائنڈ میک اپ کر رکھو۔ میں جانتی ہوں ایک لڑکی کے لیے رشتوں کو ایک دم سے قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ وقت لگتا ہے دل و ذہن کو تیار کرنے کے لیے۔ سب سمجھنے کے لیے۔ اور جتنا وہ سب کو جان لے گی اتنا ہی بہتر طور پر ایڈ جسٹ کر سکے گی۔ شیریں اور جلال بھائی کا کردار تمہارے سامنے ہے۔ خیام کو تم بچپن سے جانتی ہو اس کی عادات، اس کا مزاج کچھ بھی تم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے بہتر ساتھی ثابت ہوگا۔ تمہارے بابا نے بے حد سوچ......"

"شجاع بھی برا نہیں ہے مما۔۔ بہت اچھا ہے وہ"۔ جس بے تابی سے ان کی بات کاٹ کر بولی تھی محمودہ کو بے پناہ غصہ آیا۔ اسے گھورنے کی چاہ میں نظر روتی صورت پر ٹکائی تو چھپا چھپ برستے مینہ نے لبوں پر قفل ڈال دیا۔ ماں کا دل تھا تسفنج بن کر گویا اس کی آنکھوں سے ہی چپک گیا۔ بے اختیار ایک ہاتھ سر پر جا ٹکا۔ ان کی اس بیٹی نے بچپن میں تو کبھی انہیں نہیں ستایا اور اب بڑی ہوگئی تھی تو اس عمر میں......اور انہوں نے ٹھٹک کر ماتھے سے ہاتھ ہٹایا۔

عمر......ہاں یہ عمر کا ہی تو مسئلہ ہے۔ ناسمجھی اور نادانی کے دورے اس عمر میں ہی تو پڑتے ہیں۔ یہی تو وہ عمر ہے جب آسمان زمیں پر اتر آتا ہے۔ قدم راستوں پر نہیں کہکشاؤں پر پڑتے ہیں۔

بصارت یوں چکا چوند ہو جاتی ہے کہ سفید کپڑا بھی رنگین نظر آنے لگتا ہے۔ چاند مٹھی میں قید کرنے کی تمنا ہلکورے لیتی ہے۔ خواب، خواہشیں تتلیاں بن کر اپنے پیچھے دوڑاتی ہیں۔ اب اگر کوئی تتلی اسے بھی بہکا کے لے گئی تھی تو اس میں کچھ نیا نا تھا۔ وہی بابا آدم کے زمانے سے چلی آنے والی داستان۔ جو کہیں بھی کسی بھی روپ میں وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

"اف۔۔ جازمہ تم نے تو مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے بیٹا۔ تمہارے بابا تو اپنے تئیں فیصلہ کیے بیٹھے ہیں۔ اور اب یہ حالات......اوہ میرے اللہ مجھے نہیں پتا اس گھر میں کیا ہونے والا ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر ایک بار پھر ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ جازمہ نے ان کا بازو پکڑا۔

"پلیز مما...... میری پیاری مما۔ آپ بات کریں نا بابا سے"۔

"ہاں......ہاں۔ تم سب کو بس میری ہی گردن پتلی نظر آتی ہے۔" چڑ کر بازو چھڑایا۔

"مما پلیز...... ایک آپ ہی تو میری امید ہیں۔" وہ جس ملتجیانہ لہجے میں منمنائی کوئی اور بھی ہوتا تو موم ہو جاتا وہ تو پھر ماں تھیں۔ دل پگھل گیا۔ لیکن کہے بنا کیسے رہتیں۔

"کیوں امتحان گاہ میں گھسنا چاہتی ہو میری بے وقوف بچی۔ سب جانتے بوجھتے بھی ضد کرنا تمہاری نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاجرہ بھابھی اس رشتے کے لیے تیار نہیں اور تم پھر بھی امید لگائے بیٹھی ہو۔"

"شجاع منا لے گا انہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے بس آپ بابا کو سنبھال لیں۔" انہیں نرم پڑتے دیکھ کر جان میں جان آئی تھی۔ دوپٹے سے گال رگڑے۔ قریب کھسک کر پھر سے بازو پکڑا۔

"تمہارے بابا سے تو میں بات کر ہی لوں گی۔ پہلے تم شجاع سے کہو اپنی ماں کو راضی کرے۔"

"کر لے گا۔ بہت پیار کرتی ہیں آنٹی اس سے۔ وقتی غصہ ہے ان کا۔ اتر جائے گا۔ اینڈ پلیز ایک اور ریکویسٹ ہے آپ سے۔ آپی سے کہیں میری خاطر اپنا رویہ تھوڑا چینج کر لیں۔ ہماری شادی ہو جائے۔ پھر جو مرضی کرتی رہیں۔" بازو پر دباؤ اور

بڑھ گیا۔ انہوں نے ترحم آمیز نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ جہاں اب آنسوؤں پر ایک خاص طمانیت جگمگا رہی تھی۔ اور یہ طمانیت ہمیشہ برقرار رہے ان کے دل نے شدت سے دعا کی۔

"میں ایک بار پھر کہوں گی اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ پتا نہیں آج کل کی لڑکیاں شادی کو سلیس اردو کیوں سمجھتی ہیں۔ بس ایک بار کتاب دیکھیں گی اور فر فر سبق یاد ہو جائے گا۔ جبکہ شادی تو عورت کے لیے حساب جیسی ہوتی ہے۔ جس میں ریاضی، الجبرا کے علاوہ جیومیٹری بھی ہوتی ہے۔ اور جس کی چاہتے نا چاہتے ہوئے۔ بھی تمام مشقیں حل کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے تمام لازمی کلیوں کے ساتھ۔ اور جہاں کہیں ذرا سا بھی کلیہ غلط لگ گیا تو سارا حساب بگڑ جاتا ہے۔ کاپی کے صفحے پر کی گئی غلطیاں تو ربڑ سے مٹا کر درست کی جا سکتی ہیں۔ لیکن زندگی کے ورق پر درج ہو جانے والی معمولی سی بھی کوتاہی دنیا کے کسی بھی ربڑ سے نہیں مٹتی۔

دنیا بھی بازار کی طرح ہے۔ جیسے زندگی کے لوازمات خوب چھان پھٹک کر پسند کیے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جب خواب خریدنے نکلو تو خوابوں کے انتخاب میں بھی جلدی مت کرو۔ بلکہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ کہیں ایسا نا ہو کہ جلد بازی میں زندگی کو منہ مانگی قیمت ادا کر ڈالو۔ بارگیننگ کا اصول تم شاید بھول گئی ہو جو میں نے تمہیں سکھلا رکھا ہے۔ ہر لڑکی کی زندگی میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب وہ اس اصول کو اپنا کر اپنا "آئندہ" محفوظ کر سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ بازار میں رکھی تمام اشیاء ہی خرید لی جائیں۔ بالکل ایسے لازم نہیں کہ سب کے سب خواب بھی پورے ہوں۔ اگر اس وقت خود سے تھوڑا بھاؤ تاؤ کر لیا جائے تو اپنی ذات کے لیے ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"اور کیا یہ اتنا ہی آسان ہوتا ہے جیسے آپ کہہ رہی ہیں۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔

"یقیناً نہیں۔۔ لیکن ناممکن بھی تو نہیں ہے۔"

"اگر آپ میرے لیے دعا کریں گی تو سب اچھا ہو جائے گا مجھے اتنا یقین ہے۔" وہ گود میں دھرے ہاتھوں پر نظر جمائے بولی۔

انہوں نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کا روم روم اس کے لیے دعا گو تھا۔

☆☆☆

کھڑکی کے پار مصروف سڑک پر نظر جمائے جانے وہ کیا کھوج رہا تھا۔ یک لخت سیل فون کی مدھر ٹیون نے چونکا ڈالا۔ اک گہری سانس لیتا وہ میز تک آیا روشن اسکرین پر جو نام جگمگا رہا تھا چند دن قبل تو اسے دیکھتے ہی وہ کال پک کر لیا کرتا تھا مگر اس پل سوچ میں پڑ گیا۔ آیا کال پک کرے یا نہیں۔ اس کا اب بھی وہی سوال ہو گا وہ اسے کیا کہہ کر ٹالے گا؟ اور کال ریسیو نا کرنے پر بھی تو وہ پریشان ہو گی بس اسی خیال سے سیل اٹھا لیا۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک۔۔ تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک۔۔ کیا کر رہے ہو؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ اور شجاع قطعاً نا بتا سکا کہ لنچ بریک ہے مما نے اس کے فیورٹ نرگسی کوفتے بنا کر بھیجے ہیں اور وہ اب تک ایک لقمہ نہیں لے سکا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا ہے۔ بس راکنگ چیئر سنبھالتے کہا تو اتنا۔

"کچھ خاص نہیں۔۔ تم سناؤ کیا ہو رہا ہے۔"

"پلان ہو رہا ہے۔ آج لاسٹ دو پیریڈز فری ہیں تو اس ٹائم کو اچھا سا اسپینڈ کرنا چاہ رہے ہیں۔ ریس کورس میں فلاورز ایگزیبیشن چل رہی ہے وہاں جانے کا سوچ رہے ہیں۔ موسم بھی زبردست ہے۔ خوب انجوائے کریں گے۔" وہ بتا رہی تھی۔ شجاع نے سیل کان سے ہٹا کر دیکھا پھر کان سے لگایا۔ آج کل تو جب بھی بات ہوتی لہجہ بھیگا ہوا ہی ہوتا تھا۔

اور اس پل آواز میں وہی پہلے سی کھنک تھی وہ پوچھے بنا نا رہ سکا۔

"بہت خوش لگ رہی ہو؟"

"ہاں۔۔ بہت خوش ہوں۔ وجہ ہی ایسی ہے۔ پتا ہے میں نے مما سے بات کی ہے۔ ان کو منا لیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے وہ بابا کو بھی راضی کر لیں گی۔ بس ہاجرہ آنٹی رشتہ لے کے آجائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تم بتاؤ کب لے کر آرہے ہو ان کو؟" اور اس کے پاس فی الوقت کوئی تسلی بخش جواب نا تھا۔ ابھی صبح ہی تو گرما گرم مباحثہ چلا تھا ماں بیٹے کے درمیان۔ وہ اپنی ضد پر اڑا تھا۔ اور وہ اپنی بات پر۔ جب کوئی حل نا نکل سکا تو بھوکا پیاسا اٹھ کر آ گیا۔ اب اس صورتحال پر اسے کیا امید دلاتا اور یک دم مایوس بھی کیسے کر دیتا کہہ دیا۔

"ڈونٹ وری۔۔ جلد ہی لے کر آؤں گا۔"

"شیور؟"

"شیورڈ"۔

"او کے آئی ایم ویٹنگ"۔ کال ڈراپ ہو چکی تھی اور وہ تب سے سوچ میں ڈوبا تھا۔ اس نے لڑکی ہو کر اپنے حق کے لیے آواز بلند کر لی تھی۔ تو کیا وہ مرد ہو کر مجبور اور ناکام رہے گا۔ اس سے بڑھ کر بے بسی اور کیا ہو گی۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ اور مائیں تو بے حد معصوم ہوتی ہیں۔ اتنی نرم دل کہ جیسے موم۔ اولاد جیسے چاہے انہیں اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔ اور وہ سانچہ اب اسے تیار کرنا تھا۔

☆☆☆

اور پھر شجاع کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ کچھ بہت نہیں بس ایک آدھ دھمکی ہی کافی رہی تھی۔

ایک مہم محمودہ کو بھی سر کرنا پڑی تھی عتیق صاحب کو سب حالات بتانا پھر منانا کافی مشکل امر تھا۔ لیکن بہر طور یہ معاملہ بھی حل ہو ہی گیا۔ با دل ناخواستہ ہی سہی عتیق ہاؤس کا ڈرائنگ روم اس وقت مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ عباس صاحب کسی نئے ٹینڈر کے بارے میں ازحد پرامید تھے ان کے منہ پر تو ایک ہی بات تھی۔

ہاجرہ کل ہی امپوریم مال سے ہو کر آئی تھیں۔ موسم بدلنے کو تھا مارکیٹس سے ڈیزائنر لان اٹھائی جا رہی تھیں اور ونٹر کلیکشن لائی جا رہی تھیں۔ وہ اس قصے میں الجھی تھیں۔ پھر یاد آ گیا۔

"پہلے کا وقت کتنا سادہ ہوتا تھا۔ یہی کوئی چند سال قبل۔ تب ایسی نمود و نمائش کہاں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی لوگ خوب صورتی کو پسند کرتے تھے مگر نفاست اور سادگی کے ساتھ۔ کم لاگت میں بہترین سے بہترین ملبوسات خواتین گھروں میں ہی تیار کر لیا کرتی تھیں۔ نا صرف ملبوسات بلکہ تمام آرائشی سامان ہاتھوں سے ہی بنانے کو اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ پتا نہیں تب وقت زیادہ ہوتا تھا یا لوگ محنتی تھے۔ ہماری ماؤں نے کیسی ہماری تربیت کی تھی ایک ایک سلیقہ طریقہ گھول کر پلا دیا تھا جیسے۔ پھر جب لڑکی سسرال جاتی تھی تو ساس کی کوشش ہوتی تھی بہو ہر کام میں طاق ہو اور بھئی ہم تو تھے بھی۔ ہمارے لیے تو گھر ہی سب کچھ تھا۔ مجھے تو آج بھی اپنی وہ کیفیت یاد ہے جب شادی کے بعد پہلی بار کھانا بنایا تھا تو سب نے کتنی تعریف کی تھی۔ ابا جی نے تو خوش ہو کر پورے پانچ سو روپے دیے تھے اور وہ تب میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا انعام تھا۔ پھر جب اپنے ہاتھ کے بنے ٹکرائے اور وال ہینگنگ کمروں اور دالان میں لگائے تو اماں جی ہر آئے گئے کو جس فخر اور محبت سے بتاتیں میرا سیروں خون بڑھ جاتا۔ اس وقت کی بہو بیٹیاں اپنے ہاتھوں کے ہنر آزما کر عزت و مان اکٹھا کیا کرتی تھیں۔ اور ایک آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ سچ پوچھو تو توبہ ہی بھلی......" محمودہ جو بڑے جوش کے ساتھ سر ہلاتی جا رہی تھیں اس جملے پر چونکتی ہوش میں آئیں۔ جبکہ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید

کہہ رہی تھیں۔

"ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسی بہو لے کر آئے جو گھر کی عزت و شان بڑھا دے۔ تمہیں یاد ہو گا محمودہ جب ہماری شادیاں ہوئی تھیں تو کیسے بھاگ بھاگ کے سارے سسرال کے کام کیا کرتے تھے۔ دن سے رات ہو جاتی سب کی فکر ہوتی بس ایک ہوش نا ہوتا تو اپنا ہی۔ اللہ بخشے نا چاچی مزاج کی کم تھیں اور نا ہی تائی۔ مجال ہے جو چوں کی اجازت بھی دے جائیں۔ اور ہم نے کیسے ہنستے کھیلتے وہ وقت گزار لیا۔ کبھی کسی کو کان و کان خبر نا ہونے دی کہ آج ہم پر کیا بیتی۔ تمہارا طریقہ زندگی اور سلیقہ مندی میرے سامنے کی بات ہے میں تو تمہیں دیکھتے ہوئے ہی رملہ کو بخوشی بیٹی بنا کر لے گئی۔ مگر...... " وہ ذرا سانس لینے کو رکیں اور ان کا سانس گم ہوا کیونکہ عتیق صاحب نے عباس صاحب کی رام کہانی سے دھیان ہٹا کر ادھر دیکھا تھا۔

"بس اب کیا کہوں میں۔ کچھ کہوں گی تو میرا کہا ہی برا ہو گا۔ سچ ہے اس زمانے میں برے کو برا کوئی نہیں کہتا سب کہنے والے کو پہلے پکڑنے دوڑتے ہیں۔ بھئی اچھا لاڈ پیار کیا تم نے بیٹی سے۔ بگاڑ کر ہی رکھ دیا اسے۔ اپنے خاندان کی بچی ہے اس لیے میں سہہ گئی، ہوتی نا کہیں باہر سے لائی تو...... " صفیہ ٹرالی لے کر آ رہی تھی پیچھے ہی جازمہ تھی۔ بلیک ٹراؤزر کے ساتھ لیمن کلر کی ایمبرائیڈڈ کرتی پر بلیک ہی اسٹالر سلیقے سے لیے۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ جس نے جاذبیت اور دلکشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے دھیمے سے لہجے میں کہے گئے سلام پر عباس صاحب نے اٹھ کر خوش دلی سے اس کا سر تھپکا۔ جب کہ وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھیں۔ یہی تھی وہ لڑکی جس کے پیچھے ان کا فرماں بردار، تابع دار، بیٹا ان کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ کئی دن سے گھر کا ماحول مکدر کر رکھا تھا۔ اور پھر طرہ یہ کہ وہ ہار نہیں مانا الٹا انہیں ہی اس کی دھمکی کے آگے سپر ڈالنا پڑی۔ زوار کی شادی کے وقت ہر ماں کی طرح ان کے بھی ڈھیر سارے ارمان تھے۔ ساری عمر ہو گئی گھر سنبھالتے پہلے ساس کی سختیاں سہیں پھر باہر جا کر بھی آرام نصیب نا ہوا۔ وہاں کا تو بس نام ہی ہے ورنہ سوئی سے لے کر سلائی تک سب کام خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ واپس اپنے دیس سیٹل ہوتے سوچا تھا کہ اب بہو لا کر سکون کرنا ہے مگر ہائے رے نصیب۔ رملہ کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت نے انہیں سچ میں بے زار کیا تھا وہ تو اس سے ہی ناک تک بھری بیٹھی تھیں کہ اب اگلی مصیبت بھی مول لے لیں۔ اب ایسی بھی بے وقوف نا تھیں۔ انہوں نے تولتی نظروں سے ٹرالی سے ٹیبل تک منتقل ہوتی چیزوں کا جائزہ لیا۔

"سچ بتاؤ جازمہ تم نے اپنے ہاتھوں سے کیا کیا بنایا ہے ہمارے لیے" کپ میں چائے انڈیلتی جازمہ نے سر اٹھایا۔

"میں... میں نے تو کچھ نہیں بنایا۔ ایکچوئیلی آج کل بہت ٹف شیڈول چل رہا ہے یونی میں۔ وہاں سے آتے آتے اتنا تھک جاتی ہوں کہ پھر کچن تک جانے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔ " وہ اک پل کو گڑبڑائی تھی پھر اپنے ازلی اعتماد سے وضاحت دی۔

" اچھا...... اچھا۔ مجھے یونہی خیال آیا ذرا تمہاری قابلیت بھی جانچ لوں۔ رملہ نے تو کافی کچھ بنایا تھا نا ہمارے لیے۔ " ان کے چہرے پر گہری ہوتی مسکراہٹ اور لہجے میں عجیب سا استہزاء تھا۔ جبکہ رملہ نے اس وقت شوق شوق میں واقعی دو تین ڈشز بنائی تھیں اور چونکہ محمودہ کی زیرنگرانی بنائی تھیں تو وہ بہترین بن گئی تھیں۔

اب اس موقعہ پر وہ خاص طور پر کیا جتانا چاہ رہی تھیں یہ سب کو ہی سمجھ آ گیا تھا۔

" آپ یہ نگٹس لیں نا...... " ان کی بات کا اثر زائل کرنے کو محمودہ لپک کر آگے بڑھیں اور آداب

میزبانی نبھانے کو ایک ایک چیز اٹھا کر پیش کرنے لگیں۔ انہوں نے کچھ بھی لینے کے بجائے اک ایسی سرد آہ بھری کی پورا ڈرائنگ روم ٹھٹھر کر رہ گیا۔

" بس میرے تو سارے شوق دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سلیقہ شعار بہوئیں تو بھئی قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ اب میری بیٹی ہے اور پھر اکلوتی۔ لیکن میں نے اسے صرف پیار ہی نہیں دیا بلکہ ایسی تربیت بھی دی کہ آج سارا سسرال اس کے گن گاتا ہے۔ ماشاءاللہ گھر سنبھال رکھا ہے اس نے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں۔ بس اب فکر لگ گئی ہے تو بیٹوں کی طرف سے۔ ہم لوگ بڑے جذب سے بیٹیوں کے اچھے نصیب کی دعا کرتے ہیں۔ جبکہ اس دعا کے اتنے ہی حق دار بیٹے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیاں خوب صورت ہوں گی تو ہمارے دل بھی آسودہ رہیں گے۔ اگر وہی آنے والی کے ہاتھوں کاٹھ کے الو بن جائیں تو پورے خاندان کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ ایسے برے وقت سے تمام والدین کو بچائے۔ " انہوں نے کانوں کی لو کو چھوا۔ اور عتیق صاحب کے کان سرخ ہونے لگے۔

" اپنے عظمت بھائی کی مطربہ تو دیکھی ہوگی تم نے۔ بڑی پیاری ہے۔ بڑی ہی لائق فائق بچی ہے ماشاءاللہ۔ B,B,A کر رہی ہے۔ بھابھی کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اب۔ اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ پورا گھر بھی سنبھال رکھا ہے۔ بہت ہمت ہے اس کی۔ میرا تو ارادہ کچھ اور ہی تھا۔ مگر یہ آج کل کے بچے والدین کے تجربات اور معاملہ فہمی کو کسی خاطر میں لاتے ہی کب ہیں۔ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں۔ اور جب سمجھ آتی ہے تو......"

" افوہ......بس کر دو ہاجرہ کس بحث میں پڑی ہوئی ہو۔ " عباس صاحب کو کافی دیر بعد یاد آیا کہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ بے اختیار بیوی کو ٹوکا۔

پھر عتیق صاحب کے بازو پر ہاتھ رکھتے بولے۔

" بھئی میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ سب کو اپنی زندگی کے اہم فیصلے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اب چاہے وہ بیٹا ہو یا بیٹی۔ کیونکہ ہم تو اپنی زندگی گزار چکے اب تو ان کا وقت ہے اور آج کل کے بچے ہم سے زیادہ سمجھ دار اور باشعور ہو چکے ہیں۔ ہر اچھا برا پہچانتے ہیں۔ اب اگر ان کی خوشی اس بات میں ہے تو ہمیں کھلے دل سے ان کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ اب عتیق تم یہ بتاؤ کہ ہم رسم کب کرنے آئیں۔ " انہوں نے تو آسان لفظوں میں قصہ ہی ختم کر دیا۔ جبکہ عتیق صاحب نے انہیں یوں دیکھا گویا اک حرف پلے نہیں پڑا۔

" میں سمجھا نہیں۔ کیسی رسم؟ " اور ان کی اس ناسمجھی پر تمام افراد کے چہروں پر مختلف تاثر ابھرے تھے۔ عباس صاحب نے بیوی کو دیکھا پھر انہیں۔ اور تحمل کا دامن تھام کر بولے۔

" منگنی کی رسم۔ شجاع اور جازمہ کی۔ " عتیق صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور انداز نشست بدل کر سیدھے ہوئے۔

" دیکھیں عباس بھائی آپ میرے بڑے ہیں۔ آپ اپنے ضروری کام چھوڑ کر میرے گھر آئے۔ میرے لیے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں۔ آپ کا آنا مجھے بے حد اچھا لگا یونہی کبھی نا کبھی وقت نکال کر آتے رہا کریں۔ ملتے رہنے اور ایک دوجے سے دل کی کہنے سے کئی کدورتیں پنپنے سے پہلے ہی معدوم ہو جاتی ہیں۔ اور مجھے بھابھی کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ انہوں نے جو کہا بالکل سچ کہا۔ آج کل کے بچے واقعی والدین کے تجربات اور معاملہ فہمی کو کسی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کو اپنی اس غفلت کا پتا تب لگتا ہے جب ان کو ٹھوکر لگتی ہے۔ اور ہمیں اپنے بچے بہت پیارے ہیں ہم نے ہی انہیں آئندہ کی تکلیف سے بچانا ہے۔ یہ ابھی اتنے بھی سمجھ دار

نہیں کہ بڑے بڑے فیصلے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ بھابھی ماں ہیں انہیں پورا حق ہے یہ جہاں چاہیں شجاع بیٹے کی شادی کریں۔ اور آپ کو یقیناً اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں جازمہ کا رشتہ جلال بھائی کے بیٹے خیام سے طے کر چکا ہوں۔ بس غلطی یہ ہوئی کہ اس بات کو ابھی ہم نے خود تک ہی رکھا ہوا ہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ جازمہ کی تعلیم مکمل ہو جائے تو پھر باقاعدہ طور پر رسم کرتے۔ حالانکہ جلال بھائی نے اور شیریں بہن نے بہت کہا تھا لیکن بس...... میرا خیال ہے آپ میری اس کوتاہی کو معاف کر دیں گے۔ اور ہاں بہت دن بعد آئے ہیں آپ۔ کھانا کھائے بغیر تو میں بالکل نہیں جانے دوں گا۔ محمودہ جاؤ انتظام کرو اور جازمہ بیٹا آپ بھی جا کر مما کا ہاتھ بٹاؤ۔" انہوں نے نہایت پرسکون انداز سے کہا۔ کسی کے چہرے کی جانب دیکھا ہی نہیں۔ اور ہر چہرے کا رنگ الگ تھا۔ عباس صاحب پریشان ہو گئے تھے تو ہاجرہ آنٹی نے اک گہرا سانس لیا تھا (سکھ بھرا سانس)۔ ان کا ہوم ورک پورا تھا۔ پھر کیسے نا مطلوبہ مارکس ملتے۔

محمودہ سے بھی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا ہی نا گیا۔ وہ باپ کا حکم ملتے ہی اٹھ کر چلی گئی تھی۔

" تم نے کہیں جلد بازی تو نہیں کر دی ہے عتیق دیکھو ہمیں اپنے بچوں کی خوشی...... " انہوں نے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے سنا عباس بھائی کہہ رہے تھے اور پھر عتیق صاحب نے کیا کہا یہ ایک بار پھر سننے کی تاب نہیں تھی۔ ان کا رخ کچن کی جانب تھا لیکن انہوں نے رک کر جازمہ کے کمرے طرف ضرور دیکھا جس کا دروازہ ابھی ابھی بند ہوا تھا۔

☆☆☆

شیشہ ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں چن کر ڈسٹ بن میں ڈال دی جاتی ہیں۔ کاش کوئی ایسا ڈسٹ بن بھی ہوتا جس میں اتنی ہی آسانی سے ٹوٹے خوابوں کے ٹکڑے بھی ڈال دیے جاتے۔ پھر جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے کی جگہ نیا لا کر لگا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح خواب بھی نئے لا کر سجا لیے جاتے۔ سب پھر پہلے سا ہو جاتا۔ کہیں درد نا ہوتا۔ کہیں چبھن نا ہوتی۔ کوئی فرق نا پڑتا...... لیکن یہی تو مسئلہ ہے شیشے سے زخم لگے تو وہ آخر کار بھر ہی جاتا ہے۔ مگر خوابوں سے پڑے گھاؤ اندر تک کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ناسور بن جاتے ہیں۔ تیسرا دن تھا اسے کمرہ میں بند ہوئے۔ ان تین دنوں میں اپنے اجڑے ارمانوں کا اتنا ماتم منا چکی تھی کہ اب تو رونے سے بھی بے زاریت ہونے لگ رہی تھی۔ آج بھی محمودہ نے اس کا من پسند کھانا بنایا تھا جو اس نے چکھا بھی نہیں۔ وہ اسے سمجھا سمجھا اور منا منا کر تھک چکی تھیں اور اب تو ٹھیک ٹھاک ناراض ہو کر گئی تھیں۔ اس سے تو جیسے قسمت ہی روٹھ گئی تھی۔ شجاع بھی تو خفا ہو گیا تھا۔

" تمہیں اندازہ بھی ہے کہ مما کو راضی کرنے کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے۔ اور تم نے تو کہا تھا کہ آنٹی، انکل کو منا لیں گی۔ لیکن انہوں نے تو صاف منہ پر انکار کر دیا۔ رسماً بھی سوچنے کا وقت نہیں لیا۔ "ہاؤ انسلٹنگ ......" وہ پہلی بار اس کی غصہ بھری آواز سن رہی تھی وہ اپنے قابو میں نہیں لگ رہا تھا۔

" بابا ضرور مان جاتے اگر آنٹی اس قدر دل جلی باتیں نا سناتیں۔

تمہیں پتا ہے شجاع انہوں نے کیا کہا؟"

" کہا ہو گا۔ میں نے جب واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہ ہمارے رشتے کے لیے قطعاً راضی نہیں ہیں۔ لیکن میں نے انہیں جس طرح مجبور کر کے بھیجا وہ اس بات پر غصہ تھیں۔ اگر انہوں نے اسی غصہ میں کچھ کہہ بھی دیا تو انکل کو اس وقت اگنور (نظر انداز) کر دینا چاہیے تھا۔ بٹ انہوں نے تو کسی بات کا پاس نہیں رکھا۔ پھر پاپا نے ان کی منت کی اور وہ پھر بھی نہیں مانے۔ یہ سراسر بے عزتی ہے ہماری۔ انہوں نے مجھے ریجیکٹ کیا۔۔ شجاع عباس کو۔۔۔" اس کی تو

کھولن ہی کم نہیں ہو رہی تھی۔
"پلیز شجاع۔۔تم اس بات کو غلط رخ مت دو۔ بابا کو صرف آنٹی کی باتوں پر دکھ ہوا۔ تم نہیں جانتے......"
"جسٹ شٹ اپ......اور تم نہیں جانتیں مما کو۔ میں ان کا بیٹا ہوں میں جانتا ہوں ان کا مزاج۔ پہلے میں نے انہیں دھمکی دی تھی نا اور اب اگر میں اس دھمکی کو ان کے سامنے عملی جامہ بھی پہنا دوں نا وہ تب بھی دوسری بار میرا پرپوزل لے کر جانے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ ان فیکٹ ابھی اس معاملے کو اٹھانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ابھی تو تم بھی پڑھ رہی ہو۔ میں بھی اپنا بزنس اسٹیبلش کر رہا ہوں۔ پوری عمر پڑی ہے شادی کے لیے۔ بس میں ہی بے وقوف تھا جو تمہاری باتوں میں آ گیا اور......"
"کیا مطلب میری باتوں میں آ گئے؟ تم ننھے بچے ہو جو میری انگلی تھام کر چل پڑے۔ میں ہی تمہارے عشق میں پاگل ہو رہی تھی......" وہ غصے میں تھا تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ اگلے کچھ وقت میں بات اتنی بڑھی کہ اس نے نا صرف کال کاٹ دی بلکہ سیل ہی کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔
جس کے حصے بخرے صفیہ نے صفائی کے دوران سمیٹ دیے تھے اور وہ اپنے گم گشتہ ٹکڑے کہاں سے تلاشتی۔۔بکھری رہ گئی تھی تو صرف اس کی ذات۔ محبت تو اس کے لیے بن موسم کی برسات جیسی ثابت ہوئی تھی۔ جو یک لخت برستی ہے اور جل تھل کر دیتی ہے اور اسی طرح اگلے لمحوں میں تیز چمکتی دھوپ سارا منظر بدل ڈالتی ہے۔ ایسے کڑے انداز سے تو کوئی سخت گیر استاد بھی پیش نہیں آتا جس بے دردی سے محبت سبق پڑھانے چلی تھی۔ وہ تو گلاب بنی تھی اور ابھی پوری طرح اس کی دلکشی اور خوشبو سے مسحور بھی نہیں ہو پائی تھی کہ روح میں اترتے کانٹے زخم زخم کر گئے۔ اب وہ تھی اور اک درد لا دوا......

خالی پیٹ سوگ منا منا کر اب تو ہمت بھی کم پڑنے لگی تھی۔ بھوک نے ہر آزار سے بڑھ کر بے قرار کیا تو خود ساختہ قید سے نکل ہی آئی۔ فریج نعمتوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے صرف سینڈوچ نکالے اور کافی پھینٹنے لگی۔
"تمہاری ماں کے سر میں درد ہے اسے دوا کھلانا ہے ایک گلاس دودھ گرم کر لو اور کافی میں بھی پیوں گا۔ روم میں لے آنا۔" بابا کچن کے دروازے میں کھڑے تھے اسے دیکھا تو کہہ کر پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ دودھ کا گلاس مما کو تھمایا۔
"بس ایک کپ کافی......؟ تمہارا کپ کہاں ہے۔ چلو لے کر آؤ۔ باپ بیٹی مل کر پئیں گے اور گپ شپ بھی کریں گے۔" اسے پلٹتے دیکھا تو نیا حکم جاری کیا وہ چپ چاپ کپ لے آئی۔ محمودہ نے پر تاسف نظر اس کے ستے چہرے پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔ (مزید دیکھنے کی تاب نا تھی) بابا بغور اسے تک رہے تھے، دور پڑی کرسی پر بیٹھنے لگی تو فوراً ٹوکا۔
"اونہوں......ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔"
اور وہ خودکار روبوٹ سا چلتی بیڈ کے کنارے آ ٹکی۔
وہ سینڈوچ چڑیا کی طرح چگ رہی تھی۔
محمودہ نے ایک گھونٹ سے دوا نگلی اور باقی گلاس جوں کا توں تھا۔ بابا کافی سے اٹھتی بھاپ پر نگاہ جمائے کسی گہری سوچ میں تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ان تینوں نفوس کے ہوتے کمرے میں خاموشی سرسرا رہی تھی۔ کتنے ہی پل چپ اپنے پلو میں چھپاتی چلی گئی کہ بابا کی آواز پر دبک کر کسی کونے میں جا گھسی۔
"تمہیں یاد ہے محمودہ، جازمہ کی پہلی سالگرہ پر کیا ہوا تھا؟ تمہیں ضرور یاد ہو گا تم ماں ہو کیسے بھول سکتی ہو۔ وہ منظر تو آج تک میں خود نہیں بھولا۔ پتا ہے جازمہ بیٹا وہ تمہاری پہلی سالگرہ کا دن تھا۔ تم پیارے سے فراک میں بالکل پری لگ رہی تھیں۔

کیک کاٹنے سے پہلے میں نے تمہیں سمجھایا کہ کینڈل کی جلتی ہوئی روشنی کو ایسے پھونک مارو۔ لیکن تم نے پھونک مارنے کے بجائے کینڈل کی پھڑ پھڑاتی ہوئی لو پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اُف...... اس پل کی اذیت مجھے اب بھی ویسے ہی محسوس ہو رہی ہے وہ تو صد شکر تم میری گود میں تھیں اور میں نے فوراً تمہیں پیچھے ہٹا لیا تھا لیکن پھر بھی جلتی ہوئی لو کی بھاپ تمہارے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو چھو گئی تھی۔ تمہاری چیخیں اور رونا میری جان نکال رہا تھا۔ میں تمہیں لے کے ڈاکٹر کے پاس بھاگا۔ اس نے فوری ٹریٹمنٹ دیا۔ مجھے تسلی دی اس کے باوجود مجھے چین نہیں پڑ رہا تھا۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میں خود رو رہا تھا۔ گو کہ وہ زخم دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن جب بھی میری نظر تمہارے چہرے پر پڑتی میں تمہیں اٹھا کر سینے میں بھینچ لیتا۔ تم پر ڈھیروں پیار آتا اور خود پر غصہ۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں اتنا سا بھی درد ہوا کیوں۔ کیا میں اتنا لاپروا باپ ہوں۔ اور اس لاپروائی پر کتنا ہی عرصہ میں خود کو معاف نہیں کر سکا تھا۔

تم نے کبھی سنا ہے کہ دو لوگ ملتے ہوں' اک دوجے سے پوچھ رہے ہوں" اور سناؤ آپ کے بڑے کیسے ہیں" نہیں پوچھنے والا ان ہی الفاظ میں حال پوچھے گا۔ " اور سنائیں آپ کے بچے کیسے ہیں۔" بچے چاہے کتنا ہی قد نکال لیں اپنے والدین کے لیے وہ پھر بھی رہتے بچے ہی ہیں۔ میرے لیے تم بھی ابھی وہی چھوٹی سی جازمہ ہو جس کی تکلیف مجھے پہروں اذیت میں رکھتی تھی۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں اب بھی تمہیں جلتی ہوئی لو کے قریب جانے دوں گا۔" انہوں نے سوال کیا جازمہ کی ٹھوڑی گردن میں جا گھسی۔

سینڈوچ حلق میں پھنس گیا۔

" نہیں میرے بچے...... میں باپ ہوں میرا فرض ہے تمہاری کیئر کرنا جہاں تم ڈگمگانے لگو تمہاری انگلی پکڑ کر سہارا دینا، تمہارا خیال رکھنا۔ میں کس دل سے تمہیں کانٹوں بھری پگڈنڈی پر قدم رکھنے دوں۔ تم ابھی نادان ہو تمہارے شعور کی آنکھ وہاں تک نہیں دیکھ رہی جہاں تک مجھے نظر آ رہا ہے۔ میں یہ بالکل نہیں سہہ سکوں گا کہ میری بیٹیاں ہی اک دوجے سے متنفر ہو جائیں۔

دیکھو بیٹا بہت سادہ سی مثال ہے قدرت نے ہر نظام کو ایک مکمل دائرے کے اندر خاص اجزائے ترکیبی کے ساتھ رکھا ہوا ہے اگر کہیں کوئی چیز ذرا سا بھی اپنے دائرے سے باہر ہو جائے تو کئی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک گھر کی بنیاد کے لیے بھی خاص اکائیاں ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے پہلا نمبر ہوتا ہے عزت کا......

دوسرے پر آتی ہے محبت، اور تیسرے پر ہوتی ہیں توقعات۔ اسی ترتیب سے جس گھر کی بنیاد رکھی جائے تو اس کے آنگن میں ہمیشہ سکھ اور سکون پنپتے ہیں۔ اور جس گھر کی بنیاد میں پہلا نمبر محبت لے جائے تو وہاں توقعات دوسرے نمبر پر از خود آ جاتی ہیں اور عزت کو ملتا ہے تیسرا درجہ۔۔۔ اور جانتی ہو تیسرا درجہ کیا ہوتا ہے۔ بس جان لو کہ پھر کتنے ہی کانٹے دامن سے الجھتے ہیں۔ کتنے آبلے پڑتے ہیں۔ کئی کوہ گراں راہ میں آتے ہیں۔ اک طویل سفر کرنا پڑتا ہے عزت کو اپنا مقام واپس لینے کے لیے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسی کوئی مشقت تم جھیلو۔ میں تمہیں اسی دکھ سے بچانا چاہتا ہوں میری بچی۔ رملہ کے ساتھ وہاں جو سلوک ہوتا رہا ہے تم اس سے ناواقف نہیں ہو۔ پھر اس روز ہاجرہ بھابھی کی باتیں بھی تم نے سنیں۔ اب اس کے بعد کیا ان سے اک اور تعلق جوڑنا دانش مندی کہلائے گا۔ نو...... نیور...... میں تو اس بارے سوچ بھی نہیں سکتا۔ کل کا عذاب اٹھانے سے بہتر ہے ہم آج کی تھوڑی سی تکلیف سہہ لیں۔

جلال بھائی اور شیریں بہن بہت سلجھے ہوئے

مزاج کے ہیں۔ خیام بے حد اچھا لڑکا ہے۔ اور نہایت اہم بات انہوں نے پورے عزت ووقار کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھا گھرانہ پسند کیا ہے۔ جہاں وہ خوش رہ سکے لیکن بیٹا اگر تم راضی نہیں ہو تو میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔ میں جلال بھائی سے معذرت کر لیتا ہوں۔ اب خوش۔ بس اب میں تمہیں روتے ہوئے نا دیکھوں۔" انہوں نے اس کا سر تھپکا۔ اس کے پیمانے جو پہلے ہی لبالب بھرے ہوئے تھے۔ چھلکتے چلے گئے۔ ضبط ناممکن ہوا تو اٹھ کر کمرے سے ہی چلی گئی۔ محمودہ نے ان کی طرف دیکھا وہ سامنے پڑی ٹھنڈی ٹھار کافی کو گھور رہے تھے۔

☆☆☆

اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا وہ اتنی سبک خرامی سے چلتی آرہی تھی گویا ستاروں پر چل رہی ہو۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئیں۔

اپنے ہی دھیان میں گم۔ ہر طرف سے بے نیاز و بے پروا۔ صرف اپنے قدم گنتی ہوئی۔ کیسری رنگ کے لباس کا عکس، کچھ ڈھلتے سورج کی کرنیں اس کے سادہ اور معصوم چہرے کو جگمگائے ہوئے تھیں۔ کتنے دن بعد یہ من چاہی صورت دیکھی تھی آنکھوں میں تراوٹ سی اتر آئی۔ دل شادکام ہوگیا۔ وہ مسکراتا ہوا کار کا دروازہ کھول کر اس کے استقبال کے لیے اتر آیا۔

"جازمہ......" اسی بے دھیانی میں قریب سے گزرنے لگی تھی آواز دے کے متوجہ کیا۔

"آپ......" وہ چونک کر مڑی۔

"جی جناب......خاکسار......بہت دیر سے پلکیں فرش راہ کیے کھڑا ہوں۔ محترمہ آجائیے اب......" وہ سینے پر ذرا سا ہاتھ رکھتے جھکا پھر گھوم کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

"لل......لیکن......وہ بابا نے تو گاڑی بھیج دی ہوگی وہ ڈرائیور......" آس پاس دیکھا۔ گاڑی کہیں نہیں تھی۔

"میری خوش بختی ہے کہ آج آپ کے شوفر کے فرائض اس ناچیز کے ذمے ڈالے گئے ہیں۔ انکل نے ہی بھیجا ہے مجھے۔ اگر میرے کہے پر یقین نہیں تو کال کر کے تصدیق کر سکتی ہو۔'' وہ اپنا سیل اس کی جانب بڑھا رہا تھا۔ اور وہ جھوٹ نہیں بولتا اتنا تو جانتی ہی تھی اسے۔ پھر تصدیق کی تو ضرورت ہی نہیں تھی رات ہی تو محمودہ کی اس سے بات ہوئی تھی۔

"جلال بھائی کا آج پھر فون آیا تھا۔ وہ لوگ آنا چاہ رہے ہیں۔ تمہارے بابا سخت الجھن میں ہیں۔ پھر بتاؤ کیا کہیں انہیں؟۔"

"جو آپ اور بابا مناسب سمجھیں۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں۔" اس نے روکھے سے لہجے میں کہہ کر سر کتاب میں دے لیا۔ آج کل اس کا اوڑھنا بچھونا صرف کتابیں ہی تھیں۔ محمودہ کو اس کی تابع داری پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ ماتھا چوم کر گلے لگا لیا۔ وہ اسے اچھے نصیبوں کی بے شمار دعائیں دے رہی تھیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ دو آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر ان کے دامن میں جا گرے۔ دعائیں تو وہ ہمیشہ سے کرتی آ رہی تھیں۔ ہوا کیا۔؟ ان میں سے تو کوئی بھی کام نا آئی۔

اس دن اس کا سیل ٹوٹ گیا تھا۔ نمبر بند ہو گیا تو کیا ہوا گھر کے دوسرے نمبر تو آن تھے۔ لیکن شجاع نے پھر رابطہ ہی نا کیا۔ وہ بھی اکڑ گئی۔ جبکہ کئی بار دل چاہا لینڈ لائن سے ہی فون کر لے۔

لیکن بس ضدی انا سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی۔

کئی دن بیت گئے۔ اک شام رملہ اور زوار چلے آئے۔ رملہ نے بتایا۔

"شجاع کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ لڑکی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہی کی خواہش پر اس جمعہ کو سادگی سے نکاح ہے۔"

اور وہ سرتا پیر شل۔ کیا اس کی محبت کی عمر اتنی کم تھی ..... سردی کے دن کی طرح مختصر۔ ادھر چڑھا۔ ادھر شام اتر آئی۔ اور شام بھی ایسی گھور سیاہ کہ ہر منظر پر چھا گئی۔ سب خواب اس سیاہی میں کھو گئے۔

کیا اس کی محبت ایسی ہی بے مول تھی کہ یوں دامن جھٹک دیا جاتا۔ اس روز وہ خود کو روک نا سکی۔ دوسری طرف سسکیوں بھری خاموشی سے شجاع نے جان لیا۔ کتنی دیر اس کے لب بھی سلے رہے۔

"مجھے کوئی الزام مت دینا۔ میں نے صدق دل سے چاہا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ اگر اس روز معاملہ ٹھیک ہو جاتا تو آج ہمیں یہ دن نا دیکھنا پڑتا۔ بہرحال مجھ پر زیادہ حق میری ماں کا ہے۔ انکل کی بات بھی درست ہے خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم روتی مت رہنا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر بھی وہ وہی ہو جیسا ہم گمان کریں۔ انسان نہیں جانتا اس کی بہتری کس امر میں ہے۔ جو مقدر ہو اسے خوش دلی سے قبول کرنے میں ہی بھلائی ہے۔ میں نے سمجھوتہ کر لیا ہے تم بھی کر لینا۔ خیام اچھا لڑکا ....."

اور اس نے فون پٹخ دیا۔ اس رات وہ ایک بار پھر خوب روئی تھی۔

جب آنسو پونچھے تو خود سے عہد کیا اب پھر کبھی اس دکھ پر نہیں رونا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے خیام نے بیک سیٹ پر رکھا پنک روزز کا انتہائی دل فریب بو کے اٹھا کر اسے تھمایا۔ اس نے یوں دیکھا گویا پوچھ رہی ہو۔ "یہ کیوں ....."

"تمہیں پسند ہیں نا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں نے بہت سے پھول دیکھے۔ ہیں ماریشس بھی بے حد خوب صورت ملک ہے وہاں بھی بے شمار قسم کے پھول دیکھے۔ اور تلاشتا رہا مگر کوئی بھی پھول ایسا نظر سے نہیں گزرا جس میں تمہارے چہرے سے بڑھ کر ملاحت ہو۔ سارے پھول پھیکے پڑ جاتے ہیں تمہارے حسن کے آگے۔" اس کے لہجے میں محبت بول رہی تھی۔ وہ نظر جھکا گئی۔ سیدھا سادہ دکھنے والا خیام اتنا رومانٹک۔

"اور سناؤ پیپر کیسا ہوا؟"

"اچھا"۔ یک لفظی جواب دیا۔

"اور پہلے تمام پیپرز۔"

"وہ بھی ٹھیک ......"

"آج لاسٹ پیپر تھا۔ اور یونی کا بھی لاسٹ ڈے۔ اب جانے سہیلیوں سے کب ملاقات ہو یہی سوچ کر اداس ہو ......!" اس نے فقط سر ہلا دیا۔

"لاسٹ ڈے ایسی ہی فیلنگز ہوتی ہیں۔ اتنے عرصے کا ساتھ چھوٹ جائے تو دل کو درد تو ہوتا ہی ہے۔ بٹ یو ڈونٹ وری۔ سب سہیلیاں تو اسی شہر میں ہیں نا جب چاہے مل لیا کرنا۔ اس میں کیا مشکل ہے۔" اس نے نہایت آسان حل پیش کیا۔ وہ کیا کہتی ایک بار پھر گردن کو جنبش دی۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔ اتنے عرصے کا ساتھ چھوٹ جائے تو دل کو درد تو ہوتا ہی ہے۔ اور یہ وہ درد ہوتا ہے جسے دنیا کا کوئی حکیم، وید، ڈاکٹر نا تو کسی آلے سے چیک کر سکتا ہے اور نا دوا تجویز کر سکتا ہے۔ نا ہی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ کب تک رہے گا۔ اسے تو بس سہتے رہو چپ چاپ۔ اور وہ سہہ رہی تھی۔

اک سرد آہ لبوں کی قید سے نکل کر فضا میں کھو گئی۔

"تمہاری اداسی کا حل ہے میرے پاس۔ ہم پہلے اچھا سا لنچ کرتے ہیں پھر ڈھیر ساری شاپنگ۔ کیونکہ امی کی خواہش ہے کہ انگیجمنٹ ڈریس ان کی بہو کی پسند کا لیا جائے۔ اور مجھے پہلے سے ہی خبر ہے تم کس کلر کا ڈریس لو گی۔ پنک۔ جس پر ڈھیر سارے روزز بنے ہوں ہے نا ......؟۔ ہاہاہا ...... ٹھیک کہا نا میں نے۔" وہ اپنی ہی بات پر خوب محظوظ ہوا تھا۔ جازمہ کے نین کٹورے اک پل میں بھرے تھے۔ سامنے

سے نظر ہٹا کر خیام نے دیکھا وہ پلک پر اتری نمی ہتھیلی پر سمیٹ رہی تھی۔
"واٹ ہیپننگ کیا ہوا ہے؟۔آر یو او کے...... وائے آر یو کرائنگ؟ (کیوں رو رہی ہو)" وہ بوکھلا اٹھا۔اس کی ہتھیلی کچھ اور بھیگی تھی۔
"سوری یار میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔جسٹ جوکنگ۔تم روؤ تو مت۔سچ میں میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔جازمہ پلیز۔کہا نا سوری۔" خیام کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے والی حالت ہوگئی۔گاڑی کو اک سائڈ میں پارک کیا۔وہ اب قدرے خود کو سنبھال چکی تھی۔ہتھیلیوں سے گال رگڑتے اثبات میں سر ہلایا یا مشکل حلق سے آواز نکلی۔
"اٹس او کے"۔خیام نے پانی کی بوتل کہیں سے برآمد کر کے اس کی طرف بڑھائی اس نے تھام کر لبوں سے لگائی۔ایک موتی ابھی بھی پلک پر اٹکا تھا جسے خیام کی انگلیوں نے احتیاط سے سمیٹ لیا۔
وہ جھجک کر پیچھے ہوئی۔اس کی بے تکلفی پر خفگی سے دیکھنا چاہا لیکن اس کی بولتی آنکھوں کے سامنے ٹھہر ہی نا گیا جو یہ فریاد کر رہی تھیں۔
"آئندہ کبھی اس طرح مت رونا۔تم تو جان لے لوگی۔ظالم لڑکی۔" گاڑی پھر سے رواں دواں تھی۔
"آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" کچھ لمحے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی تھی۔پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا؟ سوال کیا۔
"کیوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔" خیام نے اک لمحے کا توقف نہیں کیا تھا۔کھٹ سے جواب آیا۔
"اور محبت کیوں ہے؟" اب کہ وہ پورے اعتماد سے پوچھ رہی تھی۔
"محبت تو بلا جواز ہوتی ہے۔اس کے پاس اپنے ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔جیسے خوشبو کو پکڑا نہیں جا سکتا صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ایسے ہی محبت کا وجود بھی گرفت میں نہیں آتا لیکن ہوتا ضرور ہے۔
اب مجھے تم سے محبت کیوں ہے میں اس کی وجہ تو نہیں جانتا۔ہاں اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔بے حد، بے تحاشا۔تمہارا کوئی نام لے تو دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگتی ہے۔آنکھیں تمہیں دیکھتے رہنا چاہتی ہیں ہر پل، ہمیشہ، جب تک دن میں کئی بار تمہیں دیکھ نا لوں بے چینی سی رہتی ہے۔یوں جیسے کہیں درد سا رہتا ہو۔اور اس درد کی دوا پھر تمہاری دید سے ہی ممکن ہوتی ہے۔" وہ مزے سے بتا رہا تھا۔وہ حیران۔۔۔۔وہ بھلا اسے کہاں دیکھتا ہے؟ خیام اس کے تاثرات پر ہنس دیا۔اور بڑے جذب سے شعر پڑھا۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب بھی ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

"اور اس سہولت کے علاوہ جدید دور کے کمال فائدے بھی تو ہیں نا۔" اس نے آنکھ سے اپنے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔پھر وہ رملہ کی شادی پر لی گئی تصاویر کی داستان بیان کرنے لگا اور یہ کہ غزالہ نے کس طرح اس کی جان نکال دی تھی۔جبکہ اس نے وہ پکس ڈیلیٹ نہیں کی تھیں صرف مذاق کیا تھا۔اس کے دل کا بھید جانچنے کے لیے۔اور یہ کہ وہ اب تک اسی دوا کے سہارے شفایاب ہوتا ہے۔یہ سب سنتی جازمہ کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔
یہ شخص اپنی چاہت میں اتنا گہرا ہے۔اور کیسا محتاط کہ اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔وہ کتنا خوش بخت تھا اس کی دعائیں در قبولیت کو چھو آئی تھیں۔یقیناً اس کے جذبے خالص تھے جسے چاہا اسے پالیا۔بے اختیار نگاہوں میں اس کے لیے رشک و احترام اتر آیا۔
"آج امی کہہ رہی تھیں کہ میں بہت پیارا لگ رہا ہوں۔اور وہ تو ماں ہیں میں انہیں ہر حالت میں پیارا ہی لگتا ہوں۔لیکن اب مجھے یقین آگیا میں واقعی

ہینڈسم لگ رہا ہوں۔ وہ تو شکر ہے آتے وقت غزالہ آپی نے میری نظر اتار دی تھی اس لیے اب مجھے کوئی فکر نہیں۔" اس کی محویت پر وہ زیر لب شرارتی مسکان لیے بولا تھا۔ وہ ہوش میں آئی جھٹ نظر پھیر گئی۔ خیام کو خوب لطف آیا۔ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔ وہ پہلی بار اس کے ساتھ تھی۔ کتنا حسین تھا یہ سفر۔ کاش یہ لمحے یہیں رک جائیں۔ وہ دل فریب احساس میں گھرا تھا۔ چند ساعت بعد جازمہ کی آواز نے گاڑی میں پھیلی خاموشی کے سینے پر ضرب لگائی تھی۔

"ویسے ضروری تو نہیں کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی بھی کی جائے۔ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہیں محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تو......"

"خدانا خواستہ...... سوچ سمجھ کر بولتے ہیں لڑکی۔ میرا شمار کیوں ہونے لگا ایسے لوگوں میں۔ اففف...... برے خیال سے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ الحمد للہ! اس کا کرم ہے مجھ پر جس نے میری خواہش کو پورا کیا۔ اور وہ جسے چاہے نواز دیتا ہے۔ اگر کسی کو من چاہا نہیں ملتا تو اس میں ضرور اللہ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس کی رضا میں راضی ہونا ہی تو اصل بندگی ہے۔ بائی داوے میں پوچھ سکتا ہوں کس کو نہیں ملی اس کی محبت؟" اور وہ اس کی سن ہی کب رہی تھی وہ تو اپنے کسی دھیان میں تھی۔

"کہتے ہیں کہ محبت تو امر ہی عالم فراق میں ہوتی ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے عاشق حاصل مطلوب سے محروم رہے تھے۔ انہوں نے وصال یار کا مزا چکھا ہی نہیں۔ اگر وہ ناکام نا رہتے تو آج ان کا کہیں نام بھی نا ہوتا۔"

"لاحول ولا قوۃ...... مجھے کوئی شوق نہیں ہے داستان بننے کا۔ ان بڑے عاشقوں کو میری طرف سے سات سلام۔" خیام نے باقاعدہ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام جھاڑا۔ پھر اسے دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار بھاگتی دوڑتی گاڑیوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔

چہرے پر چھائی غیر معمولی سنجیدگی نے اس کا دل ہولا دیا۔

"کیا ہوا ہے جازمہ......؟ اس قسم کی الجھی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ کیا تم ہمارے رشتے پر خوش نہیں ہو؟"

"ابھی گھر چلیں پلیز...... میں بہت تھک چکی ہوں۔ شاپنگ پھر کسی دن کر لیں گے۔" وہ اس کا سوال گول کر گئی تھی۔ اور تھکن تو اس کی آنکھوں سے مترشح تھی خیام نے بھی مزید کچھ نا کہا۔ واپسی کی راہ لی۔ اور وہ جو سوچ رہی تھی جاتے ہی نیند کی ایک ٹیبلٹ لوں گی اور بس لمبی تان کر سو جاؤں گی۔ تو ایسا نا ہو سکا۔ لاؤنج میں رونقیں عروج پر تھیں۔ بابا، جلال خالو، فرحان بھائی۔ جانے کس موضوع پر بات کرتے اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ محمودہ اور شیریں اپنے کسی مسئلے میں الجھی تھیں۔ ننھے احد کی الگ مصروفیت۔ سارے کشن ایک جگہ اکٹھے کیے چھلانگیں لگا رہا تھا۔ ایک مکمل خاندان۔ ایک خوش مزاج فیملی۔ غزالہ سب کے لیے چائے لے کے آ رہی تھی اسے دروازے میں بت بنے دیکھا تو اڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔ گلے لگا کر چٹاچٹ بوسے لیے۔

"کیسا ہوا تمہارا پیپر۔ ہم سب نے خوب ساری دعائیں کیں۔ جلدی سے بتاؤ۔ ٹھیک ہو گیا نا۔" اسے دیکھ کے سب ہی پوچھنے لگے۔

"ارے تھک گئی ہے میری بچی۔ ذرا دم تو لینے دو۔ سب ہی ایک ساتھ شروع ہو گئے۔ صفیہ بھاگ کے پانی لاؤ۔" شیریں نے احد کے پھیلائے کشن سمیٹتی صفیہ کو دوڑایا۔

"تم ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔" پیار سے ہاتھ تھام کر ساتھ بٹھالیا۔

خیام اس کے پیچھے ہی آرہا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی سنجیدگی اب اس کے چہرے پر دکھ رہی تھی۔ وہ فرحان بھائی کے ساتھ جا بیٹھا۔

"جاؤ صفیہ خیام اور جازمہ کے لیے بھی چائے لے کر آؤ۔" محمودہ نے پانی کا گلاس پکڑ کر اس بے چاری کی پھر دوڑ لگوائی۔

"شاپنگ ہو گئی؟ کیسا ڈریس لیا؟" غزالہ تو اسی بے چینی میں تھیں' وہ تو شیریں نے روک لیا ورنہ وہ تو ساتھ جانے کا ارادہ کر بیٹھی تھیں۔ اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ جازمہ کے پاس جواب کہاں تھا مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا جو ہر طرف سے بے نیاز اپنے سیل پر مصروف ہو چکا تھا۔ یعنی اب وضاحت اسے ہی دینا تھی۔

"وہ...... وہ کیا ہے کہ مجھے یونی میں کافی ٹائم لگ گیا تھا۔ لاسٹ ڈے تھا نا تو سب فرینڈز گپ شپ کرنے بیٹھ گئی تھیں۔ شاپنگ پر تو گئی ہی نہیں۔"

"تو کیا لنچ بھی نہیں کیا؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ارے خیام تو اسی لیے کھانا بھی نہیں کھا کر گیا تھا۔ بچہ بے چارہ ابھی تک بھوکا ہے۔ تم فون کر کے ہی بتا دیتیں بیٹا۔ وہ تو کب سے گیا ہوا ہے تمہیں لینے۔ حد ہو گئی اور تم نے بھی کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ ٹھہرو میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" محمودہ تو سنتے ہی فکر مند ہو گئیں۔ فوراً اٹھیں۔

"چلو تم سالن وغیرہ گرم کرو میں تازہ پھلکے ڈال دیتی ہوں۔"

شیریں بھی ان کے پیچھے ہی چلی گئیں۔ غزالہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھامے جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر قریب ہی رکھے ہینڈ بیگ میں سے اک پیکٹ نکالا۔ جس میں جگر جگر کرتیں سرخ اور سنہری رنگ کی ڈھیر ساری چوڑیاں تھیں۔

"ہم آج منگنی کی ڈیٹ لینے آئے ہیں۔ تمہاری چوڑیوں اور رنگ کا ناپ بھی لینا ہے۔ میں اندازے سے لے کر آئی تھی۔ پہن کر دکھاؤ اگر یہ سائز ٹھیک ہے تو پھر اسی کے مطابق بنوا لیں گے۔" اس نے بیگ میں سے ہی لوشن بھی برآمد کیا جسے ہاتھ پر لگا کر باآسانی چوڑیاں اس کی کلائی پر چڑھائی گئیں۔

"ماشاء اللہ...... کیسے سج گئی ہیں تمہارے ہاتھ میں۔ خیام دیکھنا تو ادھر۔" غزالہ نے بھائی کو متوجہ کیا۔ جس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید بے داغ کلائی پر لشکارے مارتی چوڑیاں عجب پر بہار لگ رہی تھیں۔ لیکن وہ بنا کوئی تاثر دیے پھر سر جھکا گیا۔ احد جو پھر سے کشنز کا ملیدہ نکال رہا تھا ماں کی آواز پر دیکھا تو جازمہ کی چوڑیوں پر نظر پڑ گئی بس پھر کیا تھا۔ بھاگ کر اس تک آیا۔

"آنی دو...... چوئیاں (چوڑیاں) دو۔ میں بھی پہنوں گا۔" اس کا مطالبہ اتنا معصوم تھا کہ جازمہ کو ہنسی آ گئی۔

"اُف...... ایک تو یہ لڑکا...... زمان بھائی کی بیٹیاں ہیں نا۔ بھابھی انہیں خوب چوڑیاں اور پونیاں پہنا کر رکھتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ بھی وہی سب چیزیں مانگتا ہے۔ کیا کروں میں۔" غزالہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ احد کی ایک ہی رٹ تھی۔ جازمہ نے اس کا منہ چوم کر گود میں بٹھایا۔ کلائی سے چوڑیاں اتار کر اس کے بازو میں ڈالیں۔

وہ خوش ہو رہا تھا۔ اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر۔ دونوں خوب ہنس رہے تھے۔ بچے بھی قدرت کی کتنی پیاری نعمت ہوتے ہیں جازمہ کو پتا بھی نا چلا اور مزاج پر چھائی تمام کلفت دور ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہنستے کھیلتے وہ بالکل تازہ دم ہو گئی تھی۔ کیسی نیند کہاں کی تھکن۔

"چلو اب کھانا کھا لو۔" محمودہ کہہ رہی تھیں۔

"میں بھی کھانا کھاؤں گا۔ اور آنی کے ہاتھ سے۔" احد اچھل کر کھڑا ہوا۔ اسے تو بھوک نہیں تھی۔ لیکن صرف احد کی وجہ سے میز تک آ گئی۔ خیام وہیں موجود تھا۔ وہ اسے گود میں لیے بیٹھ گئی۔

اور چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ خیام نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی نگاہیں بصد احترام احد کو دیکھ رہی تھیں۔ اس سے اچھا تو یہ چھنکو ہی رہا تھا کیسی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ جازمہ نے اسے دیکھا۔

"آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔" بے اختیار پوچھ لیا جواباً اس نے جو شکوہ کناں نظر ڈالی تو اسے نظر چرانا پڑی۔ خیام نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ پورے دھیان سے احد کی طرف جھک گئی۔

باہم مشورے سے منگنی کی رسم کے لیے اتوار کا دن طے ہوا تھا۔ مبارک سلامت کے شور میں مٹھائی کھائی گئی۔ محمودہ تو مارے خوشی کے رو پڑیں۔ شیریں انہیں گلے لگائے خود بھی رو دیں۔

غزالہ ہنستی دونوں سہیلیوں کو چھیڑ رہی تھی۔ ادھر بابا اور جلال خالو ہنس رہے تھے۔ فرحان، خیام کو گھیرے بیٹھا تھا۔ اسے اچھی آڑ مل گئی تھی۔ احد نے کہیں جگنو دیکھ لیا تھا وہ اسے لان میں لے آیا۔ اب دونوں ڈھونڈ رہے تھے۔ تبھی خیام کوریڈور کی سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔

اب وہ سب جا رہے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بنا سیدھا گاڑی تک گیا تھا۔ جازمہ کچھ سوچ کر نپے تلے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی وہ ڈوران لاک کرتا رکا۔ مڑ کر دیکھا۔

"میرا بکے تو دیتے جائیں۔ کیا واپس لے جانے کا ارادہ ہے؟" وہ آج بھی عین اسی جگہ کھڑی تھی۔ جہاں خیام نے اسے رملہ کی مہندی والی رات اپسرا سا روپ لیے دیکھا تھا۔ اور دل اس کے پلو سے بندھ کر ایسا گیا کہ اب آخری سانس تک اس کا آزاد ہونا ممکن تھا۔ آج بھی لائٹ سیدھی اس کے چہرے پر پڑتی اس کے حسن کو مزید نکھار رہی تھی۔ وہ کچھ نا بولا جھک کر فرنٹ سیٹ پر رکھا بکے نکال کر اسے تھمایا۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرائی۔ لیکن خیام کا "ویلکم" کہنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

جازمہ نے بکے میں سے ایک پھول نکالا اور کھڑکی پر جھکتے وہ پھول اس کی واسکٹ کی اوپری پاکٹ میں اٹکا دیا۔

"پہلے آپ صرف اچھے لگ رہے تھے اور اب بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" اس کا انداز اتنا دل ربا تھا کہ خیام کی ساری خفگی پل میں اڑن چھو ہو گئی۔ بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو"۔

"اور میں جناب کو ویلکم بالکل بھی نہیں کہوں گی۔"۔ سینے سے بکے کو لگاتے اوپر ہاتھ باندھ لیے وہ کھل کر ہنس دیا۔ سب اس طرف آ رہے تھے انہیں ہنستے دیکھ کر ان کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی۔

"ارے یہ پھول آج بھی میری بیٹی کو پسند ہیں۔" جلال خالو نے اس کے سینے سے لگے بکے کو دیکھ کر کہا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

"میں کل ہی ڈھیر ساری پنیریاں لا کر لگاتا ہوں۔ مجھے تو خود بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر جب بھی لگاتا ہوں یہ نالائق نکال دیتا ہے۔"

انہوں نے خیام کو گھورا اور بیٹی اور نالائق ایک بار پھر ہنس دیے۔

بابا نے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

یونہی ہنستے مسکراتے وہ سب رخصت ہوئے۔

ضروری تو نہیں ہے نا کہ ہر خواب کی تعبیر بھی وہی ہو جیسا ہم گمان کریں۔ کئی بار اللہ ہمارے گمان سے بڑھ کر ہمیں نوازنا چاہتا ہے بس ہم ہی بدگمانی کی دھند میں گم اس حکمت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مما، بابا کے چہرے پر چھایا اطمینان جازمہ کو بتا رہا تھا کہ اس نے آنے والی خوشیوں کے لیے دروازہ کھول لیا ہے۔

☆☆

ناولٹ

اُم ایمان قاضی

احساس سے گندھے لوگ



صبح سے ہی گھر میں افراتفری کا عالم تھا۔ آخر کو حبیبہ تائی اپنے اہل وعیال سمیت آج اپنے بھائی سے ملنے شہر جارہی تھیں۔ حیات نے تو نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی اور اپنے چھوٹے سے کھیت میں کھرپی، جھاڑو اور کوڑے دان سمیت جو گھسی تو اب دن نکل آنے کے بعد بھی وہیں موجود تھی۔ زہرہ نے دو تین دفعہ بلایا بھی تھا کہ پہلے آکر ناشتا کرلے پھر اپنے کام میں لگی رہے۔ مگر وہ بس تھوڑا سا کام اور رہ گیا ہے کہہ کر دوبارہ مصروف ہو جاتی۔ زہرہ اس دوران آکر اسے میٹھی لسی کا ایک گلاس پکڑا گئی تھی۔ پسینے میں شرابور حیات نے تشکرانہ انداز میں بہن کو دیکھا اور غٹاغٹ لسی چڑھا گئی۔

اوائل مئی کی گرمی دن کے آغاز سے ہی جوبن پر تھی مگر اس نے بھی آج اپنے لاڈلے کھیت کو سنوارنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ گزشتہ دنوں آنے والی آندھیوں میں ڈھیروں گند جمع ہو چلا تھا۔ چھوٹے سے احاطے میں موسم کی سبزی اگا رکھی تھی حیات نے اور اس ہرے بھرے خوب صورت احاطے کے گرد جہاں کئی سایہ دار اور پھل دار درخت تھے وہاں موسمی پھول بھی چھب دکھلا رہے تھے۔

تائی سمیت ان کی اولاد سوائے سعید بھائی کے اس چھوٹے سے باغ کا خوب مذاق اڑاتے مگر پھلوں اور سبزیوں سے مستفید ہونے میں بھی خوب آگے آگے ہوتے۔ حیات ان کی اس دوغلی پالیسی پر کبھی تو چپ رہتی، کبھی سنا بھی دیتی تھی۔ اس وقت بھی دو تین بار ولید کا گزر وہاں سے ہوا تھا۔ اسے کام میں منہمک دیکھ کر رہا نہ گیا تو تیسرے چکر پر اپنی زبان کی کھجلی دور کی۔

"ہاں بھئی! مس پینڈو! کیوں جان مار رہی ہو اتنے گھنٹے سے یہ جو مولی، گاجر، آلو بھنڈی کے باغ پر اپنا وقت ضائع کرتی ہو کسی اور کام پر کرلو تو شاید کچھ معاوضہ بھی مل جائے یہاں حاصل وصول کیا ہوتا ہے۔ کبھی ایک کلو کدو تو کبھی آدھا کلو بھنڈی ہاں سال میں تین چار بار آم، امرود، مالٹا اور فالسے بھی چکھ لیتی ہوگی تم مگر یہ بھی تو دیکھو کہ بازار میں یہ سب کتنی آسانی سے اور کتنا اچھا مل جاتا ہے۔" طنزیہ انداز میں کہہ کر اس نے فالسے کے پیڑ سے دو تین ہلکے گلابی فالسے توڑ کر منہ میں ڈالے اور کھٹاس سے آنکھیں میچی۔

"جس کا کام اسی کو ساجھے، مجھے اپنے ہاتھ کے لگائے اور اپنی دن رات کی محنت سے سینچے گئے ان پھلوں اور سبزیوں کو کھانے میں جو مزا آتا ہے، وہ تم کبھی جان ہی نہیں سکتے۔ اس لیے فی الوقت مجھ پر اور میری محنت پر تنقید کرنے کے بجائے یہ سوچنے میں وقت گزارو کہ کیسے جلد از جلد زیادہ دولت کما کر اپنے ماموں کی طرح دولت مند بن سکتے ہو تاکہ تمہیں اس دیہاتی طرز زندگی سے نجات ملے۔" ہاتھ جھاڑ کر اس نے اپنی صفائی کے اسباب جمع کر کے ایک بڑے تھیلے میں ڈالے اور اسی کے انداز میں کہا اور پاس سے گزر کے چلی گئی۔

"ہونہہ، پینڈو پروڈکشن پتا نہیں خود کو سمجھتی کیا ہے۔" اس کے طنز کو سمجھ کر بڑبڑاتا وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔



حیات خوب منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آئی تو لائٹ ندارد۔ اس نے پنکھا اٹھا کر خود کو ہوا دی اور زہرہ سے ناشتے کا کہنے ہی والی تھی جب تائی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔

"الٰہی خیر! کسی مطلب کے بغیر تو وہ کسی سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کرتی تھیں اور واقعی اس کا اندازہ بھی صحیح نکلا جب وہ شہد ٹپکاتے لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

"اے حیات! کل پرسوں جو تم نے پکی کڑھائی کا کام مکمل کیا ہے تو مجھے بڑا ہی پسند آیا۔ وہ تم ایسا کرو کہ مجھے دے دو۔ فصل کے پیسے آنے والے ہیں میں لوٹا دوں گی رقم۔ زارا کے لیے لے کے جاؤں گی تو خوش ہو جائے گی بچی! اسے بڑی پسند ہیں ہمارے ہاں کی ہاتھ کی کڑھائیاں۔"

"جی تائی بالکل پرسوں مکمل ہو گیا تھا وہ سوٹ مگر وہ آپ کو میں نہیں دے سکتی کیونکہ اس سمیت پانچ آرڈر کے سوٹ میں نے آج کی تاریخ میں بوتیک بھجوانے ہیں۔ تو وہ تو میں نے تمام سوٹ پیک کر کے رکھ دیے ہیں۔ دینو کاکا کو پیغام بھی بھجوایا ہے گیارہ بجے انہوں نے اسٹیشن کوئی سواری چھوڑنے جانا ہے تو ان کے ہاتھ یہ بھجوا دوں گی۔" بڑے اطمینان سے اس نے کہا جبکہ باہر سے اس کے لیے ناشتا لے کر آتی زہرہ سٹپٹا گئی۔ پتا تھا تائی کو سوٹ نہ ملا تو تایا کو ایک کی چار جا کر لگائیں گی اگرچہ تایا اپنی بھتیجیوں کے معاملے میں ان کی کم ہی سنتے تھے۔

زہرہ نے جلدی سے حیات سے کہا کہ "وہ تائی کو وہ سوٹ دے دے۔ وہ وعدہ کرتی ہے کہ چار پانچ دنوں میں حیات کو ویسا ہی سوٹ تیار کر کے دے گی۔" مگر حیات نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں زہرہ تم بھی جانتی ہو اور تائی بھی کہ حیات مرتضیٰ اپنی کمٹمنٹ کی کتنی پکی ہے وہ سوٹ بوتیک والوں کا ہے تو انہی کا ہی ہے اور آج کی ہی تاریخ میں دینا ہے۔ تم بے شک تائی کو ان کی بھتیجی کے لیے دوسرا بنا دینا۔" بے حد اطمینان سے اس نے ناشتا تناول کرتے ہوئے تائی کے ناگوار تاثرات کی پروا کیے بنا کہا۔

"رہنے دو۔ ایسے بھی ہیرے نہیں جڑے اس سوٹ میں جو ایسے اکڑ رہی ہو۔ اس گاؤں میں ایسی کئی عورتیں ہیں جو اس سے زیادہ خوب صورت کڑھائی کرتی ہیں۔ ان سے ہی منگوا لوں گی میں۔" تڑخ کر کہتی وہ کمرے سے نکل گئیں۔

"مرضی ہے آپ کی تائی۔" حیات کی شان بے نیازی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ زہرہ نے محض تاسف سے اسے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں کہ اسے پتا تھا آخر میں ہار اسے ہی ماننی پڑے گی۔ تائی کچھ ہی دیر میں ولید اور سمیع سمیت شہر کے لیے نکل چکی تھیں۔ سعید بھائی البتہ اپنے خاندان کی سرگرمیوں میں کم ہی شریک ہوتے تھے۔ سو وہ تایا کے ساتھ زمینوں پر تھے۔

"آہا مزا آئے گا آج تو۔ ویسے زہرہ آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مطلق العنان ظالم بادشاہ جب غیر ملکی دوروں پر نکلتے ہوں گے تو پیچھے ان کی رعایا کتنا سکون محسوس کرتی ہوگی۔ میں سبزی دیکھتی ہوں۔ آج بیل پر تازہ سبز توریاں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا تھا میرے، وہ توڑ کر میں سالن بنالوں گی اور تم مجھے آج ان کیریوں کا مربہ بنا دو جو کل آندھی کے باعث گر گئی تھیں۔ تایا بھی کب سے فرمائش کر رہے تھے کہ کب سے حیات کے کھیت کی توریاں نہیں کھائیں۔" اٹھ کر اس نے ریڈیو آن کر کے ایف ایم لگایا اور خود باہر آگئی۔ ریڈیو کی آواز اتنی رکھی کہ اس تک پہنچتی رہے۔ جب تک اس نے آگ جلا کر توریوں کا سالن بنایا زہرہ تندور جلا چکی تھی اور کیریاں بھی مربہ بنانے کے لیے تیار تھیں۔ جس وقت تایا اور سعید بھائی زمینوں سے واپس آئے۔ دونوں بہنیں دسترخوان لگا چکی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھار لسی کے ساتھ اچار، مربہ اور پودینے والی ٹماٹر کی چٹنی دیکھ کر تایا خوش ہو گئے۔

"آج تو لگتا ہے دسترخوان کو میری حیات کے ہاتھ لگے ہیں۔ وہی عام سی چیز کو ایسے اہتمام کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ شاہی خوان کا سا سواد آجاتا ہے۔" تایا کی تعریف اس کا ڈھیروں خون بڑھا گئی۔

"ہاں بھئی لڑکیوں کل شہر جانا ہے میں نے کاشت کے لیے کچھ کھاد اور اسپرے وغیرہ چاہئیں۔ تم لوگوں نے کچھ منگوانا ہو تو بتانا لے آؤں گا۔" تایا جان سے زمینوں کے بارے میں کوئی بات کرتے اچانک سعید بھائی کو یاد آیا تو انہوں نے پوچھا۔ حیات نے کہا کہ "اس نے بوتیک کے آرڈر کے لیے کپڑا اور دھاگے منگوانے ہیں اور سبزیوں کے کچھ بیج بھی۔ انہوں نے سر ہلا کر کہا کہ وہ لسٹ بنا کر تیار رکھے وہ صبح جاتے ہوئے لے کر جائیں گے۔" دن بھر چلنے والی شدید لو کو شام کو آنے والی آندھی نے ٹھنڈی ہوا میں بدل دیا تھا۔

"اس دفعہ ان آندھیوں نے آموں کی شکل نہیں دیکھنے دینی" حیات نے تڑاتڑ گرتی کیریاں دیکھ کر سوچا اور مٹی سے بھرا ایک جھکڑ چلتا دیکھ دوبارہ کمرے میں

چلی آئی تھی۔ شام تک تائی اپنی اولاد سمیت واپس لوٹ آئی تھیں۔



"سنو جی سعید کے ابا! بھائی صاحب اور چھوٹی دونوں سے ہی بچوں کے رشتے کی بات کی ہے۔ چھوٹی نے تو خوشی سے ہاں کردی مگر بھائی صاحب نے تھوڑا سا وقت مانگا ہے سوچنے کے لیے مگر مجھے پوری امید ہے کہ وہ بھی ہاں کردیں گے۔" تائی کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی جیسے ان کے بہن بھائی نے نہیں' ملک کے بادشاہ نے ان کے بیٹوں کے رشتے کو شرف قبولیت بخشا ہو' تایا کے چہرے پر البتہ سنجیدہ تاثرات چھائے رہے۔

"اور ان کی شہر میں شفٹ ہونے والی شرط کا کیا ہوا؟" انہوں نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں تو وہ شرط تو وہیں کی وہیں ہے کہ وہ دونوں ہمارے بچوں کا رشتہ اسی صورت منظور کریں گے جب ہم لوگ پوری طرح شہر شفٹ ہوجائیں گے اور بات بھی ٹھیک ہے لوگ شہر جاکر کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور ہم کنویں کے مینڈک کی طرح وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ بھائی صاحب کے بنگلے کے پاس جگہ بھی ہے خالی' میں نے تو کہہ دیا ہے ان سے کہ پلاٹ کے لیے بات کریں۔ ابھی سے شروع کریں گے تب جاکر ہی کہیں مکمل ہوگا سب کچھ۔"

"اور یہ ساری پٹی تمہیں تمہارے بھائی اور بہن نے پڑھائی ہوگی۔" ان کا ٹھنڈا لہجہ تائی کو آگ لگا گیا۔

"کیوں میں کوئی اندھی ہوں یا بے عقل جو مجھے کوئی پٹی پڑھائے گا۔ ساری زندگی اسی دو اور دو چار میں گزر گئی۔ زمین' زمین کا کلمہ پڑھتے رہے آپ ساری عمر ۔ارے' یہ زمین کیا دے رہی ہے وہ وقت کی روکھی سوکھی۔ اسی کو بیچ دیا ہوتا اور شہر جاکر تمام سرمایہ کسی کاروبار میں لگایا ہوتا تو آج کہاں ہوتے ہم لوگ۔ میرے بھائی نے بھی ایسا ہی کیا ناں اور بہنوئی نے بھی' دیکھا ان دس سالوں میں ہم وہیں رہ گئے کنویں کے مینڈک' ان کو دیکھیں کیا عالی شان بنگلے' گاڑی کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ اب اگر میں اپنے بچوں کے مستقبل کا سوچ رہی ہوں تو کیا برا کررہی ہوں' ماں ہوں ان کی اتنا بھی حق نہیں بنتا میرا۔ میں نے بھائی اور بہنوئی سے بات بھی کرلی ہے۔ یہ زمینیں جو ہمارے کسی کام کی نہیں ہیں۔ ان کو بیچ کر شہر میں گھر تو بنوانا ہی ہے۔ باقی کا سرمایہ دونوں کے ساتھ کاروبار میں بھی لگاؤں گی۔ آخر کو دونوں بیٹے ان کے داماد بنیں گے تو کاروبار میں بھی تو حصہ ہوناں ان کا۔"

تایا نے تائی کی ساری تقریر نہایت خاموشی سے سنی بلکہ برداشت کی پھر جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکیں تو گویا ہوئے۔

"میں اب بھی وہی بات کروں گا جو پہلے سے کرتا آیا ہوں کہ زمین بیچنا ہم لوگ بہن بیٹی بیچنے کے برابر سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری عزت ہوتی ہے مشکل وقت کا سہارا اور رزق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ تمہارے حصے کی زمین تم بیچو' بانٹو یا جو کچھ کرو میں تمہارے کسی بھی پروگرام کا حصہ نہیں ہوں نہ ہی ان رشتوں میں میری مرضی شامل ہے۔ میں نے اور میرے مرحوم بھائی نے مل کر جو بچوں کے حوالے سے خواب دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر تو تمہارے حسد کی وجہ سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اب جو اور جیسے چاہو کرو مگر میں یہ گاؤں' یہ سرزمین کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا کہ میرے حصے کا جو رزق ہے وہ مجھے ہر صورت ملتا رہے گا۔ جب تک دم ہے تو محنت کرکے کھاتا رہوں گا۔ پھر میں اکیلا کہاں ہوں وہ یتیم بچیوں کی ذمہ داری ہے میرے سر پر۔ اگر جو انسان بن کر سوچیں تم تو وہ آج بھی میری بہوئیں بن سکتی ہیں۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ اس چڑیل کا سحر آج تک ٹوٹا ہی نہیں آپ کے سر سے بیس سال زندہ رہی تو اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی باندھ کے رکھا اب مر گئی ہے تو دو جونکوں کی صورت حسین بلائیں میرے سر پر مسلط کر گئی ہے۔ مگر آپ بھی کان کھول کر سن لیں اس حرافہ کی بیٹیوں کو تو میں مر کر بھی بہوئیں نہیں

بناؤں گی۔"

"بند کرو اپنی بکواس! اس لیے تو تمہارے منہ لگنا گوارا نہیں کرتا میں زندہ لوگ تو تمہارے زیر عتاب ہیں ہی مرے ہوؤں کو تو بخش دو۔ کتنی دفعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہاری بہن کا نصیب میرے بھائی کے ساتھ نہیں جڑا تھا تو سب کچھ بھی بنتا تھا اس میں اس جنت مکانی کا کیا قصور۔ شہر میں رہنے والے کالج سے پڑھنے والے مرتضیٰ نے پہلے دن سے ہی اماں کو بتا دیا تھا کہ اپنی بھانجی کو اس کے نام کی آس میں مت رکھیں۔ وہ کسی ان پڑھ سے شادی نہیں کرے گا اور تمہیں بھی تو کتنی بار اپنے منہ سے یہ بات کہی تھی اس نے۔ تمہاری بہن بھی بیٹھی تو نہیں رہ گئی ناں اس کے نام پر خوش باش ہے اپنے گھر مگر تم کم عقل عورت نے اس اجھلی ماس سے جو بیر پہلے دن سے باندھا' وہ آج اس کے مرجانے کے بعد بھی ویسے کا ویسا جوان ہے۔ میں تو خود حیران ہوتا ہوں کہ کوئی اور تمہارے جیسی عورت ہوتی تو خوب مقابلہ کرتی تمہاری زبان درازی کا۔ آخر کو اپنے میاں کی کمائی کھاتی تھی تمہارے باپ یا شوہر کی نہیں مگر شریف خاندان کا خون تھی پھر پڑھی لکھی بھی جو جاہل عورت سے منہ ہی نہ لگنا گوارا کرتی ہو گی۔"

"ہاں شریف خاندان کی شریف زادی' اس لیے بھاگ کے نکاح کرلیا۔" تائی چمک کر بولیں۔

"نہ اتا' نہ پتا' نہ آگا' نہ پیچھا۔ نجانے کیسا گندا خون تھی۔" انہوں نے مزید زہر اگلا۔

"نکاح کیا تھا اس نے میرے بھائی سے کوئی جرم نہیں اور ماں باپ سے چھپ کر ایسا کیا تو ناراض تھے وہ لوگ' کتنی بار معافی مانگنے بھی گئی مگر نجانے کیسے سخت دل لوگ تھے کہ ذرا بھی دل نہ پسیجا۔ بھائی بھابھی کی موت پر میں گیا تھا بلاوا دینے کہ جیتے جی تو رحم نہ آیا ان کو اب مرے ہوؤں کو شاید بخش دیں۔ مگر نجانے سب بیچ باچ کر کس دیس کو سدھار گئے۔ بہت امیر لوگ تھے اور شریف بھی سارا محلہ گواہی دیتا تھا ان کی شرافت کا۔ اس شہری عورت کا یہاں اس سہولتوں سے عاری گاؤں میں تم جیسی کے ساتھ اتنے برس گزارے جانے سے بڑھ کر اس کی شرافت کی دلیل کیا ہو گی۔" تایا کی آزردگی کو تائی کے انداز اور باتوں نے بڑھا دیا تھا اور یہ جھگڑا آج کا نہیں تھا بہت پرانا تھا جب سے ان کے چھوٹے بھائی شہری لڑکی سے نکاح کرکے لائے تھے۔

یونیورسٹی کے طالب علم مرتضیٰ کو وہ یونیورسٹی میں ہی ملی تھیں۔ ایک باپ تھے جو لاڈلی بہو کے کہنے پر چلتے تھے۔ سارہ جو کہ پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی مرتضیٰ کی پسندیدگی کو بھانپ چکی تھی مگر کبھی مثبت جواب نہ دیا تھا کہ پہلے گھر میں بات کرنا چاہتی تھی۔ بھابھی نے بھائی اور سسر کے کان بھر کر اپنے آوارہ بھائی کے ساتھ رشتہ پکا کردیا۔ اس نے خوب واویلا کیا۔ باپ اور بھائی کو سمجھانا اور بتانا چاہا مگر پتا نہیں کون سی پٹی بھابھی نے ان کی آنکھوں پر باندھ رکھی تھی کہ ایک نہ سنی تھی اور جس شام کو اس کا نکاح تھا اسی صبح وہ یونیورسٹی آئی تھی مگر گھر کبھی واپس نہ جانے کے لیے اور خود ہی مرتضیٰ کو ساری صورت حال بتا کر نکاح کے لیے کہا تھا۔

مرتضیٰ جو روز سوچتا تھا کہ کیسے اس شہری لڑکی سے شادی کی درخواست کرے گا۔ اس پیش کش پر نہال ہو کر فوراً" اسے قبول کرلیا اور اسے لے کر فوراً" گاؤں آ گیا تھا جہاں ایک دوسری عورت سارہ کی بھابھی کے سے تیور اور ارادے لیے موجود تھی کہ اس عورت نے چھوٹے دیور کو اپنی ملکیت سمجھا تھا اور اپنی بہن کو بھی اس گھر میں لانا چاہتی تھی۔ خوب صورت اور تعلیم یافتہ سارہ کی ان دو خوبیوں کو اس عورت نے سارہ کا عیب بنا کر عمر بھر اس کی زندگی اجیرن کیے رکھی تھی۔ سارہ کئی بار اپنے شوہر کے ساتھ اپنے باپ اور بھائی سے معافی مانگنے پہنچی تھی مگر ہر بار ہی منہ کی کھانی پڑی تھی۔

تائی کے بیٹے تھے۔ سو اس بات پر اتراتے ہوئے وہ اسے بیٹیوں کا طعنہ دے دے کر بھی جینے نہ دیتیں کہ جیسی ماں ویسی ہی بیٹیوں کی تربیت کریں گی۔ ایک اس داغ کو خود پر سے اتارنے کے لیے سارہ نے اتنے سال

تائی جیسی تیز طرار عورت کی بری بھلی سنتے گزاری تھی۔ زہرہ کے ابا گورنمنٹ ٹیچر تھے۔ سارہ کے دکھ درد سنتے تو کہتے کہ شہر چل کر رہتے ہیں مگر اپنوں سے ڈسی سارہ نجانے کس وہم کا شکار تھیں کہتیں کہ ان کو کچھ ہو گیا تو کم از کم گاؤں میں ان کی بچیاں اپنوں کے درمیان تو رہیں گی۔ کتنی بار تایا یقین دہانی کراتے کہ ان کی بیوی کتنی مخالفت کیوں نہ کرے وہ اپنی دونوں بھتیجیوں کو اپنی بہوئیں بنائیں گے۔ مگر تائی کے انداز اور زبان سارہ کو بے حد خوف زدہ کر دیتی۔

سعید تو پھر بھی تایا جیسا ہی تھا نرم مزاج کا اپنے لوگوں اور مٹی سے محبت کرنے والا۔ شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے دونوں بھائیوں خاص طور پر ولید کی طرح نہ تو شہر جا کر بسنے کی ہڑک تھی نہ ہی اپنے ماموں اور خالہ کی طرح دولت مند ہونے کا خبط۔ سارہ اور مرتضیٰ کی حادثاتی موت کے بعد جب تایا نے بچوں کی باضابطہ شادی کا نام لیا تھا تائی نے ایک تماشا کھڑا کر دیا تھا اور ایسی صورت میں زہر کھانے کی بھی دھمکی دی تھی یوں تایا سمیت سب چپ ہو رہے تھے۔ تائی کے بار بار باور کرانے پر ولید تو اپنی کزنز سے والدہ جیسی ہی عداوت رکھتا تھا مگر سعید کے دل میں محبت تو نہیں تھی بہرحال ہمدردی موجود تھی خصوصاً جب وہ ان دونوں کو معاشی جدوجہد میں بے حال دیکھتا تو۔ یہ بھی تھا کہ اسے شریک حیات کے لیے نہ تو ماموں کی الٹرا ماڈرن بیٹی پسند تھی نہ خالہ کی نک چڑھی اولاد' اور ایک بار اس نے اماں سے بھی کہا تھا کہ بھلے زہرہ یا حیات سے اس کا رشتہ نہ جوڑیں مگر کوئی ایسی لڑکی لائیں جو اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ جبکہ تائی نے یہ سمجھا تھا کہ وہ زہرہ اور حیات کی وجہ سے منع کر رہا ہے تو جا کر خالہ کی بیٹی سے اس کی بات پکی کر آئی تھیں۔



"اماں کہہ رہی ہیں کہ آج کیری اور کدو کے مربوں کے دو مرتبان تیار کر دو کل شہر لے کر جانے ہیں۔" تائی کا حکم زہرہ تک پہنچانے والا وہ ولید تھا۔ مگر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی حیات جو کہ فریم میں سوئی دھاگے سے الجھی تھی۔ تیر کی طرح اڑ کر آئی تھی مبادا سدا کی موت کی ماری زہرہ ابھی اٹھ کے مربہ بنانے چل دے۔

"ہاں بن جائے گا مربہ۔ اپنی اماں سے جا کر کہہ دو ساتھ یہ بھی کہ پیسے پیشگی بھجوائیں کیونکہ اچار' مربے' چٹنیاں بنانے کے لیے پھل اور سبزی تو میرے پینڈو پروڈکشن (کھیت) سے نکل آتی ہے مگر ان سب کے لیے کچھ اور لوازمات کی بھی ضرورت پڑتی ہے جن میں چینی' گھی اور لکڑی جیسے لوازمات چاہیے ہوتے ہیں۔ جو یقیناً پیسوں سے آتے ہیں۔"

"تم سے کس نے کہا؟ میں تو زہرہ سے بات کر رہا ہوں۔ لالچی نہ ہو۔ بس میں نہیں تمہارے کہ خود کو بھی بیچ دو تم۔" ولید کے منہ بنا کر کہنے پر اس کو آگ لگ گئی۔

"جن کے تم جیسے رشتہ دار ہوں تو ان کو خود سمیت ہر متعلقہ چیز کی قیمت لگانی پڑتی ہے زہرہ اس وقت تک کچھ نہیں بنا کے دے گی جب تک پیسے نہیں آئیں گے۔ مفت کے بیگار کے لیے نہ تو ہمارے پاس وقت ہے نہ ہمت۔"

"لڑنا تو بند کرو تم دونوں!" زہرہ جھنجلا کر بولی۔

"ولید میرے بھائی تم ایسا کرو۔ زمینوں سے کچھ سوکھی لکڑیاں لا کر دے دو یا تائی سے ہی کہو اسٹور سے کچھ لکڑیاں نکال دیں۔ چینی میرے پاس رکھی ہے کل منگوائی تھی تو کام چل جائے گا۔" مزید یہ چھوٹی سی جنگ زیادہ طویل نہ ہو جائے' سو زہرہ ہی نے ولید سے کہا تو وہ خوں خوار نظروں سے خود کو گھورتی حیات کو دیکھتا باہر چلا گیا۔

"ہونہہ مفت خورے۔ کیا ضرورت ہے تمہیں ایسے لوگوں سے مروت برتنے کی جو صرف اپنی غرض کے غلام ہیں۔ دیکھا ہے جب سے ہم نے یہ مربہ چٹنیوں کی فروخت کا کام شروع کیا ہے۔ تائی لکڑی والے اسٹور کو تالا کیوں لگا کے رکھتی ہیں۔ وہ ہم پر

زندگی تنگ کر دینا چاہتی ہیں اور تم ہو کہ ایسے بچھ بچھ
جاتی ہو جیسے ہمارا رزق وہی تو دے رہی ہیں ہمیں۔"
ولید کو زور سے مفت خورے سنا کر وہ بہن کی طرف
مڑی اور اسے بے نقط سنا ڈالیں۔

"غصہ مت کیا کرو حیات میں ڈرتی نہیں ہوں کسی
سے نہ تائی ہمارے حصہ کا رزق دے رہی ہیں۔ بس یہ
سمجھ لو کہ دنیا میں ہر انسان کے ظرف کا پیمانہ الگ ہے
اب جیسے تائی کرتی ہیں ویسے تو میں مر کر بھی کسی کے
ساتھ نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ظرف کا مظاہرہ کرتی ہیں۔
میں اپنے ظرف کا۔ تم صرف یہ سوچ کر چپ ہو جایا کرو
کہ اللہ کے بعد دنیا میں یہ گھر ہماری واحد پناہ گاہ ہے
جس میں ہم عزت سے رہ رہے ہیں۔ بھلے اپنا کماتے
اور کھاتے ہیں مگر دنیا کی میلی نظروں سے محفوظ ہیں تو
اس میں ہمارا کارنامہ نہیں ہے اس پناہ گاہ کی وجہ سے
ہے یہ سب۔ وہ ہمارے عزیز ترین رشتے کی بیوی ہیں
سو احترام کی متقاضی ہیں۔ ان سے مت کلام کرو مگر بد
تمیزی بھی مت کرو۔ اپنا موڈ اچھا کرو آج تمہارا رزلٹ
آنا ہے یاد نہیں تمہیں سعید بھائی سے کہا تھا کہ آج کا
اخبار لے آئیے گا۔ یہ بتاؤ کہ آگے کا کیا ارادہ ہے
تمہارا؟" زہرہ نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے بہلا لیا
تھا۔

پھر شام تک ایف اے کے رزلٹ نے حیات کا
موڈ خوش گوار کر دیا تھا۔ تایا تو گاؤں میں بانٹنے کے لیے
جلیبیاں تک لے آئے تھے۔ سعید بھائی بھی حیات کی
پسندیدہ مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے تھے۔ تائی البتہ صرف
ناگوار تاثرات لیے یہاں وہاں پھرتی رہی تھیں۔ حیات
سے تو ویسے ہی خدا واسطے کا بیر تھا انہیں۔ زبان بندی
کی وجہ بھی یہ تھی کہ تین گھنٹے لگا کر زہرہ نے انہیں ان
کی بہن کے لیے دو قسم کے مربے تیار کر کے دیے
تھے۔ سو اس وقت وہ صرف نظر انداز کی پالیسی اپنائے
ہوئے تھیں۔ ولید بھی حیات کے دوبدو مقابلہ کرنے
کی وجہ سے اس سے خار کھاتا تھا مگر زبانی کلامی جنگیں
اس گھر کا روز کا معمول تھیں ان دونوں کے درمیان
اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ چھوٹے بھائی سے حیات کے
پاس ہونے کی خبر سن کر آیا تھا۔

"واہ بھئی مس پینڈو پروڈکشن! ایف اے پاس
کرنے پر تم نے فروٹ اور سبزی کے باغات اگا لیے۔
ان سے چیزیں بنا بنا کے فروخت کرنے لگیں۔ اب
آگے پڑھ کے تو مجھے لگتا ہے ہمیں اس گھر میں چھوٹی
چھوٹی جوسز اور فوڈ بنانے والی فیکٹریز نظر آنے لگیں
گی۔" وہ تایا کو بتا رہی تھی کہ وہ پرائیویٹ آگے پڑھنے
کا ارادہ رکھتی ہے سو اسے شہر سے پراسپکٹس منگوا دیا
جائے جب ولید نے آکر اسے مخاطب کیا۔

"جی ہاں ان شاء اللہ! ترقی کا سفر ہمیشہ پہلی سیڑھی
سے چھوٹی سطح سے ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا
ہو گا اور باتوں سے ہوائی قلعے تعمیر کرنے والے صرف
منہ کی کھائیں گے۔" اس نے پرسکون ہو کر جواب
دیا۔

"شاباش میری دھی! میں دو دن میں ہی اپنی دھی کو
فارم منگوا دیتا ہوں تایا نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ولید کو
غالباً" اس کے پرسکون انداز سے مزا نہیں آیا اس لیے
بدمزا ہو کر جلیبیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سعید بھائی ایم اے کے بعد نوکری کے لیے جوتیاں
چٹخا کر تھک گئے تھے مگر آج کل جب پی ایچ ڈی بھی
بے روزگاری کے ہاتھوں خودکشیاں کرنے پر مجبور
ہیں۔ ایک ایم اے پاس کو کون پوچھتا۔ سو تھک ہار کر
انہوں نے وہی آبائی پیشہ کھیتی باڑی ہی اپنایا تھا۔ تائی
لاکھ کہتی رہ گئیں۔ ان کے بھائی اپنے کاروبار میں اسے
کہیں کھپا دیں گے۔ مگر سعید نے جو کہ اپنے ماموں اور
خالو کے مشترکہ دو نمبر دوائیوں کی سپلائی کے کام کے
بارے میں جانتا تھا' صاف انکار کر دیا تھا۔ ہاں ولید اپنی
تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ماموں کے ساتھ کام کر
رہا تھا۔

تائی جان نے اپنے حصہ کی زمین سے فروخت
ہونے والی رقم سے شہر میں گھر بنوانا شروع کر دیا تھا جو
ولید کے زیر نگرانی تھا۔ اب وہ چاہتی تھیں تایا بھی اپنی
زمین بیچ کے جو رقم انہیں دیں اس سے وہ اپنے دونوں
بیٹوں کی ماموں اور خالو کے کاروبار میں شراکت داری

کرلیں جس کے لیے تایا راضی نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

"اماں! زارا کی عادات کچھ عجیب سی ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ ماموں نے اسے کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے۔ آزادانہ دوستوں سے میل جول رکھتی ہے۔ دوستوں میں لڑکے بھی شامل ہیں۔ آئے روز یا تو ماموں کے گھر پارٹیوں میں اس کے دوست آئے ہوتے ہیں یا وہ گئی ہوئی ہے۔ ایک بار میں نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا تو مجھے خوب سنا ڈالیں کہ اپنے کام سے کام رکھوں۔" ولید جو کہ اب تک دور کے ڈھول سہانے کے تحت ماموں کی فیملی اور ان کی رہن سہن کو خوب آئیڈیلائز کرتا تھا۔ اب جب سے ماموں کی دوائیوں والی کمپنی میں ملازم ہوا اس کی رہائش ماموں ہی کے گھر پر تھی۔ اسے ماموں کے گھر والوں کے طور طریقے کچھ خاص بھائے نہیں تھے۔

"تو تمہیں کیا ضرورت ہے قبل از وقت اعتراض کرنے کی۔ ہر کسی کی مرضی ہے جیسے چاہے گزاریں زندگی اپنی۔ شہر میں پلی بڑھی ہے بچی۔ کالج جاتی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہے تو ہو جاتی ہے علیک سلیک ابھی تو تم اس کے مالک مختار نہیں بنے جب بن جاؤ تب اسے اپنی مرضی کے مطابق چلا لینا۔ مت بھولو کہ ابھی تمہارے ماموں نے رشتے کے لیے ہاں نہیں کی ہے۔ تم یہ بتاؤ ہماری کوٹھی کا کام کہاں تک پہنچا۔" زارا کے بارے میں سمجھا کر وہ اشتیاق سے اپنے شہر میں بننے والے گھر کے بارے میں استفسار کرنے لگیں۔ اور جب وہ ماں کو تفصیل بتا رہا تھا تایا اور سعید بھائی اکٹھے اندر داخل ہوئے تھے۔

"بس کرو نیک بخت! مت ان بچوں کو حرام کی راہ پر لگاؤ جن کو ایک ایک لقمہ میں نے حلال کا کھلا کر یہاں تک پہنچایا ہے۔ چھوڑ دو یہ ضد۔ جس گھر میں یتیم بچوں پر ہاتھ رکھا جائے اس گھر کو تو عرش پر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تمہیں اللہ نے ہدایت اور نیکی کمانے کا موقع بھی دیا ہے تو محض ایک ضد میں سب کچھ برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ یہ میرا فرماں بردار بچہ جانتی ہو اس نے آج مجھے کیا کہا۔" انہوں نے سعید کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ سعید بھائی نے نظریں جھکالیں اور تائی ناگواری سے تایا کو دیکھنے لگیں۔

"اس نے کہا" ابا اپنا گھر "اپنی مٹی چھوڑ کر جانے کے تصور سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تو میں وہاں جاکر رہوں گا کیسے آپ اماں کو بتادیں میں یہیں رہوں گا۔" اللہ نے تمہیں فرماں بردار اولاد دی ہے۔ اللہ کے شکر کے علاوہ ان کے جذبات کو سمجھنا تمہارا فرض بنتا ہے۔ جیسے وہ تمہاری جذبات کی قدر کرتے ہیں۔"

تایا نے ایک بار پھر تائی کو سمجھانا چاہا مگر ناکام رہے تھے۔ اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ تائی جا کر اگلے روز اپنی بھانجی کو سعید بھائی کے نام کی انگوٹھی بھی پہنا آئیں ساتھ شگن کی کچھ رقم بھی دے آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تایا میں اندر آجاؤں!" تائی کے گاؤں کے دورے پر نکلتے ہی حیات نے تایا کو اکیلے دیکھا تو اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ وہ شاید زمینوں پر جانے کے لیے تیار ہی تھے مگر اسے دیکھ کر موبائل جیب میں رکھا حساب کتاب والا رجسٹر دوبارہ میز پر رکھا اور اسے اندر بلا لیا۔

"وہ تایا! آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی تین چار دنوں سے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔" وہ نظریں جھکائے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بول رہی تھی۔ تایا نے بغور اس کا انداز ملاحظہ کیا کہ کیا بات تھی جو وہ یوں ہچکچاہٹ کا شکار تھی ورنہ وہ اپنی ہر بات بے دھڑک بیان کر دیا کرتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ حیات پتر! کیا کہنا ہے؟ آرام سے بتاؤ کیا بات ہے؟ کوئی پیسے شیشے چاہئیں یا شہر سے کچھ منگوانا ہے۔"

"نہیں نہیں! پیسے ہیں تایا! وہ امام صاحب کی بیگم آئی تھیں کسی کام کے سلسلے میں تو زہرہ کے رشتے کی بات کرکے گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں دو تین بار تائی

سے بات کر چکی ہیں مگر آپ نے انکار کر دیا ہے کہ غیروں میں رشتہ نہیں کرنا۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ آپ ایک دفعہ پھر سوچ لیں کیونکہ اچھا اور شریف گھرانا ہے۔ برسوں سے ہم انہیں جانتے ہیں اور وہ ہمیں۔ لڑکے کا آڑھت کا چلتا ہوا کاروبار ہے۔ آپ ـــ"

"ٹھیک ہے بچے! تم فکر مت کرو اور جاؤ میں ملتا ہوں امام صاحب سے اور دیکھتا ہوں کہ کیا کرتا ہے۔"

تایا نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا سر تھپتھپایا اور رجسٹر اٹھا کر باہر چلے گئے۔

اس وقت ان کو یہ بات سن کر تائی پر جو غصہ آیا تھا وہ بیان سے باہر تھا۔ شکر ہے وہ گھر پر موجود نہیں تھیں ورنہ ایک معرکہ تو یقینی تھا۔ اپنے بیٹوں کے لیے بھی راضی نہیں رشتہ کرنے پر۔ دوسرے اچھے رشتے بھی انہیں بتائے بغیر منع کر رہی تھیں۔ پتا نہیں اس کے حسد اور نفرت کی حد کہاں تک تھی۔ حالانکہ تایا نے کچھ دن پہلے ہی ان سے کہا تھا کہ وہ ان بچیوں کے لیے بھی گاؤں میں رشتہ کی بات چلائیں۔

وہ دیکھ چکے تھے کہ وہ کتنی ہٹ دھرم تھیں۔ اکیلے ہی جا کر سعید بھائی کا رشتہ طے کر آئی تھیں جبکہ سعید بضد تھا کہ وہ شہر والے گھر نہیں جائے گا بلکہ جو بھی لڑکی بیاہ کر آئے گی یہیں آئے گی۔ اس پر بھی تائی نے لاپروائی سے کہا تھا وقت آنے پر وہ ایک سعید تو کیا سارے خاندان کو ہی لے جائیں گی ساتھ۔ چھوٹا خرم جو نویں جماعت کا طالب علم تھا اسے شہری ماحول کا عادی کرنے کے لیے شہر میں داخلہ کرا دیا تھا۔ فی الحال وہ اپنے ماموں کے گھر تھا۔ رشتہ کی بات کہیں اور چلانے پر تائی نے تایا کا پژمردہ چہرہ دیکھا اور فخر سے مسکرا کر کہا تھا۔

"ارے امیر الدین! بڑے بھولے ہو تم ایسی لڑکیوں کے لیے بھلا کون رشتہ لائے گا جن کی ماں گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔" تایا اس ڈھیٹ عورت کو بس دیکھ کر رہ گئے تھے۔ جس پر اثر ہی نہ ہو اس کے سامنے بات کر کے کیا گنوانا۔ پتا نہیں کیسی ضد اور بیر کا رشتہ اس نے سارہ سے پہلے دن سے باندھا تھا کہ آج اس کے قبر میں جا کر سونے کے بعد بھی وہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی بیٹیوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ تایا کے قدم تیز تیز امام صاحب کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔



"تم ـــ تم نے کیا سوچ کر تایا سے ایسی بات کی حیات! تمہیں شرم نہیں آئی ذرا سی بھی بھلا کیا سوچیں گے وہ میرے بارے میں۔" زہرہ تو حیات کے منہ سے یہ ساری بات سن کر روہانسی ہو گئی۔ جبکہ حیات اپنی اس کاوش پر مسرور نظر آ رہی تھی۔ کل ہی تو سعید بھائی سے اس نے تھرڈ ایئر کا کورس منگوایا تھا۔ بی اے پرائیویٹ ہی کرنے کا ارادہ تھا اس کا کہ ریگولر پڑھائی کے لیے نہ تو ذرائع تھے نہ ہی وسائل۔ اکنامکس کی کتاب کا سرسری جائزہ لیتے اس نے اطمینان سے بہن کے ہراساں چہرے کو دیکھا اور مسکرائی۔

"دیکھو زہرہ! سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تائی سمیت ان کا سارا خاندان یہاں سے پھر ہونے والا ہے۔" اس نے ہوا میں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تایا ہماری وجہ سے مشکل میں ہیں۔ اچھی زندگی اور بہتر زندگی کسے پسند نہیں ہوتی۔ وہ سہولتوں سے عاری اس گاؤں سے جانے سے انکاری ہیں تو صرف ہم دونوں کی وجہ سے کیوں کہ ابھی ان میں احساس باقی ہے اور ان کا خون سفید نہیں ہوا ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہو تائی ہمیں پتا نہیں کیسے یہاں برداشت کر رہی ہیں۔ وہ تو شکر ہے اس گھر اور زمینوں میں ہمارے ابا کا حصہ ہے۔ تایا اور تائی کے درمیان بہت عرصہ سے تعلقات ناخوش گوار ہیں تو وجہ ہم دونوں ہیں۔ ایسے میں کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم بھی ان کا خیال کریں۔ امام صاحب کی بیگم نے دو تین بار تم سے بات کی مگر تمہیں گھبرانے شرمانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔" زہرہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے پھر سے اپنی بات شروع کی۔

"اب بڑی تم ہو تو شادی بھی پہلے تمہاری ہونی

چاہیے ناں۔ تائی کی فطرت جانتے ہوئے مجھے شک تھا کہ انہوں نے تایا سے اس رشتے کی بابت بات ہی نہیں کی ہوگی۔ سوان کو منظر سے غائب دیکھ کر میں نے تایا سے بات کرلی ہے۔ میں جلد از جلد تمہیں اس گھر سے رخصت کر دینا چاہتی ہوں۔ تاکہ گزشتہ پانچ سالوں سے دو اور دو چار کے جس چکر میں ہم الجھے ہیں اس سے ہٹ کر اپنے حصے کی خوشیاں کشید کریں کہ زندگی پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا باقی سب کا۔ اللہ تو وسیلہ بناتا ہے' اسباب بھی پیدا کرتا ہے۔ بس ان کا ادراک اور فہم ہم انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ ہم ان کو کس نہج پر استعمال کرتے ہیں۔"

"اور تم۔۔ تم کیا کرو گی؟ زہرہ نے پھر ہراساں ہو کر پوچھا۔ حیات کے برعکس وہ خود اعتمادی سے عاری تھی۔ اس لیے تائی بھی اسے دبا کر رکھتیں اور کتنے ہی کام نکلوالیا کرتی تھیں۔

"میں ۔۔۔ میں تمہاری طرح انیس سو ساٹھ کی ہیروئن نہیں ہوں جو تائی کا ظلم و ستم برداشت کروں گی۔ یہ سب کام ایسے ہی چلتے رہیں گے۔ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں گی پھر تم اور تمہارا میاں میرا رشتہ تلاش کر کے میری بھی شادی کروا دینا اور پھر کسی فلم کے اینڈ کی طرح ہم بھی ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔" اس نے اتنے مزے سے کہا کہ زہرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔



"میں نے زہرہ کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ فصل کے بعد اس کی شادی کی تاریخ بھی پکی کردی ہے۔" تایا کی اس بات سے حیات نے خوشی سے زہرہ کی طرف دیکھا جو حواس باختہ سی تایا کو دیکھ رہی تھی۔ ولید اور خرم بھی گھر آئے ہوئے تھے۔ جبکہ تائی کی سماعتوں پر جیسے کسی نے بم پھوڑا تھا۔ سارہ کی بیٹیوں کو تو وہ رلتا دیکھنا چاہتی تھی۔

"کہاں اور کس سے؟ یہ اوقات ہے اب اس گھر میں میری کہ گھر کے رشتے مجھے بتائے بغیر بالا بالا طے ہوں گے پوچھنا تو ایک طرف۔" زہرہ کے ہاتھ کے بے کڑوالے چاول اچانک زہر لگنے لگے تو انہوں نے دسترخوان پر پلیٹ پٹخ کر کہا۔

"شکر ہے تم نے انہیں گھر کے مکینوں میں تو شمار کیا۔ یہ سب باتیں رہنے دو سعید کی ماں کہ کہاں اور کیسے' نہیں تو بہت سے کھاتے کھل جائیں گے بچوں کے سامنے رہا سہا بھرم بھی ٹوٹ جائے گا۔" انہوں نے تائی کو مخاطب کر کے کہا پھر حیات کی طرف متوجہ ہوئے۔

"حیات پتر! جب سے تم لوگوں کا ابا گزرا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے حصہ جو اس بہشتی کا بنتا تھا' اس کا ایک ٹکا بھی میں نے خود پر حرام سمجھا ہے اور وہ بینک میں ڈالتا گیا ہوں ایک دو دن میں وہ رقم نکلوا دیتا ہوں' سعید کے ساتھ جا کر خریداری کر آنا دونوں بہنیں۔"

"زہرہ تو جو جیسا ہے' ٹھیک ہے کی بنیاد پر قبول کر لے گی ابا مگر حیات کی دفعہ خیال رکھیے گا۔ کوئی فوڈ انسپکٹر' کوئی فارسٹ آفیسر یا ماہر نباتات ہی تلاش کیجیے گا یہ کہاں کسی ایسے ویسے کو گھاس ڈالنے والی ہے۔"

تایا کی بات ختم ہوتے ہی ولید کی زبان میں کھجلی ہوئی اور وہ شرارت سے بولا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے لیے' ہر وہ شخص اہم ہے جو محنت کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہو اور جسے صرف اپنے زور بازو سے حاصل ہونے والی کمائی پسند ہو نہ کہ دوسروں کے ٹکڑے چاٹ کر کمانے والا کوئی لالچی آدمی۔" حیات فوراً ہی تڑخ کر بولی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ ولید ماموں کی بیٹی کے ذریعے دولت کمانے کا خواہاں تھا ورنہ اس کی جاب ماموں کی فیکٹری میں میڈیکل اسٹور زپر دوائیاں سپلائی کرنے کی تھی اور پارٹ ٹائم جاب کے طور پر وہ ماموں کے گھر کی ڈرائیوری سے لے کر بازار سے سبزی لے آنے تک کے کام کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی اگرچہ اپنے آزادانہ ماحول اور فطرت کی وجہ سے ولید کو کچھ خاص پسند نہیں تھی مگر فی الوقت اس کی نظر ماموں کے بنک بیلنس عالیشان

بنگلے اور بہترین گاڑی پر تھی جو اس لڑکی سے شادی کے بعد اس کے ہونے والے تھے باقی شادی کے بعد وہ اس کو سدھار ہی سکتا تھا۔ حیات اس کی لالچی فطرت کو جانتی تھی اور تائی کی بھی سو ولید جب جب اس کی حلال کی کمائی کا مذاق اڑاتا اسے منہ توڑ جواب دیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تائی بیٹے کی مدد کو آئی تھیں۔

"دیکھ رہے ہیں اس لڑکی کی زبان درازی۔ پھر الزام تربیت پر ہی آتا ہے۔ اگلے گھر بھلا کون اتنی لمبی زبان برداشت کرتا ہے۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ شریف بچیاں مردوں سے منہ ماری نہیں کیا کرتیں۔"

"اوہ! تم بھی لٹھ لے کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔ بہن بھائیوں میں نوک جھوک ہو جاتی ہے۔ کیا ہوا جو اس نے بات کا جواب دے دیا۔" تایا نے تائی کی بات کو چنداں اہمیت نہیں دی تھی۔

اگلے چند دن حیات اور زہرہ کی زندگی کے خوب صورت اور اہم دن تھے۔ تایا کی ہدایت کے پیش نظر سعید بھائی انہیں تین دن شہر لے جاتے رہے تھے۔ پھر تایا کی تاکید بھی تھی اور زہرہ نے بھی تائی کو ساتھ چلنے کا کہہ کر ان کا مان بڑھا دیا تھا۔ سو احسان دھرتے وہ ان کے ساتھ ہی چلی آئی تھیں یہ اور بات تھی کہ ہر چیز اچھی اور معیاری خریدتے دیکھ کر دل ہی دل میں خاوند کی بے وقوفی پر تلملاتی رہی تھیں جس نے ایک بڑی رقم حیات کے ہاتھ میں پکڑائی تھی۔

خریداری کے آخری دن تائی نے سعید بھائی سے کہا تھا کہ اب شہر آنا ہو ہی گیا ہے تو وہ اپنا زیر تعمیر گھر دیکھتی جائیں جو اب تکمیل کے مراحل میں تھا۔ سو نا چاہتے ہوئے بھی زہرہ اور حیات کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ تائی کے بھائی کے گھر کے بالکل پاس ہی تھا ان کا زیر تعمیر گھر۔ سو وہاں گیٹ پر پہنچتے ہی ساتھ والے بنگلے پر ایک گاڑی آ کر رکی تھی جس میں سے بیک ڈور کھول کر تائی کی طرح دار اور حسین بھتیجی باہر نکلی تھی۔ ان سب کو دیکھ کر بھی نظر انداز کرنے کی پالیسی اپناتے ہوئے وہ ڈرائیور کو سامان اندر پہنچانے کا حکم دے کر چلتی بنی تھی۔ حیرت تو تب ہوئی جب ڈرائیونگ سیٹ سے ڈھیروں شاپرز سے لدے پھندے ولید کو نکلتے سب نے دیکھا تھا۔

تائی تو ان دونوں کی وجہ سے کھسیا گئی تھیں۔ ایک تو بھتیجی کا ایسا رویہ 'اوپر سے ولید کے ساتھ اس کا بات کرنے کا انداز۔۔۔ ہاں سعید بھائی چپ نہ رہ سکے اور آگے بڑھ کر بھائی کو پکارا جس نے ابھی تک اپنے گھر کے باہر کھڑی گاڑی اور اس کے پاس کھڑے گھر کے مکینوں کو نہیں دیکھا تھا۔

"رکو رکو میاں! مانا کہ شہر میں بہت مصروف ہوتے ہو اور جاب اور اوور ٹائم خاصا ٹف ہے مگر ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندے کو ادھر ادھر دیکھنے کا وقت بھی نہ ملے۔" سعید بھائی کی پکار پر وہ ڈھیروں شاپرز سمیت حیرت سے پلٹا پھر ان سب کو ایک ساتھ دیکھ کر حیرت شدید تر ہو گئی۔

"ارے آپ لوگ! السلام علیکم! باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آئیں۔ جاب ٹائمنگ تو پانچ بجے تک ہے مگر آج ڈرائیور ماموں کے ساتھ کہیں گیا ہے تو زارا کو ضروری شاپنگ کرنی تھی سو مامی نے مجھے کال کر کے بلوایا تھا۔" تیز تیز بولتا وہ شاید اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

"سعید بھائی! آپ لوگ مل آئیں اندر اپنے رشتہ داروں سے۔ میں اور زہرہ گاڑی میں ہیں۔ جلدی آجائیے گا۔ مغرب کی اذانیں تو یہاں ہی ہو گئی ہیں۔ آگے گاؤں کا راستہ بھی تو خراب ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات تو ہو ہی جائے گی۔ تایا نے کہا بھی تھا کہ مغرب تک تم لوگوں کو گھر ہونا چاہیے۔" حیات نے صرف کہا ہی نہیں زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بیٹھ بھی گئی۔

تائی نے بھی ان دونوں کو اندر آنے کو نہیں کہا مبادا اندر جا کر ماموں کی بیٹی اور بیوی کا رویہ دیکھ کر ان دونوں کو کسی بات کا موقع ملے خصوصاً" حیات کو تاہم سعید بھائی نے ان دونوں کو کہا تھا کہ وہ بھی اندر چلیں یوں مناسب نہیں لگتا کہ وہ سب اندر جائیں اور وہ دونوں لڑکیاں اکیلی گاڑی میں رہیں۔ مگر حیات کے انکار پر سعید بھائی نے بھی تائی کو ولید کے ساتھ اس تاکید کے

ساتھ بھیجا تھا کہ مامی سے مل کر فوراً" واپس آجائیں۔ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

ولید کو پچھلے چند روز سے گاؤں آنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا کہ اپنے مکان کی تعمیر کے ساتھ ساتھ دوائیوں کی سپلائی کے علاوہ آج کل ماموں کی بیٹی کے لیے فل ٹائم ڈرائیونگ کے فرائض وہی انجام دے رہا تھا۔ صبح کالج لے جانا اور لے آنے کے علاوہ شام میں اسے کسی نہ کسی دوست کے گھر ڈراپ کرنا ہوتا ولید حیران ہوتا کہ شہری زندگی اور طور طریقوں کی اندھی تقلید میں ماموں اور مامی کو احساس ہی نہیں تھا کہ بیٹی کے دوستوں میں لڑکیوں سے زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی اور اسے وہ لوگ اسٹیٹس سمبل سمجھتے تھے شاید کبھی آج تک اس بگڑی اولاد سے باز پرس نہیں کی تھی۔

ایسے میں ولید روز منصوبے بناتا کہ ایک دفعہ اس کی شادی زارا سے ہو جائے پھر وہ اس کو سیدھا کردے گا۔ جتنا بھی خود کو شہری ماحول میں ڈھال لیتا' بنیادی طور پر اندر سے ایک مکمل مشرقی مرد تھا جو اپنے حوالے سے جڑے ہر رشتے کو ویسا دیکھنے کا خواہاں تھا جیسا کہ ایک مشرقی مرد چاہتا ہے۔

آج زہرہ کی شادی کے دن تایا نے خصوصی تاکید کی تھی کہ وہ ہر صورت گاؤں آئے سو ماموں سے مشکل سے اجازت لے کر وہ آگیا تھا مگر اپنے دل کی اس بغاوت پر حیران رہ گیا جب اس نے سجی سنوری حیات کو اپنے بہنوئی سے رسمی نوک جھوک کرتے دیکھا۔ روایتی لباس میں ہلکا پھلکا میک اپ کیے وہ سیدھا اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

وہ اس کی چچا زاد تھی۔ تائی اور تایا کی ان کے رشتے پر کئی بار بحث ہوتی' جھگڑے بھی ہوئے مگر دل نے کبھی بھی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں اسے چھیڑ کر تنگ کر کے وہ بے حد خوشی محسوس کرتا۔ اس کے فوراً" دیے جانے والے جواب اور دوبدو زبانی لڑائی ولید کو مزا دیتی۔

ان دونوں بہنوں کی معاشی جدوجہد کو دل میں سراہتا وہ ہمیشہ اس کا مذاق اڑانے کے درپے رہتا۔ حقیقت بھی یہی تھی وہ جب جب اسے اپنے چھوٹے سے کھیت کے لاڈ اٹھاتے دیکھتا گرمی ہوتی یا سردی۔ موسموں کی شدت سے بے نیاز وہ اپنے پھول' پودوں' سبزیوں کی خود سے بڑھ کر حفاظت کرتی تو وہ دل میں اسے ضرور داد دیتا۔

دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے کے باوجود قدرتی طور پر وہ قدرے سست اور کام سے جی چرانے والا شخص تھا۔ زمین اور زمین داری سے متعلق کام اسے اس لیے پسند نہیں تھے کہ ان میں محنت کا عمل دخل زیادہ تھا۔ سو شروع سے تایا نے وہ ذمہ داری سعید بھائی کو ہی سونپی تھی۔ سعید بھائی کی غیر موجودگی میں کبھی کبھار زہرہ یا حیات چارہ کاٹنے والی مشین پر چارہ بھی کاٹ لیا کرتی تھیں کہ تایا نے زمینوں پر کچھ مویشی بھی رکھے ہوئے تھے مگر تایا یا سعید بھائی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی ولید نے کبھی مشقت والے کسی کام کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا۔ ایسے میں تائی نے زہرہ اور حیات کے رشتے سے انکار کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کو اپنے بھائی اور بہن کے ہاں رشتہ جوڑنے کی نئی راہ دکھلائی تھی جس میں ان کی بھانجی اور بھتیجی دونوں ہی اکلوتی اولاد کے درجے پر فائز تھیں اور دونوں ہی دولت مند والدین کی اولاد تھیں۔

ولید تو فوراً" ہی اس راستے پر چل پڑا تھا جس میں محنت کم تھی اور آسائشیں زیادہ مگر سعید بھائی بضد رہے تھے کہ وہ ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی میں آنے والی کو ویسی ہی زندگی کو قبول کرنا پڑے گا جیسی وہ گزار رہے ہیں اور وہ اسی میں ہی مطمئن ہیں۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا ایسے میں حیات کا سیدھا ولید کے دل پر نقب لگانا اسے بے حد پریشان کر گیا تھا۔

"او بھائی کن سوچوں میں گم ہو؟ ابا کب سے بلا رہے ہیں کہ آؤ زہرہ کی رخصتی ہو رہی ہے۔" سعید بھائی نے کندھے پر ہاتھ مار کر اسے متوجہ کیا جو نجانے

دھیان کے کس سفر پر تھا۔ چونک کر سیدھا ہوا تو دونوں بہنوں کی ایک دوسرے سے لپٹ کر کر خوب روتے دیکھا۔



اگلے روز حیات کی آنکھ معمول کے مطابق ہی کھلی تھی۔ زہرہ کے نہ ہونے کے احساس نے آنکھوں میں نمی بھری تو اس کو پیچھے دھکیلتی وہ زہرہ کی خوشیوں کی دعا کرتی معمول کے کاموں میں لگ گئی۔ ناشتا اسے ہمیشہ گرم اور پسندیدہ ملتا تھا اس میں بھی ساری کارگزاری زہرہ کی ہوتی تھی وہ اس کا ہر کام آدھے سے زیادہ بغیر کہے بانٹ لیا کرتی تھی۔ کپڑوں پر کشیدہ کاری کرنی ہوتی یا ڈیزائن کا چھاپا لگانا ہوتا اور تو اور دوپہر کو تندور بھی جلا کر اسے آٹا پانی سب وہاں پہنچا دیتی اور حیات کا کام جا کر تندور میں روٹیاں لگانا ہوتا تھا کیونکہ باوجود کوشش کی زہرہ کو تندور پر روٹیاں لگانا کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ چپ چاپ آکر اپنے چھوٹے سے خوب صورت قطعے میں بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہیں ملو گی اپنی ارضی جنت میں سو تمہارا یہ ناشتا یہیں لے آیا۔" ولید نے چائے کا کپ اور پلیٹ میں دھرا رسک اس کے قریب رکھا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ حیات نے اس کے اس قدر مہربان لہجے اور مہربانی کو قدرے اچنبھے سے دیکھا۔

"ویسے انسان کی قدر تو اس کے چلے جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ جیسے زہرہ دن رات میں کئی ایسے کام چپکے سے نبٹا دیتی تھی جو ہو جانے پر تو کبھی اس کی مدد کرائی تو ایک طرف ،شکریہ کا ایک لفظ تک نہیں کہا کسی نے ۔ مگر اس کے نہ ہونے سے ایک ہی رات میں اس کی اہمیت پتا چل گئی۔ دودھ کچن میں پڑے پڑے خراب ہو گیا کہ اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی سب کو بستر پر گرم گرم ناشتا مع لسی مکھن کے مل جاتا تھا یہ جاننے کی زحمت ہی کبھی کسی نے نہیں کی تھی کہ کیسے بنا؟ کس نے بنایا؟ وہ تو آج نماز کے بعد ابا کو تازہ چائے نہیں ملی۔ سعید بھائی میٹھی لسی کی آس میں بیٹھے ہیں کہ ملے تو کھیتوں کو نکلیں۔ اماں تو تازہ پراٹھا مکھن کے ساتھ لیتی ہیں۔ برسوں سے یہی روٹین ہے۔ آج ایک زہرہ کے نہ ہونے سے سب نظام تلپٹ ہو گیا۔ سعید بھائی نے ہی ہمت کی ہے۔ دو تھرماس چائے کے اور ڈھیروں رسک ہوٹل سے لے آئے ہیں۔ ابا نے کہا کہ تمہیں بھی بلا لیا جائے مگر سعید بھائی نے کہا کہ کون سا روزمرہ والا ناشتا ہے جو وہ دسترخوان پر آئے گی۔ ایک چائے کا کپ ہی ہے' اسے وہیں دے آؤ۔ سو اب اسی ناشتے پر گزارہ کرتے ہوئے کچھ ہاتھ پاؤں چلاؤ اور آکر ابا کو سامان کی لسٹ بنا دو کہ زہرہ کے گھر کیسا ناشتا لے کر جانا چاہیے؟" زندگی میں پہلی بار وہ اس سے ایسے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا کہ حیات کو حیرت ہو رہی تھی۔ پھر چند لمحوں میں اس نے نتیجہ بھی نکال لیا۔

ہم۔۔ محترم بھی تائی جیسے مطلب پرست خاتون کی اولاد ہیں۔ زہرہ کے بعد اب گھر کو بھی تو چلانا ہے ناں۔ سو جب تک یہاں ہیں تو ایک نوکرانی تو چاہیے ناں گھر سنبھالنے کے لیے اس لیے۔۔۔ ورنہ جس شخص کی زبان سے الفاظ کی جگہ پر پتھر نکلیں اس کا ایسا لہجہ۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم چلو ولید! میں آکر پہلے ناشتا بنا دیتی ہوں سب کو پھر تایا کو سامان کی لسٹ بنا دوں گی۔" اس نے کہا اور اپنے اور زہرہ کے مشترکہ کمرے میں آگئی تھی۔ پھر اس نے زہرہ جیسی پھرتی سے تو نہیں البتہ ناشتا بنا کر سب کو دیا۔ بکھرا گھر سمیٹا' تایا تب تک مٹھائی اور دیگر لوازمات جو اس نے لکھ کر دیے تھے لے کر آگئے۔ مارے باندھے ہی سہی تائی کو بھی ساتھ جانا پڑا تھا اور رات اور صبح وہ زہرہ کو یاد کرتے کرتے رو چکی تھی' مگر وہاں پہنچ کر اس کے چہرے کے کھلتے رنگ دیکھ کر خوش ہو گئی۔ تائی البتہ منہ بنائے بیٹھی رہیں۔ سارہ کی بیٹیوں کی ایسی قسمت کہ وہ چاہی اور سراہی جائیں بھلا انہیں کب گوارا تھا۔

شام کو زہرہ اپنے میاں کے ساتھ آئی تھی تایا کے گھر۔ حیات کو اپنا بہنوئی بھی بہت اچھا لگا تھا۔ سادہ سا مخلص نوجوان جس کی تعریفوں کے پل باندھتے زہرہ

تھک نہیں رہی تھی۔ حیات نے بے ساختہ اس کی خوشی امر ہو جانے کی دعا کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس کے چمکتے روپ کی نظر اتاری تھی۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ بس یہ تھی کہ تائی نے اپنی زبان کی دھار کو حیات کے لیے ہلکا کر لیا تھا آخر کو زہرہ کے بعد اس نے سارا گھر سنبھال لیا تھا پھر بوتیک کا کام بھی کرنا ہوتا۔ وہ تو زہرہ اب بھی آدھے سے زیادہ کام خود کرنے کے لیے لے جاتی تھی ورنہ حقیقتاً" اس کے پاس سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ کتابوں کو بھی بہت کم ٹائم دے پا رہی تھی وہ۔

اس روز تائی ولید کے ساتھ ایک بار پھر شہر کے دورے پر تھیں۔ تایا کھیتوں پر تھے۔ صفائی کر کے اس نے وقت دیکھا پھر بھنڈیوں کو جو صبح اپنے کھیت سے تازہ تازہ اتاری تھیں، دھو کر دھوپ میں خشک ہونے کے لیے رکھ دیا کہ جب تک خشک ہو جائیں تھوڑی کتابیں ہی دیکھ لے۔ ہوا چلتی دیکھ آم کے گھنے پیڑ کے نیچے آ بیٹھی۔ اکنامکس جیسا مشکل مضمون اسے پسند تو تھا مگر سلیبس میں بہت کچھ توجہ طلب تھا۔ ابھی بھی ایک سوال پر خود مغز ماری کرتی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں کس کی مدد حاصل کرنی چاہیے جب ایک دردناک مردانہ چیخ اس کا دل دہلا گئی۔ رجسٹر اور پین اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔ کچھ لمحے دھڑکتے دل کو قابو کرنے کے بعد وہ آواز کی سمت بھاگی تھی۔ مگر وہاں جا کر جو کچھ اس نے دیکھا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں۔ چارہ کاٹنے والی مشین کے پاس درد سے تڑپتے سعید بھائی اور ان کے گرد بنا چھوٹا سا خون کا تالاب۔ اس کی چیخوں سے جلد ہی وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور جب تک تایا کو خبر پہنچتی چند گاؤں والوں کی مدد سے جلد ہی سعید بھائی کو شہر ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ زہرہ بھی خبر سن کر پہنچ چکی تھی۔ تایا بھی شہر چلے گئے تھے۔ اب گھر پر وہ دونوں بہنیں تھیں اور سعید بھائی کے حق میں کی جانے والی ان کی دعائیں تھیں۔ شام تک تایا نے روتے ہوئے ان کو یہ خبر فون پر سنائی تھی کہ سعید بھائی کا ایک بازو مکمل کاٹ دیا گیا تھا جسے سن کر وہ دونوں بہنیں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ تایا، ولید اور تائی مسلسل ہسپتال میں تھے اور چند دن بعد سعید بھائی ڈسچارج ہو کر گھر آ گئے۔ سعید بھائی پر تو جو گزری تھی سو گزری تھی۔ تایا دنوں میں بوڑھے لگنے لگے تھے اور تائی، یہ وہ طمطراق اور تمکنت رکھنے والی تائی ہرگز نہیں تھیں جن کی گردن ہمیشہ تنی رہتی تھی یہ تو ایک بیٹے کے دکھ میں گھلتی صرف ایک ماں تھیں جو ان دونوں بہنوں کے گلے لگ کر خوب روئی تھیں۔

"بس کریں اماں! مرا نہیں ہوں میں، زندہ ہوں ابھی جس دن مر جاؤں اس دن پر بین کر لیجیے گا۔"

سعید بھائی کی سرد آواز پر وہ کرنٹ کھا کر زہرہ کے گلے سے الگ ہوئیں۔ جذبات میں وہ بھول گئی تھیں کہ سعید بھائی بھی پاس ہی موجود تھے۔ زندگی سے بھرپور سعید بھائی کو اس حال میں دیکھنا کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔

ولید بھی صرف تین چار دن گاؤں رکا تھا پھر اسے واپس جانا پڑا تھا۔ زہرہ واپس اپنے گھر چلی گئی تھی۔ زندگی گھسٹ گھسٹ کر ہی سہی دوبارہ سے چل پڑی تھی۔ سعید بھائی ساری دنیا سے کٹ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں گھنٹوں پتا نہیں کیا سوچتے رہتے۔ تائی ان کی حالت دیکھ دیکھ کر گھٹ گھٹ کر روتیں۔ حیات نے بغیر کہے زہرہ والی ساری ذمہ داریاں اٹھالی تھیں۔

بوتیک کے آرڈر تیار کرانے کے لیے اب وہ اکیلی ناکافی تھی کیونکہ زہرہ کی آج کل طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ چاہ کر بھی حیات کی ویسے مدد نہیں کر پا رہی تھی جیسے کرنی چاہیے تھی۔ حیات نے گاؤں کی ہی تین لڑکیوں کو اجرت پر آدھے سے زیادہ کام بانٹ دیا تھا کہ اس کو بھی سہولت ہو گئی تھی اور گھر بیٹھی ان لڑکیوں کے بھی مستقل روزگار کا بندوبست ہو گیا تھا کہ ہنر ہونے کے باوجود اس پسماندہ علاقے میں اس ہنر کی قیمت تو ایک طرف قدر کرنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔

بہت دن بعد وہ اپنے کھیت میں آئی تھی۔ پکے ہوئے فالسوں سے ٹوکری بھری۔ کچن میں جا کر جگ بھر

شربت بنایا' برف ڈال کر جگ اور گلاس سمیت سعید بھائی کے کمرے کی طرف آگئی۔ سعید بھائی کے اس طرح کے حالات کا شکار ہونے کے بعد اسے ان کی اپنی زندگی میں اہمیت پتا چلی تھی کہ کیسے ان دونوں بہنوں کے کام وہ چپ چاپ کر دیا کرتے تھے۔ شہر سے کپڑے منگوانے ہوتے یا دوسرا سامان بوتیک تک تیار شدہ کپڑے پہنچانے سے لے کر رقم کی ادائی تک ان ہی کے ذمہ تھی۔ حیات کو یاد نہیں تھا کہ انہوں نے کب سے ان کے چھوٹے بڑے تمام کاموں کی ذمہ داری اٹھائی تھی اور اب مسلسل ایک مہینہ سے وہ اس حادثہ کی وجہ سے زندگی سے کٹ گئے تھے گویا حیات نے کپڑا اور دیگر سامان تو زہرہ کے خاوند سے منگوا لیا تھا مگر بوتیک والوں نے پچھلے کام کی ادائی تاحال نہ کی تھی۔

تایا سعید بھائی کے پاس بیٹھ بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے' انہیں اکساتے کہ ایک عضو ہی تو ختم ہوا ہے' زندگی نہیں وہ اٹھیں' ہمت کریں اور زندگی سے اپنا حصہ کشید کریں مگر وہ چپ چاپ نظریں جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو گھورتے رہتے۔ حیات آج سوچ کر آئی تھی کہ اس کی زندگی کی بہت سی ذمہ داریاں بانٹنے والے اس حساس شخص سے خوب باتیں کرے گی اور انہیں اس خول سے نکلنے میں مدد دے گی جو اس حادثے کے بعد انہوں نے خود پر چڑھا لیا تھا۔

"میں سخت ناراض ہوں آپ سے سعید بھائی۔" اس نے آکر جگ اور گلاس ان کے سامنے رکھا اور خود بھی سامنے بیٹھ گئی۔ وہ پتا نہیں کن خیالوں میں تھے۔ ایک دم چونک کر سیدھے ہوئے۔ حیات نے شربت کا گلاس بھر کر ان کو دیا اور پھر سے اپنی بات دہرائی اور پھر مزید گویا ہوئی۔

"سعید بھائی! جو شہر سے نئے پھولوں والی پنیری آپ نے لا کر دی تھی۔ وہ پھول نکل آئے ہیں۔ اس بار آم کا درخت زبردست پھل سے بھرا پڑا ہے۔ چڑیا نے جو بچے دیے تھے وہ اڑنا سیکھ چکے ہیں۔ اور تو اور خربوزے کی بیل پر تین چار خربوزے دیکھ کر خوشی سے میری چیخ نکل گئی آج۔ لیکن آپ نے کب سے آ کر میرے پیارے کھیت کے بارے میں کوئی خبر نہ لی۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔ سعید بھائی اداسی سے مسکرائے۔

"تم تو اللہ کو بہت پیاری ہو حیات! مجھے تو لگتا ہے مجھ سے میرا اللہ بھی ناراض ہے جب ہی تو اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا مجھے یہ جانے بغیر کہ میں کمزور سا انسان اس بوجھ کو سہارنے کے قابل ہی نہیں تھا۔" وہ روہانسے ہو گئے۔ اور وہ اس حادثے کے بعد سے ہی اسی قدر زود رنج ہو گئے تھے کہ بات بات پر اپنا نقصان انہیں رلا رلا دیتا۔ حیات بھی ان کی بات پر تڑپ کر رہ گئی۔

ایسے مت کہیں سعید بھائی۔" وہ مالک تو سب جاننے والا سمیع و بصیر ہے' ہمیں تخلیق کرنے والا ہی ہمیں نہیں جانے گا تو بھلا کون جانے گا ہمیں۔ بس اس نے آزمائش کا وعدہ کیا ہے انسان سے تو اسی کے پیمانے بھی مقرر ہیں اس کی طرف سے' کسی کو جان سے' کسی کو مال سے' کسی کو اولاد سے تو کسی کو تکلیف سے' یہ بات تو طے ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو بھی اس کے ضبط سے زیادہ نہیں آزماتا بس صبر شرط ہے۔

مجھے اور زہرہ کو دیکھیں۔ عمر بھر ماں باپ کی ٹھنڈی چھایا میں رہتے رہتے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ دنیا کیا ہے اور اسے کیسے برتا جا سکتا ہے۔ پھر ابا' اماں کی ناگہانی موت کے بعد ہمیں یوں لگا جیسے ہم مفلوج ہو گئے ہوں' آپ تو ایک بازو سے محروم ہوئے ہیں سعید بھائی' ہماری تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ ایک جسم ہی کیا ہماری تو سوچ' احساسات زندگی سب کچھ مفلوج ہو گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ بھلا کون جان سکتا ہے آپ کی اس کیفیت کو کہ نہ صرف آپ سے ایک خون کا رشتہ ہے' بلکہ ایک گھر میں اکٹھے پلے بڑھے ہیں' پھر وہ تخلیق کار جس نے ہمیں پیدا کیا ہے کیسے ان تکالیف سے بے خبر ہو سکتا ہے۔ اسی کا وعدہ ہے کہ ہر دکھ کی آڑ میں سکھ چھپا ہے اور ہر تکلیف کے پیچھے خوشی' جب ہم انسان جانتے ہیں کہ ہم بے بس ہیں اس کاتب تقدیر کے آگے تو کیوں نہیں اس کی رضا میں راضی ہو

جاتے۔ اسی میں زندگی کا سکون پنہاں ہے۔ زہرہ اور مجھے بھی بہت وقت لگا تھا زندگی کی تلخ حقیقت کو قبول کرنے میں آپ بھی کرلیں سعید بھائی۔"

اس نے زندگی سے جڑی اس تلخ اور کڑوی حقیقت کا وہ سبق جو خود پڑھ چکی تھی' اگرچہ اس کا موضوع کچھ اور تھا' سعید بھائی کو پڑھنے میں مدد دی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ حالات کی سختی میں پستے انسان کو کسی ناصح کی' کسی زادراہ کی ضرورت ہر صورت ہوتی ہے جو اس کو مایوسی سے نکال کر زندگی گزارنے کی نئی نہج دے سکے۔

اس کی آزمائش میں اس کی بہن زہرہ اس کے لیے ڈھال بن گئی تھی۔ اب وہ کسی دوسرے کی ڈھال بن کر مایوسی کی اس گرد کو جھاڑنے آئی تھی جس نے سعید بھائی کو کئی دنوں سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پھر اس نے ضد کرکے آخر کار سعید بھائی کو کمرے سے نکل کر باہر کی کھلی اور تازہ ہواؤں میں آنے پر مجبور کردیا اور اپنے خوب صورت سے کھیت میں لے آئی۔ تائی نے آگے خوب بولتی حیات اور اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے سعید بھائی کو کھیت کی طرف جاتے دیکھا تو مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔



زہرہ کی شادی کے بعد ہی سے دل نے اپنی راہ کیا بدلی تھی کہ ولید کی کیفیات بھی بدل گئی تھیں۔ ابھی اپنی حالت پر غور بھی نہ کرپایا تھا کہ سعید بھائی والا واقعہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ وہ فطری طور پر اپنی غرض سے مطلب رکھنے والا انسان تھا پھر بھی تھا تو بھائی ہی' ایک پریشانی نے مستقل اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اوپر سے ماموں نے اس کی تنخواہ اور مراعات بڑھائی تھیں تو کام بھی بڑھا دیا تھا۔ ابھی تک ان کے گھر کے لیے کسی ڈرائیور کا انتظام نہ ہوسکا تھا۔ ولید ہی مستقل یہ ذمہ داری اٹھا رہا تھا۔ بعض اوقات تو مامی اور ان کی صاحبزادی کا نخوت بھرا انداز اسے خوب کھلتا جب وہ اس کے ساتھ ایک ڈرائیور کے طور پر ہی سلوک کرتیں۔

ان کے اپنے ذاتی گھر کا تکمیلی کام التوا کا شکار تھا کہ تائی کی دلچسپی ایک دم ہی اس طرف ختم ہوگئی تھی ۔سعید بھائی والے واقعے کے بعد اور ان کی زمین کی فروخت سے حاصل کی جانے والی رقم بھی ختم ہوچکی تھی۔ ولید پچھلی بار جب گاؤں گیا تھا اس کا تب ہی ارادہ تھا اپنی اماں اور ابا سے رقم کی بابت کہنے کا کہ کچھ انتظام کردیں تو گھر کو مکمل کیا جاسکے مگر اتنی پریشانی میں تھے اس کے ماں باپ کہ وہ یہ بات کہے بنا ہی لوٹ آیا تھا۔

اس دن دوائیوں کی سپلائی کے لیے آفس کے دو ورکر چھٹی پر تھے تو ان کا کام بھی اکیلے ولید کو ہی کرنا پڑا تھا سو حد سے زیادہ تھکن وجود پر سوار تھی۔ وہ گھر جاکر آرام کا ارادہ رکھتا تھا گھر آنے پر اس نے ملازم کو کھانا نکالنے کا کہا اور خود فریش ہونے گیسٹ روم کی طرف چل دیا جو ماموں کے گھر میں آج کل اس کی جائے رہائش تھی۔ ٹیبل پر آکر ابھی اس نے پہلا نوالہ ہی توڑا تھا کہ ماموں کی سجی سنوری صاحبزادی سیڑھیاں اترتی دکھائی دی۔

"یہاں مفت کی روٹیاں توڑی جارہی ہیں اور میں کب سے نواب صاحب کا ویٹ کررہی ہوں کہ آئیں اور مجھے ردا کے گھر ڈراپ کرآئیں اوپر سے موبائل آف کررکھا ہے۔ مسٹر ولید تم لاکھ سگے بھانجے سہی میرے پاپا کے مگر نوکری تو نوکری ہوتی ہے ناں۔ یہ مت بھولا کرو کہ جو سرو سز دیتے ہو وہ احسان نہیں ہے ہمارے اوپر اس کی ہینڈسم پے منٹ کرتے ہیں میرے پاپا۔ دولت ایسے ہی نہیں کمائی جاتی اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلائے جاتے ہیں' اسٹرگل کرنی پڑتی ہے۔"

اس کو پتا نہیں کب کا اور کس بات کا غصہ تھا جو اس نے فوراً" ہی کھانا کھاتے ولید پر اتار دیا۔ ولید نے کب بھلا اتنی بے عزتی برداشت کی تھی سست اور کاہل ہونا اور بات تھی۔ مگر اماں' ابا نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ اپنے گھر کا ہل کر پانی نہ پینے والا ولید اگر اب تک چپ تھا تو بات پردے میں تھی کہ ماموں کا رویہ اس سے نارمل ہوتا تھا ہاں مامی اور ان کی بیٹی ذرا نخریلی

طبیعت کی تھیں اور وہ اسے ان کے ماحول کی دین سمجھا تھا مگر ایسی دوبدو بے عزتی تو کبھی نہ ہوئی تھی اس کی۔ اس کے اندر کا غیرت مند مرد نکل کر باہر آیا۔

"ایک منٹ! یہ تم مجھ سے بات کس انداز میں کر رہی ہو۔ سنو بی بی! محنت کر کے ہی کماتا ہوں اور مفت کی تنخواہ نہیں دے رہے تمہارے والد مجھے۔ صبح شام کی تخصیص کے بغیر جو کام مجھ سے لیا جا رہا ہے وہ کم از کم تین بندوں کے برابر تو ہے ہی۔ ملازم نہیں ہوں تمہارا جو ایسے بات کر رہی ہو۔ آج سن لی ہے تمہاری بک بک۔ آئندہ برداشت نہیں کروں گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا اور غصے میں کھاتا اور اس کو چیختا چھوڑ کر باہر آگیا۔ غصہ ایسا شدید تھا کہ پروگرام نہ ہوتے ہوئے بھی رکشا لے کر اڈے پر پہنچا گاؤں کے لیے ٹکٹ کٹائی اور رات گہری ہو رہی تھی جب وہ گھر پہنچا تھا۔

گاؤں میں اگرچہ لوگ سرشام ہی سو جاتے ہیں مگر اماں اور ابا اسے جاگتے ہوئے ملے تھے۔ اس کی اچانک آمد پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا مگر اس نے کچھ بھی ظاہر کیے بنا ہی بتایا کہ "بس ملنے کو دل کیا اور آگیا۔" بات کرتے ہوئے اور ادھر ادھر بھی نظریں دوڑا رہا تھا جب اماں کی چارپائی سے ملی چارپائی پر وہ کروٹ لیے سوتی نظر آئی تھی۔ اگرچہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس کی موجودگی سے ملنے والے ایک سکون کی کیفیت نے اسے خود بھی حیران کیا تھا۔ اسی وقت اس نے ماموں کی بیٹی پر لعنت بھیجتے ہوئے جلد از جلد اماں سے بات کرنے کا ارادہ کیا اور سو گیا۔



اگلی صبح اسے بہت سے حیرت انگیز خوش گوار مناظر دیکھنے کو ملے تھے۔ جن میں سب سے پیارا منظر سعید بھائی کا پرسکون چہرہ اور انداز تھا۔ ورنہ جب سے ان کے ساتھ حادثہ ہوا تھا وہ ہنسنا بولنا تو بھولے ہی تھے۔ بے حد چڑچڑے اور زود رنج بھی ہو گئے تھے۔ پچیس دن پہلے ہی تو وہ ان کی ایسی حالت دیکھ کر پژمردہ گیا تھا اور پھر زندگی کا سب سے حیرت انگیز منظر اس نے حیات اور اماں کے درمیان باہمی یگانگت دیکھی۔ وہ اور اماں دونوں مل کر تندور پر روٹیاں لگاتے ہوئے گہری سہیلیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔

ناشتا کرنے کے بعد سعید بھائی تیار ہو کر باہر چلے گئے تھے ابا نے بتایا کہ انہوں نے گاؤں میں ہی ایک میڈیکل اسٹور کھول لیا تھا کہ اب وہ مشقت والے کام نہیں کر سکتے تھے۔ مشکل سے ہی سہی انہوں نے زندگی کا تلخ گھونٹ پی کر خود کو معاشی دوڑ میں شامل کر لیا تھا۔

جس وقت تائی نے حیات کے ہاتھ سے سبزی کی ٹوکری لے لی اور کہا کہ وہ کام کے لیے آئی لڑکیوں کو وقت دے۔ سالن وہ خود بنالیں گی۔ تائی کا حیات سے ایسا انداز، ولید غش کھانے کو ہی ہو گیا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ گھر سے باہر گھنے درختوں کی چھاؤں میں آگیا کہ کل سے بند فون آج آن کرنے پر ہی بجنے والی گھنٹی نے بتا دیا تھا کہ کال کس کی ہو سکتی ہے۔

"مجھے تم سے اس بے وقوفی کی ہرگز امید نہیں تھی ولید! بے بی نے اگر کچھ کہہ ہی دیا تھا تو برداشت کر لیتے۔ تمہیں نہیں پتا میں نے تمہارے لیے کیا کیا خواب دیکھے ہیں تم میرے اپنے بھانجے ہو۔ میرا خون اور میں چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے دست راست بن کر بہت آگے جاؤ، تمہیں پتا ہے وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ لاڈلی ہے۔ ایسے کرو گے تو کیسے ہو گا سب؟ آج تین جگہوں پر میڈیسن کی ڈلیوری پہنچانی ہے اور تم غائب۔ موبائل بند۔ بے بی کی شکایت نظر انداز کر بھی دوں تو ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ تو کاروبار میں ہرگز نہیں چل سکتا۔ جہاں بھی ہو فوراً" پہنچو میں انتظار کر رہا ہوں۔" انہوں نے اس کی کچھ سنے بغیر صرف اپنی سنائی اور کال ڈراپ کر دی تھی۔ ولید نے سر جھٹک کر موبائل جیب میں ڈالا تھا۔

حیات کو حقیقت میں آج کل سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ گھر کے کام کاج لڑکیوں کے ساتھ بوتیک کا کام اور شام کو ایک گھنٹا زہرہ کے خاوند کے پاس اکنامکس پڑھنے چلی جایا کرتی تھی، جب جب اسے

اس مضمون میں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا کیونکہ خوش قسمتی سے وہ اس مضمون میں ماسٹرز تھا۔ اس دوران اس نے ولید کی نظروں کا بدلنا محسوس کیا تھا نہ ہی یہ کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔



ولید اپنی بات کرنے اپنے ماں 'باپ کے پاس آیا تھا جب کہ اس نے وہاں اور ہی کھاتا کھلا دیکھا۔ تائی بری طرح اپنی بہن کو کوس رہی تھیں جنہوں نے سعید بھائی کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی بیٹی ساری زندگی ایک معذور شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی اسے تو سعید کی دیہاتی طرز زندگی ویسے ہی پسند نہیں تھی اب تو خیر ایک واضح وجہ بھی موجود تھی انکار کی۔ ہاں ولید کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ خالہ نے کہا تھا۔ تایا خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے جبکہ سعید بھائی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

"معذوری کو میرے بچے نے اپنی کمزوری تو نہیں بنایا ناں۔ ماشاء اللہ سے اپنا کما رہا ہے۔ گھربار کا خرچ اٹھا سکتا ہے۔ اپنی زمینیں ہیں۔ میں بھی اپنے تمام تعلق توڑ کے آئی ہوں اس سے۔ اس لڑکی سے پہلے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا کے دکھاؤں گی جس نے منہ پھاڑ کر انکار کیا ہے میرے بچے کے لیے۔ ہونہہ! ایک اتنا برا ہو گیا میرا بچہ کہ اس کے لیے کتنے چاؤ سے طے کیا گیا رشتہ توڑ دیا اور دوسرے بیٹے کے لیے فوراً" تیار ہو گئی۔

"اماں آپ غصہ مت ہوں۔ میرے خیال میں انہوں نے کوئی غلط بات یا مطالبہ نہیں کیا ہر انسان اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بہترین چیز منتخب کرتا ہے۔ یہی اصول وہ رشتے ناتوں پر بھی لاگو کرتا ہے ایک معذور شخص کو کوئی عقل کا اندھا ہی بیٹی دینا پسند کرے گا۔ آپ میری فکر چھوڑیں اور ولید کی بات کریں۔ ماموں نے بھی تو کھل کر نہ ہاں کی ہے نہ ناں کی ہے۔" سعید بھائی نے ایسے رسان سے اپنی معذوری کا ذکر کیا جیسے کسی اور کی بات کر رہے ہوں۔ اماں تڑپ کر رہ گئیں۔

"میں تو کہتا ہوں اماں! آپ ماموں کی نخریلی بیٹی کے رشتے پر بھی لعنت بھیجیں اب۔ ایسی زبان دراز لڑکی جس کا شادی سے پہلے یہ حال ہے کہ منٹوں میں اگلے کی عزت اتار کے رکھ دیتی ہے۔ شادی کے بعد تو اس کے میاں کو پٹا ڈال کے رکھنے کا ارادہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کی شہ حاصل ہے اسے" ولید نے غصے سے کہا اور پرسوں کا پورا واقعہ کھول کر بیان کر دیا۔

"دیکھ لو بیگم! سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ میری تو کل بھی تمہاری ماں نے نہیں مانی تھی کہ رشتے ناتے اور لین دین اپنے جیسے لوگوں میں ہی مناسب لگتا ہے مگر اس پر بہن بھائی کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ اب تم خود سمجھ دار ہو۔" تایا نے ہنکارا بھر کر کہا۔

"ہاں آپ اور اسے بڑھاوا دے دیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ شہری بچی ہے اور طرح کے ماحول سے پلی بڑھی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی آہستہ آہستہ بھائی اس رشتے پر راضی ہیں۔ انہوں نے ولید کو اپنی کمپنی میں اتنی اچھی نوکری دے رکھی ہے اور بھلا کیا چاہیے؟" تائی نے تنک کر کہا۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں اماں نوکری دی ہے ماموں نے مجھے مگر ان کی بیوی اور بیٹی نے غلام سمجھ لیا ہے شاید میں یہ جاب تو جاری رکھوں گا مگر اس رشتے کے بارے میں ذہن سے نکال دیں۔" وہ دوٹوک کہتا اٹھا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ رکا۔

"میں حیات سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" کہہ کر رکا نہیں باہر نکل گیا تھا۔

"دیکھا اب تک جھٹلاتے آئے ہیں آپ میری بات۔ اب آپ کے سامنے ہے سب کچھ کیسے ہنسی خوشی ماموں کی بیٹی کے لیے راضی تھا ولید اور اب چند دنوں میں پتا نہیں کیسا جادو چلایا ہے کہ شادی سے انکاری ہو گیا۔ ایسے ہی تو اس کی ماں تھی۔ شکل سے معصوم اور گنوں کی پوری۔ ایسے ہی تو نہیں مرتضیٰ نے میری بہن کو ٹھکرا دیا تھا۔"

"بس کریں اماں! خدا کا خوف کریں کچھ۔ ابھی بھی آپ نے ٹھوکر نہیں کھائی۔" تایا ابا کا چہرہ بے حد سرخ ہو گیا تھا جبکہ سعید بھائی چپ نہ رہ سکے۔

"پہلے تو کچھ دن میں سوچتا ہی رہا کہ میں نے آج تک کسی کا برا کرنا تو ایک طرف کسی کا برا سوچا ہی نہیں پھر میرے ساتھ کیوں برا ہوا؟ مگر بہت سوچنے پر ایک پردہ تھا آنکھوں اور ذہن پر جو ہٹ گیا تھا۔ یتیم کی کفالت اور اچھے سلوک پر اگر جنت کا وعدہ ہے تو برے سلوک پر جہنم کی آگ بھی ہے۔ میں یہ جان کر لرز گیا کہ میرے ساتھ ہونے والا حادثہ میری آزمائش نہیں بلکہ سزا ہے جو اللہ کی طرف سے یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں اس گھر پر نازل ہوئی ہے۔ کیا بگاڑا تھا ان معصوموں نے آپ کا جو آپ نے ایک پل کے لیے نہیں بخشا نہ ان کو نہ ان کے مرے ماں باپ کو۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تائی حیرت سے گم گو سے سعید بھائی کو مسلسل بولتے سن رہی تھیں۔ تایا افسردہ سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"خدا کی قسم میں نے اپنی بیوی کے طور پر ایسا ہی گھر اور ایسی ہی لڑکی سوچی تھی جیسی ہمارے گھر کی لڑکیاں ہیں کہ میں نہ تو دولت کے انبار کے خواب دیکھتا ہوں نہ شہروں کے گھٹن زدہ ماحول مجھے پسند ہیں مگر میں نے کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ جانتا تھا میری خواہش آپ کبھی پوری ہونے نہیں دیں گی ان لڑکیوں کی زندگی اس گھر میں مزید مشکل بنادی جائے گی اور قبر میں سوئی اس عورت کو بھی آپ کے الزامات بلکہ آپ کے عائد کردہ گناہ چین نہیں لینے دیں گے۔ ہم انسان دوسرے پر کی گئی ایک زیادتی آسانی سے بھول کر اس کے لیے دوسرا ہدف تلاش کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر وہ تخلیق کار اپنے حقوق تو معاف کر بھی دے شاید اپنے بندوں کے حقوق کی حق تلفی کبھی نہیں بھولتا نہ ہی اپنے بندوں سے کی گئی زیادتی۔ یقین نہ آئے تو میرے ساتھ جو حادثہ ہوا اسی کو ہی دیکھ لیں۔ ان دونوں لڑکیوں یتیم ہونے کے بعد اگر جو سینے سے لگا لیتیں آپ تو دنیا میں ہی جنت کما لیتیں۔ مگر آپ نے ایک محاذ ہی بنا لیا ان کے خلاف پھر بھی انہوں نے اف تک نہیں کی کبھی نہ ہی کوئی شکایت۔ اور نہ انہوں نے بد دعائیں دی ہوں گی آپ کو میں ان کی تربیت اور فطرت سے واقف ہوں مگر جو کمال کا صبر کیا ہے انہوں نے وہ تو سزا کی صورت اس گھر پر اترا۔ ماں ابھی بھی آپ سمجھ نہیں پائیں تو خدانا خواستہ اس بار تو ایک عضو کی محرومی دکھائی اللہ نے آپ کو سزا کا یہ عمل طویل ہو گیا تو یہ نقصانات اور صورتوں میں بھی ہو سکتے ہیں اور باقی ہر نقصان کا نعم البدل تو ہے۔ اگر جو کسی کی جان۔۔۔"

"نہیں نہیں اللہ کے لیے چپ کرو بس کرو۔ اللہ میرے ویہڑے کو ہنستا بستا رکھے۔ تم سب کو سلامت رکھے۔ مت کہو ایسا کچھ میرا دل پھٹ جائے گا۔" سعید بھائی کے دکھائے گئے آئینے میں تائی کی اپنی شکل بہت کریہہ نظر آرہی تھی جبھی وہ مزید برداشت نہ کر سکیں اور سعید بھائی کو چپ کروا کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ انہیں اپنے کیے سے زیادہ یہ خوف رلا رہا تھا کہ اب کی بار کی جو سزا ہو گی وہ اس سے زیادہ کڑی ہوئی تو۔۔۔؟ آخر تایا ہی نے انہیں مشکل سے چپ کروایا تھا۔ وہ دن تو تائی نے بار بار سعید بھائی کی باتیں یاد کرتے ہوئے رو رو کر گزارا تھا کہ کڑے احتساب کی زد میں تھیں مگر اگلے روز حیات کے پاس چلی آئیں۔ وہ لڑکیوں کے ذمہ کام لگا کر ابھی ابھی اپنے کھیت میں ایک کیاری کی گوڈی میں مصروف تھی جب تائی کو دیکھ کر حیران رہ گئی کھرپی اس نے کیاری میں پھینکی اور دوپٹے سے ہی ہاتھ پونچھ کر کھڑی ہو گئی او تائی کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"کیا ہوا تائی؟ خیریت تو ہے ناں؟" پریشانی سے اس نے پوچھا کہ سعید بھائی والے واقعے کے بعد وہ سب بے حد ڈرے ہوئے تھے یوں جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا۔"

"حیات! تائی نے اس سے ہاتھ چھڑا کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔"

"مجھے معاف کر دو میری بچی! تمہاری ماں سے ضد کے چکر میں میں نے بہت کچھ برا کیا تم لوگوں کے

ساتھ۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے' وہ تو اس سب کے لیے بہت کم ہے۔ میں تو اس سے بھی زیادہ سزا کی مستحق ہوں۔"

"ارے۔۔۔ کیسی باتیں کرتی ہیں تائی۔ خدا کی قسم! میں ہوں یا زہرہ ہم نے تو ابا کے بعد تایا کو اپنے باپ کی جگہ اور آپ کو ماں کی جگہ سمجھا ہے اور مائیں تو برا بھلا کہتی ہی ہیں ناں اپنی اولاد کو برا بھلا بتانے کے لیے خدا کی قسم ہم نے کبھی آپ کی نیت پر شک نہیں کیا۔ آپ کا احسان تو ہم کبھی اتار ہی نہیں سکتے۔ اپنے بچوں جیسا کھلایا پلایا اور پہنایا۔ اپنے گھر کی چھت دی۔ باقی آپ اگر کچھ کہتی تھیں تو میں کون سا رکتی تھی جواب میں بت کریں ایسا۔" اس نے تائی کو بات ہی نہ مکمل کرنے دی اور انہیں لے کر تایا کے پاس آ گئی۔ ولید آج صبح ہی شہر چلا گیا تھا کہ ماموں کی کالز پر کالز آ رہی تھیں۔ سعید بھائی اپنے اسٹور پر تھے۔



"کیا کہہ رہی ہیں اماں! آپ کا بیٹا جب ٹھیک تھا' نارمل تھا' آپ کے اپنے الفاظ ابھی تک مجھے نہیں بھولے۔ آپ نے کہا تھا کہ سارہ کی بہنوں میں سے کسی کو بہو بنانے سے بہتر ہے میں زہر کھالوں۔ تب آپ کو اپنی بہن کی بیٹی نظر آئی تھی۔ اب وہی سارہ کی بیٹی اچھی ہو گئی آپ کے معذور بیٹے کے لیے۔" سعید بھائی نے غصے سے کہا۔ اماں تڑپ ہی تو گئیں۔

"خدا گواہ ہے سعید! میں اللہ کے حضور معافی کی طلب گار ہوں۔ میں نے ان دونوں سے بھی معافی مانگی ہے۔ وہ تو زہرہ اپنے سسرالی رشتہ داروں میں سے کسی کا رشتہ حیات کے لیے لائی تھی۔ ایک اچھی بچی تو اپنی ضد میں گنوا چکی ہوں۔ دوسری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی۔ پھر تم نے خود کہا تھا کہ یہ تمہارے دل کی خواہش ہے۔ میں نے دونوں کے سامنے اس رشتے کے ساتھ تمہارا نام بھی رکھ دیا تھا۔ حیات نے بلا جھجک تمہارا نام لیا ہے۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔" تائی گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہے اماں! مان لیتا ہوں کہ آپ توبہ تائب ہو گئیں اور معافی تلافی بھی ہو گئی۔ میں ایسی خواہش رکھتا تھا مگر اس حادثے سے پہلے۔ اب مجھ جیسے انسان کو کوئی حق نہیں کہ کسی اچھی بھلی لڑکی کی زندگی برباد کروں۔ میں ہی کیوں ولید نے بھی تو آپ کے بھائی کی بیٹی سے شادی سے انکار کر کے اب حیات کا نام لیا ہے تو اس سے کیوں نہیں کرتیں حیات کی شادی آپ۔۔۔"

"لیا تھا نام سعید! تم سے پہلے ولید کا نام ہی رکھا تھا حیات کے سامنے میرا یقین کرو اتنے بدگماں مت ہو اپنی ماں سے کہ میں اپنی نظر میں ہی گر جاؤں۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا کر چکی ہوں۔ لیکن اب میں ان بچیوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ حیات نے نہیں جانتی کیا سوچ کر تمہارا نام لیا۔ مگر میں نے جب اس سے ولید کی خواہش بیان کی اور اس کی مرضی پوچھی تو جانتے ہو اس نے کیا کہا؟" تائی نے سعید بھائی سے پوچھا وہ سنجیدہ سے بیٹھے رہے مگر استفہامیہ انداز ضرور تھا ان کا؟

"اس نے کہا ولید کیوں تائی؟ سعید بھائی کیوں نہیں۔ جس قسم کی میری فطرت ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں ولید جیسے شخص کو زندگی کا شریک سفر بنا سکتی ہوں۔ ہاں آپ' سعید بھائی کے بارے میں کہیں گی تو میں ضرور سوچوں گی۔ آگے آپ اور تایا میرے سربراہ ہیں۔ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔" تائی نے سعید بھائی کو ساری تفصیل بتائی۔ سعید بھائی پوری بات سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔

"وہ بے وقوف ہے ماں! زندگی کے تقاضے اور اس کی باریکیاں نہیں سمجھ رہی۔ آپ اسے سمجھائیں۔ آج ہمدردی میں وہ یہ فیصلہ کرلے گی۔ مگر بعد میں جب پچھتائے گی تو اس تکلیف کی زد میں ہم سب آئیں گے۔ میں اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کر چکا ہوں۔ بار بار کا ٹوٹنا اور بکھرنا انسان روز برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھ میں مزید کسی دکھ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے کہہ کر اٹھے اور باہر چلے گئے۔

تائی نے ایک بازو سے محروم اپنے شان دار بیٹے کو

دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔ حیات کے اس فیصلے پر وہ بہت خوش تھیں اور مطمئن تھیں کہ سب ٹھیک ہونے جا رہا تھا مگر سعید بھائی کی باتیں سن کر وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ کیا واقعی ایسا کرنا خود غرضی ہو گا؟ پھر سعید کا کیا ہو گا؟ کون قبول کرے گا میرے بچے کو؟ کون اس کی سونی زندگی میں رنگ بھرے گا؟ یا وہ ایسے ہی رہے گا تمام عمر۔۔۔؟" اس سوال کے ذہن کی سطح سے ٹکراتے ہی وہ تڑپ گئیں۔

☆☆☆

ولید ماموں کے پاس آ تو گیا تھا مگر ذہن مسلسل پیچھے کی طرف لگا ہوا تھا کہ کیا اماں اس کی شادی حیات سے کرنے پر راضی ہو جائیں گی؟ کیا حیات راضی ہو گی ایسا کرنے پر آخر کو اماں کے ساتھ ساتھ ان سے ناروا سلوک میں وہ خود بھی پیش پیش ہوتا تھا بھلے زبانی کلامی ہی سہی۔ ماموں سے آتے ہی اس نے صاف کہا تھا کہ وہ صرف کمپنی کی جاب کے لیے راضی ہے، گھر کے لیے ڈرائیور کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ ماموں بھی اس کے دوٹوک انداز کو دیکھ کر چپ رہ گئے تھے مگر اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ بچی کی بات کو دل پر لے گیا ہے ورنہ اتنی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ شام کو وہ ماموں کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر آ گیا تھا۔ گھر اگرچہ مکمل ہو چکا تھا مگر چھوٹے موٹے کئی تکمیلی کام ہونے والے تھے۔ اس نے یونہی گھر کا حال احوال جاننے کے لیے فون کیا تھا اور یہ جان کر حیرت سے گنگ رہ گیا کہ حیات نے اس کے لیے انکار کر کے سعید بھائی کے رشتے کے لیے ہامی بھری تھی مگر سعید بھائی اس بات کو اس کی بے وقوفی گردان کر انکاری تھے۔

☆☆☆

وہ حسب معمول سعید بھائی کے لیے ناشتا لے کر آئی تھی جب انہوں نے اسے روک لیا تھا کہ انہیں اس سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ سعید بھائی جب ناشتا کرنے لگے تو ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے اس کی تعلیم کی، بوتیک والے کام کی، اس کے پودوں، پھولوں اور پھلوں کی اور جب انہوں نے ناشتا ختم کر لیا تو سنجیدہ ہو گئے۔

"دیکھو حیات! میں جانتا ہوں تم انتہائی سمجھ دار اور میچور لڑکی ہو۔ اپنی عمر کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ باشعور اور معاملہ فہم جو یقیناً" چچی جان کی تربیت کے علاوہ حالات کی دین بھی ہے۔ مگر کچھ معاملوں میں تم ابھی بھی اپنی عمر کے مطابق ہی فیصلہ کر رہی ہو۔ غیر دانش مندانہ۔" حیات نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"عام حالات میں اماں کی سوچ بدلی ہوتی۔ تم نے میرے رشتے پر ہاں کی ہوتی تو میں اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی گردانتا مگر بگڑے حالات اور انسانوں کے تکبر کو توڑنے کے لیے زندگی کی شدید ٹھوکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ٹھوکر میری معذوری کی صورت میں تھی اس کے بغیر حالات کبھی تمہارے حق میں نہ ہوتے۔ اب میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اب بھی لاکھوں لوگوں سے بہتر رکھا ہے مجھے، تکلیف دی مگر سنبھلنے کا حوصلہ بھی دیا۔ معذوری ضرور زندگی کا حصہ بنی مگر بوجھ نہیں ہوں میں کسی پر مگر۔۔۔ وہ تھوڑا سا رکے "مگر میں نہیں سمجھتا کہ میں اب تم جیسی لڑکی کے قابل ہوں کیا کمی ہے حیات تم میں جو تمہیں مجھ جیسے شخص کے ساتھ ناحیات باندھ دیا جائے۔ تم کم عمر ہو، خوب صورت اور پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سمجھ دار بھی، ہو میری دعا ہے کہ تمہیں تمہارے جیسا کوئی خالص انسان ملے، تمہاری قدر کرنے والا کیونکہ بہت دکھ دیکھے ہیں تم نے اور زہرہ نے۔۔۔ اب زندگی سے خوشیاں وصولنے کا وقت ہے۔ آگے بڑھو اور ہاتھ بڑھا کر لے لو۔۔۔" وہ پھیکا سا مسکرائے۔

"وہی تو لینا چاہ رہی ہو سعید بھائی ہاتھ بڑھا کے۔۔۔ مگر آپ میرے حصے کی خوشیاں دے ہی نہیں رہے۔۔۔" اس کے ترنت جواب پر وہ گنگ رہ گئے۔

"میں۔۔۔ میں ادھورا انسان کسی کو کیا دے سکتا ہے

حیات ۔۔۔ ہاں دعائیں ہیں اور انہیں تمہیں مجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں بن کے میری دعاؤں میں شامل ہو۔"

"میں بھی بہت زیادہ کی چاہ نہیں رکھتی سعید بھائی! خدا کی قسم میرے لیے مادی دولت سے کہیں بڑھ کر ہے احساس کی دولت جس سے آپ مالا مال ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے حالات اور زندگی عام لوگوں سے ہٹ کر تھے تو خیالات بھی عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ آپ اور مجھ میں کیا بات مشترک ہے 'احساس کا رشتہ ہے ہم دونوں کے بیچ' پھر دونوں ہی محنت اور کوشش پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ آپ کا چلتا ہوا میڈیکل اسٹور ہے۔ میرا بھی بوتیک کا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ ہم مزید محنت کریں گے۔ اللہ نے کبھی بھی کسی کی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیا۔ ہماری بھی محنت رنگ لائے گی۔ بس آپ خود کو ادھورا سمجھنا چھوڑ دیں۔ دیکھا جائے تو دنیا میں مکمل تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ اس عضو کے نا ہونے کو ادھورا سمجھتے ہیں میں سمجھتی ہوں ہر خود غرض انسان ادھورا ہے' ہر ظالم ادھورا ہے' ہر احساس سے عاری ادھورا ہے۔ بس آپ کی اور میری ڈیفینیشن میں تھوڑا سا فرق ہے۔" وہ اتنے مان سے کہہ رہی تھی کہ سعید بھائی اسے دیکھتے رہ گئے۔

"امید کافی ہے کہ اب جب تائی آپ سے بات کریں گی تو آپ اپنے بھائی کی وکالت چھوڑ کر اپنی ذات کے لیے خوشیاں ڈھونڈنے کا فیصلہ کریں گے۔" وہ ناشتے کے برتن اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ سعید بھائی نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ وہ بہت کچھ اس سے کہنا اور سمجھنا چاہ رہے تھے مگر دل تھا کہ حیات کی باتوں پر سر دھنے جا رہا تھا۔



تائی کا شہر میں گھر تیار ہو چکا تھا۔ ولید بھی ایک دن کے لیے آیا ہوا تھا مگر جب تایا نے شہر میں گھر کے حوالے سے بات چھیڑی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ تائی کو اب ولید کی شادی کر کے نئے گھر شفٹ ہو جانا چاہیے۔

"نہیں سعید کے ابا! ماں باپ تو اولاد کے ساتھ ہی سونہڑے لگتے ہیں۔ ایک پتر کو یہاں چھوڑ کر میں وہاں کیسے خوش رہ سکتی ہوں۔ سعید کی شادی ہو جاتی پھر بھی اور بات تھی۔ ابھی تو حیات کی ذمہ داری ہے خیر سے اس سے فارغ ہو کر ہی کچھ سوچیں گے۔" تائی اداسی سے بولی تھیں مگر ان کی اس بات سے تایا کو خوشی ہوئی تھی کہ زندگی میں پہلی بار ان کے لہجے میں حیات کے لیے پیار تھا۔

"وہ اماں! پھر آپ نے بات کی حیات سے ۔۔۔؟" ولید بے حد جھجک کر بولا۔

"ہاں کی تھی بیٹا! وہ کہتی ہے تم سے اس کی سوچ نہیں ملتی اور جس سے ملتی ہے وہ ہی نہیں مان رہا تو میں کیا کروں؟ زہرہ نے جو رشتہ بتایا تھا اس کے بارے میں وہ ایک دوبار پوچھ چکی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کیا جائے۔ ہیرے جیسی ایک بچی کو اپنی ضد میں میں نے گنوا دیا۔ دوسری کو میرا بے وقوف بیٹا اپنی ضد میں گنوانے چلا ہے۔ وہ رشتہ بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں سعید کے ابا اور کل بھائی کا فون آیا تھا دبے لفظوں میں رشتے کی یاد دہانی کرا رہے تھے۔ میں بھلا کیسے ولید سے پوچھے بغیر ہاں کر دیتی۔ جب اس کی ضد بھی سن چکی ہوں۔" تائی نے ولید کو جواب دے کر رخ تایا کی طرف کر لیا۔

"اماں! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کسی کی سوچ پر کوئی زبردستی قابض نہیں ہو سکتا حیات اچھی لڑکی ہے۔ اس لیے آپ سے کہا تھا مگر اس کی مرضی نہیں ہے تو ٹھیک ہے مگر میں ماموں کی بیٹی سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ ان کو صاف بتا دیں۔" ماں سے کہہ وہ باہر نکل گیا۔

اگلے دن ولید واپس چلا گیا تھا۔ تائی نے اپنے بھائی سے رشتے کے لیے معذرت کر لی تھی اور سعید بھائی کو بھی خوب سنائی تھیں کہ "اتنی اچھی لڑکی کو ٹھکرا کر وہ جذبات میں ایک فیصلہ تو لے بیٹھا ہے' مگر بعد میں

خوب پچھتائے گا وہ بھی اس صورت جب حیات خود ایسا چاہتی تھی۔" پھر انہوں نے روتے ہوئے کہا تھا کہ "تایا نے حیات کا رشتہ زہرہ کے رشتہ داروں میں طے کر دیا ہے۔ وہ تو جلدی شادی بھی کرنا چاہتے ہیں مگر حیات کی خواہش ہے کہ تین ماہ بعد اس کے امتحان ہیں تو اس کے بعد ہی ایسا کوئی سلسلہ رکھا جائے ہاں ابھی صرف منگنی کی چھوٹی سطح پر ایک تقریب ہو گی تاکہ سب رشتہ داروں کو پتا چل جائے۔"

تائی کے منہ سے یہ سب سن کر سعید بھائی کو لگا ان کی سانس رک گئی ہو۔ یہ سوچ کر ہی ان کا دم گھٹنے لگا کہ ان کے دل اور گھر کی روشنی کسی اور کی زندگی میں اجالا بکھیرنے چلی ہے۔ مگر دل کو ڈپٹ کر چپ کراتے کراتے وہ خود نڈھال ہو گئے' تائی نے ان کا یہ لٹا پٹا انداز بغور دیکھا تھا۔

"سعید میرے بچے! اب بھی وقت ہے... اگر کچھ کہنا ہے تو کہہ دو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ ابھی نہ تو منگنی ہوئی ہے 'نہ نکاح' بات سنبھل سکتی ہے۔ کیسے پہاڑ سی زندگی گزارو گے سعید! مان جاؤ..." وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور سمجھانے لگیں۔

"اپنی زندگی میں پہاڑ جیسے بوجھ کو سہارنے کے لیے میں کمزور لڑکی کا سہارا نہیں لے سکتا اماں۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ حیات اس کے ساتھ خوش رہے گی۔ آج وہ اور آپ جذباتی ہو کر سوچ رہی ہیں مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزرتی۔ بار بار یہ ذکر کر کے مجھے تکلیف مت دیں اور اسے اچھے طریقے سے رخصت کریں۔ وہ یہ محسوس نہ کرے کہ یہ اس کے ماں باپ کا گھر نہیں ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ تائی بے بسی سے طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

اگلے کچھ دن سعید بھائی نے اپنی روٹین کچھ اس انداز میں بدل لی کہ حیات سے سامنا کم سے کم ہو مگر ایک ہی گھر میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس دن وہ دوپہر میں اسٹور پر لڑکے کو ٹھہرا کر تھوڑی دیر آرام کرنے آئے جب وہ ان کا پسندیدہ شربت لے کر کسی بوتل کے جن کی مانند حاضر ہو گئی۔

"فیصلہ کر لیا ہے تو اس کا بہادری سے سامنا بھی کریں۔ مجھ سے کترانا اور بچنا تو مسئلے کا حل نہیں ہے ناں سعید بھائی!"

"اف اللہ! یہ لڑکی کیسے اندر گھس کر سوچوں تک کو پڑھ لیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلائے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے حیات! تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں کسی سے بھی کترا نہیں رہا بس مصروفیت زیادہ تھی مگر اب ایک ملازم رکھ لیا ہے تو سہولت ہو گئی ہے۔ تم سناؤ امتحانوں کی تیاری کہاں تک پہنچی اور ٹیوشن جا رہی ہو یا نہیں؟ اور ہاں پرسوں تک کپڑے تیار رکھنا۔ شہر کا چکر لگتا ہے میرا کچھ دوائیاں لینی ہیں اسٹور کے لیے وہ بھی لیتا آؤں گا اور تمہارے پچھلے آرڈر کی پے منٹ بھی اسی دن طے ہوئی تھی وہ بھی لیتا آؤں گا۔" انہوں نے بات بدل دی۔

"جی ٹھیک ہے تیاری اکنامکس کے کچھ چیپٹرز کا مسئلہ تھا جو احمد بھائی کے پاس گئی تھی کچھ دن اور کپڑے تیار ہیں لیکن اس بار مجھے آپ کے ساتھ شہر جانا ہے۔ تائی نے کہا ہے کہ منگنی کا جوڑا مجھے اپنی پسند کا لینا چاہیے۔" وہ جو اس کی بات غور سے سن رہے تھے' جلدی سے نظریں پھیر گئے۔

"ٹھیک ہے تیار رہنا۔ میں تھوڑا ریسٹ کر لوں۔ اماں سے کہو مجھے چار بجے تک جگا دیں گی۔" تکیہ سیدھا کرتے انہوں نے کہا تو حیات کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور جگ گلاس اٹھا کر باہر آ گئی۔



دو دن بعد وہ سعید بھائی کے ساتھ شہر آئی تھی۔ پھر زبردستی ان کو اپنی خریداری میں شامل رکھا تھا۔

"اف اللہ کتنا اچھا کپل ہے مگر خاوند بچارے کا ایک بازو ہی نہیں ہے... پتا نہیں کیا حادثہ ہوا ہو گا؟" وہ ایک جگہ سوٹ پیک کروا رہے تھے جب پیچھے سے کیا جانے والا ایک بے رحم تبصرہ دونوں کی سماعتوں سے گزرا۔

"آج تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ میرے اس فیصلے کی سب سے بڑی وجہ کیا تھی۔ میں تمہیں بار بار کی اس تکلیف سے بچانا چاہتا تھا جو عمر بھر ایسی باتوں اور ایسے رویوں سے تمہارا نصیب بننے والی تھی۔" آہستہ سے انہوں نے حیات کو جتایا۔

"اور میں نے بھی آپ سے کہا تھا کہ میں عام لڑکی نہیں جس پر اس قسم کی باتیں اور رویے اثر انداز ہوتے۔ میرے لیے آپ کی ذات اور آپ کا میرے لیے احساس ہی اہم ہو تا نہ کہ یہ فضول باتیں۔۔۔" خیر اب تو ان باتوں کا وقت ہی گزر چکا۔۔۔" وہ اسی طرح مضبوط انداز میں بولی۔



تین روز بعد اس کی منگنی تھی۔ زہرہ بھی آچکی تھی گھر۔ جبکہ جیسے جیسے وقت قریب آرہا تھا سعید بھائی کو اپنے دل میں چھپی اس کی شدید محبت حیرت زدہ کر رہی تھی۔ وہ اسے ایک ساتھ پلنے والے کزنز کا آپس میں ایک قدرتی لگاؤ سمجھے تھے مگر اب 'اب انہیں لگتا تھا جیسے آہستہ آہستہ کوئی روح ان کے جسم سے نکال رہا ہو۔

"یارحیم! یاکریم! تو دلوں کے بھید جاننے والا سب کچھ جانتا ہے' جانتا ہے کہ میری نیت صاف ہے۔ میں تیری رضا پر راضی ہوں مالک۔ میں صرف اپنی خوشی کے لیے ایک معصوم کو عمر بھر کے لیے ایک عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ دنیا کی ہر خوشی اس کا مقدر کردے اور مجھے سکون دے میرے مالک۔ میرے دل کو اس کی یاد سے خالی کردے۔" منگنی والے روز اٹھتے بیٹھتے ان کا دل اپنے پروردگار سے اس کی خوش قسمتی' خوش بختی اور اپنے بلند حوصلہ کی دعا کر رہا تھا۔ ہلکی پھلکی تقریب کے لیے بھی تائی نے اچھی خاصی رونق لگائی تھی۔ ولید آج ہی شہر سے پہنچا تھا۔

"شاید تم میرے نصیب میں نہیں تھیں یا میں ہی تمہارے قابل نہیں تھا اچھی لڑکی! بہرحال جہاں بھی جاؤ' دنیا جہاں کی بے حساب خوشیاں پاؤ۔" سجی سنوری لڑکیوں کے جھرمٹ میں مسکراتی' شرماتی حیات کو ولید نے دل ہی دل میں مخاطب کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

"ارے یہ کیا! کب سے تمہارے کپڑے استری کر کے لٹکا گئی تھی اور تم ہو کہ منہ سر لپیٹے پڑے ہو۔ اٹھو جلدی سے تیار ہو کر آؤ بچے! لوگ کیا کہیں گے گھر کی تقریب ہے اور میزبان ہی غائب ہیں۔" تائی نے اندر آ کر لائٹ جلائی اور آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹے سعید بھائی کو مخاطب کیا۔

"ایسی خالصتاً" زنانہ تقریب میں مردوں کا بھلا کیا کام اور پھر آپ کو پتا ہے اس حادثے کے بعد میں کم ہی لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہوں۔ ہر بار اسی حادثے کا تذکرہ' ترحم آمیز الفاظ سے لوگوں کی تو زبان کا چٹخارہ پورا ہوتا ہے۔ میں آپ اور سب گھر والے دوبارہ اسی تکلیف سے گزرتے ہیں۔" وہ بے زاری سے گویا ہوئے۔

"ارے میری جان! یہ دنیا ہے اور دنیا کا تو وطیرہ ہی یہی ہے دوسرے کی کمزوری کو پکڑ کر اچھالنا تو اگلے کو خود ہی مضبوط بننا چاہیے ناں۔ ایک بار' دوبار' کب تک تبصرہ کریں گے۔ اپنی پسند کا ردعمل نہ پا کر کسی اور جانب' کسی اور موضوع کی تلاش میں چل پڑیں گے۔ اٹھو میرا بچہ! جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔ وہ تمہاری لاڈلی حیات کا حکم ہے کہ جب تک تم نہیں آؤ گے انگوٹھی نہیں پہنے گی۔"

"ایک تو یہ لڑکی۔۔۔" تائی کی بات سن کر وہ جھنجلا کر اٹھے۔

"اچھا چلیں آپ! میں آتا ہوں ابھی۔" قدرے خفا سے لہجے میں انہوں نے سلیپر پہنتے ہوئے کہا۔ تائی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ پھر جب وہ تیار ہو کر باہر آیا تو دیکھا۔ صوفے پر وہ دشمن جاں انہی کے مشورے سے لیے گئے ہلکے گلابی کام والے جوڑے میں سجی سنوری دل سے اتنی قریب لگی کہ انہوں نے بے ساختہ نظر چرالی۔

صوفے پر درمیان میں وہ اور ارد گرد تایا' تائی موجود تھے جبکہ ولید صوفے کے پیچھے کھڑا اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا اور خلاف توقع اس کو کوئی جواب دیے

بغیر وہ سر جھکا کر مسکرا دی تھی' تایا نے سعید بھائی کو دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اسے وہاں پر بیٹھنے کو کہا۔
"ارے ابا! بیٹھیں آپ! میں ٹھیک ہوں یہاں ۔بلائیں حیات کی ساس کو آ کر رسم شروع کریں۔ مغرب تو ہونے کو ہے۔" انہوں نے بوکھلا کر کہا۔
"ارے یار تم بیٹھو! یہ تمہاری جگہ ہے اور حیات کی ساس تو ظہرے سے آ کر اپنی سیٹ پر اپنی بہو پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔ بس تقریب کا دولہا ہی کچھ زیادہ بدھو ہے۔" تایا نے مسکرا کر کہا اور ہونق سے سعید بھائی کو حیات کے پاس بٹھا کر اپنی جیب سے انگوٹھی نکال دی۔
"یہ لو بھائی! پہنا دو اپنی دلہن کو۔ دلہن کی ساس کی خواہش ہے کہ انگوٹھی ان کا بیٹا خود اپنی ہونے والی دلہن کو پہنائے۔" ابا کا مسکراتا لہجہ' اماں کا چمکتا چہرہ اور خود اس کا شرمایا سا روپ' لمحے میں وہ سب کی شرارت سمجھے اور اپنا کیا گیا فیصلہ خود بخود ٹوٹتا محسوس کیا۔ اتنے لوگوں کے اس مان کو وہ اس پل کیسے ٹھکرا سکتے تھے جو وہ ان پر کئی لوگوں کے درمیان کر بیٹھے تھے۔ انگوٹھی پہناتے ہی سب سے پہلے ان کے گلے لگنے والا ولید تھا۔
"سوری یار! میری طرف سے دل میں کوئی بدگمانی مت لانا۔ بس میں چاہتا تھا کہ تم اپنے منہ سے اپنی پسند کا اقرار کر لو اس لیے چھوٹا سا ڈرامہ رچایا کہ میں اس کٹ کھنی بلی کو پسند کرتا ہوں ورنہ مجھ میں کہاں اتنی ہمت جو ان کھیت کھلیانوں کی کھیتی باڑی کر سکوں' اچار' مربے' چٹنیاں سپلائی کرتا رہوں۔ تمہارا کام ہے تم ہی کو مبارک ہو۔" اس کی بات سن کر سعید بھائی کے دل میں جو ہلکا سا بوجھ ولید کی طرف سے تھا وہ سرکتا ہوا محسوس ہوا۔
رات گئے یہ ہلا گلا ختم ہوا تھا۔ کہاں تو وہ اس سے بچنا چاہ رہے تھے' کہاں اب اسے دیکھنے کی چاہ تھی' بات کرنے کی خواہش تھی مگر زہرہ اور اس کی سہیلیوں نے بہت دیر تک اسے اپنے نرغے میں لیے رکھا تھا۔ بہت دنوں بعد وہ سکون کی نیند سوئے تھے۔ پتا نہیں کتنے دنوں کے رتجگے کے بعد ایسی ٹوٹ کر نیند آئی

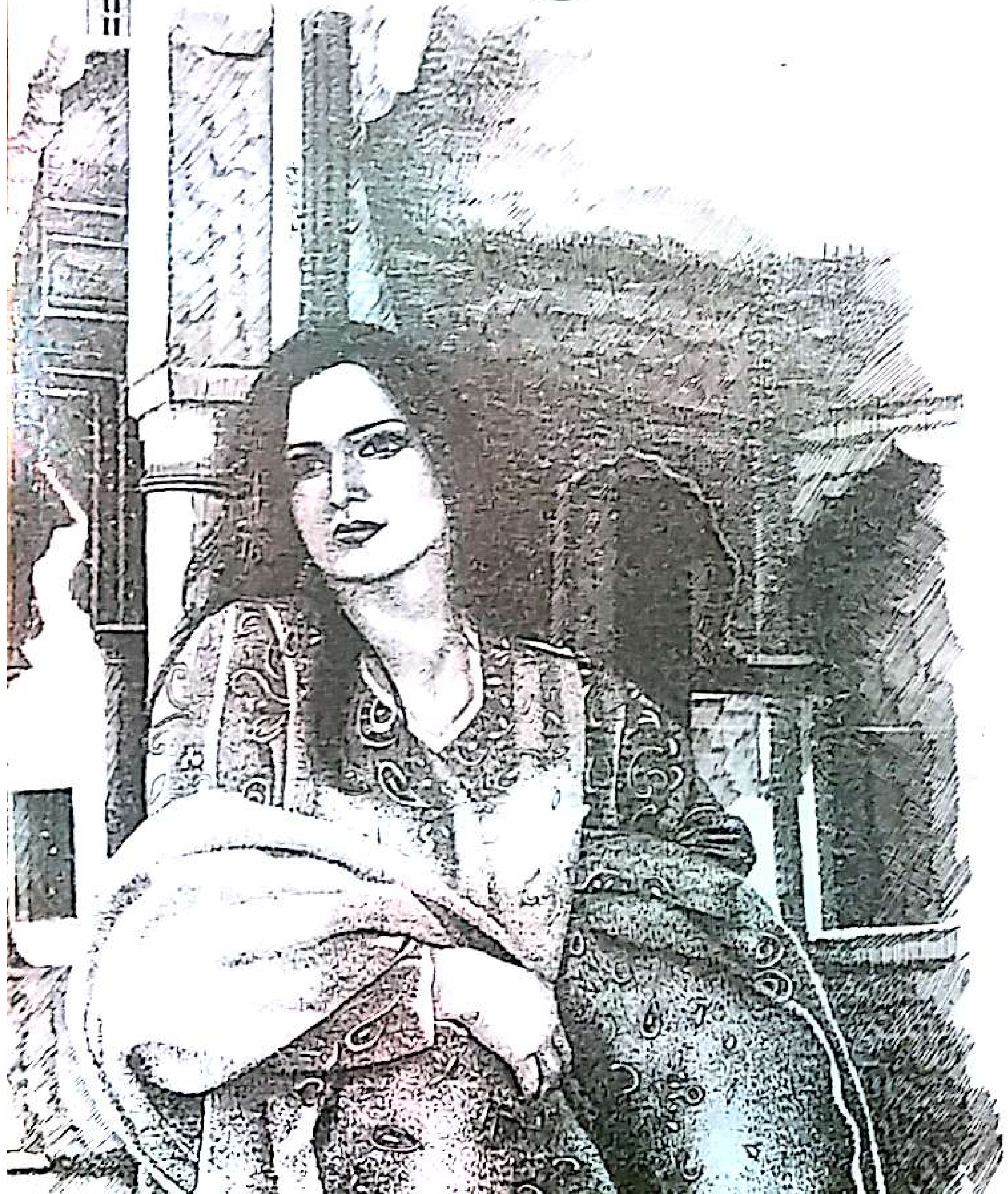
کہ صبح دس بجے کے قریب جاکر کسی نے انہیں جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ دشمن جاں سامنے تھے۔
"کیا پی کے سوئے تھے ایسا جو ابھی تک نیندیں نہیں پوری ہو رہیں۔ ایک سو ایک چکر لگا چکی ہوں۔ چھ سو بار آوازیں دے چکی ہوں۔" وہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔ سعید بھائی کب سن رہے تھے اس کی بات، انہیں تو اس کو دیکھنے، دل میں اتارنے سے فرصت ہی نہیں تھی۔
"یہ... یہ ٹھیک نہیں ہے سعید بھائی! آپ کبھی بھی نظرباز نہیں رہے اور آپ کی اسی خوبی نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا تھا۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔ سعید بھائی ہنسے تو پھر ہنستے ہی چلے گئے۔
"خدا کو مانو لڑکی! ابھی سے بھائی کہنے کی عادت چھوڑو گی تو ہی عادت پختہ ہو گی ناں ورنہ تو شادی کے بعد بھائی کہنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔" حیات نے بہت دنوں بعد ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں ان کی نظر اتارتے ہوئے وہ پرجوش انداز میں بولی۔
"آپ نے باتوں میں لگا لیا مجھے... پتا ہے میں کیوں بے چین تھی آپ کو جگانے کے لیے! انہیں پتا ناں... چلیے میں آپ کو بتاتی ہوں۔" وہ بے حد خوشی کے عالم میں بولی۔
"صبح جب میں تایا کو ناشتا دینے گئی... یہ بڑی گاڑی ہمارے گھر آن کر رکی۔ ان میں سے جو مہمان تھے انہوں نے ابا اور اماں کے گھر کی تصدیق کی اور یہ جان کر میں اماں کی بیٹی ہوں، مجھے گلے سے لگالیا۔ پتا ہے وہ کون تھے سعید بھا...؟" خوشی سے کہتے کہتے وہ رکی...
"وہ... وہ میرے ماموں تھے۔ اماں، ابا کی وفات کا سن کر بہت روئے پھر سب کچھ بتایا کہ کیسے ان کی بیوی میری اماں سے روایتی نند، بھاوج والی چپقلش رکھتی تھی، عمر بھر نانا ابو اور ماموں کو اماں کے خلاف کیے رکھا جس کی وجہ سے انہوں نے میری اماں اور ابا کی شادی کو قبول نہیں کیا اور اماں کو ہمیشہ کے لیے خود سے لاتعلق کر دیا۔ برسوں بعد ماموں اور ممانی کو اس وقت اپنے ظلم کا احساس ہوا جب ان کی اپنی بیٹی نے ماں باپ کی

مرضی کے خلاف شادی کرلی۔ ممانی بھی شاید ضمیر کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھیں، بیٹی کے اس اقدام کے بعد ماموں کو سچ سچ بتادیا اور میری اماں اور اپنی بیٹی دونوں کی غلطی کی معافی مانگی۔ اپنی اولاد کا کیا سامنے آیا تو ماں جائی کے احساس نے ماموں کی راتوں کی نیندیں اڑادیں۔ اب پوچھتے پوچھتے یہاں آنکلے ہیں۔ اماں کے حصے کی جائیداد کے کاغذات بھی ساتھ لائے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔
میں نے کہا۔ جو جائیداد ہماری ماں کے کام نہ آسکی اس سے ہمارا ابھی کوئی لینا دینا نہیں۔ ان کے گھر سے اماں بھی میکے کا مان چاہتی تھی اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں زہرہ اور میں تاکہ کوئی ہمیں بے حیثیت جان کر ارزاں نہ کرسکے۔" وہ رو دی تھی۔ اتنی بہادر حیات... بڑی سے بڑی بات کو چٹکیوں میں اڑا دینے والی حیات شاید اتنی اچانک خوشیاں برداشت نہ کرپائی تھی۔
"ارے... ارے مجھے بہادری کے سبق پڑھاتی لڑکی جس نے اپنی باتوں اور عمل سے ایک مایوس انسان کو زندگی کی طرف لوٹایا، اتنی کمزور ہے مجھے پتا ہی نہیں تھا اور تم سے کس نے کہا تم بے حیثیت ہو... اپنی حیثیت مجھ سے اور میرے دل سے پوچھو۔ آج سعید احمد تم سے وعدہ کرتا ہے حیات کہ اس گھر میں، میری زندگی میں تمہاری حیثیت اتنی مضبوط ہو گی جتنی میرے دل میں ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کسی کی جرات نہیں کہ تمہیں ارزاں جان سکے۔ اٹھو آنسو پونچھو اور ویسی ہی ہنستی مسکراتی حیات بن کر دکھاؤ جیسی دیکھنے کی مجھے عادت ہے۔" انہوں نے کہا تو حیات نے جلدی سے آنکھیں رگڑلیں۔
"چلیں اب میرے ساتھ... ماموں بے چین ہیں آپ سے ملنے کے لیے، بھرائی آواز میں کہتی وہ ان کا بازو تھام کر انہیں کمرے سے باہر لے آئی جہاں دیگر گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس کے میکے والے ان کے منتظر تھے۔ یقیناً" ایک خوب صورت زندگی کا آغاز ہونے کو تھا جو احساس سے گندھے کچھ لوگوں کے گرد گزارنا تھی۔



نزہت جبیں

راہِ طلب



شمو خالہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلیں، ماربل کے چکنے فرش پر پڑے ہوئے پانی کے قطروں نے نہایت بھونڈے انداز میں ان کا خیر مقدم کیا۔ جیسے ہی پاؤں پانی پر پڑا، ویسے ہی وہ سلپ ہو کر دھم سے زمین پر بیٹھ گئیں، نہ صرف بیٹھیں، بلکہ ماربل کے فرش پر تیزی سے سلپ ہو کر برآمدے کے گول ستون کی جانب سفر کا آغاز کر دیا۔ ہم بچہ پارٹی برآمدے کے سامنے والے صحن میں بیٹھے پکنک کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف تھے۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہم سب چونک کر پلٹے تو شمو خالہ کو ماربل کے فرش پر ظلم ڈھاتے دیکھا۔ ساتھ ہی توپ کا رخ ستون کی جانب تھا۔''اللہ اکبر'' یااللہ اس ستون کو اپنی امان میں رکھنا۔ اس ستون پر ہمارا برآمدہ بے چارہ کھڑا ہے۔ اس برآمدے پر رحم کر میرے مولا۔'' ارحم بھائی کے بے ساختہ جملے کی ادائی پر ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اللہ پاک نے ارحم بھائی کی معصوم دعا کو قبول کر لیا۔ اور ستون پر رحم آگیا، تب ہی شمو خالہ تھوڑا سا پھسل کر رک گئیں۔ دھماکے کی آواز پر کچن میں کام کرتی تائی اماں، چچی جان اور اماں بھی چونکیں اور باہر کی جانب بھاگیں۔

''ارے کیا ہو گیا ہے۔'' اندر کمرے سے دادو نے بھی آواز لگائی۔ کیونکہ ان کو اٹھ کر باہر تک آنے میں ٹائم درکار تھا۔ اس لیے وہ اندر کمرے سے ہی چلائیں۔ ہم بچے بہ مشکل اپنی ہنسی پر کنٹرول کرتے ہوئے سب سے پہلے ہی موقع واردات پر شمو خالہ کی مدد کو پہنچے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ شمو خالہ کی ایک ٹانگ اوندھی، دوسری سیدھی تھی۔ ہم لوگ اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ خالہ کو اٹھائیں تو اٹھائیں کیسے۔

''ارے جاہلو! تم لوگوں کو ہنسی آرہی ہے۔ مجھے اٹھاؤ تو سہی۔'' شمو خالہ ناراض ہوتی تو نہیں تھیں، لیکن اس وقت وہ غصے میں تھیں۔

''آپ کو اللہ ہی اٹھائے گا خالہ، ہماری کیا اوقات۔'' طورسم ادھار رکھنے کا قائل نہ تھا۔ تب ہی دھیرے سے منمنایا۔

''ہنہ۔'' اماں نے آنکھیں نکال کر طورسم کو گھرکی دی، جبکہ موجودہ صورت حال دیکھ کر ان کے لبوں پر بھی ہنسی نمایاں تھی۔ ارحم بھائی، تائی اماں اور اماں نے مل کر بہ مشکل شمو خالہ کو اٹھا کر برآمدے میں بچھے تخت پر بٹھایا۔ تخت پر بیٹھ کر شمو خالہ نے اپنی پھولی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کی۔ مریم آپا دوڑ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئیں۔ پانی پی کر اور اچھی طرح سے تسلی کرنے کے بعد کہ کوئی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا، شمو خالہ ہم بچوں کی طرف پلٹیں۔

''یہ بتاؤ یہاں پر پانی پھینکا کس نے تھا؟''

''شمو خالہ! ابھی ابھی اذکا آپی یہاں پر پونچھا لگا رہی تھیں۔ یقیناً انہوں نے پانی ٹھیک سے خشک نہیں کیا ہوگا۔'' مجھے اذکا آپا سے ہونے والی کچھ دیر پہلے کی لڑائی یاد آگئی۔ تب ہی جلدی ان کا نام لے دیا۔

''ارے ارے نہیں! میں تو اچھی طرح سے پونچھا نچوڑ کر لگاتی ہوں۔ یہ نومی سے گرا ہوگا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے دادو کو پانی پلایا تھا۔ ویسے بھی نومی چلتا کم ہے اور ڈانس زیادہ کرتا ہے۔'' اذکا آپا نے نومی سے بدلہ نکالا۔

''جس نے بھی یہ حرکت کی، اس کو سزا ضرور ملے گی۔ آہ! شاید کمر میں چک پڑ گئی ہے۔'' شمو خالہ نے کراہ کر کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کمر...... کمر...... کہاں ہے...... یہ تو کمرہ ہے، کمرہ اور ایسے کمرے میں چک نہیں، ریل گاڑی کی چھک چھک پڑ سکتی ہے۔'' نومی طورسم کے کان میں بولا۔'' دونوں کھی کھی کرنے لگے۔ قریب کھڑی تائی اماں نے سرگوشی سن لی تھی۔

''ارے بھئی! کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ تم سب نے مل کر کیا اٹھا پٹخ کر رہے ہو؟ دو گھڑی سونے بھی نہیں دیتے۔ پورے کا پورا جنجال پورہ بنا رکھا ہے گھر کو۔'' دادو بھی نیند سے بے دار ہوئی تھیں۔ تب ہی جھنجلا کر اور گھبرا کر کمرے سے باہر آکر بولیں۔ تب شمو خالہ کے گرنے کی واردات کا مقدمہ، دلائل،

ثبوت اور گواہان کی موجودگی کے ساتھ دادو کے سامنے پیش ہوا۔ اور فیصلہ رات کو تایا ابو نے سنا دیا کہ اس نے مہینے جو پکنک کا پروگرام طے ہوا تھا وہ کینسل۔'' اوہو! سارے بچوں کے منہ لٹک گئے۔ سزا سن کر شمو خالہ خود بھی گھبرا گئیں، ان کو بچوں کے اداس اور لٹکے ہوئے منہ دیکھ کر برا لگا۔

'' آئے ہائے بڑے بھیا! اب اتنی بڑی سزا بھی نہ دو معصوموں کو...... انجانے میں ہی ہوا ہوگا نہ......

بھلا جان بوجھ کر کون ایسا کرے گا...... معافی دے دیں بھئی۔'' وہ بھلا بچوں کو افسردہ کیسے دیکھتیں، تب ہی جھٹ سے تایا ابو سے سزا واپس لینے کی درخواست کر ڈالی، مجھے شمو لہ خالہ کی یہ ہی بات بہت پسند تھی۔ ہمیں اداس یا پریشان دیکھ ہی نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

ایک ہزار گز پر بنا ہوا بڑا سا پرانے طرز کا یہ گھر دادا جان نے اپنی جوانی میں بنایا تھا۔ جب اولادیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ دادا جان کی خواہش تھی کہ ان کے تینوں بیٹے اس گھر کو آباد رکھیں اور چین و سکون سے ایک ساتھ رہیں۔ میرے تایا ابو کرامت حسین، پھر میرے ابا جی فراست حسین اور سب سے چھوٹے نخی چاچو یعنی سخاوت حسین۔ میں نے اس گھر میں جب ہوش سنبھالا تو تایا ابو، تائی اماں ان کے تین بچے ارحم بھیا، طورسم بھائی اور ازکا آپا اور نخی چاچو کے دو بچے مریم اور نومی کو دیکھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ''نیلم فراست'' ہمارے ساتھ ہی دادا جان کے کزن کی بیٹی شمو خالہ ''یعنی شمیمہ خاتون'' بھی رہتی تھیں۔ مجھے اپنے گھر کا سب سے اہم فرد شمو خالہ ہی نظر آتی تھیں۔ پہلے پہل تو متناسب ڈیل ڈول کی حامل تھیں، مگر وقت کے ساتھ جسامت قدرے بھاری ہوگئی۔ ویسے ہمارے گھر کی دیگر خواتین دادو سمیت سلم اور اسمارٹ تھیں۔ اس لیے شمو خالہ کی جسامت ہمارے لیے بھاری ہی تھی۔ شمو خالہ کی شخصیت مجھ سمیت سارے بچوں کے لیے خاصی اہم تھی۔ میں نے ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی دیکھا۔ وہ اکثر ہم بچوں کو مزے لے لے کر ہماری پیدائش کے قصے سناتیں، جس سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ تائی اماں۔ چچی جان اور اماں کے ہونے والے تمام بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے اور بعد کے تمام مراحل میں شمو خالہ کا کردار بہت جان دار ہوگا۔ وہ مریضہ اور بچے کا بھرپور خیال رکھتیں۔ ساتھ ساتھ دیگر امور بھر سرانجام دیتیں۔ ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد بھی ہم بچوں کی بیشتر ذمے داریاں شمو خالہ کے کاندھوں پر ہی تھیں۔ وہ ہم سب بچوں سے بہت پیار کرتیں۔ ہماری پسند، ناپسند اور ہماری ضرورتوں کا خیال شمو خالہ کو ہماری اماؤں سے زیادہ ہوتا۔

میرے ہوش میں آنے سے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر ان کا بنایا ہوا یہ گھر الحمدللہ آباد تھا۔ دادا جان کا کاروبار تینوں بیٹوں نے احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ گھر میں دادو کے احکامات پر عمل درآمد ہوتا۔ تائی اماں، اماں اور چچی جان مل جل کر گھر کے دیگر امور انجام دیتیں۔ شمو خالہ کو دادو بالکل اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتیں۔ جبکہ تایا ابو، چاچو اور ابا جی بھی شمو خالہ کا بہت خیال رکھتے۔ رشتے میں وہ تو ہماری پھپھو ہی لگتیں، لیکن نہ جانے کیوں ارحم بھائی نے ان کو شمو خالہ کہنا شروع کیا تو ان کی دیکھا دیکھی ہم سب نے بھی شمو خالہ ہی کہنا شروع کر دیا۔

مجھے بچپن سے ہی اپنا بڑا سا پررونق، پرانی طرز پر بنا ہوا حویلی نما گھر بہت اچھا لگتا۔ جہاں امن، محبت، خلوص اور اتفاق پر عمل پیرا ہو کر ہر شخص ایک دوسرے کا خیال رکھتا۔ کبھی گھر میں کسی کو اونچی آواز سے بات کرتے نہیں سنا۔ دادو کی کبھی بہوؤں سے تو تو میں میں ہوئی، نہ دیورانی، جٹھانی والی روایتی ضد اور جھگڑے...... ہم بچے مل جل کر کھیلتے اور مل جل کر ایک ساتھ ہی اسکول جاتے۔ ہوم ورک کرتے اور کبھی اگر کھیل میں عموماً طورسم اور نومی کی بدمعاشی اور بے ایمانی کے باعث ہمارا جھگڑا ہو جاتا تو ثالث کا کردار شمو خالہ ہی ادا کرتیں۔ سانولی سی، مناسب

نین نقش، لمبے سیاہ گھنے بالوں، دراز قد اور وقت کے ساتھ ساتھ فربہی کی جانب بڑھتی جسامت کے ساتھ مجھے شمو خالہ بہت اچھی لگتیں۔ وہی تو تھیں جو ہماری ہر فرمائش پوری کرتیں۔ ارحم بھائی کو نوڈلز کھانے ہوتے، طور سم بھائی کو نگلس کھانے کا دل کرتا، کبھی مریم کو چکن کارن سوپ پینا ہوتا، کبھی اذکا آپا کا دل روغنی روٹی اور چائے پینے کو مچل جاتا۔ مجھے اپنی گڑیا کے لیے اچھے اچھے کپڑے سلوانے ہوتے، سارے کام، ساری فرمائشیں شمو خالہ جھٹ پٹ سے پوری کر دیتیں اور ہماری اماؤں کو خبر بھی نہ ہوتی۔

اذکا آپا بڑی ہوئیں ان کو ہوم اکنامکس سے دل چسپی تھی۔ انہوں نے وہی سبجیکٹ پسند کیا۔ جب اذکا آپا کسی بھی پروجیکٹ کی تیاری میں تھک جاتیں اور سمجھ نہیں آتا، تب شمو خالہ ان کی مدد کو موجود ہوتیں، نہ صرف اذکا آپا کی مدد کرتیں، بلکہ وہ چیز پہلے سے بہتر اور نفیس انداز سے تیار کر کے اذکا آپا کے ہاتھوں میں آ جاتی۔ شمو خالہ ہر کسی کی مدد کے لیے کسی پری کی طرح موجود ہوتیں۔ کسی کام سے عار نہیں تھا، بلکہ نفاست اور مہارت کے ساتھ انجام دیتی تھیں۔ کبھی دادو کا سوٹ دو گھنٹے میں سلائی کر کے بٹن ٹانک کر تیار کرتیں، تو کبھی تائی اماں کی ساڑی کی فال لگا رہی ہوتیں، کبھی اماں کی ساڑھی کی پلیٹیں استری سے جما رہی ہوتیں، تو کبھی چچی جان کے برقعے کی کٹنگ کر رہی ہوتیں۔

ہم بچیوں کے عید کے شرارے، چٹا پٹی کے غرارے، کلی کے کرتے، پاجامے، پشواز گوٹا کناری اور چمپا، بیلوں سے سجا کر تیار کر رہی ہوتیں۔ خاندان میں کسی بھی شادی پر جانا ہوتا، کسی تقریب میں جانا ہوتا تو شمو خالہ کی ذمے داری تھی کہ گھر کے تمام افراد کے کپڑے خود نکالتیں۔ سب کو استری کر کے ہینگ کرتیں، ساتھ ساتھ تایا ابو کو گرین ٹی کی ضرورت ہوتی تو شمو خالہ وہاں دوڑتیں، نخی چاچو کو ان کی پسند کے مطابق کولڈ کافی بنا کر دیتیں، تو ابا جی کو گرما گرم چائے پیش کر رہی ہوتیں۔ کسی جادوئی طاقت کی طرح وہ سارے امور بنا جھنجلاہٹ اور افراتفری کے انجام دیتی رہتیں اور گھر والوں کی ڈھیروں دعائیں وصول کرتے کرتے کبھی ان کے ہونٹوں پر خوب صورت اور جان دار مسکراہٹ ہوتی، تو کبھی ان کے مسکراہٹ میں بناوٹ لگتی، چہرے پر شگفتگی کی جگہ اداسی ہوتی۔

میرے فطرت میں تھوڑی سی ٹوہ اور تجسس بچپن سے ہی تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا، ہم بھی کچھ بڑے ہو گئے۔ شمو خالہ کی عمر بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ مجھے یہ ٹوہ ہوتی کہ سب کی شادیاں تو ہوتی ہیں، یہ شمو خالہ کی شادی کب ہو گی؟

☆☆☆

زمانہ اتنا بدل گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے بدل چکی تھی۔ کھانا پینا، سونا، اٹھنا زندگی کے طور طریقے، پڑھائی، حالات، ہر چیز میں تبدیلی آ گئی تھی، لیکن دادا جان کے بنائے اس گھر کی کچھ روایتیں اور طور طریقے آج بھی موجود تھے۔ گرمیوں کی خوش گوار شاموں میں جب سورج ہمارے گھر کی لمبی لمبی دیواریں عبور کرتا ہوا مغرب کی طرف اپنا رخت سفر باندھ کر پناہوں کی تلاش میں نکلنے لگتا۔ تب ہمارے گھر کے بڑے سے صحن میں تختوں پر سفید، سفید چادریں بچھا دی جاتیں۔ صحن کو دھو کر پونچھا لگا دیا جاتا۔ پنکھے چلا کر تختوں کے آس پاس لگا دیے جاتے۔ صحن کی عقبی دیواروں کے ساتھ بنی چوڑی چوڑی ترچھی سرخ اینٹوں سے بنی کیاریاں...... جن میں لگے چنبیلی اور موتیا کے پھول کھل اٹھتے، گلابوں کی مہک کے ساتھ مل کر موتیا اور چنبیلی کی خوشبو سارے صحن کو مہکا دیتی۔ شمو خالہ ایک طرف رکھے گھڑونچی پر مٹکوں میں پانی بھر کر اس پر گیلا لال سوتی کپڑا ڈال دیتیں۔ کپڑے پر ادھ کھلی موگرے اور موتیے کی کلیاں بچھا دیتیں۔ مغرب کی اذان ہوتے ہوتے یہ کلیاں کھل کر پھول بن جاتیں، مجھے وہ مہک اتنی پیاری لگتی کہ جھوٹ موٹ کی پیاس لگنے لگتی اور میں بار بار گھڑونچی کے پاس جا کر ان

پھولوں کی مہک لمبی لمبی سانس لے کر اپنے اندر اتارتی۔ مٹکے کا ٹھنڈا پانی اور موتیا کی مہک اندر تک میرے اندر خوش گوار احساس اترتا چلا جاتا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے شمو خالہ موگرے اور موتیے کے ڈھیر سارے پھول توڑ کر اپنے دوپٹے میں جمع کر لیتیں۔ پھر تخت پر آ بیٹھتیں۔ اذکا آپا لمبی سوئی اور سفید دھاگے کی ریل لے آتیں۔ شمو خالہ ان پھولوں کو دھاگے پر پرو کر گجرے بناتیں، تین گجرے ایک تائی اماں کے لیے، ایک اماں اور ایک چچی کے لیے، باقی بچے ہوئے پھول دادو کی جھولی میں ڈال دیتیں۔ مجھے شمو خالہ کے ہلکے رنگ کے ململ کے دوپٹے سے آتی پھولوں کی مہک اتنی اچھی لگتی کہ میں شمو خالہ سے چپک جاتی اور ان کے دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر خوشبو محسوس کرتی رہتی۔

کبھی کبھی میں ان کے بنائے ہوئے گجروں سے ایک گجرا اٹھا لیتی۔ "شمو خالہ! یہ گجرا آپ لگائیں نا...... آپ کے بال اتنے پیارے ہیں...... اچھا لگے گا آپ کے بالوں میں...... آپ کیوں نہیں لگاتیں؟" میں ان کے بالوں میں گجرا لگانے کی کوشش کرتی۔

"ارے نہیں گڑیا!" وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے گجرا لے کر پھیکی مسکراہٹ سجائے کہتیں...... پھیکی بے جان اور زخمی مسکراہٹ...... میں الجھ جاتی۔

شمو خالہ فطرتاً سادہ طبیعت خاتون تھیں۔ گنتی کے چند ہلکے رنگوں کے جوڑے تھے۔ میں نے ان کو کبھی تیز رنگ کے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ ان کے کمرے میں بیڈ۔ الماری کے علاوہ جائے نماز، قرآن پاک، چند پرانے رسالے، پرانی نوٹ بک اور چھوٹی سی صندوقچی ٹائپ بکس جسے آج کے دور میں ہم جیولری باکس کہہ سکتے ہیں۔ سال میں ایک بار شمو خالہ وہ جیولری بکس کھولتیں، ایک ایک، دو دو لال ہری چوڑیاں ہاتھوں میں ڈال لیتیں۔ سرے دانی سے سرمہ آنکھوں میں لگا لیتیں اور مجھے ان کی سرمئی آنکھیں بہت اچھی لگتیں۔

"شمو خالہ! آپ روزانہ سرمہ کیوں نہیں لگاتیں؟ روزانہ لگایا کریں نا، آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔" میں غور سے ان کو دیکھ کر کہتی۔ تو وہ مسکرا دیتیں۔

سردیوں کی یخ بستہ خون منجمد کر دینے والی راتوں میں جب ہمارے والدین اپنے اپنے کمروں میں بند لحافوں میں دبکے نیند کے مزے لے رہے ہوتے، اس وقت ہم سارے بچے شمو خالہ کے روم میں کارپٹ پر گدے بچھائے کمبل میں گھسے شمو خالہ سے جن بھوتوں اور پریوں والی کہانیاں سن رہے ہوتے۔ ایسے میں کسی کو واش روم بھی جانا ہوتا تو شمو خالہ کا ہاتھ تھام کر واش روم تک جاتے، کیونکہ بھوتوں کی کہانیوں سے ڈر بھی تو لگتا تھا۔ اس وقت بھی ہم بچوں کو ہری ہری سوجھتی، نومی بھائی کو بوائل انڈا کھانے کا دل چاہتا تو مجھے گڑ والی چائے کی طلب ہوتی، اذکا آپا اور مریم کو گرما گرم مونگ پھلیاں اور گڑ کھانے کی خواہش ہوتی۔ شمو خالہ ایک چولہے پر انڈے بوائل کرنے رکھ دیتیں، تو دوسرے چولہے پر کچھ مونگ پھلیاں توے پر مہارت سے بھوننے لگتیں، ساتھ ساتھ گڑ والی چائے بھی تیار ہو جاتی۔

"ہائے اللہ شمو خالہ آپ کتنی پیاری ہیں، بالکل فرشتوں جیسی۔" اذکا آپا کہتیں۔ "نہیں، شمو خالہ اچھی والی پری ہیں، سب کی ہیلپ کرنے والی۔" میں جلدی سے اپنا فلسفہ جھاڑتی تو شمو خالہ مسکرا دیتیں۔ وہی مخصوص میٹھی اور دل آویز مسکراہٹ جو ان کے لبوں کا خاصہ تھی۔

گھر کے پیچھے والے حصے میں نیم، جامن اور آم کے درخت لگے تھے۔ نیم کے درخت پر رسی والے جھولے ڈالے ہوئے تھے۔ جب ساون کا مہینہ آتا اور ہلکی ہلکی بارش سے فضا مٹی کی سوندھی خوشبوؤں سے مہک جاتی۔ ماحول میں خوب صورت نشہ سا اتر آتا، ہم سب بارش میں بھیگتے ہوئے جھولا جھولتے اور شمو خالہ سے ساون کے گیتوں کی فرمائش بھی کرتے۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد شمو خالہ اپنی میٹھی اور سریلی آواز میں ہمیں ساون کے خوب

صورت نغمے سنانے لگتیں

ساون کے دن آئے بالم

جھولا کون جھلائے......

ان کی آواز میں ایک درد اتر جاتا۔ شاید اس درد کو کوئی محسوس بھی نہیں کرتا، لیکن...... مجھے احساس ہوتا کہ شمو خالہ کی آواز میں نمی شامل ہو گئی ہے۔ ان کے انداز میں درد اور کرب کا احساس شامل ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی گاتے گاتے وہ یک دم چپ ہو جاتیں۔ ان کی خالی خالی آنکھوں میں چھپے بادل، باہر کے گرجتے برستے بادلوں سے زیادہ گہرے ہوتے۔ زیادہ پرسوز ہوتے۔

''کیا ہوا خالہ؟ چپ کیوں ہو گئیں، گائیں نا۔'' میں بہ غور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کچھ کھوجنے کی ناکام کوشش کرتی۔

''خالہ! اتنا اچھا گا رہی تھیں آپ...... گائیں نا۔'' تب کوئی اور بچہ بھی بول اٹھتا۔ ایک لمحے میں ہی شمو خالہ خود پر کنٹرول کر لیتیں۔

''ایسا کرو اب تم لوگ جھولا جھولو اور سارے مل کر گانے گاؤ...... میں تم لوگوں کے لیے گرما گرم پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔'' وہ شاید وہاں سے کھسکنے کا بہانا تلاش کرتیں۔

''ارے واہ زبردست خالہ، ساتھ میں گرین والی چٹنی اور کیچپ بھی لیتی آئیے گا۔'' طور سم فرمائش کر دیتا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتیں۔ میرا دل وہاں جھولے پر نہیں لگتا اور میں چپکے چپکے ان کے پیچھے باورچی خانے کی طرف چل دیتی اور خاموشی سے چھپ کر کچن کی کھڑکی سے دیکھتی، پکوڑوں کے لیے پیاز کاٹتے کاٹتے آنکھوں سے بہتے پانی میں مجھے ان کے آنسو بھی دکھائی دیتے۔ میرا دل چاہتا جا کر ان کے ہاتھ تھام کر پوچھوں کہ شمو خالہ کیا ہوا؟ آپ اداس کیوں ہو گئیں؟ آپ کے اندر کیا ہے؟ آپ کی ہنسی میں درد کیوں ہے؟ لیکن میری ہمت نہیں ہوتی اور میں سر جھکا کر واپس جھولے پر آ بیٹھتی۔ پھر میرا دل نہ بارش کے ٹھنڈے پانی میں لگتا، نہ ہی چٹ پٹے پکوڑے اور کیچپ میں لطف آتا۔ عجیب سی الجھن میرے اندر اتر جاتی۔

گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں جب سارے گھر والے اپنے کمروں میں اے سی چلا کر آرام کر رہے ہوتے تھے۔ ایسی گرمی میں کوئی بچہ بھی اپنے کمرے سے باہر نظر نہیں آتا سوائے میرے۔ ایسے میں شمو خالہ اپنی پرانی سی نوٹ بک میں کچھ لکھتی رہتیں۔

☆☆☆

ابا جی لوگوں کے ایک کزن تھے افتخار مرزا، جن کو ہم سب بچے افتی چاچو کہتے تھے۔ وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے، ان کی بیگم رابعہ چاچی بہت امیر فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ افتی چاچو بے چارے غریب سے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد اکیلے ادھر ادھر کھاتے پیتے، ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتے اور پڑھائی کے بعد معمولی سی جاب کر لی تھی۔ نیک شریف اچھی صورت شکل کے انسان تھے۔ انتہائی نفیس، بااخلاق، نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے، جبکہ رابعہ چاچی انتہائی بد دماغ، اکھڑ مزاج اور مغرور عورت تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ حسن، فاروق اور اروی، افتی چاچو کبھی کبھی ہمارے گھر آتے تو رونق لگ جاتی۔ شمو خالہ ان کا بھی ابا جی، تایا ابو اور چاچو کی طرح خیال رکھتیں۔ افتی چاچو اپنے کام کے سلسلے میں آتے ایک آدھ دن رہتے یا کبھی صبح آ کر شام کو واپس لوٹ جاتے۔ مجھے لگتا افتی چاچو اور رابعہ چاچی کی آپس میں نہیں بنتی۔

☆☆☆

دن برق رفتاری سے گزر رہے تھے۔ شمو خالہ کی عمر ڈھلنے لگی تھی اور مجھے ان کی شادی کو لے کر مزید فکر ستانے لگی تھی۔ اذکا آپا نے گریجویشن کر لیا تو تائی اماں کے بھانجے کا رشتہ ان کے لیے آ گیا بلال بھائی پڑھے لکھے اور شریف جوان تھے اس لیے ابتدائی مراحل کے بعد اذکا آپی اور بلال بھائی کا رشتہ طے ہو گیا اور شادی جلد ہی طے پائی اور گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ میں ان دنوں نویں کلاس میں

تھی، میں بھی تھوڑی بڑی ہو چکی تھی۔ بچپن والا تجسس اور ٹوہ آج بھی برقرار تھی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید اضافہ ہی ہوا تھا۔ اذکا آپا کی شادی کے حوالے سے گھر میں تیاریاں عروج پر تھیں۔ اتنے بڑے خاندان میں ہونے والی گھر کی پہلی شادی تھی اس لیے تیاریاں بھی اسی لحاظ سے کی جا رہی تھیں۔ اس روز شموخالہ، تائی اماں، اماں اور چچی جان کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ ان کو اپنی مرضی سے اذکا آپا کے کپڑوں کے لیے گوٹا کناری اور سلمہ ستارے وغیرہ خریدنا تھے۔ میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر شموخالہ کے کمرے میں آ گئی اور وہ نوٹ بک تلاش کرنے لگی جس پر وہ کبھی کبھی کچھ لکھتی تھیں گو کہ مجھے امید نہ تھی کہ میں اپنی ٹوہ میں کامیاب ہوں گی، لیکن...... میری امیدوں کے بالکل برعکس خلاف توقع مجھے ہرے رنگ کے کور والی نوٹ بک کا کونا ان کے سفید براق تکیے کے کارنر پر نیچے دبا نظر آ گیا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھی ادھر ادھر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ نوٹ بک تکیے کے نیچے سے نکالی۔ اس وقت سارے بچے ٹیوشن پڑھ رہے تھے اور پیٹ میں تکلیف کی وجہ سے میری آج چھٹی تھی، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بے فکر ہو کر چھت پر آ گئی۔ یہ بہت پرانی نوٹ بک تھی شاید ہماری پیدائش سے بھی پہلے والی کیونکہ سن دیکھ کر میں چونکی تھی، میں نے صفحہ پلٹایا۔

''بعض اوقات انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کرتا۔ اللہ پاک نے میرے دل کی خواہش کیسے پوری کر دی۔ اللہ پاک تیرا شکر ہے تو نے میرے نصیب کھولے، میں...... بہت بہت خوش ہوں...... اللہ پاک خالہ اماں اور میرے بھائیوں کو سلامت رکھے جنہوں نے فرض سمجھ کر اتنے اچھے طریقے سے فرض کی ادائی کی۔ میں بہت خوش ہوں تم سے پیار ملا دل کو قرار آ گیا۔'' کچھ آگے لکھا تھا۔'' زندگی اب مکمل لگنے لگی ہے۔ محبت کرنے والا ساتھ ہو تو زندگی خود بخود سہل ہو جاتی ہے۔'' صفحہ پلٹتی رہی اور پڑھتی رہی۔

''اللہ پاک ہماری یہ دعا بھی سن لے میری جھولی میں اپنے کرم کی بھیک ڈال دے پروردگار! یا اللہ! کیا میرے نصیب میں یہ خوشی نہیں......؟ میں کب تک یوں ہی رہوں گی......؟ میری دعاؤں کو کب قبولیت کا درجہ ملے گا......؟'' پھر کچھ صفحات کے بعد لکھا تھا۔

''ایک عورت کا نامکمل ہونا کتنا بڑا عذاب ہے، کتنا بڑا دکھ...... میں کتنی بے بس ہوں یہاں ساری محبتیں، رشتے اور خلوص مل کر بھی میرے نصیب کو نہیں بدل سکتے...... اللہ پاک تو تو مالک دو جہاں ہے بخشنے والا، عطا کرنے والا، رحیم و کریم ہے تو...... اپنے کرم کے خزانے سے دو بوند مجھ بدنصیب کی جھولی میں گرا دے میرے مولا...... مجھے بامراد کر دے...... مجھے بامراد کر دے......'' آگے لکھا تھا۔

''یا اللہ میں نے کیا کیا منتیں مانی تھیں تیرے آگے...... میری ساری دعائیں...... درمیان میں رہ گئیں اور مجھے آج یہ پتا چلا کہ میں ''بانجھ'' ہوں۔ یہ لفظ زہر کی مانند میری رگ رگ میں اتر گیا ہے۔ نامرادی اور تشنگی کی آگ میں جھلسا گیا ہے...... ''اف'' میں کیا کروں میرے مولا...... میں...... میں کیسے کسی کی زندگی اپنے ساتھ خراب کروں؟ میرے نصیب کا مجھے بھی بھگتنا ہے......''

اور آگے بہت سارے صفحات سادہ تھے پھر لکھا تھا۔'' مجھے اپنے نام کے ساتھ جڑا ہوا یہ نام بہت عزیز ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہمارے ساتھ جڑا ہوا ہر رشتہ ہمارے پاس بھی ہو، ہمارے ساتھ بھی ہو، ہماری نگاہوں کی دسترس میں ہو، ہمارے ہاتھوں کو ان کے لمس کا احساس بھی ہو...... رشتے تو وہ ہوتے ہیں جو دل کے پاس ہوں، ہماری پسندوں میں، ہماری سوچوں میں، ہمارے خیالوں میں، ہمارے حوالوں میں رہیں جن کے تصور سے ہماری راتیں آباد رہیں، کیا ہوا کہ وہ میرے پاس نہیں، میرے ساتھ نہیں، میری دسترس میں نہیں...... یہی کافی ہے کہ وہ ایک

نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہے۔ میں اس نام کی لاج نبھاؤں گی، ہمیشہ اس حسین دن کی یاد تازہ کروں گی کہ جب وہ نام میرے نام کے ساتھ جڑا۔"

اس سے آگے بھی کچھ لکھا تھا، مگر میں نے مزید نہیں پڑھا...... جلدی سے نوٹ بک بند کی اور نیچے لا کر شمو خالہ کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ ساری باتیں میرے سر پر سے گزر گئیں۔ کیا لکھا تھا...... بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

ازکا آپا کی شادی کی تیاریوں نے زور پکڑ لیا اور ہم بچے بھی مختلف پلان بنانے میں مصروف ہو گئے ساتھ ہی شمو خالہ نے برآمدے کے کونے میں بچھے تخت پر سلائی مشین سنبھال لی۔ وہ بڑے چاؤ اور ارمانوں سے جہیز کے جوڑوں کی سلائی خود ہی کر رہی تھیں۔

"ارے پاگل بچی! کاہے کو اتنی محنت کرتی ہے۔" جب دادو نے ان کو ازکا آپا کی جہیز کی جامنی کلر کی ساڑی پر سلور گوٹے کے پھول بنا کر ایک ایک پتی کو ٹانکتے دیکھا تو آخر بول ہی دیا۔ "بازاروں سے آج کل ایک سے ایک تیار چیز مل جاتی ہے...... کیوں اپنی آنکھیں دکھاتی ہو تم۔"

"بے شک خالہ اماں! بازار سے ہر چیز مل جائے گی شاید اس سے اچھی اور نفیس بھی، مگر...... ان ریڈی میڈ چیزوں میں کسی ماں کی ممتا کی مہک شامل ہو گی......؟ کیا وہ لوگ اتنی محنت سے ایک ٹانکا بھی لگاتے ہوں گے......؟ اور سچی بات تو یہ ہے خالہ اماں کہ جب تک دلہن کے جہیز کے جوڑوں کو گھر میں تیار نہ کریں شادی کا مزا ہی نہیں آتا۔ سوئی کے ایک ایک ٹانکے کے ساتھ رنگین چمکتے کپڑوں میں دعائیں بھی پیوست ہوتی جائیں اور میں بھی ہر ہر ٹانکے پر لبوں سے دعاؤں کے خزانے لٹاتی ہوں کہ اللہ پاک ہماری بچی کو شاد آباد اور ہنستا مسکراتا رکھنا...... زندگی کے طویل ترین سفر میں اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ کا پر خلوص اور محبت بھرا ساتھ نصیب ہو...... ان دونوں کو سلامت رکھنا ان کی جھولی کو اپنے خزانوں سے مالا مال کر دینا...... ان کو بامراد کرنا میرے مولا۔" وہ ایک جذب میں بولے جاتیں ان کا لہجہ بکھرنے لگتا۔ اسی لمحے کپڑے پر تیزی سے چلتے ہاتھ کی انگلی پر سوئی چبھ جاتی، سسکاری ان کے لبوں سے خارج ہوتی۔ شہادت کی انگلی کے پور پر خون کا ننھا سا قطرہ دیکھ کر میں گھبرا کر آگے بڑھتی۔

"اف شمو خالہ! آپ کو تو خون نکل آیا۔" دادو بھی گھبرا جاتیں۔

☆☆☆

ازکا آپا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گئی اور وہ بلال بھائی کے ساتھ ہنی مون ٹرپ پر روانہ ہو گئیں۔ افتی چاچو کچھ دنوں سے بیمار تھے اس لیے وہ شادی پر نہیں آ سکے۔ ہاں، ڈھیر ساری دعائیں انہوں نے بذریعہ کال دے دی تھیں۔ شادی سے فراغت ہوئی تو سب نے مل کر گھر کی تفصیلی صفائی کی۔ شادی کے ہنگاموں میں سارا گھر الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ میں اسکول سے آ کر کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر، سب کمروں میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئے تو کتابیں کھول کر بیٹھ گئی میٹرک کا سال تھا اور ابا جی نے پابند کیا تھا کہ 80% سے کم نہیں آنی چاہیے اور مجھے بھی میڈیکل میں جانا تھا اس لیے پڑھائی پر مکمل فوکس کرنا چاہ رہی تھی۔

"پڑھ رہی ہو گڑیا......؟" شمو خالہ کی آواز پر میں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"جی خالہ!"

"گڈ! اچھی بات ہے چلو تم پڑھ لو اللہ پاک تمہیں کامیاب کرے، آمین۔" میں نے مسکرا کر کہا وہ واپس پلٹیں۔

"خالہ!" میں نے آواز لگائی یوں وہ کسی کے کمرے میں بے وجہ نہیں آتی تھیں، اس لیے مجھے حیرت ہوئی۔ "آپ کو کچھ کام تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں! بس جاگ رہی تھی تو یوں ہی چلی

آئی۔ تم پڑھ لو شاباش۔" انہوں نے پلٹ کر جلدی سے کہا۔
"شمو خالہ! ادھر آئیے۔" میں نے ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ میرے سامنے آ بیٹھیں۔
"گڑیا تم ڈسٹرب ہوگی خواہ مخواہ۔"
"نہیں خالہ بھلا میں آپ سے ڈسٹرب ہو سکتی ہوں آپ کیوں آئی تھیں یہاں، بتایئے ناں پلیز......!" میں نے عاجزی سے کہا۔
"میں آج تم کو ایک سچی کہانی سنانے آئی تھی۔ ہمیشہ من گھڑت کہانیاں سنتی تھیں اور کافی دن ہو گئے کہ تم لوگوں نے کہانی نہیں سنی کیونکہ تم لوگ اب بڑے ہو گئے ہو اور اب...... اب تمہیں سچی کہانی سنا سکتی ہوں۔ وہ کہانی جو بہت پرانی ہے تمہارے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی......" شمو خالہ کے چہرے پر عجیب و غریب اتار چڑھاؤ تھا۔ آنکھیں جیسے گزرے ماہ و سال کو یکجا کر رہی تھیں اور چہرے پر ان گنت سوچوں کا جال بنا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے ان کو دیکھا اور کتاب بند کر سائیڈ پر رکھ دی فطری تجسس اور بچپن والی ٹوہ کی عادت ہنوز برقرار تھی۔ وہ ماضی میں الجھ کر تانے بانے بنتی رہیں۔

☆☆☆

"اماں...... اماں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ بولو ناں...... چپ کیوں ہو گئی ہو......؟" سولہ سترہ سالہ بچی چیخ چیخ کر اپنی ماں کے بے جان وجود کو ہلا رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا جب اماں نے اس کو پانی پلانے کا کہا تھا۔ نقاہت اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز پر وہ بجلی کی طرح اٹھی تھی۔ نیند تو ویسے بھی آج کل اسے نہیں آتی تھی۔ اماں کی دن بہ دن بگڑتی صحت اور حالات نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک طرف مجبور بیوہ اور بوڑھی بیمار عورت جو دن بہ دن موت سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور دوسری جانب سولہ سترہ سالہ معصوم اور تنہا "شمیمہ خاتون" افسری بیگم بشارت حسین کی رشتہ دار تھیں، لیکن خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ ان کے شوہر بھی غریب سے آدمی تھے اور شادی کے چند سال بعد ہی شمیمہ دو سال کی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت بشارت حسین نے بہت چاہا کہ افسری بیگم ان کے ساتھ ان کے گھر رہ لیں، لیکن افسری بیگم کی ضد اور انا نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ بشارت حسین نے ان کی ضد کے باوجود بھی ان کا بہت خیال رکھا اور ہر طرح کی امداد کرتے رہے مسلسل پریشانیوں اور حالات کی وجہ سے افسری بیگم بھی بیمار رہنے لگیں۔ شمیمہ خاتون نے کتنی بار ان کو کہا کہ بشارت خالو کو بلا لیں۔ کرامت بھائی یا فراست بھائی سے مدد لے لیں، مگر افسری بیگم ہر دفعہ انکار کر دیتیں۔ رہائش بھی دوسرے شہر میں تھی۔ ماں کی پنشن سے علاج معالجہ اور گھر کے اخراجات چلتے۔ شمیمہ نے جیسے تیسے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ ادھر افسری بیگم کی بیماری بھی آخری اسٹیج پر آ گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے ان کو کینسر بتایا تھا۔ شمیمہ بے چاری رو رو کر ان کی صحت کی دعائیں کرتی قریب کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ محلے والے تھے جو تھوڑا بہت ساتھ دیتے اسی طرح کسمپرسی میں آخر کار افسری بیگم موت سے لڑتے لڑتے ہار گئیں اور شمیمہ کی چیخوں نے محلے والوں کو اکٹھا کر دیا۔ کسی محلے کے بزرگ نے بشارت حسین کا نمبر لے کر ان کو اطلاع دے دی۔ بشارت حسین، فراست حسین اور نعیمہ بیگم کراچی سے لاہور آئے تدفین کے انتظامات کیے اور پھر شمیمہ کو ساتھ چلنے کی ایک بار پیش کش کر دی۔ شمیمہ سر جھکائے زار و قطار رو رہی تھیں کوئی راستہ نہ تھا۔ گھر بھی کرائے کا تھا ابا کی پنشن بھی اماں کے ساتھ ختم ہو جانی تھی۔ زمانہ اتنا خراب تھا۔ وہ بھلا جوان جہان اکیلی کس طرح رہتیں۔ نعیمہ بیگم نے ان کو سینے سے لگا کر کہا۔
"شمو! خدا گواہ ہے کہ تجھے ہم اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ تجھے اس گھر میں کبھی غیریت کا احساس نہ ہو گا۔ تو ہماری اپنی ہے اور اسلام میں بھی سب سے پہلے رحم اپنے رشتے داروں پر کرنے کا حکم ہے

اور...... یہ ہمارا فرض ہے...... تیرا ہم پر حق ہے میری بچی...... ہمیں اس حق سے محروم نہ کر...... یہ سوچ کر اس گھر سے نکل کہ جہاں تو جارہی ہے وہاں پر تیری ماں، باپ، تین تین بھائی اور بھاوجیں تیری منتظر ہیں......" شمیمہ نے سر اٹھایا نعیمہ بیگم کے لہجے کی سچائیوں پر تڑپ کر ان کے سینے سے جالگیں۔

شمو کو اس گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بہت جلد ہی وہ اس گہرے صدمے سے باہر نکل آئیں۔ انہیں یہاں آکر ایک لمحے کے لیے بھی اجنبیت یا غیریت کا احساس نہ ہوا بدلے میں انہوں نے بھی گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ہر طرح کے امور میں بھرپور حصہ لینا شروع کردیا۔ ان ہی دنوں افتخار احمد جو کہ بشارت احمد کے ننھیالی رشتے دار تھے بے چارے اکیلے تھے وہ نوکری کے سلسلے میں کراچی آگئے۔ سیدھے سادھے اور عام سے نین نقش والے افتخار احمد شریف بندے تھے اکیلے رہتے تھے۔ ان کو اپنے لیے نیک شریف اور گھریلو لڑکی درکار تھی۔

بشارت احمد نے نعیمہ بیگم اور بیٹوں کے مشورے کے بعد شمیمہ سے پوچھا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ہم ان کی شادی افتخار احمد سے کردیتے ہیں۔ اگر نہیں تو کوئی بات نہیں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔ یہ گھر تمہارا ہے، تم یہاں آرام سے رہ سکتی ہو اور تمہاری مرضی اور خواہش کے بنا کوئی کام نہیں ہوگا۔ ویسے تم ہماری ذمے داری ہو اور ہم تم کو ان شاء اللہ تعالیٰ اسی طرح اس گھر سے رخصت کریں گے کہ جیسے کہ ہماری اپنی بیٹی کو کرتے۔" بشارت حسین کی بات پر شمیمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"خالو جان! آپ کو باپ کی جگہ مانا ہے۔ خالہ اماں میری ماں ہیں اور یہ تینوں میرے بھائی اس لیے میں نے آپ کو اختیار دے دیا ہے آپ میرے لیے جو مناسب سمجھیں وہ کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ افتخار احمد کا انتخاب کیا ہے آپ لوگوں نے تو یقیناً وہ اس قابل ہوں گے کہ میرے لیے اس میں بہتری ہوگی۔ آپ لوگ بسم اللہ کریں آگے اللہ پاک بہتر کرنے والا ہے مجھے آپ لوگوں کا ہر فیصلہ منظور ہے۔" نعیمہ بیگم نے آگے بڑھ کر شمیمہ کو گلے سے لگالیا ان کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

اور بہت جلد ہی شمیمہ کو خوب دھوم دھام کے ساتھ دونوں جانب سے تیاریاں کرکے افتخار احمد کے ساتھ رخصت کردیا گیا۔ وہ افتخار احمد کے چھوٹے سے گھر کو آباد کرنے آگئیں۔ افتخار احمد بہت پیار کرنے والے انسان تھے اکیلے رہتے رہتے عمر ہوگئی تھی۔ شمیمہ کی محبت اور توجہ ملی تو ان کو نہ صرف سکون حاصل ہوا بلکہ ان کی صحت پر بھی واضح اثر پڑا دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے تھے۔ دن بہت اچھی طرح گزر رہے تھے۔ شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی افتخار احمد کی ترقی ہوگئی اور آفس میں ان کا عہدہ بڑھ گیا۔ وہ اس کا کریڈیٹ بھی شمیمہ کو ہی دیتے۔

ایک سال، دو سال اور تین سال یوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہوکر گزر گئے۔ تب لوگوں کے احساس دلانے پر اور افتخار احمد کی خواہش پر اولاد کی کمی محسوس ہوئی۔ دعائیں کیں، وظیفے پڑھے ڈاکٹر کے پاس گئے...... ایک، دو نہیں بلکہ تین تین ڈاکٹرز نے یہ روح فرسا اور جان لیوا خبر سنائی کہ شمیمہ بیگم ماں نہیں بن سکتیں۔ وہ قدرتی طور پر اس صلاحیت سے محروم ہیں وہ بانجھ ہیں "اف" کیسی قیامت تھی کہ جو آگئی تھی۔ شمیمہ بیگم کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا، تو افتخار احمد پر بجلیاں گر پڑی تھیں۔ بے شک اپنے رب پر پورا بھروسا تھا، مگر...... کب تک......؟ شمیمہ تو مجرم بن گئی تھیں۔ ادھر افتخار احمد بالکل چپ ہوکر رہ گئے تھے۔ افتخار احمد کو اولاد چاہیے تھی اور...... شمیمہ کا دامن اس نعمت سے محروم تھا۔ زندگی اچانک سے دکھ اور اذیت کے طوفانوں میں گھر چکی تھی۔ افتخار احمد شمیمہ سے بہت پیار کرتے تھے، مگر...... اس تلخ سچائی کو بار بار سن کر...... دیکھ کر وہ ٹوٹ چکے تھے۔ ان دنوں افتخار احمد کا ٹرانسفر بھی دوسرے شہر ہوگیا۔

☆☆☆

آج کل افتخار احمد اپنے باس کی فیملی کا بہت ذکر

کرتے کہ ان کی بیوہ بہن ہیں بے چاری شادی کے دو ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اچھی فیملی ہے اب کوئی بھی رشتہ نہیں آتا لوگ ان کو منحوس سمجھتے ہیں توبہ توبہ لوگ بھی کیسے ضعیف الاعتقاد ہو گئے ہیں قدرت کے کاموں کو الٹے سیدھے ناموں سے جوڑ لیتے ہیں انسان لاکھ کچھ بھی کر لے، پلاننگ کر لے، لیکن ہونا وہی ہے جو رب چاہے اس کی مرضی، فیصلہ اور رضا کے آگے ہم کیا ہماری اوقات کیا ہے۔

''ایک بات کہوں افتخار احمد.....؟'' افتخار احمد کا بیگ پیک کرتے کرتے شمیمہ نے کہا۔

''ہاں بولو۔'' افتخار احمد جو ضروری کاغذات سمیٹ رہے تھے سر اٹھا کر بولے۔

''آپ..... وہاں اکیلے کیسے رہیں گے میرا خیال ہے کہ آپ شادی کر لیں۔''

''ارے کیا ہو گیا..... پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟'' افتخار احمد یوں اچھلے جیسے کرسی پر کانٹے نکل آئے۔

''یہ بات میں کئی دن سے کہنے کا سوچ رہی تھی اور ایسا آپ کو کرنا پڑے گا افتخار احمد محبت اپنی جگہ، مگر..... آپ کو وارث چاہیے..... آپ کے خاندان کو یہیں پر ختم نہیں ہونا ہے..... یہ بات کو مان لینا ہے کہ میں آپ کو یہ خوشی نہیں دے سکتی..... آج نہیں تو کل آپ نے ایسا کرنا ہے تو کیوں نہ آج ہی کر لیں۔ میں اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں کہ ایسا ہوتا ہے اور دنیا میں بے شمار لوگ دو شادیاں کرتے ہیں..... بلا وجہ اور بے ضرورت..... آپ کو تو ضرورت ہے..... معقول وجہ بھی ہے اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں، اس لیے آپ جانے سے پہلے رابعہ بیگم سے نکاح کر لیں۔'' شمیمہ کی بات پر افتخار احمد بری طرح جز بز ہو گئے۔ وہ خود جس بات کو کہنے کے لیے کئی دن سے حیلے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ شمیمہ نے کتنی آسانی سے ان کے دل کی بات سمجھ کر ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

''نہیں..... نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' انتہائی دبی آواز اور بودے لہجے میں ان کے لب ہلے۔

''کیوں نہیں ہو سکتا افتخار احمد.....؟ میری پروا نہ کریں آپ کا نام میرے ساتھ جڑا ہے اور جڑا رہے گا..... ہاں آپ ایک کام کیجیے کہ اسلام آباد میں ہی مستقل رہائش کر لیں..... یہ گھر یوں ہی رہے گا اور میں خالہ اماں کے ہاں چلی جاؤں گی..... میرا آپ کا رشتہ جو اللہ پاک نے بنایا ہے وہ یوں ہی برقرار رکھیے گا.....'' شمیمہ کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ بہت دنوں سے ان کے دل و دماغ میں ہونے والی جنگ میں دل ہار گیا تھا اور دماغ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ ان کو یہ تو برداشت کرنا ہی تھا اور اگر افتخار احمد ایسا چاہتے ہیں تو غلط بھی نہیں تھا۔ ان کو بھی اپنا نام زندہ رکھنا تھا۔ اپنی نسل آگے بڑھانی تھی۔

افتخار احمد مختصر سامان اور رابعہ کو لے کر اسلام آباد چلے گئے۔ شمیمہ نے نہایت ہمت، حوصلے سے ان کو رخصت کیا۔ کوئی یہ کب جانتا تھا کہ بظاہر ہنسنے والی یہ لڑکی جب رات کو تکیے میں منہ چھپاتی ہے تو کتنی بے آواز سسکیاں اس کے اندر دم توڑتی ہیں۔ ساری ساری رات وہ کروٹیں بدل بدل کر گیلے تکیے پر سر پٹختی ہے..... اس کے اندر کیسے کیسے طوفان بپھرتے ہیں..... کتنی آہیں، کتنی سسکیاں رات کی تاریکی میں اس کے کمرے میں گونجتی ہیں اور صبح وہ فریش ہو کر گھر کے کاموں میں یوں مگن ہو جاتی کہ کسی کو کچھ خبر ہی نہ ہوتی کہ رات بھر کیسے کیسے طوفانوں سے گزری ہے..... کتنی بار مری ہے۔

دن، ماہ اور سال گزرتے رہے..... افتخار احمد کے تین بچے ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی آتے ان کے بچے اچھے تھے مگر بیگم انتہائی کھڑوس، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے افتخار احمد کو بیٹے اور بیٹی دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔'' شمو خالہ ایک لمحے کو رکیں میں جو آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے ساری کہانی سن رہی تھی ساتھ ساتھ ایک ایک بات سمجھ آ رہی تھی۔ خالہ نے اس کہانی میں شوہر کا نام نہیں لیا تھا۔

''خ..... خالہ..... آپ..... آپ.....؟ وہ..... آپ تھیں.....؟'' میرے سر پر حیرتوں کے

پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے...... یہ سب میرے لیے بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شمو خالہ کی شادی بھی ہو چکی تھی اور...... ''اف'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ میں ابھی تک شاکڈ کی کیفیت میں تھی اتنی بڑی تلخ حقیقت جان کر...... میرے حواس بے قابو ہو رہے تھے...... ''شمو خالہ......! آپ نے خالو کا نام نہیں بتایا...... بتائیں ناں وہ زندہ ہیں یا......؟'' میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے پوچھا۔

''ارے ارے! اللہ نہ کرے..... اللہ پاک ان کو سلامت رکھے......'' وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولیں......تب ہی باہر برآمدے میں کچھ شور سا ہوا ہم دونوں تیزی سے اٹھے۔

''الٰہی خیر'' بے ساختہ شمو خالہ کے منہ سے نکلا۔ برآمدے میں آئے تو پتا چلا کہ ابھی ابھی افتی چاچو کے بیٹے کی کال آئی تھی کہ ان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ اسپتال میں ہیں۔

''ہائے اللہ دادو۔'' سینے پر ہاتھ مار کر تخت پر دھم سے بیٹھ گئیں

''یا اللہ اپنا رحم کرنا۔'' شمو خالہ کے منہ سے نکلا اور وہ فوراً وضو کرنے بھاگیں۔ فوراً تایا اور ابو کو کال کی ،تایا ابو، ابا جی، چاچو بھی آفس سے آگئے۔ تایا ابو، ابا جی اور ارحم بھائی فوراً اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ شمو خالہ نے بھی مصلیٰ سنبھال لیا۔ دادو بے چاری برابر رو رہی تھیں۔ اماں اور چاچی کا رابطہ تایا ابو وغیرہ سے تھا۔ افتی چاچو کی حالت بہتر تھی۔ معمولی سا اٹیک تھا۔ چار دن بہ مشکل گزرے اور پانچویں دن یہ لوگ افتی چاچو اور تینوں بچوں کو لے کر اچانک واپس آگئے، ہم سب حیران تھے، افتخار چاچو خاصے کمزور لگ رہے تھے۔ مضمحل اور سوگوار سے۔

تایا ابو نے بتایا کہ، رابعہ چاچی اور افتی چاچو کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ رابعہ چاچی کو پیسے کا بہت زعم تھا وہ جو چاہتی کرتی تھیں۔ افتخار چاچو ان کی ہر بات مانتے وہ بے چارے سیدھے سادھے بندے تھے۔ رابعہ چاچی معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا کرتیں۔ ٹیپ ٹاپ رہنے والی رابعہ چاچی عمر سے کم دکھائی دیتیں ایسے میں ان کو اپنے پرانے دوست جس سے کچھ عرصے پہلے دوبارہ رابطہ ہوا تھا۔ وہ اچھے لگنے لگا اور وہ افتی چاچو سے پیچھا چھڑانے کا بہانہ ڈھونڈنے لگیں۔ افتی چاچو نے لاکھ سمجھایا بچوں کا واسطہ دیا، مگر اس عمر میں آکر بھی ان کی پرانی محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ انہوں نے بچے بھی افتی چاچو کے منہ پر دے مارے اور صاف صاف طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ گھر بھی رابعہ بیگم کا ہی تھا۔ افتی چاچو بے چارے مشرقی مرد تھے۔ انہوں نے اس صدمے کو دل پر لے لیا اور اٹیک آگیا۔'' حالات جان کر دادو نے رابعہ چاچی کو خوب برا بھلا کہا...... مگر...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، گو کہ افتی چاچو کا اپنا گھر تھا، لیکن ان کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے دادو نے ان کو کچھ دن کے لیے روک لیا۔ شمو خالہ ان کی خدمت میں کمی نہ چھوڑتیں۔ ان کو تو ویسے بھی عادت تھی سب کے لیے حاضر...... حسن، فاروق اور اروٰی بھی ساتھ تھے۔ شمو خالہ ان کا خیال بھی بالکل ایسے رکھتیں جیسے ہمارا رکھتی تھیں۔ اچھی غذا، بھرپور توجہ اور وقت پر دواؤں کی وجہ سے افتی چاچو جلد ہی ٹھیک ہو گئے۔

☆☆☆

''شمو! اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے......اس کی مصلحت کے آگے ہماری سوچیں پہنچ بھی نہیں سکتیں۔ تمہارا صبر، تمہاری مستقل مزاجی، تمہاری ریاضت نے تم کو آج یہ دن دکھایا ہے کہ...... یہ بچے بھی تمہاری جھولی میں آگئے۔'' دادو کی بات پر شمو خالہ نے سر جھکا لیا ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گر کر ان کے دامن میں جذب ہونے لگے۔

''ارے پگلی! یہ تیرا حق ہے......اب یہ بیس سال کی دوری ختم ہونے لگی ہے...... ایک بار پھر تم دونوں ایک ہونے لگے ہو......'' دادو نے آگے بڑھ کر شمو خالہ کو سینے سے لگا کر ان کا ماتھا چوم لیا۔

دادو نے گھر میں چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کیا تھا۔

آج میں نے پہلی بار شمو خالہ کو مرجنڈا کلر کے سوٹ میں دیکھا تھا۔ ہمیشہ ہلکے رنگ پہننے والی شمو خالہ اس رنگ میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ صحن میں تخت پر بیٹھی حسب معمول موگرے اور موتیے کے گجرے بنا رہی تھیں۔ آج تین نہیں چار گجرے تھے...... میں نے حیرت سے چوتھے گجرے کی جانب دیکھا۔

''لو گڑیا! تم کہتی تھی ناں کہ میں بھی گجرا لگاؤں تو یہ تم خود ہی لگا دو میرے بالوں میں۔'' انہوں نے ایک گجرا اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔

''ہائیں'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر شمو خالہ کے مسکراتے چہرے کی جانب دیکھا ان کے چہرے پر پھیلی مسکان میرے لیے بالکل نئی تھی۔ تب میری نگاہ سامنے اٹھی۔ افتی چاچو کھڑے تھے سفید کرتے شلوار میں شیو کیے، نکھرے نکھرے سے شمو خالہ کے چہرے پر میٹھی مسکان تھی۔ میں کبھی شمو خالہ کو دیکھتی کبھی افتی چاچو کو...... ذہن میں الجھی گتھی ایک دم سلجھ گئی تھی...... یعنی میں بڑی ہوگئی تھی...... واقعی......

میں دوڑ کر شمو خالہ کے کمرے میں گئی ان کا سوٹ کیس پیک ہو کر تیار رکھا تھا۔ جیولری باکس سے لال ہری چوڑیاں غائب تھیں کیونکہ وہ ان کی کلائی میں سج گئی تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔

کچھ دیر بعد افتی چاچو اپنے تینوں بچوں اور شمو خالہ کو لے کر اپنے پرانے گھر جا رہے تھے۔ جہاں زندگی ان کی منتظر تھی۔ شمو خالہ کے چہرے پر اتنا اطمینان، سکون اور اتنی فریش آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ آج ان کے چہرے پر ممتا کا سکون بھی تھا۔ سامنے افتی چاچو اور تین تین جوان بچوں کے ساتھ نے ان کو معتبر بنا دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے آج شمو خالہ کی شادی ہو رہی ہے۔ کیسی انوکھی رخصتی تھی ان کی...... رخصت ہوتے سمے میں ان سے لپٹ کر بری طرح رو دی۔

''خالہ آپ بہت یاد آئیں گی......؟ میں آپ کو بہت مس کروں گی......؟ میری گڑیا کے کپڑے کون سی کرے گا......؟''

''اب گڑیا کی شادی کی فکر مت کرو...... اب تمہاری شادی کی تیاری کرنی ہے ہمیں۔ جلدی جلدی بڑھ لو...... پھر...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی...... اپنے حسن کی دلہن بنا کر......''

''ہائیں سچی۔'' روتے روتے میں یک دم چونک کر بے ساختہ بولی۔ ساتھ ہی پاس کھڑے حسن کی طرف دیکھا سانولا سا دھیمے لب و لہجے والا حسن واقعی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میری بے ساختگی پر حسن نے والہانہ انداز میں مجھے دیکھا اور سب لوگ زور سے ہنس دیے تب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور میں نے شمو خالہ سے دوبارہ لپٹ کر اپنی جھینپ مٹائی۔ مجھے آج لگا تھا میں واقعی بڑی ہوگئی ہوں۔

☆☆

کچن اور آپ

اس ماہ نرگس نسیم کو ''کچن اور آپ'' میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے نرگس نسیم کو تین ماہ کے لیے ''ماہنامہ کرن'' مفت دیا جا رہا ہے۔

نوٹ:۔ پیاری بہن سدرہ بتول اور نرگس نسیم آپ دونوں اپنے گھر کا پتا ارسال کریں تا کہ آپ دونوں بہنوں کو ''ماہنامہ کرن'' بھجوایا جا سکے۔ بہنوں سے درخواست ہے کہ ''کچن اور آپ'' میں اپنے گھر کا پتا ضرور تحریر کیا کریں۔

مصباح علی سیّد

مہر و کہکشاں

ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ غیر معمولی خوب صورت اور معصوم روائیبہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں ارینج کی۔ جندب ازمیر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے' جندب اور روائیبہ کی پرخلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے 'مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پا چکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام زکا' حنبل زکا ہیں۔ خیام کی دو بچے اعشال اور ازلان ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ روایتی زمیندارنی اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرزکا کی والدہ ماں جان فالج کی مریضہ ہیں۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے' لیکن حنبل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

شہروز کمال ایک اکھڑ دماغ شخص ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ صبرینہ سے پسند کی شادی کرنے کے باوجود اس سے اکتایا رہتا ہے۔ وجہ چار بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش ہے اور وہ بیٹے کا تمنائی ہے۔



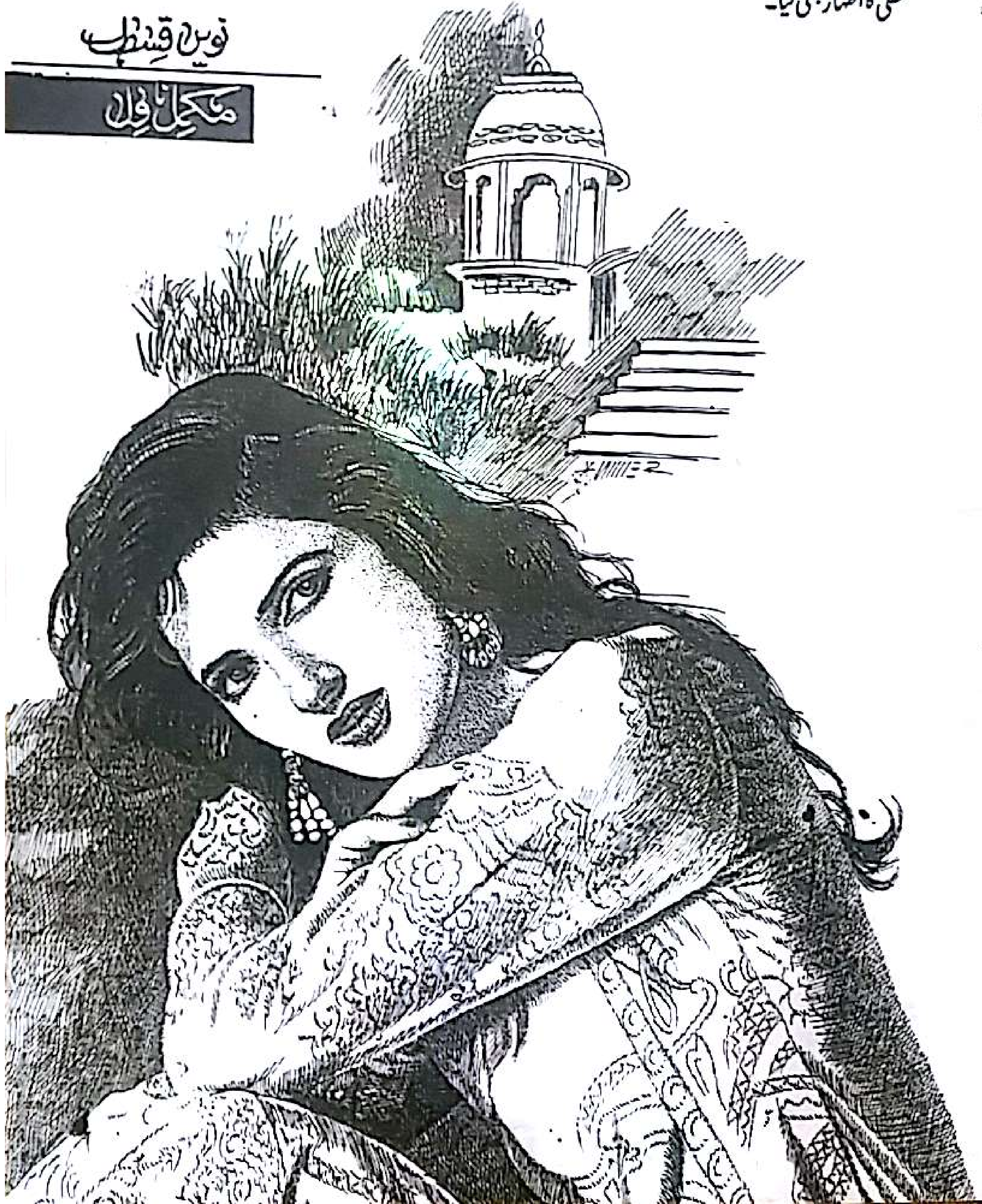
اماں جان کی طبیعت شدید خراب ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے ازمیر سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ جب کہ میرزکا کی ان سے ناراضی چل رہی ہے کیوں کہ ازمیر نے ان کی سالی کو طلاق دے کر آسٹریلین کرسچن لڑکی مریم سے شادی کی تھی لیکن اب ماں کے اصرار پر حنبل زکا ازمیر کو پاکستان بلانے کے لیے قائل کرلیتا ہے۔

رضا حیات کی بیٹی ماہم کی منگنی ہے انہیں پتا چلتا ہے ازمیر پاکستان آرہا ہے وہ شرکت کی دعوت دے دیتے ہیں۔

ازمیر مریم دونوں پاکستان آتے ہیں۔ کچھ ناراضی کے اظہار کے بعد میرزکا نے انہیں معاف کردیا روائیبہ کو نہ لانے پر خفگی کا اظہار بھی کیا۔

نویں قسط

مکمل ناول



وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کمرے اور کمرے سے باہر کھڑے نفوس بری طرح لرز گئے، اب کیا ہوگا، کسی کی سمجھ میں کچھ بھی آنا دشوار تھا۔ آئمہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتی آگے بڑھیں۔ کمرے کی جانب تیزی سے بڑھتے ازلان کے قدم خود بخود چوکھٹ پر جم گئے۔ وہ پھٹی آنکھوں سے لال بھبھوکا حنبل اور ڈری سہمی روائیہ کو دیکھ رہا تھا۔ خوف زدہ سی چند قدم حنبل کی جانب بڑھی قدرے قریب آکر تھوک نگلتے ہوئے بولی تھی۔

"آئی سے سوری (میں نے کہا سوری) پلیز...... میں نے کہا تو تھا گھر جا کر بتا دوں گی، ایکچوئلی......"

"بکواس بند کرو۔" دھاڑتے ہوئے اس کے جبڑے بے طرح اکڑ گئے تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ اس طرح آرام سے اعتراف کرلے گی۔ اس کا جی چاہا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارے۔ روکنے کی کوشش میں حنبل کا کانپتا ہاتھ دیکھ کر ازلان تیزی سی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس سے نگاہ ملتے ہی وہ ایک قدم اور حنبل کے قریب ہوتے ملتجی لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں اور بھی بہت کچھ بتاؤں گی...... میں نے کہا تو تھا جب آؤ گے......"

"قریب مت آؤ میرے......" اس کے لہجے میں زلزلے جیسی درشتی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی لیب رپورٹس اس کے اوپر اچھالیں۔ "میں بھی کہوں میری بچی کا ڈی این اے مجھ سے میچ کیوں نہیں ہو رہا۔" سنتے ہی روائیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا منہ وا تھا آواز اندر ہی کہیں الجھ سی گئی۔

"ناراض تھا نا وہ تم سے...... میری عزت پر اس کی ناراضی کو فوقیت دی۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی گردن کی جانب بڑھا تھا آئمہ نے تیزی سے حنبل کو روکا۔

"حنبل...... چھوڑ میرا بچہ...... اتنا غصہ نہ کر، ملازموں کے کان پڑ گئی تو بڑی بدنامی......"

"آپ درمیان میں مت بولیں بھر جائی......" وہ پہلے سے زیادہ زور سے دھاڑا تھا خوف سے آئمہ کا ہاتھ اس کی پشت سے کرنٹ کھا کر ہٹا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کون کیا کہہ رہا ہے، کیا ہو رہا ہے۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔" مڑ کر اب وہ پوری آنکھیں پھاڑے آئمہ کو دیکھ رہا تھا۔ "میں بکواس کرتا رہا، آپ ساتھ جائیں...... مگر نہیں...... چند مہینے آپ لوگ کچھ بھی نہیں سنبھال سکے۔"

"خدا کے واسطے......" آئمہ نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ "حنبل خدا کے واسطے، جوانی میں اس سے غلطی ہوگئی، معاف کردے اسے...... ہم یہ بچی کسی کو دے دیں گے...... ورنہ بڑوں کی غیرت کا جنازہ نکل جائے گا۔"

روائیہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ حیرت سے ایک ایک کا منہ تکتی اور سانس بالکل کہیں اندر آواز کے ساتھ چپک گئی تھی۔ حنبل کی باتیں اور ردعمل اس کی سمجھ سے باہر اور غیر متوقع تھا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑا اس کی گردن میں پڑنے والا گڑھا رکی سانس سے ناقابل یقین حد تک دھنسا اور ہنسلی کی ہڈیاں ایسے باہر ابھر آئیں جیسے سانس رکتے رکتے وہ مر جائے گی۔

"کیا خدا کے واسطے......" وہ اسی کروفر سے چنگھاڑ رہا تھا۔ "میں تو دل سے چاہ رہا ہوں یہ چھت گر جائے اور نکل جائے جنازہ میرا اور اس کا......"

"حا...... حا...... حنبل......" وہ بمشکل کہہ پائی۔

"یہ سب کیا...... کیا...... ہے۔" اک لرزتا ہوا ہاتھ سہارے کے لیے حنبل کے کندھے تک آیا تھا اس نے بے دردی سے جھٹک دیا۔

"اس وقت میرے سامنے سے ہٹ جاؤ...... ورنہ بہت برا ہو جائے گا......" وہ ہمت کرتی اس کی سمت بڑھے جا رہی تھی آئمہ نے اسے پکڑ کر روکا تاکہ سامنے سے ہٹا لے۔

"تجھے سنائی نہیں دے رہا۔"

"مجھے بات کرنی ہے اس سے...... پلیز...... حنبل...... میری بات سنو۔"

"بات......!" وہ اکھڑ کر بولا۔ "مجھے تو یہ سوچ کر گھن آرہی ہے، قیامت میں تم میرا حوالہ ہوگی اور کیا بات سنوں...... چھوڑا ہے کچھ سننے سنانے کے

لیے۔"
مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی تھیں ناں تم، میں نے کہا تھا سوچ کر فیصلہ کرو۔" حنبل نے بھنوئیں اچکا کر پہلے اسے پھر آئمہ کو دیکھا تھا۔

"اگر یہ جانا چاہتی ہے، اسے کہیں چلی جائے۔ چچا کی پراپرٹی شیئرز، اس کا حق مہر اور باقی......" باقی لفظ پر آ کر حنبل کو اپنے بدن کی تمام رگیں کٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں بہت تکلیف سے اس نے "باقی پیپرز" لفظ مشکل سے ادا کیا۔

"مجھے ایڈریس بتا دے بھجوا دوں گا......"

روائیہ کو شدید چکر آیا تھا۔

وہ اب وہاں رکا نہیں تھا تیزی سے باہر جانے کے لیے مڑا۔ اذلان نے اسے روکنا چاہا، حنبل کے دماغ پر خون سوار تھا جو درمیان میں آ رہا تھا اسی کو کھانے کو پڑ رہا تھا۔ اذلان کی شرٹ دونوں ہاتھوں سے دبوچی۔ اذلان کے پیروں سے زمین نکلی سو نکلی، آئمہ کو قیامت آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اکڑے جبڑے ہلاتے کہہ رہا تھا۔

"تم میرے کسی کام نہیں آ سکے......اذلان......"

اس نے تنفر سے اس کا گریبان چھوڑا اور باہر نکل گیا تھا۔ اذلان پر شرمساری سے گھڑوں پانی آ گرا تھا۔

"کاش وہ کبھی بدنیت نہ ہوتا" لمحے بھر کی شیطانیت نے ہمیشہ کے لیے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔

"یہ، یہ سب کیا ہے......؟" اذلان ریورلس اٹھا کر تحیر سے دیکھتا آئمہ کی جانب ہوا۔ آئمہ نے تڑاخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔

"چپ کر جا، کم بخت......" گال پر ہاتھ رکھے لمحہ بھر کے لیے وہ پتھر کا بن گیا۔ آخر آئمہ کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟ پتھر میں جان پڑی وہاں لمحہ بھر رکنا اس کے لیے محال تھا۔ وہ باہر لاؤنج کی جانب بڑھا تھا۔

حنبل جب دروازے سے نکلا تھا چوکھٹ کے پاس کھڑی اعشال یک لخت پیچھے ہوگئی تھی۔ شدید غصے میں تو اکثر انہیں دیکھ چکی تھی، لیکن اس قدر شدید۔ البتہ کچھ فاصلے سے سب منظر دیکھتی اور سنتی سلوئی کے لیے یہ سب بہت غیر متوقع تھا۔ حنبل کے اس قدر اشتعال پر ڈر تو اسے بھی جانا چاہیے تھا، لیکن پتا نہیں اس وقت اس کے اندر کس حس کی تسکین ہو رہی تھی تب ہی گردن اکڑا کر مستحکم انداز میں پکارا۔

"رکو حنبل......" اس نے جھٹکے سے گردن پھیری اس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ سلوئی پروا کیے بغیر دو قدم اس کے قریب ہوئی۔

"تم کہتے تھے رقیب کو معاف کر دینا چاہیے......
تو کر دو معاف......پانیوں کو سناٹے سے بچا لو......"

حنبل کو اس وقت اپنے ہی لفظ گالی کی طرح لگ رہے تھے۔ کتنی خواہش ابھری تھی کاش یہ دن زندگی میں نہ آتا، کتنا اچھا تھا جرمنی کی حکومت اس کیس میں اسے پھانسی دے دیتی وہ بہت بہتر تھی اس زندگی سے۔ بنا جواب دیے اس کے بھاری قدم تیزی سے ماں جان کے کمرے کی جانب اٹھتے چلے گئے۔

☆☆☆

کئی رنگوں سے سجی باریک پتنگ بہت مستی میں فضا پر تخت جمائے تیر رہی تھی۔ پرندے اس کے قریب ہونے سے خوف زدہ تھے کہیں اپنی ڈور سے ان کی نازک گردنیں نہ کاٹ دے۔ اونچی ہوتی ہوئی زمین سے نکتہ کی طرح نظر آتی گگن کو چھونے والی تھی کہ اچانک اس کی ڈور کسی تیز مانجھے کے کانچ سے کٹی تھی۔ کٹی ہوئی بے وزن پتنگ بے رحم جھونکوں میں ڈولتی درخت کی شاخوں میں الجھ کر پھڑ پھڑانے لگی۔ کسی شوقین نے اس کی ڈور اپنی جانب کھینچنا چاہی وہ خاردار شاخوں میں الجھ کر لیر و لیر ہوگئی۔ پھٹے وجود کی دھجیاں درخت پر جھول رہی تھیں۔ وہ بھی بالکل ایسی لیر و لیر پتنگ کی طرح جھولتی سب سمجھنے کی کوشش میں تھی۔

دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ چکی تھی جو سن چکی تھی کتنی دیر تو اسے وہ سب سمجھنے میں لگی۔ اسے یہ سمجھ میں آنا مشکل تھا آخر حنبل یہ سب کس بنیاد پر کہہ کر گیا ہے، اس سے کچھ پوچھے، بتائے بنا کیسے آیا اور فیصلہ سنا کر چلا گیا۔ اس کی ذات اس کے نزدیک اتنی بے مول تھی۔ کس کے کہنے پر ڈی

این اے ٹیسٹ کروایا؟ غلطی کہاں ہے؟ یہ ڈھونڈنے کی کوشش تو کیا پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ وہ تو سمجھتی رہی شاید پریگننسی چھپانے پر خفا ہے، اور یہ اللہ جانتا تھا اسی کی کاروباری پریشانی کے سبب سب ہوا، مگر وہ تو من گھڑت الزام پر خفا تھا۔ کیوں۔ اسے ایسا لگا تھا؟ اتنی انسلٹ، اتنی بے اعتباری، اتنی ذلت...... اپنی ذات کی گرد اس کی محبت کا بنا آہنی جنگلا پگھل کر بہنے لگا۔ کیا محبت یوں بھی کرچی کرچی ہوسکتی ہے۔

اس کی نگاہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے بے ڈھنگے گلدان پر رکی۔ جس میں اس وقت افشاں کے ساتھ گلابی پھولوں کی سوکھی پتیاں بھی بھر رکھی تھیں۔ اس پر کندہ اس کے جملے روائیبہ کا منہ چڑھانے لگے۔

''ان لوبی پازیٹو۔''

''سب جھوٹ، دھوکا، فریب۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے گلدان پر ایک ہاتھ مارا وہ زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گیا۔ تمام سوکھی پتیاں اور افشاں اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ روائیبہ کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ سب کیا ہورہا ہے۔ لیب رپورٹس زمین پر بکھری تھیں اور بھرجائی وہ کس چیز کی معافی مانگ رہی تھیں، کیا جرم کیا تھا اس نے آخر اور کیوں اس کی بچی کسی کو دے دیں گے۔ اسے اپنی بے بسی پر یک لخت بہت سارونا آیا۔

صفائی میں کہنے سننے کے لیے وہ رکا کب تھا۔ کتنے آرام سے کہہ گیا جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اسے اپنے اور اس کے حوالوں سے گھن آتی ہے...... کیوں؟ بڑا سا منہ کھول کر اس نے بمشکل آکسیجن اندر بھرنی چاہی سانس اٹک اٹک گئی۔ اس کی سانس ایک کمزور اور بے اعتبار شخص کے لیے اٹک رہی ہے، جو اس کے وجود کے بجائے کاغذی پرزوں کو اہمیت دے رہا ہے، لیبارٹری کی مشینری اس سے زیادہ اعتبار پا گئی۔

''نہیں......'' اس نے جھٹکے سے ہچکی روکی نگاہ سوتی ہوئی معصوم بچی پر گئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ننھے خراٹوں میں سو رہی تھی۔ روائیبہ نے بے بی کاٹ کی پٹی مضبوطی سے تھام لی۔

''آئی ہیٹ یو...... آئی ہیٹ یو صنبل ذکا......''

وہ پوری شدت سے چلائی تھی۔ ''اللہ تمہیں چین نصیب نہیں کرے گا......'' اس نے رپورٹس کو پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

''میں ان پر یقین نہیں کرتی۔ بکواس ہے یہ......''

آئمہ بیگم نے جب اسے سنبھلتے دیکھا قدرے خفگی لیے اس کی جانب بڑھی تھیں۔

''میں نے تو تجھے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا تھا، کتنا اعتبار کیا تھا تجھ پر...... لیکن تو نے یہ کیا، کیا...... تو کیا سمجھی صنبل اتنا بے وقوف ہے دھوکے میں آجائے گا...... بے گانی اولاد سینے سے لگالے گا...... وہ غیرت مند مرد ہے...... جان دے دے گا...... عزت کا جنازہ نہیں......''

وہ یک بارگی سے ان کے چہرے کو تکنے لگی۔ آخر بھرجائی کہہ کیا رہی ہیں...... کون سی غیرت، کون سا دھوکا...... عزت والے دیکھو، راتوں کے سناٹوں میں اٹھ کر اپنے ہی گھروں میں نقب لگانے والوں...... کی غیرت جاگ رہی ہے...... بنا قصور، بنا گناہ مجرم بھی ثابت کردیا۔ وہ تنفر سے انہیں دیکھتی کچھ نہیں بولی تھی۔ آئمہ دانت جما کر بولیں۔

''کم از کم مجھے ہی بتادیا ہوتا...... یوں سب کے سامنے ذلیل نہ ہوتی...... چلو غلطی ہوگئی اسی وقت معاملہ ختم کروادیتی...... یہی معافی مانگنے آیا تھا وہ اس رات...... مجھے بھی اپنے گناہ میں شامل کیا تو نے......'' روائیبہ کا جی چاہا آئمہ کو جھنجوڑ کر رکھ دے ان کے بیٹے کی نیت کا فتور ان کے منہ پر مارے، مگر وہ دانت جما کر اتنا بولی تھی۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا...... جو گناہ کرتا ہے...... اس کے سامنے آجاتا ہے......'' اس نے بے دردی سے اپنے آنسو پونچھے ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنی بچی کا ضروری سامان اور چند ماں باپ کی وہ نشانیاں جو وہ آسٹریلیا سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ ڈالیں اور اٹھا کر چلنے لگی تھی۔ میرون شال بیگ لٹکاتے وقت کندھوں پر پھسلی اس نے اتار کر زور سے

زمین پر پٹخی تھی۔ اس کا دھاگا گلے میں پہنی چین میں الجھا اسے وہ چین گرم آگ جیسی لگی تھی۔ سرخ یاقوت کے لاکٹ کو اس نے مٹھی میں دبوچ کر جھٹکے سے کھینچا تھا چین ٹوٹ کر ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے تنفر سے اسے بیڈ پر پٹخ دیا۔ چین بے دردی سے کھینچے جانے پر گردن کے اطراف گہرا زخم آ گیا تھا، مگر اب ان معمولی زخموں کی کیا پروا تھی اس کا تو پورا وجود زخمی ہو گیا تھا۔ بچی کو اپنے ساتھ لگائے جب وہ چوکھٹ سے نکلنے لگی آئمہ گھبرا گئی تھیں۔

''یہ، یہ کیا کر رہی ہے، کہاں جا رہی ہے اب......؟'' اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بہروں کی طرح چلتی کمرے سے نکلی لاؤنج پار کر گئی اعشال اور سلویٰ تحیر سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ لان میں ڈرائیو وے پر بڑھ رہی تھی۔ آئمہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے تھیں۔

''تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا...... کہاں جا رہی ہے...... بابا جان کا انتظار تو کر، پہلے سب کچھ کر کرا لیا، اب......'' اس نے کٹیلی نگاہ سے آئمہ کو دیکھا پھر آگے بڑھنے لگی۔ ''دیکھ روائیہ ابھی جنبل غصے میں ہے، غصہ اترے گا، میں خود اس سے بات کروں گی۔ جو کچھ کر لیا اب مزید بات تو نہ بڑھا......'' انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ پھنکارتی ناگن کی طرح بس انہیں دیکھے گئی۔

''بولتی کیوں نہیں، بول، کچھ تو کہہ...... اتنا دوپہر سحر ہے۔ ذرا سی بچی لے کر کہاں جا رہی ہے......''

''کیوں میرا کوئی خدا نہیں......'' آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے جس قطعیت بھرے انداز سے کہا تھا لمحہ بھر کے لیے آئمہ اندر تک کانپ گئی تھیں۔ اس کی کلائی کو تھامے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑتی کھل گئی۔ آئمہ وہاں ہی جمی رہیں اور وہ گیٹ تک بڑھ گئی۔ اسلم گیٹ پر کھڑا تھا۔ بنا چادر لیے اس گھر کی عورت کبھی ایسے باہر نہیں نکلی تھی چادر تو کیا اس کے سر سے بھی دوپٹا پھسل رہا تھا۔ اس نے تعجب سے پہلے

روائیہ پھر خاصے فاصلے پر کھڑیں آئمہ کو دیکھا روائیہ بڑھتی جا رہی تھی اس نے بھی روکنے کی ہمت نہیں کی۔

☆☆☆

حویلی سے ملحقہ سڑک پار کر کے وہ بڑی سڑک پر آ گئی تھی۔ جب وہ حویلی سے نکلی جولائی کا آگ برساتا سورج اسے سوا نیزے پر محسوس ہو رہا تھا۔ گرد بار میں لپٹے گرم تھپیڑے اپنے چہرے سے ٹکراتے محسوس ہوئے۔ اپنے گال ننھی بچی کے چہرے پر ٹکائے مخبوط الحواس چلی جا رہی تھی۔ خشک بنجر آنکھوں کے سامنے تمام وہ مناظر ناچ رہے تھے جو ان ڈیڑھ سالوں میں آنکھوں کا حصہ بنے تھے۔ قریب کی سڑکیں ختم ہوئیں تو وہ شہر جانے والی سڑک پر آ گئی۔ یہاں تک کا راستہ اسپتال آنے جانے کی وجہ سے اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اتنا سا فاصلہ طے کر لینے پر ہی اسے شدید کمزوری محسوس ہونے لگی پیاس کی شدت سے حلق اندر تک چپک گیا تھا۔ اس لمحے اسے محسوس ہوا اس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے، جیسے کوئی سواری قریب آ کر رکی ہو اور کوئی اس سے اترا ہو۔ تب ہی عقب سے آواز آئی۔

''باجی کہاں جانا ہے؟'' اس نے گردن پھیر کر دیکھا ایک رکشا کھڑا تھا جس سے چند سواریاں اتر کر دوسری جانب جا رہی تھیں اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رکشا ڈرائیور بھی حیران ہوا۔ حال حلیہ گاؤں کے لوگوں جیسا تو نہیں تھا شکل و صورت انگریزوں جیسی۔ پہلا خیال یہی آیا تھا کسی کی مہمان ہوں گی اب واپسی ہے۔ دماغ کے کسی ایک کونے میں بھی گمان نہیں ابھرا تھا کندھے پر دوپٹا جھولاتی عورت کا تعلق کسی صورت بھی چیمہ حویلی سے ہو سکتا ہے۔ ان کی عورتیں کسی نے آج تک اس سڑک پر نہیں دیکھی تھیں نا کہ بغیر چادر کے۔

''جی باجی...... جانا ہے......؟'' اس کی دوسری آواز پر وہ شہر کا بتا کر سوار ہو گئی۔ رکشا اپنی مخصوص آواز اور دھواں چھوڑتا شہر کی جانب تیزی سے بھاگ رہا تھا اور روائیہ کا ذہن کئی برس پیچھے۔

وہ فلوریہ کا ڈرائنگ روم تھا ازمیر، مریم اور

فلوریہ کے ساتھ وہ بھی وہاں بیٹھی تھی۔ ازمیر نے مریم کو کبھی بھی لیڈی ہیلہ یا فلوریہ سے ملنے کو منع نہیں کیا تھا۔ ہاں خود بہت کم کرسمس یا ایسٹر پر چلے جاتے تھے۔ کیوں کہ ان کی فلوریہ کے ساتھ اکثر ہی کسی بات پر تلخ کلامی ہو جاتی تھی۔ تب بھی شاید ایسٹر تھا اور وہ بے حد بور ہو رہی تھی۔ ان کے بچے اپنے فرینڈز کے ساتھ کہیں باہر تھے اور فلوریہ مریم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ طنز ازمیر کی جانب اچھال دے دیتی جسے وہ خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ تب ہی رچرڈ اور سی (فلوریہ کے بچے) ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے کسی پاپ سنگر کا حلیہ بنائے، سگریٹ کا دھواں اڑائے خاصے ہی عجیب لگ رہے تھے۔ رچرڈ روائیہ کی جانب بڑھا اور ''ہیلو'' کرتے بے تکلفانہ ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ وہ اس کی اس انداز پر اچھی خاصی بوکھلا گئی تھی۔ ازمیر کی آنکھوں میں تندی ابھری تھی، مگر دانت جما کر خود کو روکتے روائیہ کا ردعمل دیکھ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا شاید دونوں کی پوریں ہی مس ہوئی ہوں گی اس نے ناگواری سے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ جیسے ہی اس کے پاس دھپ سے بیٹھا وہ اٹھ کر ازمیر کے پاس آ بیٹھی۔ فلوریہ اس کی بوکھلاہٹ پر زور سے ہنسی تھی۔

''ویسے مریجل تمہاری بیٹی ذرا بھی تم پر نہیں ہے، ڈرپوک دبو...... تم تو بہت دلیر ہوتی تھیں پسند اور ناپسند کا واضح اظہار کرنے والی۔''

ازمیر کو جتنا غصہ رچرڈ کے انداز پر آیا تھا اس سے کہیں زیادہ فلوریہ کا قہقہہ تپا گیا تھا۔ دل میں آیا اچھی طرح سنائیں اور آئندہ کبھی ادھر نہ آئیں بلکہ جس تند شکوہ کناں انداز میں مریم کو دیکھا تھا اس سے واضح تھا وہ مزید برداشت نہیں کرنے والے۔ وہاں سے اٹھتے ہی مریم سے واضح الفاظ میں کہا تھا۔ ''اپنی بہن اور اس کی فیملی سے تم بھلے روز ملو، لیکن میری بیٹی آئندہ ادھر نہیں آئے گی۔'' لیکن فی الوقت انہوں نے فلوریہ کو جتاتے ہوئے باور کروایا تھا۔

''ہماری بیٹی ہم پر ہے یا نہیں ہے، لیکن مجھے خوشی ہے اسے اچھے برے کی پہچان ضرور ہے۔'' روائیہ کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے اسے اپنے قدرے قریب کر لیا تھا۔ اک تحفظ بھرا احساس اس وقت اس میں اترا تھا اور ازمیر کی پریقین لہجے پر سے لگا وہ واقعی اچھے برے میں تمیز کر سکتی ہے، لیکن آج رکشے میں تنہا بیٹھے اس نے خود کلامی کی تھی۔

''ڈیڈی مجھے نہیں پہچان، مجھے بھی اچھے برے کی پہچان نہیں ہو سکی، میں لوگوں کو ان کے رویوں کو نہیں سمجھ سکی، جسے سب سے زیادہ اپنا سمجھا وہ تو سب سے بے اعتبار نکلا۔'' آنکھوں کا بہتا گرم پانی ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا اور رکشے والے کو کسی اچھی ریسٹ ہاؤس کا پتا کرا تر گئی تھی۔

اس تھوڑی سی دیر کے سفر میں وہ فیصلہ کر چکی تھی اسے یہاں سے ایمبیسی رابطہ کرنا ہے پھر ان کی مدد سے واپس اپنے ملک چلی جائے گی۔ کہیں بھی چلی جائے گی، لیکن یہاں بے اعتبار لوگوں کے بیچ ہرگز نہیں رہے گی، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی بے گناہی کے ثبوت اس شخص کو دیتی نہیں پھرے گی جس نے اس کی بات سننا تک گوارہ نہیں کی۔ ایک بے اعتبار شخص کے بجائے اپنی معصوم بیٹی کے لیے جیے گی۔

وہ اپنی بازو کے حلقے میں اسے لیے ہوٹل کے بیڈ پر لیٹی تھی۔ بچی روئے جا رہی تھی۔ وہ اپنی انگلی کی پور اس کے رخساروں پر پھیرتے آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

''میں رو رہی ہوں، یہ کافی نہیں ہے...... تم کیوں رو رہی ہو رابی......'' اسے اپنے منہ سے یک لخت رابی نکلنے پر حیرت ہوئی تھی کبھی بہت پہلے لینا فیڈرک اسے پیار سے رابی کہا کرتی تھیں۔ سمندروں کے فاصلے ہونے پر بھی لینا فیڈرک کی یاد کسی بہت اپنے کا احساس دلا گئی تھی۔

''ہم لینا کے پاس چلیں گے...... میں کوئی جاب کر لوں گی...... سب ٹھیک ہو جائے گا......'' اسے دیکھتے ہوئے درپردہ وہ خود کو آنے والے وقت

کے لیے تیار کر رہی تھی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"رابی نام پسند آیا تمہیں...... رابعہ...... اچھا ہے ناں......" ناک کی نمی زور سے کھینچ کر آنکھیں بالکل خشک کر لیں۔ "اب نہیں رونا۔ ہم اکیلے تھوڑی ہیں، ہم دونوں ساتھ ہیں۔"

اس نے اٹھ کر ہینڈ بیگ کھولا تاکہ اس کے لیے فیڈر تیار کر سکے۔ بیگ کی زپ کھولتے ہی موبائل کی تھرتھراہٹ واضح محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لینے تک وہ رک چکا تھا اور پانچ مسڈ کالز لکھا روشن تھا۔ فون کرنے والا کوئی اجنبی نہیں تھا، مگر اب وہ کسی سے کوئی بات کرنا سنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ سب سہارے اب توڑ چکی ہے، اسے بیساکھی نہیں چاہیے بلکہ بیٹی کی بیساکھی بننا ہے، یہ صرف خیال تھا اور خیال کب درست ہوا کرتے ہیں......؟

☆☆☆

کئی دنوں سے اس کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ مسلسل برف باری نے زندگی اچھی خاصی منجمد سی کر دی، ہر چیز سے بےزاری اکتاہٹ کچھ ماہم کی جانب سے بھی فکر رہتی تھی اس کا دوبارہ مس کیرج ہو چکا تھا۔ کچھ دن پہلے روائیہ کو فون کیا تھا وہ بہت اداس اور زندگی سے بےزار محسوس ہوئی تھی کئی بار پوچھنے پر صرف اتنا ہی بتایا تھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری......"

"کیا ہوا......؟"

"آنٹی نے نہیں بتایا......؟" سوال کا جواب سوال سے دیا تھا اس نے تحیر سے "نہیں" کہہ دیا تو وہ کھوکھلا سا مسکرائی تھی۔ "یعنی کہ آنٹی میری ہر بات جندب سے چھپاتی ہیں۔" اس نے دل میں سوچتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں، بس ایسے ہی......"

"پھر بھی......؟"

"سرپرائز ہے...... بتا دوں گی۔" اس کے خفیہ سے مسکرانے پر وہ بھی ہنس دیا۔

"حنبل آ رہا ہے؟" اسے پورا یقین تھا کہ وہی آ رہا ہوگا اور کیا سرپرائز ہو سکتا ہے۔

"ہاں اسی ہفتے...... وہ کہہ تو رہا ہے، دعا کرو آ جائے، اب مزید انتظار نہیں ہو رہا مجھ سے......"

"آ جائے گا فکر نہیں کرو۔" کچھ دیر اسمتھ اور میرڈین کی باتیں کر کے فون بند کر دیا تھا۔ اس بات کو تقریباً دس دن گزر چکے تھے اسے بیٹھے بیٹھے دھیان آیا یقیناً حنبل آ چکا ہوگا۔ خیر خیریت پوچھنے کے تحت اس نے روائیہ کے نمبر پر کال کی تھی۔ ایک، دو، تین کئی بار کرنے پر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے گھر فون کیا جو عائشہ نے اٹھایا۔ اپنی خیریت بتانے، ماہم اور باقی سب کا پوچھ لینے کے بعد اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

"اور روائیہ کی طرف آنا، جانا ہوا...... وہ ٹھیک ہے......"

"ہاں...... ٹھیک ہی ہوگی...... یاد ہی نہیں رہتا فون کرنا...... آج کروں گی۔"

"میں کر رہا تھا، مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی۔" جندب کے کہنے پر ان کی نگاہ سامنے کیلنڈر پر گئی آنکھیں سکیڑے دنوں کا حساب لگاتے خود کلامی میں بولی تھیں۔

"اچھا ہاں...... میں کرتی ہوں پتا...... اللہ خیر کرے۔"

رضا حیات ٹی وی پر اپ ڈیٹس سن رہے تھے۔ ان کے فون رکھنے پر سرسری سا پوچھا تھا۔

"خیریت، کیا کہہ رہا تھا؟"

"کیا کہنا ہے، سلام دعا دے رہا تھا۔" پھر فون کی ڈائری ڈھونڈتے ہوئے مزید بتانے لگیں۔

"روائیہ کا پوچھ رہا تھا فون نہیں اٹھا رہی...... پتا نہیں گھر پہ ہے...... اسپتال میں ہے۔" ان کے آخری جملے پر عینک کے اوپر سے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب...... وہ ٹھیک تو ہے......" عائشہ کو ڈائری مل گئی تھی، صوفے پر اطمینان سے بیٹھیں صفحے پلٹتے بتایا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہی ہے...... خیر سے پورے دنوں سے تھی...... ہو سکتا ہے اب تو فارغ بھی ہو گئی ہو۔" ان کے تجاہل عارفانہ پر پورے کے پورے ان کی

جانب گھوم گئے تھے۔ انہیں حیرت ہوئی اتنی بڑی خوش خبری پتا ہونے کے باوجود تذکرہ تک نہیں کیا اور اب ایسے بتا رہی ہیں جیسے روز یہی ذکر ہوتا رہا ہو، ان کی حیرانگی میں درشتی شامل ہو گئی تھی۔

''کمال ہے عائشہ بتایا تک نہیں تم نے...... بندہ بچی کی خیریت پوچھ لیتا ہے، مل آتا ہے، جا کر...... حد کرتی ہو تم بھی......!''

وہ اپنے مخصوص انداز میں چڑ کر بولی تھیں۔

''ہاں بس ایک میں ہی حد سے باہر ہوں باقی تو سب حد میں بیٹھے ہیں...... کتنے مہینے تو ہو گئے تمہاری بیٹی نے ستا رکھا ہے، سسرال سے اس کی نہیں بن رہی، دو دفعہ طبیعت خراب کر کے بیٹھی ہے، بیٹے کے الگ دکھڑے ہیں، تمہارے لیے پکاؤں، گھر دیکھوں یا دوستوں کے بچوں کی خیر خیریت یاد رکھوں۔ ایک دماغ ہے میرا...... جگہ جگہ الجھا پڑا......'' مجال ہے رضا حیات نے ان کا ایک بھی شکوہ پورا سنا ہو، فوراً روائیہ کو کال ملائی، مگر نو آنسرنگ ہونے پر انہوں نے حنبل کا نمبر ملایا تھا۔

چمکتے موبائل کی اسکرین اس کے جھلتے وجود کو مزید دہکا گئی تھی۔ ماں جان کے کمرے میں وہ جھنجھناتا آیا تھا۔ اپنے اوپر کنٹرول کرنا اسے بے حد دشوار ہو رہا تھا۔ اسی لیے وہ روائیہ کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ اپنے خون کی بڑھتی حدت سے اسے خوف ناک طوفان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

کتنی دیر وہ ان کے کمرے کے وسط میں کھڑا گہرے سانس لیتے خود کو قابو کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ وہ غصے کا شروع دن سے ایسا ہی تھا کسی کسی معاملے پر تو اسے خود کو روکنا بے حد دشوار ہو جاتا تھا اور آج کا معاملہ اسے نہیں لگتا تھا آج وہ خود کو روک پائے گا اس کے گال اور کانوں کی لوئیں خون برسا دینے کی حد تک سرخ تھیں کن پٹیوں کی تمام رگیں سبز ہو کر ابھر آئی تھیں۔

''حنبل میں شادی سے اچانک آ گئی تھی...... تمہیں پتا ہے ناں...... میرا جندب سے جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''کیسا جھگڑا......؟''

''تم جب آؤ گے تو بتا دوں گی۔'' روائیہ کی پرانی باتیں ایک بار پھر کانوں میں ٹکرانے لگیں۔ ''تم اس وقت کیا کرنے گئی تھیں اس کے کمرے میں......''

''میں وہی اسے کلیئر کرنے گئی تھی، حنبل مجھ سے اتنی غلطیاں کیوں ہو جاتی ہیں۔ مجھے آسٹریلیا...... آسٹریلیا والے یاد آ رہے ہیں...... تم سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔'' لفظوں کی گڈمڈ پر۔

اس نے اپنی مٹھیوں میں بالوں کو جکڑ لیا تھا۔ ''حنبل اگر کوئی غلطی کر کے معافی مانگی تو کیا معاف کر دینا چاہیے۔ ہاں اگر حوصلہ ہو تو، چاہے غلطی کتنی ہی بڑی ہو، کرنے والا کتنا ہی قریبی ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے چیختے ہوئے بیڈ پر زور سے ٹھوکر ماری تھی۔

''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے، ناراض تو نہیں ہو گے۔ غصہ تو نہیں کرو گے۔ جو تم جانتے ہو۔ جو تم نہیں جانتے، شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔ معافی، جھگڑا، شادی، غلطی...... چیختے دھاڑتے کتنے لفظ تھے جو اس کے اندر اودھم مچاتے اس کی سانسیں روکنے لگے وہ آکسیجن لینے کی غرض سے آہستہ آہستہ کمرے سے ملحقہ ٹیرس کی جانب نکلا تھا۔

سامنے کے منظر نے اسے بالکل ٹھنڈا برف کی طرح کر دیا تھا۔ وہ کندھے پر بیگ لٹکائے بچی کو اٹھائے گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی، آئمہ اسے پکارتی پیچھے پیچھے تھیں۔ آئمہ نے اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ چند لفظ بول کر جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے لفظ اتنی دور سے سنائی نہیں دیے تھے، مگر آنکھوں کی تیزی، ہونٹوں کی جنبش سے زمین اپنے قدموں تلے لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کسی ٹرانس کی کیفیت میں اس کا سر آہستہ آہستہ نفی میں ہل رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ واقعی اسے چھوڑ کر جا رہی ہے اس نے اپنی سانس بمشکل اندر کی جانب کھینچی اور الٹے قدم پیچھے کی جانب کمرے میں جانے لگے تھے۔

''کوئی ایک نقطہ...... کوئی پل...... کوئی لفظ کچھ تو روائیہ تم نے رہنے دیا ہوتا جسے پکڑ کر میں یہ کہہ سکتا شاید ویسا نہیں جیسا سمجھ رہا ہوں۔ شاید کہیں کچھ اور غلط ہے...... تم نے جا کر مہر لگا دی۔'' وہ دھپ سے بیڈ پر گرا تھا۔ ''تم واقعی پچھتا رہی تھیں مجھ سے شادی کرکے...... میری محبت، میری چاہت میں کہاں کمی رہ گئی تھی، تم نے ایسا کیسے کرلیا...... اتنا بڑا فیصلہ۔'' شک کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک گئی۔

وہ کسی بت کی مانند بیڈ پر بیٹھا تھا جب اس کے موبائل کی اسکرین چمکی اور شور مچانے لگا۔ رضا حیات کالنگ دیکھ کر اس بت میں بجلی کے شرارے دوڑ گئے حنبل نے چند لمحے ہی اسکرین کو غور سے دیکھا تھا اور انتہائی اشتعال میں پوری قوت کے ساتھ اپنا موبائل سامنے دیوار پر دے مارا اس کا قیمتی موبائل اسی وقت کرچی کرچی ہوتا خاموش ہوگیا تھا۔

رضا حیات بہت دیر تک ''ناٹ ریسپونڈنگ'' سنتے رہے۔ انہیں حیرت تھی آخر کال ریسیو کیوں نہیں ہورہی۔ پہلے کبھی اس طرح ہوتا تھا تو حنبل فوراً ایکسکیوز کا میسج کردیتا تھا۔ ''بزی ہوں، بعد میں بات کرتا ہوں۔'' پھر وہ بھولتا نہیں تھا، مگر آج بہت دیر انتظار کرلینے کے بعد ایک بار پھر سے نمبر ملانے شروع کیے جب کسی صورت رابطہ نہ ہوا تو میر ذکا کے نمبر پر فون کیا تھا

میر ذکا کو حویلی آئے بمشکل گھنٹہ گزرا ہوگا۔ وہ کافی خوش تھے ان کا اجلاس کامیاب رہا تھا، لیکن گھر والوں کے چہروں پر چھائی ہوئی انہیں تفتیش میں مبتلا کررہی تھی۔ آئمہ نے بہت حد تک چھپانے کی کوشش کی تھی، لیکن جب انہوں نے حنبل کا پوچھا۔

''کدھر ہے...... بلاؤ اسے......'' وہ ڈگمگا گئیں، فوراً سے کہا تھا۔

''آرام کررہا ہے...... طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی......''

''کیا مطلب، کیا ہوا اسے......'' وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی جانب رخ کرنے ہی لگے تھے آئمہ نے آرام سے کہہ دیا۔

''بابا جان بیٹھ جائیں۔ اسے ڈسٹرب مت کریں۔'' اتنی بڑی بات وہ کتنی دیر تک چھپا سکتی تھیں۔ بہت سے لفظ جوڑ کر ملتجی لہجے میں پردے اور آہستہ آہستہ ساری بات بتائی تھی۔ سنتے ہوئے میر ذکا کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا۔ وہ بچے تو تھے نہیں اس سارے قصے کو ڈراما یا فلم سمجھ کر جوں کا توں قبول کرلیتے۔ آئمہ کی سانس کے توقف میں وہ گمبھیر آواز میں بولے تھے۔

''ایسا ہو کیسے سکتا ہے...... تم نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا...... وہ سب جھوٹ تھا کیا...... یعنی تم سب جانتے بوجھتے اس کے گناہ کو پالتی رہیں، اتنے بڑے دھوکے میں رکھا ہمیں...... تم اس کے ساتھ برابر کی شریک ہو۔''

''باباجان......'' کہتے ہی ان کے لہجے میں بہت سی نمی اتر آئی۔ لجاجت سے بولی تھیں۔ ''باباجان میں کیا کرتی، جب مجھے پتا چلا بہت سا وقت گزر چکا تھا اور مجھے کون سا حقیقت پتا تھی، صرف وقت کی کمی بیشی سے کچھ کھٹکا سا تھا اور اگر پتا بھی ہوتا تو اپنے بڑوں کی پگڑیاں میں خود روند دیتی...... زہر نہ پی کے مرجاتی میں......'' آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آنے سے آواز خاصی بوجھل ہوگئی۔ ''وہ تو اسپتال میں مسئلہ بن گیا تھا، تب ڈی این اے ٹیسٹ ہوا...... ورنہ میں تو کان و کان کسی کو پتا نہ چلنے دیتی، یہ ذلت کا زہر اپنے اندر ہی رکھتی۔'' وہ نخوت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اپنے اندر کیوں...... اسے کیوں نہیں دے دیا زہر...... اسے زندہ جانے کیسے دے دیا، گڑھا کھود کر یہیں قبر بنا دیتے اس کی...... دس دن گھر سے باہر کیا گیا، پیچھے عزت کے جنازے نکل گئے، میری ناک کے نیچے کیا کچھ ہوتا رہا، تم کہہ رہی ہو آرام سے بیٹھ جاؤں، میں زندہ گاڑھ دوں گا اسے......'' وہ تن فن کرتے حنبل کے پاس گئے تھے اور آئمہ کی جان پر بنی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ اٹھا طوفان آخر تھمے گا کیسے اور جب تھمے گا تو اپنے ساتھ کیا کیا لپیٹ لے

جائے گا فی الحال تو جوان کے منہ میں آرہا تھا وہ پڑھ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ سر تھامے ماں جان کے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ میر ذکا پورا دروازہ کھول کر سامنے آکھڑے ہوئے۔

''تو یہاں سر پکڑے کیوں بیٹھا ہے...... اسے دہلیز پار کرنے کیسے دے دی تونے، اس کی ٹانگیں توڑ دی ہوتیں۔'' میر ذکا کے ترش انداز پر اس کے خون کی گرمی بتدریج بڑھنے لگی دانتوں پر دانت سختی سے جما کے وہ آہستگی سے بولا تھا۔

''پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں...... جائیں آپ......''

''کیوں، اکیلا کیوں چھوڑ دوں...... اس کی جان نہ نکال دوں جس نے تمہارا سر......'' حنبل کی برداشت اتنی ہی دیر میں ختم ہوگئی تھی۔ وہ دھاڑ کر بولا تھا۔

''جائیں آپ یہاں سے اور جا کر اپنے الیکشن دیکھیں، گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے...... اس سے آپ کو ووٹ تھوڑا ملنے ہیں۔'' اس کے طنز پر وہ متاسفانہ اسے دیکھنے لگے اور قدرے بدلے لہجے میں کہا تھا۔

''یار اس سب میں میرا کیا قصور ہے......؟''

''نہیں آپ کا تو کوئی قصور ہی نہیں......'' وہ ان کے روبرو اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''سارا قصور میرا ہے...... میں نے غلطی کی تھی اس رشتے پر آپ کی بات مان کر، میں نے غلطی کی اسے یہاں چھوڑ کر...... میری غلطی تھی اسے شادی پر جانے دیا، میرے گھر والوں کے پاس تو ساتھ جانے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔''

''یار وہ اکیلی خود گئی تھی، ازلان جا تو رہا تھا......''

''ازلان سے چھوٹا کوئی نہیں تھا...... اسے بھیجتے ساتھ۔'' وہ تنک کر بولا تھا۔

''یہاں بیٹھ کر کڑھنے کا کیا فائدہ......'' میر ذکا پینترا بدل کر بولے۔ ''میں رضا حیات کی نسلوں کو سبق سکھا دوں گا۔''

''مجھے کوئی لینا دینا نہیں ہے، رضا حیات سے، اس کی نسلوں سے یا......'' ''یا'' کے بعد اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا بہت زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا تھا اس پر رکھے قیمتی ڈیکوریشن لڑکھڑا کر گرے، کچھ ٹوٹ گئے، کچھ بکھر گئے۔

''ایک تو تیرا یہی مسئلہ ہے، کوئی بات تحمل سے نہیں سنتا، کبھی حوصلے سے کچھ سن بھی لیا کر۔''

''نہیں ہے مجھ میں تحمل......'' بکھرے ڈیکوریشن کو جوتے کی نوک سے اڑاتا باہر نکل گیا تھا۔

رضا حیات نے ایک بار پھر سے حنبل اور روائبہ کا نمبر ملایا۔ جواب موصول نہ ہونے پر عائشہ اور ان کی تشویش بڑھ گئی۔ اسی لیے انہوں نے میر ذکا کا نمبر ملایا کہ ان سے ہی خیر خیریت پتا کر لی جائے۔ نمبر ملانے کے دوران ہی وہ طے کر چکے تھے ایک دو دن میں جا کر فیصل آباد کا چکر لگا آئیں۔ حنبل کے ردعمل پر میر ذکا شدید غم و غصے میں تھے ایسے میں رضا حیات کا نمبر دیکھ کر ان کے بدن میں انگارے دہکنے لگے تھے۔ انہوں نے فون کان سے لگاتے ہی بے نقط سنائی تھیں۔ رضا حیات ششدر رہ گئے، انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہنا چاہ رہے ہیں۔

''ذکا بھائی آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''سمجھ میں تمہیں تب آئے گا جب تمہارے بیٹے کے ٹکڑے کر کے تمہارے سامنے رکھوں گا۔''

''میرے بیٹے نے آخر کیا کیا ہے۔''

''تمہارے بیٹے نے جو کیا ہے نا، میں اسے بخشنے والا نہیں ہوں اور روائبہ کو زمین کی آخری تہ سے بھی نکال لاؤں گا...... صحن کے بیچ و بیچ اس کی قبر کو عبرت کا نشان نہ بنا دیا تو بات کرنا۔'' رضا حیات کا دماغ پھٹنے کی حد ہو رہا تھا۔ وہ ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔

''مجھے صحیح بات بتائیں، ہوا کیا ہے...... روائبہ کہاں ہے وہ بچی۔''

''مر گئی ہے وہ...... کم بخت......'' میر ذکا کا صرف

چلاتے رہے۔

''حنبل کہاں ہے..... میری حنبل سے بات کروائیں.....پلیز.....''

''وہ تھوکتا بھی نہیں اس کے منہ پر.....ہونہہ۔''

انہوں نے کہتے ساتھ فون بند کر دیا اور رضا حیات سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عائشہ اپنے کام چھوڑ کر متفکر سی ان کی جانب بڑھی تھیں۔

''کیا بات ہے، خیریت..... سب ٹھیک تو ہے۔'' انہوں نے بے بس سی نگاہ عائشہ پر اٹھائی آن واحد میں عائشہ کو رضا حیات بہت لاغر اور بیمار لگے تھے۔ انہوں نے فوراً انہیں پانی کا گلاس پکڑایا بعد میں ساری بات پوچھی تھی۔

''آپ روائیہ کو کال کریں.....وہ ساری بات بتائے گی یا حنبل کا نمبر ملائیں۔''

''حنبل کا نمبر بند جا رہا ہے۔'' رضا حیات کی آواز میں بھی تھکے باپ جیسی تھکاوٹ اتر آئی تھی۔

''لائیں مجھے دیں، میں روائیہ کا ملاتی ہوں۔''

انہوں نے فون اٹھا کر دو بیل دیں پھر میسج ٹائپ کیا تھا۔

''روائیہ میری جان تم فون کیوں نہیں اٹھا رہیں.....تمہارے انکل کی طبیعت شدید خراب ہے، تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں.....پلیز وقت نکال کر بات کرو۔'' انہیں یقین تھا جیسے ہی وہ میسج پڑھے گی وہ ضرور بات کرے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ بار بار چمکتی اسکرین کو دیکھے جا رہی تھی جس پر بہت سی مسڈ کالز تھیں، میسج آتے ہی اس نے کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ کتنی دیر گم صم بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ایمبیسی بات کرنے کے لیے اسے آفس ٹائم کا انتظار تھا اور رابی اسے نڈھال سی لگ رہی تھی بار بار قے کی صورت منہ سے پانی نکال دیتی۔ رضا حیات کا نمبر ایک بار پھر چمکتے ہی اس نے فون اٹھا لیا۔ فون کان سے لگتے ہی اس کے ضبط کا سارا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ بہت سا رو لینے کے بعد اس نے سارے قصے کا لب لباب بتایا اور پھر اپنا حتمی فیصلہ کہ وہ اب آسٹریلیا جا رہی ہے۔ رضا حیات آنکھوں میں حیرت لیے خاموشی سے اس کی ساری بات سنتے رہے اس کے رکتے ہی بول لے تھے۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے، کیا حنبل کو نہیں پتا یہاں کی لیبز کا حال اور تم، وہاں کس کے پاس جا رہی ہو کون ہے، وہاں؟''

''فلوریہ آنٹی کے پاس، انہوں نے مجھے کہا تھا، وہ ہمیشہ میرا ویٹ کریں گی۔''

''ہاں بالکل..... جس نے تمہارے باپ کو اہمیت نہیں دی..... وہ تمہیں دے گی..... پاگل نہیں بنو۔''

انہوں نے اپنے لہجے کی سختی کو روک کر کہا تھا۔

''میاں، بیوی میں بہت سے جھگڑے ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ گھر چھوڑ کر نکل جاؤ..... دفاع کرو اپنا..... بڑے کس لیے ہوتے ہیں، ہم بات کریں گے اس سے.....وہ ایسا کس بنیاد پر کہہ رہا ہے.....ایسے ہی خواہ مخواہ۔''

''بھیک میں ملا گھر نہیں چاہیے مجھے..... اور مجھے اب اس سے کوئی بات نہیں کرنی، جو کچھ اس نے کہا تھا وہ بہت ہے ساری زندگی کے لیے۔''

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔ تم فی الحال کہیں نہیں جا رہی ہو، انتظار کرو میرا، میں اور عائشہ آ رہے ہیں تمہارے پاس، سمجھیں۔''

''رابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پتا نہیں اسے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''اسی لیے تو بیٹا کہہ رہے ہیں، تم ذرا سی بچی کو لے کر اتنی گرمی میں گھر سے نکل آئیں۔ تم اسے دیکھو.....ہم تین چار گھنٹوں میں پہنچ رہے ہیں۔''

وہ دونوں اسی وقت فیصل آباد کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ سارے راستے انہیں اپنی لاپروائی پر غصہ آتا رہا۔ ماہم کی شادی کے بعد سے زندگی ایسی الجھ گئی تھی، کاروبار سے جیسے ہی سر اٹھانا نصیب ہوتا تو ماہم کا کوئی قصہ چھڑ جاتا۔ اس وقت وہ اس ارادے سے تھے کہ رات ہوٹل میں اس کے ساتھ رکیں گے

اور صبح ہوتے ہی اسے لے کر حویلی پہنچیں گے، جا کر بات کریں گے، بھلا ایسے بھی کبھی ہوا ہے، پیدائش کے بعد باپ کہہ دے یہ میری اولاد نہیں۔

☆☆☆

یہ فیصل آباد شہر میں ایک بہتر ہوٹل کا کمرہ تھا۔ روائیہ بیڈ پر بیٹھی تھی، بہت ویران مرجھائی صورت لیے اس کی گود میں چھوٹی سی بچی تھی جو خاصی نڈھال لگ رہی تھی۔ عائشہ نے آگے بڑھ کر بچی اس کی گود سے لے لی تھی اور وہ رضا حیات کے ساتھ لپٹ گئی۔ رضا حیات اسے بہت دیر تسلی دلاسا دے کر سمجھاتے رہے تھے۔ تب عائشہ نے بچی کی ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے بے حد سکڑتے دیکھ کر کہا تھا۔

''رضا مجھے یہ بچی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اسے ڈاکٹر کی فوری ضرورت ہے۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' روائیہ یک دم اپنا رونا بھول کر رابی کی جانب بڑھی تھی۔ ''اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے، میرے پاس تو صرف یہ ہی ہے۔''

''تمہارے ساتھ اللہ ہے۔'' رضا حیات نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور بچی کو اسپتال پہنچانے کا انتظام کرنے لگے تھے۔

رابی ایمر جنسی میں تھی اور اس میں شدید پانی کی کمی واقع ہونے کے سبب ہیٹ اسٹروک اٹیک ہو رہے تھے۔ بچی کی کنڈیشن پر رضا حیات اور عائشہ اچھے خاصے بوکھلائے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کسی طرح حویلی اطلاع دے کر بچی کی حالت بتا دی جائے، کچھ غلط ہو جانے کی صورت معاملہ مزید بگڑ جائے گا۔

روائیہ خود بے حد پریشان تھی۔ دل میں ایک ابہام تھا۔ اگر حنبل کو اس وقت رابی کی حالت کا پتا چلا تو وہ ضرور آجائے گا۔ کچھ بھی ہے، وہ اس قدر ظالم نہیں ہو سکتا، اتنی نازک کنڈیشن میں اپنی بیٹی کو دیکھنے تک نہ آئے، آخر یہ اس کی اولاد ہے، کیا اس کے دل کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہوگا۔ وہ کتنی مشکل سے مشینوں کے ذریعے سانس لے رہی ہے۔ ننھے سے جسم پر کیسے سوئیوں، پائپوں کا جال بچھا ہے، کیا اس کے دل کو کوئی چبھن محسوس نہیں ہو رہی ہوگی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ رات کی سیاہی جلد ہی روشنی میں ڈھل کر در و دیوار گرم کرنے لگی تھی۔ کسی ابھرتی امید کے تحت اس نے ایک جانب ہو کر حنبل کے نمبر پر کال ملانا شروع کی۔ اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ آن ہوتا بھی کیسے، وہ اپنا موبائل توڑ چکا تھا اور ایسی کنڈیشن میں نہیں تھا، ایک رات میں ہی موبائل تبدیل کر لیتا۔

روائیہ کو جتنی ازلان سے گھن آنے لگی تھی، وہ اس کے سیل پر تو کیا اس کی جانب نگاہ اٹھانا نہیں چاہتی تھی، لیکن اس وقت دل اور طرح سے دھڑک رہا تھا۔ بس اسے کسی طرح حنبل تک یہ پہنچانا تھا رابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے اپنی گھن کو بالائے طاق رکھا اور ازلان کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری ٹون پر ہی ازلان نے فون اٹینڈ کیا تھا اور چھوٹتے ہی بولا تھا۔

''آپ کہاں ہیں؟''

''مجھے حنبل سے بات کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر آپ کہاں ہیں، کہاں سے بات کر رہی ہیں۔''

''میں نے کہا نا، مجھے حنبل سے بات کرنی ہے۔''

اس کے دوٹوک انداز پر جتا جتا کے کہنے سے وہ اچھا خاصا خجل محسوس کر رہا تھا۔ اک رات کی چھائی شیطانیت نے اسے اتنی پستیوں میں گرا دیا تھا کہ اب اٹھنا محال لگتا تھا۔ کچھ بھی تھا ازلان فطرتاً اتنا بددیانت نہیں تھا۔ شوخ روائیہ کا معصوم حسن اور کھنکتی آواز اسے متاثر ضرور کرتی تھی اور اسے نہ پانے کی اک پھانس بھی چبھتی تھی، جس کو دبانے کے لیے وہ اکثر اس کے گرد منڈلاتا بھی تھا۔ حالانکہ پھانس کو دبانے کے بجائے نکالا جاتا ہے، دبانے سے تو وہ بدن کو گلا کر ناسور بن جاتی ہے اور پھر رسنے لگتی ہے اور اس رستے ناسور کو اس سرد سیاہ رات کی تنہائی مرہم کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ شیطان ہمیشہ انسان کے

کمزور لمحوں میں وار کرتا ہے، تاکہ اس کے شکنجے سے آدم بچ نہ سکے۔ قرآن پاک میں رب العزت بار بار تکرار کرتا ہے، باور کرواتا ہے۔ ''شیطان انسان کا صریح دشمن، شیطان انسان کا صریح دشمن۔'' مگر ہم انسان اپنے کمزور نفس کے آگے اس کے پھیلائے فسوں میں ایسے جکڑتے جاتے ہیں، پھر کچھ دکھائی سنائی نہیں دیتا، وہ کمزوریوں کو راستہ بنا، بنا کر تباہی کی جانب چلاتا چلا جاتا ہے۔

جیسے اذلان کے لیے اسے ٹھکرائے جانے کے بدلے کا راستہ اک لطیف مرہم کی صورت دکھایا اور وہ اپنا رستا ناسور لے کر مرہم کی جانب بڑھتا چلا گیا اور اس مرہم کے بدلے اس کے حصے میں صرف تذلیل آئی تھی، ہر وقت کی تذلیل اور جب جب روائیہ نے اسے تنفر سے دیکھا اسے اپنا آپ چھوٹا محسوس ہوا، اسے چپ کروانے کے لیے اسے دھمکانا پڑا تھا۔ اب وہی دھمکیاں رگید رہی تھیں۔ اس وقت جب اس نے کرختگی سے کہا۔

''میں نے کہا نا، مجھے حنبل سے بات کرنا ہے۔'' اذلان کو دل پر ہنٹر کی طرح لگا تھا۔ وہ فوراً بولا۔

''اٹس او کے...... کرواتا ہوں۔'' وہ موبائل لے کر حنبل کے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔

حنبل بیڈ پر چیت لیٹا تھا، آنکھیں بازو سے ڈھانپ رکھی تھیں۔ اس کے قریب ہی آئمہ کرسی پر بیٹھی آہستہ آہستہ اسے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ وہ ماں جان کے کمرے سے نکل کر سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا۔ خالی کمرے کو دیکھ کر اک بار پھر بدن دہکتا ہوا تنور بن گیا۔ اس کے بیڈ پر ٹوٹی چین والا لاکٹ پڑا تھا اور فرش پر ٹوٹا بکھرا مٹی کا گلدان، مگر اس کی نگاہ منہ چڑھاتیں لیبز ریپورکس پر تھی۔

انسانی فطرت بہت عجیب ہے، عقل مند سے عقل مند، بے وقوف سے بے وقوف انسان جس وقت جو دیکھنا اور سننا چاہے اسے وہی سنائی اور دکھائی دینے لگتا ہے، اس وقت اس کے حواسوں پر صرف روائیہ کی بے وفائی نظر آرہی تھی۔ یہ محسوس نہیں ہوا، مٹی کا گلدان گرا نہیں پٹخا گیا ہے، چین اتاری نہیں گئی توڑ کر پھینکی گئی ہے۔ وہ بیڈ پر دھپ سے بیٹھ کر بے ترتیب گر گیا تھا اور جانے کتنی دیریوں ہی بے حس و حرکت پڑا رہا، رات سلگ کر دہکتے دن میں ڈھل گئی۔ کب آئمہ آکر پاس بیٹھیں اسے آہستہ آہستہ نارمل کرنے کی کوشش میں ان نو، دس مہینوں کی داستان نرم لفظوں میں سناتی رہیں۔ بس وہ چپ تھا۔ ہوں نہ ہاں خاموش ساکت جیسے وہ یہاں موجود نہ ہو، یا یہ تصور کر رہا ہو، وہ دنیا میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ ایسے میں چرچراہٹ سے دروازہ کھلا، اذلان کے اندر داخل ہوتے ہی آئمہ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ البتہ ویسے ہی آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا رہا۔

''چاچی کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔'' اس نے فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ حنبل نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ البتہ ایک ترتیب سے تیرتی سانسیں رک رک کر ڈوبنے لگیں، اسے اپنا بدن اک بار پھر سے گرم ہوتا محسوس ہونے لگا۔

''بات کرلیں۔ وہ خاصی پریشان لگ رہی ہیں۔''

''اسے کہو حنبل مر گیا ہے اس کے لیے۔''

آنکھوں سے بازو جھٹکے سے اٹھاتا وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا، روائیہ کو اپنا وجود کسی اونچی چٹان سے کھائی میں گرتا واضح محسوس ہوا، وہ کھڑی کھڑی بے دم سی ہو کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز پر رضا حیات اور عائشہ چونکے، اس کی جانب بڑھے، وہ بڑا سا منہ کھولے ہچکولے لیتی ہوئی رونے لگی۔ دل سے حنبل کی محبت تو تب ہی رخصت ہوگئی تھی جب اس نے دھاڑتے ہوئے اپنے کندھے سے اس کا لرزتا ہاتھ جھٹکا تھا۔ البتہ دل کے پیندے پر چپکی کھرچن اترنے میں کچھ وقت لگنا تھا اور اس وقت اسے لگا تھا کھرچن کسی تیز دھات سے رگڑی جا رہی ہو۔

''کیا ہوا تمہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی رابی، کیوں ایسے رو رہی ہو۔'' عائشہ اس کے پاس بیٹھ گئیں، اسے تسلی دے رہی تھیں۔ روائیہ کی اپنی طبیعت اتنی بہتر نہیں تھی کہ درد پر درد سہہ سکے، اسے اپنے زخم میں شدید ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی، رابی تو ڈینٹی لیٹر پر تھی سو تھی، روائیہ بھی پیشنٹ بیڈ پر چلی گئی۔ اس کا زخم خراب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ لوگ چار دن اسپتال رہے تھے۔ رضا حیات کا کئی بار دل چاہا ایک بار حویلی جا کر ان لوگوں سے مل تو آئیں، کم از کم زچہ بچہ کی حالت سے آگاہی تو دیں۔ مگر عائشہ نے فی الحال منع کر دیا تھا۔ کیونکہ رضا حیات نے میر ذکا کو دو تین بار بعد میں بھی فون کیا۔ انہوں نے کچھ سننے کے بجائے پہلے کی طرح بے نقط سنائی تھیں۔ عائشہ نے لینڈ لائن پر آئمہ سے بات کرنا چاہی، مگر آئمہ کا پیغام زینب نے یہ دیا تھا۔

''جو لڑکی میاں سے بے وفائی کر سکتی ہے۔ اس کا کون اعتبار کرے گا۔ جب گھر کے مرد بات کرنا نہیں چاہ رہے، میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

عائشہ، رضا حیات حیران رہ گئے، کوئی ایسے کیسے لاتعلقی ظاہر کر سکتا ہے۔ ابھی یہ اس کے نکاح میں ہے۔ ان کے سرد اور کٹیلے رویوں کی وجہ سے ہی فی الوقت انہوں نے حویلی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ شاید تھوڑا وقت گزرے ان کے دماغ کام کرنے لگیں تو وہ خود جا کر یہ معاملہ سلجھائیں گے۔

روائیہ اور رابی کو وہ دونوں لے کر اپنے گھر آ گئے تھے۔ رضا حیات بہت بے چین تھے۔ اک امید سی تھی، حنبل ان سے رابطہ ضرور کرے گا۔ حالانکہ روائیہ نے دھمکی دے رکھی تھی، اگر اب آپ میں سے کسی نے وہاں فون کیا تو میں خاموشی سے یہاں سے ایسی جگہ جاؤں گی، آپ لوگ پہنچ نہیں سکیں گے۔ رضا حیات نے اس کی یہ دھمکی جذباتی بچپنا سمجھی تھی اور خود حنبل کو فون کیا۔ جواباً سننے کو ملا تھا۔

''مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔''

خاموشی سے حویلی جا کر پتا چلا تھا۔ حنبل جرمنی واپس جا چکا ہے۔ انہیں حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ ایسے کیسے جا سکتا ہے، کیا وہ ازمیر کی غلطی کی سزا اس کی بچی کے نام لکھ گیا۔ ازمیر نے تو پھر ہاجرہ کو طلاق دے کر کم از کم آزاد تو کر دیا تھا اور حنبل وہ تو نہ آزاد کر کے گیا، نہ کوئی امید دے گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا نمبر بھی تبدیل کر لیا اور اتا پتا گھر والے دینے کو تیار نہیں تھے، اتنا کروفر، میر ذکا رضا حیات پر چڑھ چڑھ آ رہے تھے، تب رضا حیات نے ٹھوس انداز میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر میری بچی نے گناہ کیا ہے، تو میں اپنی بچی کے گناہ کو ڈھانپنے کے لیے راضی ہوں۔ اپنے بیٹے سے کہو اسے فارغ کر دے۔''

سنتے ہی میر ذکا کی آنکھیں ابل پڑیں اور آنکھوں کے آگے وہ لمحہ آ گیا۔ جب جندب کے لیے رضا حیات نے روائیہ کا رشتہ مانگا تھا، یعنی یہ شخص اتنا وقت گزرنے کے بعد وہی خواہش رکھتا ہے، انہیں یقین ہو گیا کہ اس کے سارے قصہ میں رضا حیات بھی شامل ہے۔ تند نگاہ سے دیکھتے ہوئے رضا حیات سے کہا۔

''تم تو ازمیر کے مرتے ہی یہ چاہتے تھے۔ روائیہ کی صورت سونے کی چڑیا تمہارے ہاتھ لگ جائے، آخر دل کی بات زبان پر آ گئی نا۔''

''خدا کا خوف کرو میر ذکا! تف ہے تم پر۔'' میر ذکا نے برابر اسی طرح گھورا۔

''خدا کا خوف میں کروں یا تم کرو۔''

''استغفر اللہ۔'' رضا حیات تضحیک سے انہیں دیکھتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''واقعی یہ خاندان اس بچی کے قابل ہی نہیں تھا اور رہا خوف، تو اللہ آپ کو خود دکھائے گا وہ کیسا ہیبت ناک ہے۔'' رضا حیات نے دوبارہ ان سے رابطہ نہیں کیا تھا اور میر ذکا کو تو جیسے پورا یقین آ گیا تھا۔ جتنی ہمدردی روائیہ کے پاکستان آنے سے لے کر اب تک رضا حیات کی فیملی کرتی رہی ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بات ہے ضرور اور ان باہر

رہنے والوں کو کیا تمیز، رشتے ناتے کیا ہوتے ہیں۔ اللہ نے اپنی دوزخ بھی تو بھرنی ہے۔ ایسے ہی لوگ ہوں گے جو جانوروں کی طرح رشتے ناتے کچل کر من چاہی زندگی کا لطف لیتے ہیں۔

کتنا آسان ہے قیامت تک کا سوچ کر اعمال نامہ دوسرے انسان کے ہاتھ میں پکڑا کر دوزخ تک پھینک آنا۔ یہ ہم انسانوں کا من پسند مشغلہ ہے۔ دن میں کوئی دس بار اپنے قریبی لوگوں کو آگ کے ہنٹر مارتے دوزخ میں ڈال آتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں، پھر رب کیا ہوا، جس نے جزاوسزا کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں یہ فیصلہ سنانے والے، کس نے عمل دل سے کیا اور کس نے دکھاوا، کس نے رشتے کو پامال کیا اور کس نے پال لیا۔ یہ عقل کے تقاضے ہیں اور اللہ نے یہ تقاضے صرف غور و فکر کرنے والوں کے لیے رکھے ہیں اور غور و فکر تو تحمل میں ہوتا ہے۔ برداشت میں ہوتا ہے۔ غصے میں تو ہنگامہ اور ہیجان ہوتا جو سب تباہ کر دیتا ہے۔ غصے کے ہیجان اور ہنگامے نے ہی روائیہ اور حنبل کی زندگی تباہ کر دی۔

رضا حیات نے سب سے پہلے اس کی ادھوری تعلیم پر توجہ دی تھی۔ تب ہی روائیہ نے ڈریس ڈیزائننگ کا فیصلہ کیا۔ اس ڈپلومہ کے دوران اس کی ایک لڑکی سے بہت اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ عینی عمر میں زیادہ نہیں تھی لیکن کام میں بہت مہارت رکھتی تھی۔ اس کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ لیکن تجربہ تھا۔ رضا حیات نے کچھ سرمایہ لگا کر روائیہ کو بوتیک بنا دی جو عینی کے ساتھ مل کر بہت جلد بڑے آؤٹ لیٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ عینی کی باتوں میں اکثر فیصل آباد کا ذکر آ جاتا تھا۔ ایک دن روائیہ نے پوچھ ہی لیا۔

''تم کبھی ادھر گئی ہو؟''

''ہاں میں اسی شہر کی تھی، مگر اب چھوڑ دیا۔''

اس ''کیوں؟'' کی بڑی لمبی کہانی تھی۔ کون سا سرا پکڑ کر سنانے لگتی۔ غلطیاں کوتاہیاں اپنی بھی تھیں، پھر شہروز کمال نے ان غلطیوں کو جس طرح سے کیش کرنا چاہا تھا سوچتے ہوئے بھی عینی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ شہروز کمال سے بچ کر نکلنے کا ایک ہی حل سمجھ میں آیا تھا۔ وہ شہر بدل لے، کسی بھی شہر میں کوئی ایسا رشتہ دار نہیں تھا جو با آسانی پناہ دے دیتا یا ہمیشہ کے لیے پناہوں میں لے لیتا جب قسمت میں ہاسٹل ہی لکھا تھا تو وہ اسلام آباد آ گئی اور ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں رہنے لگی۔ ایک ڈیزائنر کے ساتھ کچھ عرصہ کام کیا تو لگن نے خاصی مہارت پیدا کر دی، زندگی چل سو چل آگے بڑھی۔ بس اس ''کیوں'' کو سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنا گھر، اپنا شہر کیوں بدلا۔ اب روائیہ کے سوال پر کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر پھیکا سا مسکرا کر کھوئے لہجے میں بولی تھی۔

''کچھ لوگوں کی زندگی میں مداخلت سب کچھ چھڑوا دیتی ہے، بس ایسے ہی فیصل آباد بھی کسی نے چھڑوا دیا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ تم نے فیصل آباد دیکھا ہے؟''

''روائیہ نے زخم رسیدہ سانس بھر کر کہا تھا۔ میں نے فیصل آباد برتا ہے۔''

پھر مہارت سے دونوں نے موضوع بدل لیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں کریدا جو زخم چھپے ہیں، چھپے رہیں اور اتنے سالوں میں تو اسے ویسے ہی اپنے زخم چھپانے پر بہت کمال حاصل ہو گیا تھا۔ مشکل صرف شروع شروع میں ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اندر آگ دہک جاتی، جب جب رابی روتی وہ حواس باختہ سی اسے دیکھتی تھی اور جب جندب کو یہ سب پتا چلا تھا وہ ششدر رہ گیا۔

''ایسا کیسے ہو گیا روائیہ، تم نے اسے بتایا نہیں۔''

''اس نے سنا نہیں۔''

''میں اسے ڈھونڈوں گا۔ میں بتاؤں گا، یہ جھوٹ ہے الزام ہے، تم اس سے محبت کرنے لگی تھیں، وہ بھی کرتا ہوگا۔ اسے یقین کرنا پڑے گا۔''

وہ سب کچھ آسٹریلیا چھوڑ چھاڑ واپس پاکستان آگیا تھا۔ اس نے ماں، باپ کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ وہ فیصل آباد گیا تھا، رکا بھی تھا، مگر ایسا کچھ نہیں تھا، جس پر بے بنیاد بات بنائی جائے، شادی پر ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا صرف اپنے مس بی ہیویر کی معافی مانگنے گیا تھا۔ سب کو یقین تھا، مگر جسے کرنا چاہیے تھا وہ تو منظر سے غائب ہوگیا تھا۔
جندب کے بار بار گلٹ پر روائیبہ نے دوٹوک کہا تھا۔

''جندب میں اپنی محبت کو قبر میں دفنا چکی ہوں، تم بار بار قبر پر بیٹھ کر بین مت ڈالا کرو۔ میرے اندر کے مردے کو تکلیف ہوتی ہے۔''

جندب نے بین ڈالنے چھوڑ دیے تھے۔ سب کا سلوک ایسے ہوگیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوا۔
روائیبہ اور رابی شروع دن سے اس گھر کا حصہ اور روٹین ہوں۔ وہ گھر کے کاموں میں عائشہ کے ساتھ لگی رہتی اور پھر کالج اور کالج کی مصروفیات بہت تھیں۔ فارغ وقت سارا رابی کے ناز نخرے اٹھانے میں گزر جاتا۔ عائشہ بہت ممتا کے ساتھ رابی کو پال رہی تھیں اور کتنی ہی بار روائیبہ سے معافی مانگی کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا کہیں نہ کہیں ہاتھ ان کا بھی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے اکلوتے ہونے سے ڈر گئی تھیں۔ انہوں نے روائیبہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اعتراف کرلیا تھا۔

مریم نے اس کے رشتے کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے جو کہا تھا، مریم نے مجھ سے رشتے کا ذکر کیا تھا۔ وہ صرف ایک مجبور ماں کی خودغرضی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی جندب تمہاری وجہ سے اپنی تعلیم چھوڑ کر آجائے اور تمہارے تائے کے ہاتھوں مارا جائے۔ روائیبہ نے ان کے ہاتھ کھول دیے۔

''یہ سب میری قسمت میں لکھا تھا۔ مہر میری کم ہمتی نے لگائی تھی۔ کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

وہ اور روائیبہ تھی، جسے آسانی سے جس نے جب چاہا استعمال کیا اور پھینک دیا، مگر وقت کی ندی کے تیز بہاؤ نے اسے چمکتے گول پتھر کی طرح مضبوط کردیا تھا، جو بھرپور ضرب کھانے پر بھی آسانی سے نہ ٹوٹے۔ زندگی کی بے شمار رگڑوں میں ایک رگڑ جندب کی جانب سے بھی شامل ہوگئی تھی۔ جب وہ پاکستان آگیا تو بہتر جاب ملنے پر اچھا خاصا کمانے لگا اور اب وقت تھا اس کا اپنا گھر بس جانا چاہیے۔ اپنی نسل کو کھیلتے کودتے دیکھنا، عائشہ کی کوئی دنیا سے الگ خواہش نہیں تھی، مگر جندب اس موضوع کے چھڑتے ہی یکسر بات بدل دیتا تھا۔ ماہم نے اپنے جاننے والوں کے کئی بہترین رشتے بتائے تھے، لیکن انکار در انکار۔ ایک دن ماہم نے بہت رازدانہ انداز میں روائیبہ سے کہا تھا۔ ''اگر تم جندب سے کہو، تو وہ شادی کے لیے راضی ہوسکتا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں ماہم۔''

رابی نئی نئی اسکول جانے لگی تھی۔ روائیبہ کے آؤٹ لیٹ سے آتے ہی اپنے دن کے سارے قصے لے کر کالی پونیاں جھلاتی اسے سناتی رہتی۔ اس وقت بھی اس کی ٹھوڑی سے چہرہ پکڑ پکڑ کر اپنی جانب متوجہ کرنے میں ہلکان رابی کو اس نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھالیا۔ اس کی تمام تر توجہ ماہم کے جملے پر تھی، وہ حیرانی سے بات مکمل کررہی تھی۔ ''کیا مطلب، میں کیا کہوں۔''

''دیکھو روائیبہ تم اچھی طرح جانتی ہو، وہ شادی کیوں نہیں کررہا۔'' ماہم اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور بہت نرمی سے بولی تھی۔ ''تمہاری شادی کے خراب ہونے کا اسے بری طرح گلٹ ہے۔ وہ خود کو خواہ مخواہ میں مجرم سمجھ رہا ہے، اگر تم اسے یہ یقین دلا دو، تم اپنی زندگی میں مطمئن ہو، اپنی بیٹی کے لیے جینا چاہتی ہو، تو شاید اس کا گلٹ دور ہوجائے۔ میری نند کا بہت اچھا پرپوزل ہے اس کے لیے۔'' ماہم اپنی بات بہت نرم انداز میں مکمل کر کے چلی گئی تھی، مگر اتنے سالوں میں آج پہلی بار روائیبہ کو جندب پر پھر سے غصہ آیا تھا۔ دل پر جمی کھرچن کی کوئی لاگ ضرور تھی جو بری طرح سے سڑنے لگی۔

"جنبل اتنا بے مول کر گئے، تم مجھے، میں لوگوں کے راستوں کا پتھر بن گئی۔ تم نے زمین آسمان کے فاصلے کیسے سمیٹ لیے، ایک گرم دن کی پولنگ پر لے جانے سے کترا رہے تھے۔ مجھے دنیا کی دوزخ میں پھینک کر بھول گئے۔ کیسا غصہ ہے تمہارا، جو اترا ہی نہیں، تم نے تعلق جوڑتے وقت میری رائے جانچی تھی، تعلق توڑتے وقت میری رائے، میرا وجود کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا۔ بہت برے ہو تم جنبل، بہت برے۔ میں تم سے نفرت کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے جنبل ذکا۔ سن رہے ہو نہ تم۔"

تنہائی میں بیٹھ کر کتنے آنسو اس کی گود میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے۔ جتنے آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے، اس میں اتنی ہی مضبوطی پیدا ہو رہی تھی اور چند گھنٹوں میں وہ فیصلہ کر چکی تھی، اسے مزید جندب کے لیے رکاوٹ نہیں بننا۔ اسے اب مزید رضا حیات کے گھر نہیں رہنا۔ کھانے کی ٹیبل پر جب اس نے یہ دھماکا کیا سب ہونق زدہ ہو گئے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... کہاں جاؤ گی تم۔"

"انکل، اب میں اتنا کمانے لگی ہوں، ایک اپارٹمنٹ افورڈ کر سکتی ہوں۔ مجھے اب مزید یہاں نہیں رہنا۔"

"آخر کیوں...... یہاں کیا مسئلہ ہے تمہیں، یہ تمہارا بھی گھر ہے، میری بیٹی ہو تم۔" رضا حیات نے آدھا کھانا کھایا تھا، آدھا تو پلیٹ میں دھرا رہ گیا تھا۔ انہیں اس کی احمقانہ بات دنیا کی فضول ترین بات لگ رہی تھی۔ مگر وہ بضد تھی۔

"ماہم بھی تو آپ کی بیٹی ہے، وہ بھی تو اکیلی اپنے اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔"

"وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔" اب کے وہ ڈپٹ کر بولے تھے۔ مگر وہ کندھے اچکاتے مسکرائی تھی۔

"میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہ لوں گی۔"

جندب ترچھی آنکھیں کیے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عائشہ الگ متحیر تھیں۔ سب میں اگر کوئی مطمئن تھا تو صرف روائیہ تھی۔ گردن اکڑائے آرام سے کھانا کھاتی اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ "یہاں اب میں اریٹیٹ (پریشان) ہوتی ہوں، انسان کی پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور ویسے بھی رابی بڑی ہو رہی ہے، میں اسے اپنے طریقے سے گرواپ (بڑا) کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز...... میں نے ایک دو اپارٹمنٹ دیکھیں ہیں۔ آؤٹ لیٹ کے بالکل قریب ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"چپ کر کے کھانا کھاؤ تم۔" رضا حیات نے قطعیت سے کہا تھا۔ "بہت بڑا سمجھنے لگی ہو خود کو۔ رابی کو گرواپ کرو گی۔ وہ گر جاتی ہے، اٹھا تو سکتی نہیں تم۔ اپنی مرضی سے پالو گی۔" وہ ان ہی کے انداز میں بولتی کرسی دھکیل کر اٹھی تھی۔

"اٹھا سکتی ہوں اور اب اٹھا کر بھی دکھاؤں گی۔" وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی تھی۔ کئی دن خاموشی کی نظر ہو گئے۔ اس دن وہ کچن میں کچھ پکا رہی تھی جب جندب کرسی کھینچ کر کاؤنٹر کے پاس ہی آ بیٹھا۔ اسے معلوم تھا وہ پیچھے بیٹھا ہے۔ مگر وہ اگنور کرتی اپنے کام میں لگی رہی۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔" وہ بہت آہستگی سے پوچھ رہا تھا، وہ بنا گردن موڑے کہہ رہی تھی۔

"کیونکہ تم ایسا کرنے پر مجبور کر رہے ہو۔"

"کیا، کیا ہے میں نے؟"

"کر ہی تو نہیں رہے۔" چولہے کی آنچ ہلکی کر کے وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ "تم شادی کیوں نہیں کر رہے اس لیے، جو تم چاہتے تھے وہ نہیں ہو سکا۔ اب روگ پال لیا ہے، تاکہ میں سب کی نظروں میں اچھی طرح گر جاؤں، تمہاری خوشیوں کے راستے میں، میں پتھر کی طرح آ گری ہوں۔"

جندب نے خاموشی سے ایک گلاس میں پانی ڈالا اور گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا۔ خالی گلاس اس نے ٹیبل پر رکھ کر نرمی سے پوچھا تھا۔

"کیوں ایسا سوچتی ہو۔ میں کیوں ایسا سمجھوں گا۔"

''پھر کیا چاہتے ہو تم، آخر پتا تو چلے۔''

''میں تمہیں ادھورا چھوڑ کر، خود مکمل نہیں ہو سکتا۔ یقین کرو تم جیسے ہی اپنی زندگی میں مکمل ہو جاؤ گی، میں فوراً شادی کرلوں گا۔ بس میں تمہیں خوش اور پرسکون دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف اور صرف خوش۔''

''تو پھر سن لو، میں بہت خوش ہوں۔'' آنکھوں اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ کا تاثر بکھیرے وہ ٹھوس انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں اپنی بیٹی کے ساتھ بھرپور مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔''

''نہیں ہو تم مطمئن۔'' وہ جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہ تم اور نہ ہی وہ...... وہ کیا سمجھتا ہے سب سے چھپ کر دنیا میں روپوش ہو جانا اس کا اطمینان ظاہر کر رہا ہے، ہرگز نہیں۔ اگر اپنے کہے پر اسے یقین ہوتا تو تمہیں طلاق دے کر جاتا۔ بعد میں بھجوا دیتا۔ لیکن نہیں، اور تم جو نفرت کا اتنا راگ الاپتی ہو۔ تم بھی تو خلع لے سکتی تھیں کورٹ سے، لیکن تم نے تو نوٹس تک نہیں بھجوایا۔ کیوں تم دونوں کے نام اتنا ٹائم گزر جانے کے باوجود ساتھ جڑے ہیں۔ مان لو میری بات تم دونوں کے بیچ کچھ نہ کچھ ایسا ہے جو دنوں کو کھٹک رہا ہے۔ وہ گربے آنکھیں، سکیڑے غصے کے تاثر سے اسے دیکھتی رہی تھی، اس نے پل بھر کا توقف لیا، روائیہ نے پلکوں کی باڑ گراتے استہزائیہ گردن جھٹکی اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''میں جرمنی جانے کا سوچ رہا ہوں۔'' وہ پھر سے کہنے لگا۔ ''وہاں کسی شہر میں کہیں تو ہوگا...... کہیں نا کہیں اسے ڈھونڈ ہی لوں گا اور کہوں گا، اس معاملے کو کیوں لٹکا رکھا ہے، جو کچھ کرنا ہے کرے۔ زندگی تماشا تو نہیں ہوتی، جو بنا لیا ہے۔''

''تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے مجھے چڑ ہوتی ہے تم سے۔'' وہ زچ ہو گئی تھی۔ ''بجائے میرے کل پر فوکس کرنے کے اپنے آج کو دیکھو، تمہارے گھر والے کتنے بے بس ہیں تمہیں آباد دیکھنے کے لیے اور تم میری فکر میں لگے ہو، کیا رشتہ ہے میرا تمہارا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دوٹوک بولا۔

''وہی جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ احساسات کا۔''

''ہونہہ......'' روائیہ نے گردن جھٹکی۔ ''اسی لیے میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ مزید میں یہاں نہیں رہوں گی۔ عینی ویمن ہوسٹل میں رہتی ہے، اگر اپارٹمنٹ میں نہ جانے دیا تو میں ادھر چلی جاؤں گی۔ انڈر اسٹینڈ۔'' وہ پاؤں پٹخ کر باہر نکل گئی تھی۔

وہ اپنے فیصلے پر جوں کی توں جمی تھی۔ رضا حیات نے علیحدگی میں اس سے پوچھا تھا۔

''مسئلہ ہے کیا۔ عائشہ نے تو کچھ نہیں کہا تم سے۔''

''انکل مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔''

''پھر کیوں خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو۔ ازمیر تو نہیں ہوں میں، لیکن ازمیر کی طرح تمہیں چاہتا ہوں۔ کیوں چھپا رہی ہو مجھ سے۔'' ان کے ملتجی انداز پر وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔ گربے آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ آواز روندھی سی ہو گئی، اپنے ہاتھ ان کے بوڑھے ہاتھوں پر رکھ دیے۔

''اسی لیے تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں پہلے ہی بہت گر چکی ہوں انکل۔ پلیز مجھے مزید مت گرنے دیں۔'' رضا حیات کے کندھے پر سر ٹیکتے ہی آنکھیں خالی ہونے لگی تھیں۔ ''میں ویمن ہوسٹل میں شفٹ ہو جاتی ہوں۔'' رضا حیات نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا تھا۔

''ٹھیک ہے، مگر ویمنز ہوسٹل نہیں، جانے کس قسم کی خواتین ہوں وہاں، ماحول کیسا ہو، میں کچھ کرتا ہوں تمہارے لیے۔'' اس کی ضد کا یہ ہی حل نکالا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک گھر کا کچھ حصہ کرائے کے لیے خالی تھا۔ وہ کرائے پر لے لیا اور اپنے پرانے ملازم شیر گل اور اس کی بیوی کو کل وقت اس کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ دن میں کئی بار عائشہ اور رضا حیات چکر لگا لیتے تھے۔ صبح آدٹ لیٹ جاتے رابی کو اسکول ڈراپ کر دیتی، وہاں سے عائشہ اسے گھر لے آتیں اور شام کو روائیہ واپس گھر لے جاتی۔ زندگی اپنی

ایک روٹین پر چل نکلی۔ اس روٹین سے یہ فائدہ ہوا تھا روائیہ میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ اپنے موقف پر ڈٹنے کا حوصلہ اور خود اعتمادی بلا کی پیدا ہو گئی تھی۔ دیکھنے والے کہہ نہیں سکتے تھے یہ لڑکی کبھی کسی کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہو۔ اس اعتماد نے ہی اس کی شخصیت، چال ڈھال کو بہت وقار بخش دیا تھا۔

☆☆☆

ڈولتی ہوئی زندگی کچی پکی پگڈنڈیوں سے جہاں روائیہ کی مضبوط شاہراہ پر آ چکی تھی وہاں حنبل ذکا کی لڑکھڑاتی زندگی بھی ٹھہراؤ پر آ گئی۔ اس واقعے کے بعد وہ زیادہ دن پاکستان میں نہیں ٹھہرا، دو، چار دن میں ہی جرمنی کی سیٹ کنفرم کروائی اور کبھی نہ آنے کی ارادے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جرمنی جانے سے ایک دن پہلے کی بات ہے، آئمہ بیگم، اعشال اپنے کمروں میں تھیں۔ میر ذکا ڈیرے پر ازلان بھی اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ کچن میں کام کرتی زینب کے دل میں جانے کون کون سی سوچیں آ رہی تھیں۔ نکاح میں ابھی ایک ماہ تھا اور دماغ کسی اور سمت راستہ بنا رہا تھا۔

"بڑے لوگ کہتے ہیں انسان اپنی زندگی خود بناتا، بگاڑتا ہے، صحیح کہتے ہیں۔ روائیہ بی بی اپنی کیسی بنی بنائی زندگی لمحے میں خراب کر گئی۔ اتنے اچھے آدمی کے ہوتے دوسرے کا بچہ پیدا کر لیا۔ تھو ہے اس پر۔ ازلان صاحب نے اگر کچھ کر ہی دیا تھا، کسی کو بتاتی تو سہی، مگر نہ جی، وہ تو اسپتال والے ٹیسٹ نہ کرواتے، ساری زندگی بچی حنبل صاحب کے ساتھ جڑ گئی تھی اور پھر دیدہ دلیری دیکھو کیسے رعب سے گھر چھوڑ گئی، کیا پتا اس لڑکے کے ساتھ کیسے تعلقات تھے، آدھی رات کو اس کے کمرے سے نکلی تھی تحفے لے کر، توبہ، توبہ...... تب ہی تو ازلان صاحب برے نہیں لگے اسے۔ باہر والیاں تو کہتے ہیں ہوتی ایسی ہیں، آج اس کے ساتھ، کل اس کے ساتھ، یہاں سے نکل تو وہاں...... خود عیش کر رہی ہو گی اور غیرت مند حنبل صاحب کیسا روگ لگا کر گھر میں پڑے ہیں۔ مشکل وقت کا ساتھی کوئی نہیں بھولتا اور اس سے زیادہ مشکل کیا ہو گی، بیوی منہ پر کالک مل گئی اور میں کون سا بہتان لگاؤں گی، ایک کام غلط ہوا تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دوسرے کی بھی کچھ گواہی تو ہے میرے پاس...... انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے اور ابھی وقت ہے میرے پاس قسمت بنانے کا، حنبل صاحب کے دل میں جگہ بنانے کا۔"

اس نے سوچتے ہوئے حنبل کی من پسند چائے بنائی تھی اور حنبل کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ادھر نہیں تھا، اس کا مطلب ہے وہ اپنی اسٹڈی میں ہو گا۔ وہ فوراً اس جانب بڑھی۔ ازلان کا نام تو وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اسے آئمہ بیگم کا پتا تھا۔ زندہ ہی زمین میں گاڑھ دیں گی۔ بہت سے سچ میں معمولی سا جھوٹ ملا کر اگر اس کی جان رجی کے بیٹے سے بچ جائے تو کیا حرج ہے۔ اس نے دروازے کی ناب گھمائی اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں وہ ٹیبل پر سر گرائے خاموش بیٹھا تھا۔ زینب نے ایک بلب آن کر کے چائے میز پر رکھ دی۔ تب اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ چادر اچھی طرح لپیٹے سامنے زینب کھڑی تھی۔ حنبل کو زندگی میں پہلی بار اپنا آپ بے مول لگا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے ملازمین سے نگاہ ملانا اس کے لیے دشوار بھی ہو سکتا ہے۔ وہ منہ سے کچھ بھی نہیں بولا، صرف سوالیہ بھنوئیں اچکائیں۔ زینب لجا کر تھوک نگلتے بات کر رہی تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے صاحب جی۔" وہ اس کی بات سنتے ہوئے خاموش تھا۔ "ایک رات کی میں بھی گواہ ہوں۔ میں نے اس حویلی کا نمک کھایا ہے، جھوٹ تو نہیں بولوں گی آپ سے، میں نے خود اسے ان کے کمرے میں جاتے، نکلتے دیکھا تھا۔ اکیلی نوکرانی ذات "شور بھی نہیں ڈال سکتی تھی جی۔"

حنبل کی آنکھوں میں چبھتا ہوا تحیر سا تھا، بھنوؤں کے سرے آہستہ آہستہ مل گئے۔ اسے اپنے گالوں میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہونے لگی تھی

مگر وہ اپنی کیفیت پر بہت ہمت سے قابو پائے بیٹھا یہ تاثر دے رہا تھا جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا اور زینب تھوک نگل نگل کر یہاں تک تو سچ بتا چکی تھی۔ باقی بیچ میں اسے جملوں کے ہیر پھیر کی آمیزش کرنا تھی۔

''ماہم باجی کی شادی والے دن دونوں ایک دوسرے سے کترائے ہوئے تھے، پھر آدھی رات کو ہی روائیہ باجی نے واپسی کا شور ڈال دیا۔ حالانکہ بیگم صاحبہ انہیں کچھ سمجھاتے روک رہی تھیں، مگر وہ رکی نہیں، سارے رستے روتی آئیں۔'' حنبل کی نظریں میز کی سطح پر تھیں اور جبڑے بری طرح ایک دوسرے میں گڑے ہوئے تھے۔ کانوں کی لو سے پھسلتی سرخی پورے جبڑوں پر پھیل گئی۔

''جس رات وہ معافی مانگنے آیا، بہت سارے تحفے......''

''زینب بس......اب تم جاؤ۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر اسے روکتا خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مزید کچھ بھی سننے کی سکت ختم ہوتی جارہی تھی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا شادی پر اس کے ساتھ زینب ہی گئی تھی۔ اپنی بچی کھچی عزت کے پرخچے مزید اس سے کیا اڑواتا۔ لیکن وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ تب ہی ہونٹوں پر زبان پھیر کر دوبارہ سے شروع ہوئی۔

''صاحب جی میں تو آپ کی وفا......'' حنبل اب ذرا تختی سے بولا تھا۔

''ٹھیک ہے......بس اب جاؤ......کہا ہے نا۔''

زینب کا خیال تھا۔ وہ اس کے خاندان کے مردوں کی طرح اسے پاس بٹھا کر پوری تفصیل سنے گا اور اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد پا کر اس کے آگے اپنا دل ہلکا کرے گا۔ مگر ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔ وہ پاؤں مسلتی بددل ہو کر باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی حنبل ذکا کا سارا غصہ ٹیبل پر رکھے قیمتی اسٹڈی لیمپ کو زمین پہ پٹخ کر اترا تھا۔

''کاش روائیہ میں اپنی نفرت کا تم سے اظہار کر سکتا۔ اتنی ہمت ہوتی، تمہیں اور خود کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا۔ کچھ بھی نہ کر سکا میں......اتنا بے ہمت مرد، اتنا بے غیرت تو میں کبھی نہیں تھا۔'' زوردار مکا ٹیبل کی سطح پر بجا تھا۔

''اگر اس بدبخت جندب نے کچھ غلط کر ہی دیا تھا۔'' سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اک انتقام ابھر کر معدوم ہوا۔ ''تمہیں تو اس سے نفرت ہو جانی چاہیے تھی، نہ کہ اس کی معافی سننے تنہائی میں ملنے جاتیں۔'' اس کے دماغ کی رگیں سب ابھر آئیں تھیں۔ ٹیلی فونک گفتگو کان میں گونجنے لگی۔

''غیر کی شادی پر ایسے تصویریں نہیں بنواتے روائیہ۔''

''وہ غیر نہیں ہیں، اچھا۔''

جبر کا شکار لڑکی ایسے رائے نہیں رکھ سکتی۔ اسے پھر سے تاؤ آنے لگا۔ ''مجھے اعتماد میں لینے کے بجائے گناہ کو پالتی رہیں۔ اتنی جرات تمہاری، کاش چچا، چچی کے ساتھ تم بھی جہاز میں ہوتیں۔ تمہاری وجہ سے آج میرے ملازم، مجھے یہ بتانے آرہے ہیں، میری بیوی غلط تھی۔ حنبل ذکا کی بیوی جسے وہ معصوم سمجھتا رہا۔ حنبل ذکا دھوکا کھا گیا۔ ایک ایک کر کے کتنی چیز زمین پر گرتی جارہی تھیں۔

اسے جرمنی جاتے ہوئے حتی المقدور آئمہ اور میر ذکا نے روکا تھا۔ میر ذکا نے تو یہاں تک کہا تھا۔

''تو ایسے کیوں جارہا ہے، اس بدبخت کو لا کر تیرے قدموں میں پٹختا ہوں، اپنے ہاتھوں سے اسے دفنا کر جا۔'' وہ آنکھیں سختی سے بند کیے سب سنتا رہا صرف ایک جملہ بول کر اٹھ گیا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کے پیچھے خوار ہونے کی۔''

☆☆☆

حنبل کے جرمنی جانے کے بعد آئمہ کو خاصی حیرت تھی، سب کچھ اگر ایسے ہونا ہی تھا تو کوئی فائدہ تو ہوا ہوتا......کم از کم سلوئی کے نکاح کے لیے اتاولی نہ ہوئی ہوتیں، تو حنبل کو روکنے کا ایک اچھا بہانا تھا اور

اس سے اچھی بات ہو بھی کیا سکتی تھی۔ خیام ذکا الگ پریشان تھے۔ وقت گزرے جا رہا تھا اور وہ ایسے ہو گیا تھا، جیسے پیدا ہی صرف کاروباری کاموں کے لیے ہوا ہو۔ کئی بار اسے انتہائی غصے میں کہا تھا۔

''آخر کب تک تم یوں ہی زندگی گزارو گے۔ گناہ اس نے کیا، سزا اس کو دینے کے بجائے خود کو دے رہے ہو۔''

''میں کوئی سزا نہیں دے رہا خود کو...... ٹھیک ہوں میں۔''

''کیا ٹھیک ہو...... تنہا انسان کبھی ٹھیک ہوا ہے۔ خاندان برادری میں ایک سے ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ کہیں سے بھی اپنی زندگی شروع کر سکتے ہو، طلاق مارو اس کے منہ پر، وہ بھی گناہوں سے بچے......اور تم بھی اپنی زندگی آباد کرو۔''

''مجھے جتنا زندگی نے دینا تھا، دے دیا ہے اور پلیز اس ٹاپک کو بار بار مت چھیڑا کریں، تکلیف ہوتی ہے مجھے۔'' خیام ذکا تلخی سے بولے تھے۔

''اور جو ہمیں ہوتی ہے، تمہیں یوں دیکھ دیکھ کر...... اس کا احساس نہیں ہے۔ اب جب تم پاکستان جاؤ گے، اس معاملے کو نپٹانا ہے، ہر صورت، سمجھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

ہر بار کی طرح وہ ٹھیک ہے کہہ کر بات ہی ختم کر دیتا اسے بہت اچھی طرح پتا تھا، نا اس نے بھی پاکستان جانا ہے، نہ مزید آگے کچھ ہوگا۔ شروع شروع میں اس نے طلاق کے پیپرز تیار کروا لیے تھے۔ صرف اس کے اپنے دستخط ہونے رہتے تھے۔ کتنی بار ہمت مجتمع کر کے کاغذ پھیلا کر بیٹھتا گم صم سونی آنکھیں ان لفظوں پر گھومتی رہتیں۔ دل شدت سے چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا۔ کاغذ مروڑ تروڑ کر واپس دراز میں پھینک دیتا۔ اسی اذیت میں پانچ برس بیت گئے۔

☆☆☆

رقیہ کا بیٹا رو رو بے حال ہو رہا تھا اور زینب اپنے مخصوص انداز میں ہر چیز سے لاتعلق بنی کچے صحن میں جلدی جلدی جھاڑو لگا رہی تھی۔ رقیہ بڑبڑاتی کمرے سے نکلتی تیزی سے باہر آئی اور اونچا اونچا اسے ڈپٹتی اپنے بیٹے کو چارپائی پر بندھی کپڑے کی جھولنگی سے نکالنے لگی۔

''پتا نہیں تو کیسی ماسی ہے۔ اس کی، کب سے رو رہا ہے، جھولا نہیں ہلا سکتی تھی۔ ماسیاں تو ساری رات گودوں میں بھانجا، بھانجی کو کھلاتی پھرتی ہیں۔''

اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اس کی پشت کو گھورا اور اس نے صرف ایک بار گردن موڑ کر رقیہ کو دیکھا، پھر جھاڑو دیتی آگے بڑھنے لگی۔

''اماں دیکھ لے۔'' گلزاری کے چارپائی پر بیٹھتے ہی، وہ پھر سے شروع ہوئی۔ ''کبھی کبھار تو میں آتی ہوں۔ پھر بھی خیال نہیں کرتی بھانجے کا۔ ذرا جو رشتوں کی وفا ہو اس کے دل میں...... خود غرض۔'' وہ جھاڑو پٹخ کر پاس سے گزرتی آرام سے کہہ گئی۔

''میں نے رشتوں میں وفا دیکھی نہیں ہے۔''

خالہ گلزاری نے ''چھوڑ پرے کر۔'' کی طرح ہاتھ ہلاتے رقیہ کا شکوہ دور کرنا چاہا تھا۔ اسے ساتھ بٹھائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ باتیں گھوم پھیر کر حویلی والوں پر آ رکی تھیں۔

''آج کل حویلی میں بڑی صفائی ستھرائی ہو رہی ہے۔ اذلان میاں کی شادی ہے نا۔'' بچے کو اپنے ساتھ چمٹائے رقیہ پورے غور سے سن رہی تھی۔

''اتنا کام ہوتا ہے، قسم سے تھک جاتی ہوں۔ کتنا اسے کہہ لیا چل ساتھ، بی بی بھی بلا رہی ہیں، مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔''

''اس پاگل کا رونا نہ رویا کر...... اس کا تو دماغ خراب ہو گیا۔'' صحن میں چھوٹے موٹے کام کرتی زینب کو ایک بار پھر رقیہ نے غصیلی نگاہ سے دیکھا، مگر زینب سب سننے کے باوجود گونگی بنی تھی۔

''اور اس کا کیا بنا...... وہ جو ان کی بہو بھاگ گئی تھی۔''

''شش......'' گلزاری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ایسے چپ کروایا تھا، جیسے سانس بھی روک

لے۔ حویلی کی اندر کی باتیں یوں بیچ صحن وہ بھی اونچی آواز سے...... رقیہ کو تجسس ہوا آگے ہو کر اشارے سے پوچھا "کیا ہوا۔"

"ہونا کیا ہے۔" گلزاری آہستہ آہستہ بتانے لگی، جیسے دیوار پار تو حویلی کا کوئی بندہ ہی کھڑا ہے۔ جو سن لے گا۔

"بے چاری رل رہی ہو گی کہیں۔۔۔ ہمیں کیا لینا دینا۔ اگلوں کا معاملہ ہے، وہ تو کسی کو بھنک بھی نہیں لگنے دیتے۔ پوچھنے والوں کو یہی بتا رکھا ہے، حنبل صاحب کے ساتھ جرمنی میں ہے۔۔"

"اچھا۔۔!!"

رقیہ نے لمبا سا سر ہلایا۔

"وہ تو اب پتا چلے گا جب شادی پر حنبل صاحب اکیلے آئیں گے۔۔"

"تو حنبل چیمہ آرہے ہیں شادی پر۔"

رقیہ کی پاٹ دار آواز پر زینب کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ہاں۔۔ سنا تو ہے۔۔ دو چار دنوں میں آنے والے ہیں۔۔ میں نے تو ماں بیٹی کی باتیں سنی ہیں۔۔ ورنہ مجھے کون بتائے گا۔"

زینب کے دل میں کوئی چیز رگڑ کھانے لگی تھی۔ "اللہ کیسی بستی ہے تیری، کیسے کیسے مرد عورت بنائے تو نے، ایک جانب عورت ان کی عزت پیروں میں روند کر گھر چھوڑ کر چلی گئی تب بھی اپنے نام سے جدا نہیں کیا۔ اور دوسری طرف میں نے کیا کیا تھا، صرف قمر الدین کے رشتے کو انکار ہی کرتی رہی تھی، نکاح کے بعد تو قسمت سمجھ کر اسے قبول کر لیا تھا بنا کسی گناہ کے کیسے طلاق منہ پر مار گیا۔۔۔، امیر غریب کے معیار میں، سوچ کا بھی فرق رکھا تو نے۔۔۔"

وہ سوچوں میں الجھی تھی اور دل ایک بار پھر حنبل ذکا کو دیکھنے پر ہمکنے لگا۔ کہ اتنے برسوں میں اپنی نام نہاد محبت میں تنہا جینے والا شخص کیسا لگتا ہو گا۔۔ البتہ وہ پرانی دل میں چھپی محبت کی خواہش یا تو دم توڑ گئی تھی یا پھر شاید اب اسے خود بھی پتا نہیں تھا وہ کیا چاہتی ہے، کسے چاہتی ہے۔

بس اک بے سکونی ہے اندر۔۔ جو اندر سے اندر کو کاٹ رہی تھی۔۔

☆☆☆

آج صبح سے اس کے معمولات میں کچھ فرق سا تھا عرصے دراز بعد کاموں کا پھرتی سے نبٹا رہی تھی رقیہ اپنے گھر چلی گئی تھی اور گلزاری کی نگاہوں کا وہ مرکز بنی تھی اس نے پوچھا کچھ نہیں بس اس کی تیز چال بار بار چونکاتی پھر کپڑے اٹھا کر پانی کی بالٹی بھر غسل خانے میں رکھی نہا دھو کر صاف ستھری ہوئی غسل خانے سے نکل تب گلزاری نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے۔۔ تو گرمیوں میں روز نا نہائے، اب اتنی سخت سردی میں پرسوں بھی نہائی تھی آج پھر نہالی۔"

تولیے سے گیلے بال جھٹکتے لاپروائی سے بولی تھی۔

"خود ہی تو، تو کہہ رہی تھی حویلی والے بلا رہے ہیں، وہیں جانے لگی ہوں۔"

"آج سے تھوڑی بلا رہے ہیں وہ تو کب سے بلا رہے ہیں۔ آج کیا نیا ہو گیا۔"

"پتا نہیں۔" اس نے شان بے نیازی سے چادر لپیٹی اور حویلی کے رستے پر چل پڑی تھی۔ بالکل دن کے دن جانا اسے معیوب سا لگا تھا اور آئمہ بیگم سے کوئی بعید بھی نہیں تھا جس طرح وہ ان کے بلانے پر بھی نہیں گئی تھی سب مہمانوں کے بیچ بے عزتی کر دیتیں جب جانے پر دل آمادہ ہو ہی گیا تو بندہ دو چار روز پہلے چلا جائے۔ وہاں جا کر اپنے معمول کے کاموں میں ایسے لگ گئی تھی جیسے کبھی چھٹی ہی نا کی ہو۔۔ آئمہ اعشال نے بھی معمولی سی باز پرس کی تھی بات آئی گئی ہو گئی۔ کاموں میں لگ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا حنبل ذکا دو دن بعد آنے والا ہے۔ اور ان دو دنوں میں اس نے سارا گھر شیشے کی طرح چمکا دیا تھا۔ بالخصوص حنبل کا کمرہ اور اسٹڈی۔

☆☆☆

وہ قد آور دیکھنے میں آج بھی ویسا ہی تھا لمبا

چوڑا مضبوط جثے کا مالک، پرکشش نقوش بڑی آنکھوں والا، لیکن ان پانچ سالوں نے اس کی آنکھوں کی جوت بجھا سی دی تھی، گہرے براؤن حلقے اس کی صاف رنگت پر بہت نمایاں سے لگ رہے تھے، خاموش وہ پہلے بھی رہتا تھا مگر تب اس کی خاموشی بول بول کر اس کے وجود کا احساس دلاتی تھی آج کی خاموشی جیسے سب کو کھل سی گئی جس بات پر اونچا قہقہہ لگنا چاہیے تھا وہاں وہ مسکرا دیتا، اور مسکرانے والے جملے تو لگتا تھا جیسے اس کے کان تک میں نہیں پڑے۔
اس کے آنے پر سب جہاں پرجوش ملے تھے وہاں سب کے شکوے۔ شکایتوں کا جواب پھیکی مسکراہٹ سے دے دیا تھا۔

اترتی شام کا وقت تھا سورج کی موجودگی میں بھی خوب دھند تھی شام ڈھلتے ہی گہری رات کا گمان سا ہونے لگتا بند کمروں میں بھی ہر چیز منجمد ہونے کو تھی اعشال حنبل کے ساتھ جڑی جانے کو کون سے قصے چھیڑ رہی تھی آئمہ سامنے بیٹھی تھیں، حنبل ذکا کی بدلی صورت حال کو جس نے جیسے بھی محسوس کیا لیکن آئمہ کو حقیقتاً بہت زک پہنچی تھی جس کا وہ برملا اظہار کئی بار کر چکی تھیں۔

''یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''
''کیا ہوا۔۔ بالکل ٹھیک تو ہوں۔''

اس نے خوش گوار حیرانگی سے کہا تو آئمہ کی آنکھوں میں تاسف بھر گیا۔

''اندھی نہیں ہوں میں، اور نا ہی تجھے آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔۔ چھوٹے سے کو پالا ہے تجھے۔۔ ایسا تو تو کبھی بھی نہیں تھا، بے رونق۔۔۔ گم صم۔ رنگ دیکھا ہے، کس قدر زرد ہو گیا ہے''
''وہم ہے آپ کا بھر جائی۔۔''

وہ خوش گوار نظر آنے کی کوشش میں صوفے پر تھوڑا پھیل کر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو اب وہموں کے سہارے ہی جینا ہے ناں۔۔ خوش گمانیاں تک نکل گئیں زندگی سے۔۔۔''

حنبل نے عدم توجہ کے اظہار کرنے کے لیے ٹیبل سے میگزین اٹھا لیا اور صفحات پلٹنے لگا۔

''وہ اپنی مزے سے زندگی گزار رہی ہے، پلٹ کر یہ تک نہیں سوچا کم از کم آزاد تو ہو جائے۔۔ اور تو۔۔ تو نے خود کو روگ لگا رکھے ہیں۔۔ کس بات کی سزا دے رہا ہے خود کو۔۔''

حنبل کی آنکھیں لمحے کے لیے سختی سے بند ہو کر کھلی تھیں، کاغذ پر حروف بجھتے نظر آنے لگے۔ بوٹوں کے نکوے کارپٹ پر سختی سے جمتے جا رہے تھے۔

''میری بات سن حنبل۔۔ اب تو آ گیا ہے، اکیلے میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔۔ بہت ہو گیا۔۔''
''میں ان ہی سوالوں کی وجہ سے یہاں آنا نہیں چاہتا تھا''

حنبل نے لہجے کو بہت حد تک قابو رکھا ہوا تھا مگر پھر بھی بہت دیر سے چپ بیٹھے ازلان کو خاصا درد محسوس ہوا تھا۔ تب ہی وہ چبا کر آئمہ سے کہہ رہا تھا۔

''ابھی ضرور یہ باتیں کرنی ہیں۔۔''
''تم تو چپ ہی کرو۔۔''

آئمہ نے اسے ڈپٹ دیا ''میں نہیں کروں گی تو کیا قبروں سے بڑے آ کر فیصلہ کریں گے، بابا جان الگ اس کی وجہ سے پریشان ہیں، تمہارے بھائی کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اور تم سمجھتے ہی نہیں۔''

اسی وقت زینب نے ٹیبل پر لا کر سب کے لیے چائے رکھی تھی۔ حنبل اپنا کپ پکڑتے ہوئے اسی کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

''ہاں زینب کیسی ہو۔ ٹھیک ہو تم۔''

زینب تو سنتے ہی ایسے نہال ہو گئی جیسے وہ آیا ہی اس کا حال پوچھنے ہو، اس کا جی چاہے وہاں سامنے ہی پھسکڑا مار کر بیٹھ جائے اور پانچ سالوں کی ساری روداد سنانے کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والا وہ قصہ سنائے جو قمرالدین نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن آئمہ کی موجودگی اور جب وہ اسے کٹیلی نگاہ سے دیکھ رہی ہوں، وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''جی۔۔''
''اور وہ تمہاری شادی کا سلسلہ تھا۔ ہو گئی۔۔؟

حنبل کے استفساء پر زینب کے بجائے آئمہ نے جواب دیا۔

"ہاں۔۔طلاق بھی ہوگئی۔۔"

تحیر سے ہونٹوں تک جاتا کپ ٹھہر سا گیا تھا۔ اس نے چونک کر زینب کو دیکھا جو برتن رکھ کر جلد وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی، حنبل میں ہمت نہیں تھی اس سے "کیوں" پوچھے، ایسے کتنے کیوں اس کی اپنی ذات سے جڑے تھے، وہ اندر کی جانب سے ہونٹ کچلتا پلٹتی زینب کی پشت کو تاسف سے دیکھے گیا، آئمہ کو موضوع بلا وجہ بدل جانے پر کچھ کوفت ہوئی تھی، دوبارہ سے بات شروع کی۔

"حنبل میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔۔ناصر بھائی کے رشتہ داروں سے ہے بہت اچھی سلجھی بچی ہے۔"

حنبل نے ان کی بات کو ایسے بدلا جیسے سنا ہی نہ ہو۔۔

"میری ہونے والی بھو کی تصویر تک تو آپ نے دکھائی نہیں مجھے۔۔۔اس روز بھی آپ سے کہا تھا۔ اعشال بیٹا آپ کے پاس ہے۔۔"

اعشال سے بات کرتے ترچھی نگاہ سے ازلان کو دیکھا تھا خوش گوار سے رنگ تھے اس کے چہرے پر، اعشال اپنے موبائل میں البم کھول کر بیٹھ گئی۔

"بس بات بدلنے میں ہی تمہیں کمال آیا حنبل۔"

"یہ والی۔" اعشال نے اسکرین پر انگلی رکھتے موبائل بڑھایا تھا۔

اعشال سے موبائل پکڑتے آئمہ کے شکوے کو اس نے نہایت سرسری لیا تھا۔

"بے کار کی بحث کو بدل دینا چاہے بھرجائی۔ بہت پیاری ہے ماشاءاللہ۔۔"

حنبل ازلان کی منگیتر کی تعریف کر رہا تھا۔ اور آئمہ اپنی پسند پر فخر۔

شکل صورت تو چلو اللہ کی دین جیسی بھی ہے، حنبل ویسے بہت اچھی ہے یہ، پانچ وقت کی نمازی، شرم و حیا والی۔۔ سب سے بڑھ کر کردار کی بہت مضبوط ہے۔۔"

آخری جملہ ٹھاہ کر کے لگا تھا۔ پھیکے سے مسکراتے موبائل اعشال کو واپس تھما دیا۔ اور آرام کرنے کا کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

آرام، سکون، چین اس کی زندگی سے پانچ سال پہلے ایسے رخصت ہوا تھا جیسے مرنے کے بعد کسی کے پلٹ آنے کی امید نہ رہے بالکل ایسے ہی وہی کمرہ تھا، سامان کی وہی ترتیب تھی، بس استعمال کرنے والے کی اپنی ترتیب بدل گئی تھی، بیڈ کی صاف ستھری قیمتی چادر پر اسے کانچ کے ذرے بکھرے محسوس ہو رہے تھے، استعمال کی ایک ایک چیز سے نیزے نکلتے اسے اپنے بدن میں پیوست ہوتے دکھائی دینے لگے وہ اٹھ کر گلاس ونڈو کے آگے آ کھڑا ہوا، رات کی سیاہی میں ڈوبا سناٹا دھند میں لپٹ کر خاصی ہولنا کی مچا رہا تھا کوئی منظر واضح نہیں تھا لان میں لگے بلبوں کی روشنی بھی دھند سے مدھم پڑتی بکھر رہی تھی اسی بکھرے پھیلے اندھیرے میں اچانک سے وہ واضح دکھائی دینے لگی۔

بچی کو کندھے سے لگائے، بیگ کا اسٹرپ سنبھالتی آگے کو بڑھتی۔۔آئمہ اسے بار بار روک رہی تھیں۔ مگر وہ رکی نہیں، طوفان مچاتے کمرے کا منظر ابھرا وہ چیخ چلا رہا تھا وہ جرح کے لیے منمناتی پاس آ رہی تھی، "سوری۔۔" وہ معافی مانگ رہی تھی۔۔بے ساختہ ایک زخم رسیدہ سانس زور سے باہر آئی گلاس ونڈو کو بھاپ نے ڈھانپ دیا لاشعوری طور پر وہ اس بھاپ پر اپنی انگلی کی پوریں پھیرنے لگا لمحے بعد اس نے چونک کر دیکھا تھا۔

جبھی بھاپ پر اس کی پور سے لکھا "روائیہ" صاف جگمگا رہا تھا، سارے بدن میں برقی لہر سی دوڑی کسی ہذیانی کیفیت میں اس نے اپنی ہتھیلی بے دردی سے شیشے پر رگڑی تھی۔

کیوں کیا تم نے وہ سب۔؟
اس نے پوری قوت سے دیوار پر ٹھوکر ماری اور رخ بدل لیا۔ کانوں میں رضا حیات کی کال گونجنے لگی اور پھر ٹوٹتے موبائل کی کرچیاں سامنے ابھر آئیں ہر کرچی میں ایک منظر ابھر رہا تھا، سب سے پہلے ٹپ ٹپ برستی بوندوں کی آواز تھی اور اس میں بیٹھی اکتائی، بے زار روائیہ۔ وہ اسے پکار رہی تھی، حنبل کو یاد آنے لگا یہ شادی میں جانے سے پہلے کا قصہ تھا۔۔ پھر چند آوازیں اور ابھریں وہ سفر میں تھی اور بے زاریت سوا ہو چکی تھی، جیسے اسے فرار چاہیے ہو، کہیں چلی جانا چاہتی ہو، اور پھر تو جیسے ایک کے بعد ایک تخیل کہیں اسے شدت سے پکارنا، کہیں کچھ چھپانا، بات کرتے کرتے لہجے میں خوف زدگی، کچھ پر اسراریت، کچھ گھبراہٹ جانے کیا کیا تھا، نا چاہتے ہوئے بھی دماغ کا اتنا کچھ یک لخت سوچنا، حنبل کی رگیں پھٹنے کو ہو رہی تھیں اور ان رگوں میں تناؤ مزید جب بڑھا جب لیبز رپورٹس کے واضح نشان آنکھوں کے آگے رک گئے۔
''سر ان بچوں میں صرف ایک ہی بچی پری میچور ہے۔۔ وہ اپنے ٹائم سے ایک ماہ پہلے ہوئی ہے ۔۔''
اس جملے نے اسے چیر کر رکھ دیا۔۔ اس کے جرمنی جانے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد وہ شادی پر گئی تھی ۔ دماغ کی رگیں اب ٹیس کی صورت دکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے سامان کی جانب بڑھا اور بیگ کی زپ کھول کر اپنی میڈیسن کا پاؤچ باہر نکال لیا۔ جرمنی جانے پر اسے اینزائٹی (بے خوابی) کا مسئلہ ہو گیا تھا، اس نے نیند کی ادویات کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل ایک ٹیبلٹ اثر رکھا دیتی تھی۔ پھر یہ اس کی روٹین بن گئی جب کبھی روائیہ اس کے دماغ پر چڑھتی دوا اپنا اثر چھوڑ دیتی اس نے مقدار بڑھائی شروع کر دی۔ اب بھی اس نے زیادہ مقدار کی دوا نگلی اور بستر پر آ گرا تھا۔ کچھ دیر سر پٹخنے کے بعد نیند کی آغوش میں جا سویا۔

☆☆☆

صبح کا سورج کسی نامعلوم رستوں پر گامزن تھا۔ پورا ملک اس کی روشنی کو ترسا ہوا تھا۔ میڈیا ہی بتا رہا تھا اس سال ریکارڈ توڑ دھند پڑ رہی ہے۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں نکلتیں بھی تو اس وقت جب اس کے ڈھک جانے کا ٹائم سر پر ہوتا اس ٹھنڈی یخ سردی میں وہ بے ترتیب بستر پر پڑا سوتا رہا بدن کا کچھ حصہ کمبل سے ڈھکا تھا کچھ بنا کمبل کے، خاصا دن چڑھنے پر اذلان نے آ کر جب اسے بے دار کیا جسم میں بہت اکڑاؤ سا تھا۔
''ایسے ہی سو گئے تھے۔۔ جوتوں سمیت۔۔''
قنوطیت سے بیڈ پر بیٹھے حنبل کو دیکھ کر اذلان سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔
''ہاں یار۔۔ تھک گیا تھا، نیند بہت آ رہی تھی۔۔''
جمائی روکتے بیڈ سے اترتے حنبل کو دیکھنے کے بجائے اس کی نگاہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پھیلی تھی۔ میڈیسن پاؤچ سے باہر نیند کی دوا رکھی تھی۔ پانچ سالوں سے گھرے احساس جرم میں ایک بار پھر سے وہ گھر گیا۔
''چاچو کو نیند نہیں آتی، وہ دوا کھا کر سوتے ہیں۔۔''
واش روم کی جانب بڑھتے حنبل کو دیکھ کر اس نے متاسف ہنکارا بھرا۔ ''صرف ایک رات کی غلطی۔۔ جس کی پردہ پوشی کے لیے میں نے بار بار غلطی کی۔''

انسان اپنی غلطی یا خطا کو ماضی بننے نہیں دیتا اس کی پردہ پوشی میں رک کر، جھوٹ، دھمکی ڈراوٴ کی مہر ثبت کر کے مستقبل کے لیے گناہ تیار کر لیتا ہے۔ اذلان کو اپنے اسی تیار کیے گناہ پر پچھتاوا بھی تھا۔ یہ ٹھیک تھا اس کی نیت میں فتور تھا، ٹھکرائے جانے کی ٹیس فتور کو اکساتی رہی، لیکن ٹھنڈی تہماری نے دل کے فتور کو تقویت بخش دی تھی، اپنی غلطی کا بھرپور احساس ہونے کے باوجود اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا

تھا چاچو کا گھر کس وجہ سے ٹوٹا، جو گناہ سبب بنا تھا کم از کم اس میں اس کا ہاتھ نہیں تھا اور یہاں آ کر اس کے دماغ کی سوئی اٹک جاتی تھی۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ پوری جزئیات سے سوچتا کبھی خود سے گھن آتی، کبھی اپنا آپ بے گناہ لگتا۔ اپنے یہی تاثرات چھپانے کے چکر میں حنبل سے نگاہ چراجاتا تھا۔ کئی بار دل میں آیا حنبل کے سامنے اعتراف کرے اور روز کی اذیت سے جان چھڑالے، پھر یہی خوف روک دیتا ناکردہ گناہ کی کیا گواہی ہوگی۔۔ کون قصور وار ٹھہرے گا، کون بے قصور۔۔؟؟؟

تولیے سے بال رگڑتا حنبل واش روم سے نکل کر ڈریسنگ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ تولیہ بیڈ پر اچھالا، ہیر برش سے بال درست کرتے آئینے میں ازلان کو دیکھتے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا۔ کیا سوچ رہے ہو۔۔"

"ہوں۔۔ کچھ نہیں۔۔"

وہ پھیکا سا بولا تھا۔

"اپنی فیانسی سے ملے ہو۔؟

حنبل نے ہیر برش رکھ کر اسپرے چھڑکنا شروع کیا۔

"نہیں، ملا تو نہیں، کسی شادی پر دیکھا تھا ایک بار۔۔"

"ملنا ہے۔۔؟

حنبل نے خوش گوار انداز میں گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے آہستگی سے "نہیں" کہہ دیا۔۔ "امی، اعشال مل چکی ہیں۔ بہت ہے" کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"ہاں بولو۔۔"

حنبل نے اسپرے رکھ کر رسٹ واچ ڈریسنگ سے اٹھائی اور باندھتا ہوا اس کی جانب آیا۔ "وہ۔ وہ آپ مل آتے۔"

ازلان ہچکچا کر فوراً بات بدل گیا۔ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے حنبل کو بھی بہت حیرت ہوئی تھی۔

"یہی بات کہنی تھی۔؟؟ جرابیں پاؤں پر چڑھاتے ہوئے اس کے انداز میں حیرانگی در آئی تھی۔

"نہیں۔ یہ تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا۔۔"

ازلان نے فوراً سے سنبھل کر بات بنائی تھی" میں چاہ رہا تھا، آپ آج ڈیرے کا چکر لگا لیتے، ایکچوئلی۔۔ کچھ کھاتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آرہے آپ دیکھ لیتے۔۔ یہ کہنا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔۔ چائے پی کر چلتے ہیں۔"

حنبل کے ہاں بھرنے پر وہ فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ حنبل کتنی دیر اسے گہری نگاہ سے دیکھتے سوچتا رہا "یہ جو کہنا چاہتا تھا، کہا نہیں۔۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔۔"

☆☆☆

زندگی کے سود و زیاں پر غور کرتے کرتے وہ اس مقام پر آ گئی تھی صبح بیٹھتی اور شام تک اب تک کی بیتی زندگی کا ایک ایک لمحہ سوچتی تھی کڑوے بہتے سمندر میں زندہ لاش جیتی تیرتی زندگی کو بچانے کے لیے حتی المقدور ہاتھ پاؤں چلائے تھے جتنا اس کے بس میں تھا اتنا اس نے کیا، اس سے بڑھ کر کیا مگر حاصل وہی لا حاصل رہا، کتنا بھولا ہے انسان سب کچھ کب اس کے بس میں ہوا ہے، سوچو تو اس کی اپنی پلکوں کی جنبش پر خود اس کا اپنا اختیار نہیں اور ارادے دنیا اٹھا پٹخ کر دینے کے ہر دم لیے رکھتا ہے، وہ بھی کتنے ارادے کر چکی تھی، سب کچھ تو کر لیا تھا جس کے لیے کیا تھا بس وہ نہیں رہا تھا سوچتے ہوئے اس کی دماغ کی رگیں پھٹنے کے بجائے آنکھیں پھوٹ پڑی تھیں، اس کے ساتھ کیسی زندگی گزاری تھی، ذلت، رسوائی ہر وقت کم تری کے طعنے، سانسیں خون چوس لینے کی حد تک روکے رکھتا تھا اور اب جب نہیں رہا کیسی کسک دل میں اتار گیا ہے بھالے کی طرح دل میں پیوست نہ سونے دے، نہ جاگنے دے بس تکلیف در تکلیف روتے روتے بے اختیار سبرینہ نے شہروز کمال کی کچی قبر پر سر مارا تھا آنسو مٹی میں جذب

ہونے لگے۔
شہروز کی میت لے کر وہ تب ہی پاکستان آگئی تھی اور عدت یہاں آکر فیصل آباد میں پوری کی تھی۔
عدت پوری ہونے کے بعد وہ آج خاموشی سے قبرستان آگئی وہاں کا کھا جانے والا سناٹا درختوں سے ابھرتی سائیں سائیں میں کوے، چڑیوں کا شور وحشت سوا کر رہا تھا۔ اوپر سے شہروز کمال کے ساتھ گزرا ایک ایک پل یاد آنے لگا کچھ عرصہ پہلے تک وہ یہی سمجھتی رہی تھی شہروز کمال کے رویے نے اس کے دل اس کی محبت ختم کر کے نفرت بھر دی ہے، لیکن عدت کے دنوں میں اسے پتا چلا تھا عورت سب سے نفرت کر سکتی ہے لیکن اپنے شوہر۔۔ خواہ کیسا ہو ہزار چاہنے کے باوجود بھی بس اس سے نفرت نہیں کر سکتی، قسمت کو کوس سکتی ہے مگر اس کے ساتھ گزارے لمحوں کو نہیں۔ اب روتے ہوئے بھی صرف خود کو اپنی قسمت کو مسلسل کوس رہی تھی، تب حبہ نے اپنا نازک سا ہاتھ ماں کے کندھے پر رکھا۔
''مما پلیز ایسے مت روئیں۔۔ پاپا کو تکلیف ہوگی۔۔''
اس نے سر اٹھا کر حبہ کو دیکھا تھا اس کی معصوم سیاہ آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا مگر بہا نہیں تھا اس کے ساتھ ہی سوہا کھڑی تھی اور دائیں جانب دعا اور عشا ۔۔ عدن ان پانچوں سے ہٹ کر قبر کے پیچھے بیٹھا اپنی انگلی سے کچھ کرید رہا تھا، اس کے لیے یہ جگہ خاصی نئی اور مختلف تھی۔
یہ سب اداس اور رو رہی تھیں وہ البتہ اپنے کام میں مشغول رہا سبرینہ نے پانچوں بچوں کو باری باری دیکھا تھا پھر اپنے آنسو پونچھتی دعا کا ہاتھ پکڑ کر زمین سے اٹھی۔
''چلو گھر چلتے ہیں۔''
وہ ایک لائن میں راستہ بناتیں قبرستان سے باہر آگئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور نے غور کیا تھا۔ ان کے ساتھ عدن نہیں تھا۔
''عدن بابا کہاں ہیں باجی۔۔''
سبرینہ نے گردن گھما کر چاروں جانب دیکھا پھر واپسی کے لیے بھاگی تھیں۔ ڈرائیور ان کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔ قبرستان سارا خالی تھا۔ کہیں کہیں کسی قبر پر کوئی کھڑا فاتحہ پڑھتا دکھائی دیتا۔ کوئی پھول ڈال کر ہاتھ جھاڑتا پاس سے گزرا ان کی نگاہیں سب قبروں پر گھوم رہی تھیں عدن کہیں کھڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا، سبرینہ نے زور زور سے پکارا۔
''عدن۔۔ عدن۔۔''
اسے لگا اس کی آواز کی بازگشت اس کی منہ پر تھپیڑ مار رہی ہے۔ پانی کی بھری بالٹی اٹھائے گورکن نے انہیں پکارتے اچنبھے سے دیکھا تھا اور انہی کی جانب بڑھا۔ اسے دیکھ کر ڈرائیور خود تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔
''یہاں ایک بچہ تھا، جی۔۔ گورا چٹا۔۔ چھوٹا سا جی۔۔'' وہ ہاتھ سے اس کے قد جتنا اشارہ کر رہا تھا۔
گورکن کی نگاہیں بھی چاروں جانب گھوم گئیں جب باپ کی قبر کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھی، وہ بالکل قریب جا کر رکی، حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی عدن قبر کے ساتھ منہ جوڑے سیدھا سپاٹ لیٹا تھا، سبرینہ نے آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا اس کے کپڑے جھاڑتے ہوئے اچھا خاصا جھنجوڑ کر ڈپٹا تھا۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہاں کیوں لیٹ گئے ہماری جان نکال کر رکھ دی۔''
سبرینہ کو دیکھتے ہوئے عدن کی آنکھوں کی چمک کچھ بجھ سی گئی تھی، بالکل ویسے جیسے کچا چور اپنی پہلی چوری پر ہی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے، پھر ان خجل آنکھوں میں معصوم ناگواری اتری سبرینہ کا یوں اسے بڑھ کر اٹھا لینا اس وقت عدن کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کچھ دیر اور اپنے باپ کے پاس لیٹنا چاہتا تھا، ابھی اسے اپنے دل کی بہت سی باتیں ان سے کرنا تھیں۔
جب سبرینہ اور بچیاں شہروز کمال کی قبر پر رونے کے ساتھ فاتحہ پڑھ رہی تھیں اس وقت عدن اس کی قبر میں اپنی انگلی کے ناخن سے چھوٹا سا سوراخ

کرنے میں سرگرداں تھا اس کا دل تھا اس وقت انگلی ڈرل مشین کی راڈ بن جائے اور کم از کم اتنا سوراخ کردے کہ وہ دیکھ سکے اسے بے تحاشا چاہنے والا باپ جس کی صبح اسے دیکھ کر ہوئی تھی رات کو اپنے ساتھ لپٹا کر عدن کے سونے کے بعد سوتا تھا وہ اب تنہا کیسے سو رہا ہے، کہیں قبر میں جا کر کوئی اور بچہ تو نہیں مل گیا عدن سے زیادہ خوب صورت اس سے زیادہ پیارا، کیوں کہ عدن کو شہروز کمال کے پیار سے یہ اندازہ ہوا تھا اس کا باپ اسے اس کی خوب صورتی کی وجہ سے چاہتا ہے، کتنی بار تو سبرینہ کو جتاتے سنا تھا۔

''میں خوب صورتی پر مر مٹنے والا ہوں۔ اسی لیے اللہ نے مجھے حسین بیٹا دیا ہے۔''

''ہونہہ......''

اس کی ایسی باتوں پر سبرینہ کا لہجہ تلخ ہو جاتا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ جب سگی اولادوں میں تقابلی مظاہرے شروع ہوں تو ماں بھی تلخ ہو جایا کرتی ہے اور اگر مقابلہ بھی باپ کر رہا ہو۔ تو ماں تلخ تو کیا زہر باد بن جاتی ہے۔

اور شہروز کمال تو اٹھتے بیٹھتے تقابلی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ سبرینہ نے بھنوؤں سکیڑتے تضحیک آمیز انداز میں کہا تھا۔

''حالانکہ لوگ بیٹیوں کے خوب صورت ہونے کی دعا کرتے ہیں۔۔ خیر آپ کی کیا بات ہے۔۔ آپ نے تو اس کا نام بھی لڑکیوں والا رکھ دیا عدن...... کتنے لوگ تو مجھے یہی پوچھتے ہیں، چار کے بعد ہوا نام پھر بھی لڑکیوں والا ملا۔''

''تم اور اپنے جیسے فضول لوگوں کی سوچ کو تو رہنے ہی دو۔۔''

شہروز اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے استہزائیہ بولا تھا ''عدن کا مطلب پتا ہے، بہشت، جنت اور اس کے آجانے سے میرا گھر جنت بنا ہے، جنت کا سا سکون ملتا ہے مجھے۔۔''

تب عدن بمشکل چار سال کا تھا جب یہ سب شہروز کمال کے منہ سے سنا تھا اور صرف سنا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے پاس بیٹھے عدن کو پورے جوش کے ساتھ خود میں بھینچ لیا تھا، سر پر بوسے دیے تھے اور اب کئی مہینوں سے اس کے بغیر وہ ایسی جگہ لیٹا ہے ہر افسوس کرنے والا سبرینہ کو یہی کہتا

''اللہ اسے جنت نصیب کرے۔''

''جنت تو وہ تھا باپ کی پھر لوگ کس جنت کی دعا کر رہے ہیں یا پاپا کس جنت کی تلاش میں ادھر جا سوئے۔ بس اسی جنت کو دیکھنے اور کسی حد تک جیلسی محسوس کرتے اس سے خوب صورت کون سی جنت ہو گی وہ چپکے سے وہاں رک گیا تھا اتنی دیر میں اس نے آدھی انگلی جتنا سوراخ کر لیا تھا اندر سے جنت تو دکھائی نہ دی مٹی کی تہ در تہ نکل رہی تھی کہ سبرینہ نے چھاپا مار دیا اس کا دل ٹوٹ کے رہ گیا۔ معصوم سی آنکھیں شکوے سے بھر گئیں۔

''میں پاپا کو بتا رہا تھا، ان کے بعد آپ مجھ سے پیار نہیں کرتیں، کوئی پیار نہیں کرتا، مجھے اپنے پاپا کے پاس جانا ہے۔۔ انہوں نے وہاں کون سی جنت لے لی ہے۔۔ مجھے ان کے پاس جا کر دیکھنا ہے۔''

وہ اس کی گود میں اپنا جسم اکڑاتے ہوئے اترنے کی ضد کر رہا تھا۔

''عدن......''

سبرینہ کے دل پر مکا لگا تھا۔ اس نے اسے لپٹا کر سختی سے بھینچ لیا۔ ''ایسے کیوں کہہ رہے ہو''

''مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔۔ ناں۔۔ اپنے پاپا کے ساتھ رہنا ہے۔''

وہ اسے سنبھالتی واپسی کے لیے بڑھ رہی تھی ڈرائیور کی آنکھوں میں بھی پانی سا تیر گیا لیکن سبرینہ کو اپنی نگاہوں کا پانی کسی تیزاب کی طرح کاٹتا محسوس ہو رہا تھا، جیسے جیسے اس کے قدم قبرستان سے باہر نکل رہے تھے، عدن کی ضد عروج پکڑ رہی تھی اسے بمشکل قابو کیے وہ گاڑی میں بھی سمجھاتی رہی لیکن سسکیوں کے بیچ عدن کی ایک ہی فریاد۔

''اسے ماما کے ساتھ نہیں رہنا، پاپا کے ساتھ

رہنا ہے۔۔اپنے پاپا کے پاس رہنا ہے، گھر نہیں جانا ۔۔اس گھر میں نہیں جانا۔۔"
عدن کی سسکیاں ہتھوڑے کی طرح دل پر لگیں سبرینہ کی اپنی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔
اس نے ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کا کہا تھا۔ اب اسے اپنے گھر فیصل آباد نہیں جانا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں اپنے ننھیال چلی جائے، ان سب سے مل کر اس کا اپنا دل بھی بہل جائے گا۔ اور بچوں کے لیے بھی وہاں کا ماحول کچھ چینج ہوگا۔ عدن کو ہریالی بہت پسند ہے، وہاں کے کھیت کھلیان دیکھ کر بہل جائے گا۔ ان کی گاڑی فراٹے بھرتی گاؤں کی سڑک پر گامزن تھی۔

☆☆☆

وہ ڈیرے پر جانے کے ارادے سے باہر آیا تھا ۔اس کا خیال تھا ازلان باہر لاؤنج میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا، مگر وہ اسے ادھر نظر نہیں آیا، آئمہ اور اعشال صوفوں پر بیٹھیں شادی کے لیے کی جانے والیں چیزوں کی لسٹ چیک کر رہی تھیں، وہ قریب آکر سلام کرتے ہوئے ازلان کا استفسار کر رہا تھا۔
"وہ یہاں ہی ہوگا۔ تم کہاں اٹھتے ہی چل دیے؟"
"ڈیرے پر۔ کوئی کام تھا ادھر۔۔"
"ہاں تو چلے جانا، پہلے کچھ کھا پی تو لو۔۔ وہاں بڑا کوئی کک بیٹھا ہے جو ناشتے کروائے گا۔"
"فی الحال تو بھوک نہیں ہے۔۔ وہاں سے آکر کھالوں گا۔"
وہ متلاشی نگاہ سے ازلان کو دیکھ رہا تھا۔
"انسان بنو۔۔ اور بیٹھو ادھر ناشتا لگواتی ہوں۔"
آئمہ نے اسے ڈپٹا اور پھر زینب کو ناشتا لانے کے لیے آواز دی تھی۔
"نہیں نہیں۔ بھرجائی صرف چائے۔"
وہ کہہ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تھا، آئمہ متاسفانہ اسے دیکھتی رہیں۔ یک لخت ہی ان کا لہجہ ٹوٹ کر بکھرا۔
"تم ایسے تو نہیں تھے حنبل۔۔"
اس کی آنکھوں کے حلقے، چہرے کی زردی انہیں دکھ میں مبتلا کر رہی تھی۔ "کبھی آئینے میں رنگ روپ دیکھا ہے اپنا۔۔ میں دیکھ رہی ہوں تمہارے کھانے پینے، سونے جاگنے کی روٹین۔۔ کیوں اپنی جان پر ظلم کر رہے ہو"
آئمہ کا لہجہ اتنا متفکر سا تھا کسی بھی دیکھنے سننے والے کو حیران کر سکتا تھا۔ کوئی بھابھی اپنے دیور کے لیے اتنا غم بھی رکھ سکتی ہے، بالکل سگی ماں جیسا انداز اور وہ تو حنبل کے آتے ہی جیسے ٹھان کر بیٹھی تھیں۔ اسے شادی کے لیے قائل کرنے کے لیے اگر اپنے سر کی بھی قسم دینی پڑی تو ضرور دیں گی۔
"کیا ہوگیا آپ کو۔۔"
وہ پھیکا سا مسکرایا۔ اور آئمہ روہانسی انداز میں کہنے لگیں۔
"مجھے نہیں تمہیں ہوگیا ہے۔۔ اتنا زرد رنگ کبھی تھا تمہارا۔۔ اس کا صدمہ کھا رہے ہو، جو کبھی تمہاری بنی ہی نہیں ۔۔ جس کے نزدیک اپنی، تمہاری، خاندان کی کوئی عزت، کوئی وقار نہیں تھا۔۔ سب کچھ دوستی پر لٹا دیا۔۔ اتنے کمزور مرد تو تم کبھی نہیں تھے حنبل۔۔" یہ لفظ حنبل ذکا پر کسی گرم سیسے کی طرح گرے تھے، اگر اسے پتا ہوتا صبح کا آغاز اس طرح کی باتوں سے ہوگا وہ اٹھتے ہی مزید نیند کی دوا کھا لیتا۔۔ اسے ایسی صبح چاہیے ہی نہیں تھی جو بدنما، داغ دار آئینہ اس کے سامنے لا کھڑا کرے۔
"جس لڑکی کا میں کہہ رہی ہوں، وہ بہت اچھی ہے۔۔ ہیرا ہے حنبل ہیرا، تم ایک بار ان کی فیملی سے مل تو لو۔۔ اسے دیکھ تو لو۔۔ اگر پسند نہ آئی پھر بات کرنا۔۔ شادی پر ان کی فیملی کو میں نے خاص طور پر بلا رکھا ہے۔۔ بس تمہاری رضا چاہیے، میں تو شادی پر ہی اس کے ہاتھ میں انگوٹھی ڈال دوں گی۔۔"
زینب ٹیبل پر ناشتا لگا کر بلانے کے لیے آکر کھڑی ہی ہوئی تھی، حنبل فوراً سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئیں آپ بھی ناشتا کرتے ہیں۔۔ واقعی اس وقت بھوک محسوس ہورہی ہے۔''

آئمہ کے بند منہ میں اگلے دانت جمے تھے اور آنکھوں سے چنگاری زینب کے لیے نکلی تھی کیوں کہ اسی کی بے وقت حاضری حنبل کو بات بدلنے کا موقع دے گئی وہ چبا کر بولی تھیں۔

''میں صبح میں ناشتا کرتی ہوں۔۔ اور اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔۔''

''تھوڑا سا لے لیں۔ آؤ آپ آؤ اعشال بیٹا۔''

اعشال سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور روٹھے پن سے کہا تھا۔

''امی کوئی غلط بات تو نہیں کر رہی چاچو۔ وہ آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔۔''

''میری جان میں خوش ہوں۔۔ آپ سب کو بس وہم ہو گیا ہے۔''

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا صرف وقت گزاری کے لیے معمولی سا ناشتا کیا تھا اور اس معمولی سے وقت میں اعشال اسے یقین دلا چکی تھی۔

''اگر آپ شادی نہیں کریں گے تو یاد رکھنا، میں بھی نہیں کروں گی۔۔ مجھے بھی کوئی زبردستی راضی نہ کرے۔۔''

اس کی بچگانہ دھمکیاں حنبل کے چہرے پر مسکان کی طرح پھیلی تھیں۔

☆☆☆

آج ڈیرے کا ماحول معمول سے بہت ہٹ کر تھا، اس کے آجانے کی خوشی میں وہاں اچھی خاصی رونق لگ گئی تھی۔ حالانکہ آج دھند بھی پچھلے دنوں سے کچھ زیادہ ہی تھی جس کی وجہ سے فضا میں خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔ لیکن جیسے ہی حنبل ذکا کے ڈیرے پر آنے کا پتا چلا جان پہچان والے گرم شال لپیٹے اس سے ملنے آئے تھے۔ چائے، حقے کے دوران ان سب کی باتوں کا نچوڑ جرمنی، جرمنی کا ماحول کاروبار، معمولات کے ساتھ موسم ہی زیر بحث رہا، جس حقیقت سے وہ خوف زدہ تھا لوگ اسے ملتے ہی باز پرس شروع کر دیں گے، اور اس باز پرس سے کتراتے کتراتے پانچ سال بہت گئے۔ کسی ایک نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک جاننے والے نے جب یہ پوچھا۔

''اور بیوی بچے وغیرہ ٹھیک ہیں، سیٹ ہو گئے جرمنی میں۔''

تو اسے یقین آیا کسی کو کچھ بھی نہیں پتا، حویلی کے ملازم آج بھی وفادار ہیں، پانچ سال پہلے کے قصے کی باہر بھنک نہیں پڑنے دی، حنبل کے اندر کی توڑ پھوڑ نے اسے بہت تبدیل تو کر دیا مگر آج وہ اپنی شعوری کوشش سے اپنے پرانے انداز میں مضبوطی سے جما بیٹھا ساری باتوں میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ حنبل ذکا کے ڈیرے پر آنے کا فائدہ موچی نذیر نے اٹھایا تھا جب سب لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ قریب آبیٹھا اور اپنے بیٹے اصغر اور زینب کے رشتے کا قصہ لے بیٹھا۔

''میں نے تو جی بہت سمجھایا ہے، اسلم کو، مگر وہ جواب ہی نہیں دیتا، جیسا میرے بیٹے میں نقص ہے، ویسا اس کی بیٹی میں۔ دونوں ڈھانپ لیں گے ایک دوسرے کو۔''

''میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہ رہے ہو تم۔''

حنبل نے اخبار پھیلا کر سامنے ٹیبل پر پھیلا لیا۔

''بتایا تو ہے جی۔''

اس نے حقے میں زور سے غرق کر کے حقے کی نے چھوڑ دی۔ ''میرے اصغر کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر ہی اللہ کو پیاری ہو گئی، اب تین سال کا بچہ ہے میری بڈھی (بیوی) سے سنبھلتا ہی نہیں۔ اسی لیے چاہ رہے ہیں، دوسری ماں لے آئیں کچھ تو خدا خوفی کر کے خیال کرے گی جی۔ اور زینب بھلے اول رات کی بیاہی مگر ہے تو طلاقن ناں۔'' حنبل کے زردی میں گھلے رنگ پر یک لخت خون دوڑا تھا اس نے تند نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا لفظ ''طلاقن'' برداشت نہیں ہوا تھا

اس سے پھر نگاہ اخبار پر کرلی ماتھے پر ناگوار لکیر ابھی بھی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

"کچھ پتا ہے، کیا مسئلہ ہوا تھا زینب کے ساتھ"

"مجھے کیا سارے گاؤں کو پتا ہے۔۔ ماں باپ نے سارے گاؤں میں رو رو کر شور ڈالا تھا، قمرالدین کو ڈھونڈتے پھرے تھے، کمینہ بے غیرت ملا ہی نہیں، پتا نہیں کہاں چھپ گیا تھا"

نذیر کو طویل بیانی کی عادت تھی جس سے حنبل کو اکتاہٹ ہوئی وہ دوٹوک انداز میں بولا،

"مسئلہ کیا تھا۔۔"

"کیا ہونا ۔۔ وہی بندوں کی خرد ماگی (دماغی) پہلے بھی اسے برا بھلا کہہ کر، اس کے رشتے کو زینب نے انکار کیا تھا، وہ سمجھتا رہا کسی اور کو پسند کرتی ہوگی۔ بس جی موقع ملتے ہی بدلہ لے لیا۔۔ لعنت ہے ایسی مردانگی پر عورت کو صفائی کا بندہ موقع نہ دے۔۔ منٹوں میں پھارگ (فارغ) کر، فاصلہ سنا دیا"

اس کے آخری جملے حنبل کو انی کی طرح چبھتے محسوس ہوئے لمحے بھر کو اسے لگا وہ انتہائی پستیوں میں جا گرا ہے، بالکل ایسے جیسے اس کی مردانگی پر سنگ باری ہوئی ہو۔

"سوری۔"

وہ معافی مانگ رہی تھی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی تھیں، کوئی التجا تھی ان میں اس کے کانپتے ہاتھ میرے کندھے پر مدد کے لیے بڑھے تھے میں نے تمش میں جھٹک دیے صرف میں نے اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا، بنا موقع دیے فیصلہ سنایا تھا۔ کیا غصے اور جلد بازی میں، میں زیادتی کر گیا۔۔ اور وہ لیبز رپورٹس۔۔ وہ بچی کی پری میچورٹی۔۔ وہ سب کیا تھا، اس کا لفظ اعتراف سوری۔ میں کہاں جاؤں میرے اللہ، پانچ سال ہوگئے اس اذیت میں گھرے مجھے اس تکلیف سے نجات دے دے۔ جو کچھ بھی غلط یا صحیح ہے کم از کم مجھ پر آشکار تو کردے۔"

یک لخت اسے خود پر ترس آیا تھا اس نے اخبار لپیٹ کر ایک جانب رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا میں بات کروں گا اسلم سے۔"

اس نے فی الحال نذیر کو ٹالا تھا۔ اس کے دکھائے آئینے سے دل کی جو کیفیت تھی مزید وہاں بیٹھنا تکلیف دہ امر تھا۔ وہ فوراً باہر جانے کے لیے نکلا۔ سامنے سے اذلان کچھ کھاتوں کے رجسٹر لے کر آگیا۔

"یہ کہہ رہا تھا۔ ذرا آپ دیکھ لیتے کئی قرضے ہیں اس میں جو ابھی تک کسانوں نے نہیں دیے۔"

اس کے بائیں ہاتھ میں بمشکل تھاما بھاری رجسٹر دیکھ کر حنبل کے دل کو دھکا سا لگا تھا دو سال پہلے اذلان کے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تھا یقین نہیں آتا تھا ایسے کیسے ہوسکتا ہے، اور اب جب یہاں آکر اس کا ہاتھ دیکھا تو لفظ نہیں تھے اس دکھ کو بیان کرنے کے لیے اس کے بس میں ہوتا تو اپنی انگلیاں اتار کر اس کے ہاتھ پر لگا دیتا اس نے آگے بڑھ کر اس سے رجسٹر پکڑ لیا۔

"کیسے ہوگیا تھا یہ سب۔۔؟"

حنبل کی نگاہ اس کے بائیں ہاتھ کی کٹی انگلیوں پر تھی۔۔ اذلان کے رخسار پر پھیکی سے مسکان ابھر کر معدوم ہوئی۔

اپنے ہاتھ کو پھیلا کر دونوں جانب سے دیکھا پھر حنبل کی جانب نگاہ اٹھائی۔

"جب ہم اپنے مقام کو بھول جائیں، حادثات سزا کے طور پر ہوتے ہیں۔ بس سزا ہے یہ۔" الجھن سے حنبل کی بھنوئیں سکڑ گئی تھیں۔

"کیا مطلب ...... کیسی سزا؟

وہ گڑبڑا کر بات سنبھالنے لگا۔

"ظاہر ہے نوکروں کے کرنے کا کام میں کر رہا تھا، بیلٹ مجھے ملازم سے چیک کروانی چاہیے تھی۔ پھر بجلی کا بھی دھیان نہیں کیا۔ مل گئی سزا۔"

"بے وقوف۔ احمق۔"

اس کا جواب حنبل کو فضول لگا۔

''ابھی تو میں ہوں یہاں -- یہ پھر دیکھ لیں گے--''

اس نے رجسٹر ٹیبل پر رکھ دیا ''فی الحال گھر چلتے ہیں''

''گھر جا کر آپ نے اسٹڈی میں بند ہو جانا ہے--اب آئیں ہیں تو کھیتوں کا چکر لگاتے چلیں''

ازلان کہہ کر ڈیرے کے پچھلی جانب کے دروازے سے باہر کی جانب بڑھ رہا تھا حنبل اس کے ساتھ تھا اور اس کا ذہن ہر قدم پر برسوں پیچھے جا رہا تھا وہ ایسے ہی اس کے ساتھ کھیت دیکھنے نکلی تھی اسے حنبل کا ساتھ خوشی دینے لگا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہل کر بے تحاشا خوش ہونے والی، کبھی اس کی باتوں سے نہیں لگا تھا وہ اس ساتھ پر پچھتائی ہو، پھر ایسا کیا ہوا، اسے یہ ساتھ برا لگنے لگا، وہ اس شادی پر پچھتائی۔ وہ دونوں اب کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر تھے۔ دھند کے دھوئیں میں لپٹے سبز کھیت اور سہمے گیلے پروں والے کوے سب دبکے ہوئے لگ رہے تھے۔

وہ کئی برسوں بعد لوٹ کر ان جگہوں پر آیا تھا اتنے سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا کتنی تبدیلیاں خوش کن تھیں، مگر نہیں بدلا تھا تو وہ اس نے اندر کا سناٹا۔ گہرے حلقوں سے آباد سونی آنکھیں جو اس کے رتجگوں کی چغلیاں کھا رہی تھیں۔ ازلان برابر چلتا جانے کیا کیا باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ اپنے اندر کی شکست وریخت اس سے چھپانے کی کوشش میں مصنوعی طور پر مطمئن نظر آنے کی کامیاب کوشش میں تھا۔

وہ چلتے چلتے ٹیوب ویل کے قریب پہنچ گئے ٹیوب ویل سے گرتے پانی کا شور، چھینٹے، اور آواز کی کھنک، دماغ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ایک مزارع کی بیوی نے میاں سے کسی بات پر ہنستے ہوئے چلو بھر پانی میاں پر اچھالا وہ ٹھنڈ سے بدکا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ حنبل کے لیے بڑی تکلیف تھی اس منظر میں، وہ فوراً ازلان سے بولا تھا۔

''میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیے، دیر ہو رہی ہے'' ازلان نے تاسف بھری نگاہ سے اس سارے کو دیکھا کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے۔ پھر بند کر لیے چند قدم آگے بڑھا وہ تیز قدموں سے ساتھ آ رہا تھا۔ اس کے تیز قدموں نے ازلان کے خاموش کروائے لب، گاڑی میں بیٹھتے ہی کھلوا دیے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

''ایم سوری چاچو۔ ریئلی ایم ویری سوری۔''

''کیوں۔ کس بات کی سوری۔''

حنبل اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ گاڑی کو ریورس گیئر لگاتے ٹرن کرنے کے لیے پیچھے دیکھ رہا تھا کہ کچھ ہے تو نہیں اس دوران اس نے اعتراف کر لیا۔

''ہوتی ہیں کچھ غلطیاں۔ گناہ، خطائیں۔ ان کی معافی مانگ لینی چاہیے۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا-- بہت معذرت چاہتا ہوں۔ پلیز معاف کر دینا۔'' گاڑی مڑ کر اب گھر کی جانب تیزی سے بھاگنے لگی تھی اور حنبل اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

''میں ہرٹ نہیں ہوا-- بس ٹھنڈ زیادہ ہے۔ اس لیے گھر واپسی کا کہا ہے۔'' وہ پل بھر چپ رہا پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے آہستگی سے دہرایا تھا۔

''ہو سکتا ہے کبھی ماضی میں کرنے کی کوشش کی ہو، آپ نہ جانتے ہوں۔ معاف کر دینا۔''

حنبل آج بھی نہ سمجھ سکا مقابل کس بات کی معافی مانگ رہا ہے، بالکل اس دن کی طرح جب روائیہ معافی مانگتی رہی صرف اس خیال سے پریگننسی کا، بچے کی پیدائش کا اسے بتایا نہیں۔ تو خفا ہونا ہی تھا۔ وہ ہر سوری کو اپنی سوچ کے رنگ میں رنگتا رہا۔

ان کی جیپ گیٹ سے اندر داخل ہوئی ڈرائیور کے ساتھ ایک اور گاڑی کھڑی تھی، جس پر صرف حنبل کا دھیان گیا تھا وہ اس گھر کی نہیں تھی۔ اسی لیے ازلان سے پوچھا تھا۔

''یہ گاڑی کس کی ہے--''

''پتا نہیں آیا ہو گا کوئی---''

رکی گاڑی سے اتر کر ازلان اونچی کھڑی مغرور

عمارت کی جانب بڑھ گیا اور حنبل چند پل ڈرائیو وے پر کھڑا رہا پھر پرانے معمول کی طرح پرندوں کے پنجروں کی جانب چلنے لگا تھا۔ پنجروں کے پاس رکتے ہی اسے اندازہ ہوا پرندے بہت بدل گئے ہیں پرانے اب دکھائی نہیں دے رہے۔ حنبل کو دیکھ کر مالی تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور پرندوں کی تفصیل سنانے لگا تھا۔ حنبل کو اپنے سفید موروں کی جوڑی یاد آئی استفسار پر مالی نے بتایا تھا۔

''جی بڑے والا تاں پتا نہیں کیسے باہر نکل گیا، بہت تلاش کیا ملا ہی نہیں۔۔۔ اور دوسرا اس کی یاد میں چند دن ہی جیا تھا پھر ڈھیلا ہوتے ہوتے ایک دن پنجروں کے پاس مرا پڑا تھا''

''خیال کرنا تھا ناں۔۔اس کا۔''

حنبل کے لہجے میں درد سا اگ آیا تھا۔

''صاحب جی میں تو بہت خیال کرتا ہوں، موسم کا، ان کی خوراک آرام کا۔۔ ازلان صاحب بہت کرتے ہیں جی۔۔''

ازلان کے نام پر اس نے پیچھے مڑ کر اس دیکھا وہ برآمدہ پار کر کے عمارت میں داخل ہو چکا تھا حنبل پھر پرندوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کسی کسی کو نکال کر ہاتھ پر بٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

ازلان لاؤنج کو پار کرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا، لاؤنج کے ساتھ ملحقہ سیٹنگ روم کا محراب نما درمیانی دروازہ جو ہمہ وقت کھلا ہی رہتا تھا اس وقت بھی کھلا تھا وہاں سے کچھ آوازیں آرہی تھیں، شاید کوئی مہمان آیا ہوا تھا، ازلان کے قدم اسی جانب اٹھے، لاؤنج کی بناوٹ ترچھی ہونے کے سبب لاؤنج کے لوگ سٹنگ روم میں دکھائی نہیں دیتے تھے مگر سٹنگ روم کا منظر واضح ہو جاتا تھا باہر سے ہی وہ مزید دو قدم آگے بڑھا۔

آئمہ عجیب سے لہجے میں بات کر رہی تھیں،

''اب ان سب باتوں کا کیا مقصد ہے۔۔''

''میں ایک بار ملنا چاہتی ہوں۔ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میری بات سنو۔ حنبل بہت مشکل سے واپس آیا ہے، بہت منت ترلے کیے اس کے، کتنی مشکل سے تو اسے شادی کے لیے راضی کر رہی ہوں۔ اب تم یہ فضول بات کرنے آگئیں، تمہیں اس لیے تھوڑا بلایا ہے شادی پر، تم آکر سب تل پٹ کر دو۔۔ خدا کے واسطے۔۔ خدا کے واسطے۔۔''

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



بمنیٰ اختر

حصار ذات میں اُتر آؤ

سیاہ آسمان صاف ہو کے بھی محسوس نہیں ہوتا تھا تیز دھند چہار سو چھائی تھی.... ایسے میں اس خوب صورت رہائشی علاقے کی سڑک کے اعتراف میں لگے تمام پیڑوں کو برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا درخت کے ساتھ سڑک کے اعتراف میں برف پڑی تھی.... سڑک چکنی پھسلن معلوم ہو رہی تھی تیز ہوا میں پیڑوں کے پتوں کو ہلا رہی تھیں یہ ماحول نہایت سرد تھا .... اس سڑک پہ بنے تمام گھروں کے مرکزی دروازے پہ ٹائر فلورز لگے تھے جن پہ ''میری کرسمس'' لکھا تھا۔ تمام گھروں سے پیانوں کی دھنوں پہ جنگلو پڑھنے کی آواز دھیمی دھیمی آ رہی تھی۔ ایسے میں اس خوب صورت سے بنگلے کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو پارٹی اپنے عروج پہ تھی بزرگ مرد، عورتیں، لڑکے لڑکیاں سب موجود تھے۔ سامنے پیانو پہ بیٹھی سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی جس کی صندلی رنگت پر کشش نقوش تھے۔ وہ روز پنک کلر کی شیفون کی خوب صورت فراک جو کہ ٹخنوں سے ذرا اوپر تھی میں ملبوس تھی اُس کے ہاتھ میں خوب صورت سا ہیرے کا بریسلیٹ اور کان میں چھوٹے سے ہیرے کے ٹاپس پڑے تھے.... وہ معصوم سی لگتی کیرل (کیرل دعائیہ نغمات ہوتے ہیں جو کہ کرسمس کے موقعے پہ پڑھے جاتے ہیں) پڑھ رہی تھی سارے بچے جھوم جھوم کے اُس کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ تمام افراد سنجیدگی سے سن رہے تھے کچھ دھیمے دھیمے گنگنا بھی رہے تھے۔ اُس لڑکی کی آواز مدھر تھی..... سننے میں خوب صورت لگتی تھی۔

good tidings to you
and all of your kin
good tidings for
chirstmas
and a happy new year
we wish you a marry
chirstmas
we wish you a marry
chirstmas
we wish you a marry
chirstmas
and a happy new
''year .....

''ہیلو لیا (halleluiah/hallelujah، الحمدللہ)'' ..... سب نے کورس میں صدا بلند کی اور پیانو پہ بیٹھی لڑکی کی کیرل ختم ہوئی۔ ایزی چیئر پہ بیٹھے ایک ضعیف شخص جن کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی بیٹھی تھی گلاس ہوا میں بلند کر کے بولے۔

''آج ہم سب کرسمس کی برکت سے یہاں جمع ہوئے ہیں .... خداوند اس نوروز کو ہمارے لیے باعث رحمت بنائے ہمارے خاندان پہ اپنی برکت اور رحمت اُتارے اور ہمارے خاندان میں ایسے ہی محبت اتفاق اور خوشیاں قائم رکھے.... اور میرے بیٹے اور بہو کے کاروبار میں برکت دے جس کے لیے وہ سفر پہ گئے ہیں..... خاندان کے لیے'' .... کہہ کر اُنہوں نے ٹوز کیا .... سب نے کورس میں کہا ٹو دا فیملی'' (خاندان کے لیے) اور سب نے گلاس..

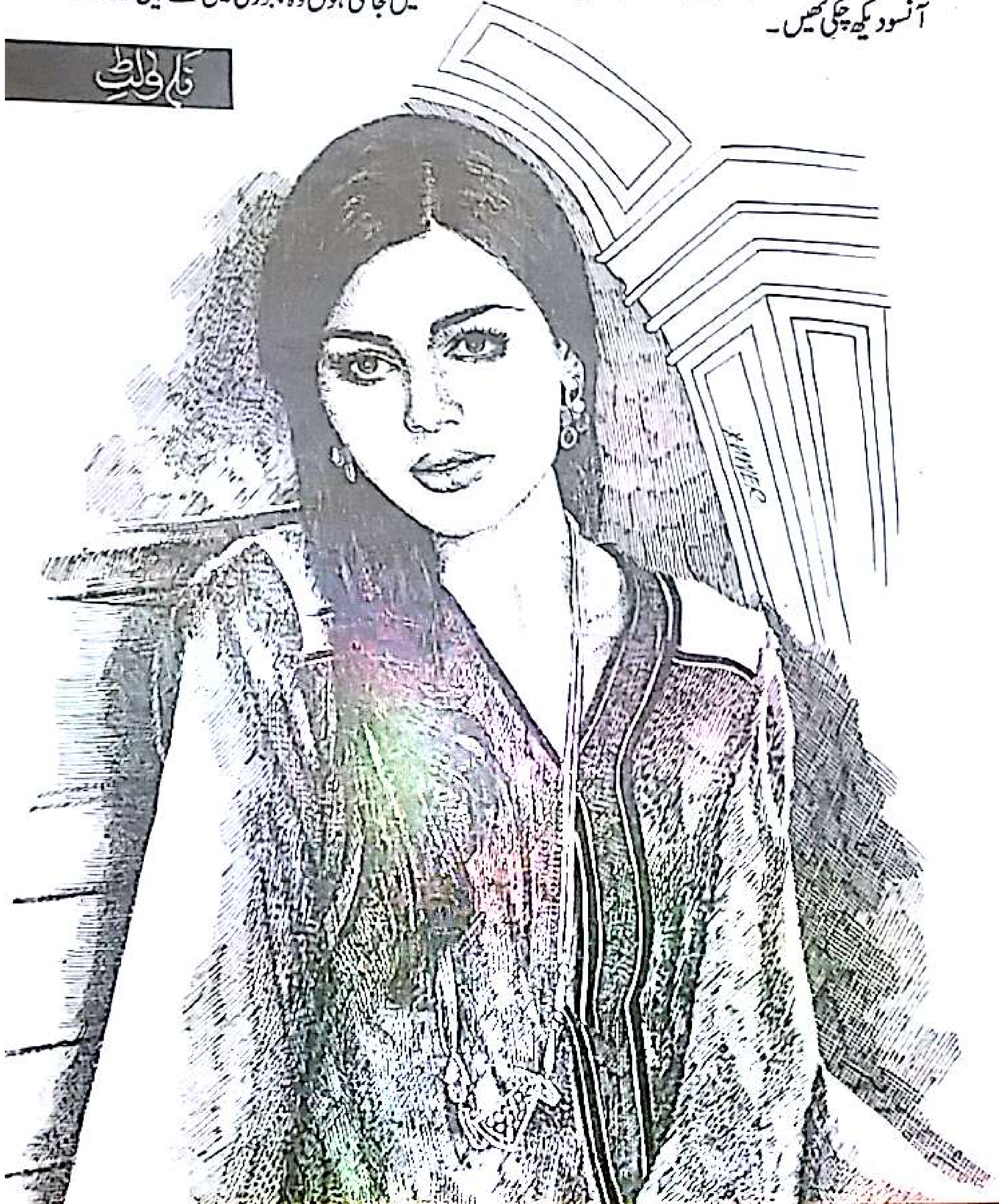
ہوامیں بلند کیا۔

''تم نے بہت خوب صورت کیرل پڑھی ویولا (viola)''......ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اُٹھ کر اُسے گلے سے لگایا تھا۔وہ بغل گیر ہوئی تو اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''تھینکس آنٹ نکول''..... وہ کہتے ہوئے الگ ہوئی۔آنٹ نکول اُس کی آنکھوں میں موجود آنسو دیکھ چکی تھیں۔

''آہ! کم آن' تم بہت بہادر ہو بیٹی.... کیا ہوا جو اس کرسمس وہ تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔تم جانتی ہو ناں اتنی ساری محنت تمہارے لیے ہی کرتے ہیں...اور وہ تمہیں اس طرح روتا دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوں گے''....آنٹ نکول کے کہنے پہ ویولا نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''میں جانتی ہوں وہ مجبوری میں گئے ہیں وہ اچھے



پیرنٹس ہیں"..... ویولا اُداسی سے مسکراتے ہوئے بولی۔
"آنٹ نکولا اب میں چلتی ہوں آج کرسمس کی وجہ سے میری کرفیو نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت رات ٹھیک نہیں ہے"..... ویولا نے کہا۔
"ویولا! میں اور تمہارے انکل دونوں چاہ رہے تھے کہ تم آج یہیں رک جاؤ ویسے بھی ایمیلی نے مجھے کہا تھا تمہیں اپنے پاس رکھ لوں جب تک وہ لوگ نہیں آتے"..... ان کے لہجے میں فکر تھی ویولا نے ایک نظر اُس ساری محفل پہ ڈالی..... یہ سارے اُس کے رشتے دار تھے ..... یہ اُس کے دادا کا گھر تھا..... یہاں اُس کے چچا پھوپھی اور اُن کے بچے موجود تھے..... سامنے کھڑی پیار نچھاور کرتی خاتون اُس کی چچی تھیں..... لیکن اِس لمحے اُسے شدت سے اپنے والدین کی کمی محسوس ہو رہی تھی..... سامنے بیٹھی اس کی ہم عمر کزن اپنے والد کے سینے سے لگی دادا سے کوئی بات کر رہی تھی..... وہ سارے اپنے تھے لیکن اس پل اُسے صرف سب کو دیکھ کر تکلیف ہو رہی تھی وہ دکھی تھی..... آج پھر وہ تنہا تھی ..... وہ جن کے ساتھ ہونا چاہتی تھی اُن کے ساتھ نہیں تھی۔
"میں جانتی ہوں آنٹ نکولا اور سچ پوچھیں تو یہاں رکنا مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے لیکن فی الحال میں جانا چاہتی ہوں ..... اور ویسے بھی میں اپنے کپڑے بھی نہیں لائی ہوں کل سارا سامان لے کر آجاؤں گی۔" ویولا نے سہولت سے کہا تو نکول اُداسی سے مسکرا دیں.....
"میں جانتی ہوں تم آج نہیں رکنا چاہتی ..... خیر تم جانا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے پر ہم تمہیں مس کریں گے"..... نکول نے کہا تو ویولا نے اُداسی سے اُنہیں دیکھا..... کاش وہ بھی مجھے آپ کی طرح سمجھ لیتے..... اُس نے سر جھکا..... پھر مسکرا دی۔ آنٹ نکول اب اپنے شوہر کی طرف بڑھی تھیں غالباً اُنہیں بتانے گئی تھیں۔ اور تب ہی تین اِس کی ہم عمر اِس سے کئی زیادہ خوب صورت لڑکیاں اس کی طرف آئی تھیں۔
"تم کیوں جا رہی ہو ہم سب کے ساتھ رکو پلیز! ہم بہنوں کو کبھی کبھی تو موقع ملتا ہے یوں ملنے کا ہم بہت ساری باتیں کریں گے انجوائے کریں گے اور مجھے جاننا بھی ہے تمہارے ہائی اسکول میں کتنے خوب صورت لڑکے ہیں اور اب تک تمہیں کوئی ملا یا نہیں"..... ایک نازک سی گوری چٹی لڑکی جس کی آنکھیں ہیزل گرین تھیں پر جوش انداز میں بولی۔
"ہاں نا ویو! ایماء ٹھیک کہہ رہی ہے ..... آج تو ہم نے لوراء سے پوچھنا بھی ہے کچھ۔ تمہیں پتا تو ہے نا اُس کا ایک بوائے فرینڈ ہے"..... دوسری لڑکی نے کہا تو درمیان میں کھڑی لڑکی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ (جیسا کہ قارئین جانتے ہیں کہ امریکا اور دیگر یورپی ممالک میں یہ رواج اب معاشرتی سائنسی اور صحت کے اعتبار سے قانون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ تمام بالغان لڑکے لڑکیاں لازمی بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز یعنی ہماری زبان میں "محبوب" رکھیں تو یہ جسمانی اور ذہنی صحت مندی کی علامت ہے اور یہ رواج ان کے معاشرے میں نہ صرف عام ہے بلکہ معیوب بھی نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی بالغ لڑکا یا لڑکی کسی کے ساتھ محبت کا رشتہ نہ بنائے تو والدین اُسے ماہر نفسیات کے پاس لے کر جاتے ہیں اُس پہ سختی کرتے ہیں اور معاشرہ بھی ایسے لوگوں کے حوالے سے مشکوک پایا جاتا ہے وہ ایسے شخص کو یا تو کرمنل مائنڈ یا نفسیاتی مریض سمجھتے ہیں ہاں انگلینڈ میں آج بھی بہت سے معزز خاندان اس رواج کو بے حیائی کہتے ہیں اور ارینج میرج پہ نا صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ عمل بھی کرتے ہیں لیکن یہ تعداد کم ہے۔ سو قارئین سے التماس ہے کہ مذکورہ کہانی اُسی معاشرے کہ پس منظر میں رکھ کے پڑھیے گا..... اس سے نہ ہمارے معاشرے پہ منفی اثر پڑ رہا ہے اور نہ کوئی اثر خود یہ لے رہا ہے کیونکہ ہر معاشرے کے اپنے اصول اپنے نظریات ہوتے ہیں اور ہمیں دنیا کے باسی کی حیثیت سے اُس کا احترام کرنا چاہیے)
"تم لوگ تو اس بات کو غلط سمجھ رہے ہو میں نے کہا ہے' میں نے کہا تھا وہ بہت ہینڈسم ہے اور میرا

اسائمنٹ پارٹنر ہے اور اُس نے بس مجھے اتنا کہا ہے کہ مجھے اپنے موٹاپے پہ دکھی نہیں ہونا چاہیے میں دنیا کی سب سے خوب صورت موٹی لڑکی ہوں''.....لوراء نے اپنے پھولے گالوں کو مزید پھلاتے ہوئے کہا۔ اور وہ سب ہنس دیں۔

''اوہ لورا اُس نے بالکل سچ کہا ہے''......ویولا مسکرا کر بولی۔

''لیکن میرا یقین کرو' میرا جانا ضروری ہے گیویلا لوراء اور ایناء میرا ابھی جانا ضروری ہے میں سامان نہیں لائی ہوں اور تم لوگ جانتے ہو میں بنا اپنی چیزوں کے میں کتنی ان کمفرٹ ہو جاؤں گی اور بس آج رات کی ہی بات ہے میں کل صبح ہی چیزیں لے کر آجاؤں گی ابھی تو ہمارے پاس پوری چھٹیاں پڑی ہیں''.....وہ بولی......لیکن دل نہ صرف دکھی اور بلکہ وہ شرمندہ بھی تھی۔ وہ تمام لڑکیاں سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگیں....تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص اس کی طرف آئے۔

''ویولا تم چاہو تو میں تمہیں چھوڑ دوں یا ڈریک کو کہہ دوں وہ تمہیں چھوڑ آئے گا''.....وہ شفقت آمیز انداز میں بولے تو ویولا مسکرا دی۔

''نہیں ڈیڈی انکل! نہ آپ ڈریک کو پریشان کریں اور نہ ہی خود زحمت کریں میں سب دے لے لوں گی''.....وہ سہولت سے بولی۔ تو انہوں نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ پھر ایزی چیئر پہ بیٹھے دادا نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ وہ جھری زدہ چہرے پہ روحانیت کا عنصر لیے بارعب صفت تھے۔ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہنے لگے۔

''تمہیں پتا ہے ویولا تم بالکل مجھ جیسی ہو اکثر تمہارے گریٹ گرینڈ دادا مجھے چھوڑ کے' وہ شپ پہ کام کرتے تھے ناں' چلے جاتے تھے اور اُس وقت سب مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن میں اکیلا رہتا تھا....اس لیے نہیں کہ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا بلکہ اس لیے کیونکہ میں مضبوط تھا اور تم بہت مضبوط ہو بالکل میری طرح....میری سب سے فیورٹ پوتی ہو....اسی لیے یہ میں تمہیں دے رہا ہوں''....اُنہوں نے اپنی جیب سے کچھ نکالا اور اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا....اُس نے دیکھا وہ سرخ رنگ کا یاقوت کا لاکٹ تھا یہ لاکٹ اُس کی مرحوم دادی کا تھا۔ وہ خوشی سے مسکرائی تو دادا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ویولا میرم پیرش سب سے بہادر ہے''....انہوں نے کہا تو وہ بچوں کی طرح مسکرا دی۔

''ویولا تم ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا تم بہت پیاری بچی ہو اور مجھے میری بیٹی گیولا سے سے زیادہ عزیز ہو....اور تمہارے لیے میرے دل میں ڈھیر سا پیار ہے کیونکہ ہم ایک دوسرے کے اپنے ہیں......ہے ناں''....ان کی بات پر اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں....وہ تیزی سے اُن کے گلے لگ گئی۔

''میں کل صبح جلدی آؤں گی آپ کے پاس ڈیڈی انکل''....اس کے لہجے میں نمی تھی....ہاں یہ سچ تھا وہ اُس کے اپنے تھے....سب سے اپنے۔

☆☆☆

ویولا لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموش سی سڑک پر ٹہلنے والے انداز میں چل رہی تھی یعنی واک کر رہی تھی اُس کے گلے میں دادا کا دیا لاکٹ پڑا تھا....اُس نے جان بوجھ کر سب وے نہیں لیا تھا....وہ پیدل چلنا چاہتی تھی......حقیقت یہ تھی وہ دنیا سے بھاگنا چاہتی تھی سب سے بھاگنا چاہتی تھی وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ تکلیف میں ہے دکھی ہے....بس تنہائی....وہ تنہائی سے باتیں کرنا چاہتی تھی بہت سی باتیں....جیسے وہ اکثر کیا کرتی تھی....اور اس سنسان رہائشی علاقے سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی تھی بھلا دنیا سے چھپنے کے لیے۔ اس جگہ اردگرد بنگلے ہی بنگلے بنے تھے سفید جیسے برف کا ڈھیر خوب صورت لگ رہے تھے۔ وہ اداس سی ان سب کو دیکھتی چل رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی اداسی تھی۔

''لگتا ہے راستہ بہت لمبا ہے''....اچانک سے ایک مردانہ آواز پہ ویولا چونکی۔ اُس نے پلٹ

کے دیکھا۔ پشت پہ سرخ لباس اور سفید داڑھی میں ملبوس سینٹا کلاس کھڑے تھے۔ اُن کا بڑا سا سرخ تھیلا ان کی پشت پہ تھا۔ ویولا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی تھیں۔

''سینٹا''.... ویولا حیرت سے بولی۔ سینٹا نے مسکرا کے سر ہلایا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے تم نے سینٹا نہیں بلکہ بھوت دیکھ لیا ہے''..... سینٹا نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی۔

''کیا آپ اصلی کے سینٹا ہیں''.... وہ بولی تو سینٹا نے آنکھیں پھیلا کے دیکھا۔

''کس بے وقوف نے کہا بھلا سینٹا بھی اصلی ہوتے ہیں! ارے یہ داڑھی بھی نقلی ہے اور مونچھیں اور بال بھی''..... سینٹا نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا کر رہ گئی۔ سینٹا اُس کے ساتھ چلنے لگے۔

''تم اس خوب صورت شام میں اُداس کیوں ہو''..... سینٹا نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ویولا کی مسکراہٹ سمٹی۔

''نہیں سینٹا میں اُداس نہیں ہوں''..... ویولا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا..... سینٹا اُسے دیکھ کے مسکرا دیے۔

''تو پھر کیا غصہ ہو؟'' سینٹا کے کہنے پہ اُس نے پھر زبردستی کی مسکراہٹ سے اُنہیں دیکھا۔

''نہیں سینٹا''.... وہ مختصراً بولی۔ سینٹا نے سر اثبات میں ہلایا۔

''تو پھر ناراض ہو؟'' جواباً سینٹا نے پوچھا تو اب کے اُس نے اُنہیں گڑبڑا کے دیکھا..... وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''نہیں سینٹا بالکل نہیں''.... وہ سنجیدگی سے بولی۔

''اچھا تو پھر کسی پہ غصہ ضرور ہے تمہیں''..... سینٹا کے سوال پر ویولا کے قدم تھمے... سینٹا نے اگلا قدم بڑھایا تھا کہ پلٹ کر اُسے دیکھنے لگے۔

''سینٹا آپ مجھے چڑانے آئے ہیں''.... ویولا غصہ ہوئی تو سینٹا گڑبڑائے۔

''ارے نہیں نہیں میں تو تمہارا ساتھ دینے آیا ہوں اتنا لمبا راستہ ہے اکیلے جاؤ گی کیا''...... سینٹا نے گھبرا کر کہا تو ویولا نے ایک نظر اُنہیں دیکھا اور پھر چلنے لگی لیکن اب چہرے پہ سنجیدگی تھی۔

''اچھا اب مسکراؤ خوب صورت لڑکی! تمہاری مسکراہٹ مجھے کسی کی یاد دلاتی ہے''..... سینٹا نے کہا تو ویولا نے لبوں پہ اُمڈتی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''کس کی یاد دلاتی ہے''.....

''ایمنڈا اسیفائرڈ کی''..... سینٹا نے آہ بھرنے والے انداز میں کہا تو ویولا کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔ وہ ہنستی چلی گئی۔

''آپ واقعی نقلی سینٹا ہیں''..... ویولا بمشکل ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

''مجھے بھی اب ایسا ہی لگ رہا ہے''.... سینٹا نے دھیرے سے کہا۔

''لیکن پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں کیا تم کچھ کہنا چاہو گی''..... سینٹا نے سر اُس کے کانوں میں جھکا کر کہا۔ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ویولا نے گہرا سانس بھرا۔

''ایک بات بتائیے سینٹا! ایسا کیوں ہوتا ہے جب بھی خوشیاں ملتی ہیں تو کہیں ناں کہیں کچھ نہ کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔ کبھی سب کچھ پورا کیوں نہیں ملتا۔ گاڈ کبھی سب کچھ پورا کیوں نہیں دے دیتا۔ ہمیشہ آدھی ادھوری خوشیاں یا کبھی خوشیوں کے ساتھ تھوڑا غم کیوں دے دیتا ہے حتیٰ کہ پیار بھی تھوڑا کبھی آدھا ادھورا اور کبھی کبھی پیار ہو تو وقت نہیں دیتا۔'' ویولا نے سامنے پیڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اب کے لہجے میں درد سا تھا۔ سینٹا مسکرائے۔

''انسانوں کی عادت کبھی نہیں جائے گی مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگوں کو جو ملتا ہے اُسی پہ خوش کیوں نہیں ہو جاتے۔ جو نہیں ہوتا ہے اُس کے لیے کیوں سوچ سوچ کے جو ملا ہے اُس کی بھی خوشی

اور مزا برباد کردیتے ہو بس ایک بار یہ کیوں نہیں سوچ لیتے کہ جو ملا ہے اگر یہ بھی نہ ملتا تو.... کیا کرسکتے تھے'' .....سینٹا کے کہنے پہ ویولا خاموش سی اُنہیں تکے گئی.... ہاں یہ تو سچ ہے اگر یہ بھی نہ ملے تو....

''پتا ہے کیا یہ سب گاڈ کی ٹرک ہوتی ہے تاکہ لوگ ہر موقعے پہ اُسے یاد کریں بھلے شکوہ ہی کر کے.... وہ اگر سب کچھ مکمل دے دے گا تو کیا تم اُس سے کچھ مانگو گی.... نہیں ناں.... اور مانگنا نہیں ہوگا تو تم اُسے یاد بھی نہیں کرو گی.... ہم زیادہ تر اُسے مطلب سے یاد کرتے ہیں ناں چاہے غم ملے یا خوشی۔'' سینٹا نے مسکراتے ہوئے کہا اور ویولا نے پھر شرمندہ سا ہو کر اُنہیں دیکھا۔ واقعی انسان مطلب پرست تو ہے وہ تو گاڈ سے بھی مطلب کا تعلق رکھتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ یہ سڑک بھی تو رہائشی علاقے کی ہی لیکن یہاں تھوڑی چہل پہل تھی۔

''پتا ہے انسانوں کی ایک بہت بڑی پرابلم ہے اگر وہ اپنے جذبات اپنے احساسات سب سے چھپائیں اور ساری دنیا کی سامنے بہت خود کو ایسے ظاہر کریں جیسے ہمیں ماحول اور حالات کا کوئی فرق نہیں پڑتا تو دنیا ہمیں بہت مضبوط سمجھ لیتی ہے اور دنیا میں یہ جو بہادر اور مضبوط ہوتا ہے دنیا واہ واہ بھی اُسی کی کرنا چاہتی ہے۔ لوگ بننا بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ کوئی بھی کمزور یا بزدل نہیں بننا چاہتا اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے لیکن ایک سچائی بتاؤں تمہیں..... ہم اکثر دنیا کہ سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنے میں اپنے آپ کو ہی کمزور کر ڈالتے ہیں۔ ہم اکثر خود سے بات نہیں کرتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس لمحے ہم کمزور ہیں لیکن صرف دنیا کی وجہ سے نہ صرف اُس بات کو نظرانداز کرتے ہیں بلکہ آہستہ آہستہ خود سے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں ہم اپنے آپ کی سننا چھوڑ دیتے ہیں اور وہ سچائی جو ہمارا آپ ہمیں بتا رہا ہوتا ہے' اُسے نہیں مانتے' نہیں سنتے.... پتا ہے اس دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں جو کمزور نہ ہو.... کبھی نہ کبھی سب ہی دکھی ہوتے ہیں غم ملتا ہے اور عقل مندی یہ ہے کہ اُسے کسی سے بانٹ لیں کیونکہ گاڈ نے ان چیزوں میں کوئی برکت نہیں رکھی ہے۔ یہ جتنا بانٹیں اُتنی جلدی کم ہوجاتی ہیں'' .....سینٹا کے کہنے پہ اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ پھر سینٹا رُکے۔

''ارے دیکھو اتنی دیر سے گھوم رہا ہوں کوئی ملتا ہی نہیں سارے گفٹ بھی میرے تھیلے میں پڑے ہیں اب تک تم نے بھی کچھ نہیں مانگا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولے۔ ویولا بے اختیار مسکرائی۔

''پتا ہے سینٹا میری ایک فرینڈ ہے لنڈا! وہ ہر سال یہ ہی دعا کرتی ہے کہ جب سینٹا آئیں گے تو میں اُن سے یہی کہوں گی کہ مجھے ایک بوائے فرینڈ دے دے۔'' ویولا نے ہنستے ہوئے کہا تو سینٹا نے آنکھیں پھیلا کر اُسے دیکھا۔

''کیا واقعی..!'' سینٹا نے حیرت سے پوچھا تو ویولا نے سر اثبات میں ہلایا۔

''یہ لڑکیاں بھی ناں..... ویسے تم بتاؤ کہیں تمہیں بھی تو بوائے فرینڈ نہیں چاہیے!'' سینٹا کے کہنے پہ ویولا کھل کے مسکرائی۔

''مجھے.....! مجھے وہ چاہیے جسے میں چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ بھی مجھے چاہے.... لیکن مجھے پتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا'' .....وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔ سینٹا نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''ایسا کیوں نہیں ہوگا ویولا! کیا پتا یہ آج ہی ابھی ہی ہوجائے؟'' سینٹا بولے تو وہ تلخ سا مسکرائی۔

''اُس کی میں پسند نہیں ہوسکتی اور جب میرے والدین کی زندگی میں میرے لیے وقت نہیں ہے تو اُس کے پاس کیا ہوگا۔ وقت ہو ہی نہیں سکتا'' ویولا دھیمے سے بولی۔ چہرے پہ دکھ سا تھا۔

''لیکن ایسا بھی تو ہوسکتا ہے ناں کہ کوئی دنیا میں ایسا ہو جسے تمہارا وقت چاہیے ہو.....'' سینٹا کے کہنے پہ وہ یک دم چونکی تھی۔

"مطلب"....وہ حیران ہوئی۔ تو سینٹا مسکرا دیے۔

"خوشیاں موجود ہیں ہمارے اردگرد کبھی کبھی مل جاتی ہیں' کبھی کبھی ڈھونڈنی پڑتی ہیں اور گاڈ نے ہمارے لیے ہر طرف خوشیاں رکھی ہیں بس ڈھونڈنا ہوتا ہے....اپنی ادھوری خوشیوں پہ مت دکھی ہو۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں کبھی خوشیاں نہیں ملیں' کبھی پیار نہیں ملا۔" سینٹا کہتے ہوئے مسکرائے۔ جبکہ ویولا ناسمجھی سے سینٹا کو دیکھ رہی تھی۔ سینٹا نے اپنے تھیلے سے ایک سرخ ریپنگ پیپر گفٹ باکس نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

"یہ دنیا کی سب سے خوبصورت کیرل پڑھنے والی لڑکی کے نام....میری کرسمس ویولا!" اُنھوں نے کہتے ہوئے گفٹ اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے باکس تھاما اُس کی نظریں باکس پہ جمی تھیں۔

"میری کرسمس۔" ویولا دھیمے سے بولی۔ وہ آگے پیچھے سے گفٹ باکس دیکھ رہی تھی اور اُسی پل چونکی۔ میں نے تو اپنا نام اُنہیں بتایا ہی نہیں تو بھلا اُنہیں کیسے پتا کہ میرا نام ویولا ہے۔ اُس نے سامنے دیکھا تو وہاں سینٹا کہیں نہیں تھے...اُس نے آگے پیچھے گھوم کر دیکھا وہ کہیں نہیں تھے۔ ویولا نے حیرت سے اُس گفٹ باکس کو دیکھا۔ ویولا کو اچانک سردی کی لہر جسم میں گھستی محسوس ہوئی اُس نے سامنے سڑک پہ نظریں ڈالیں یہ وہ کہاں آ گئی تھی....حیرت اُس کے چہرے پہ واضح تھی.....یہ اُس کی منزل نہیں تھی.....یہ تو.....سر اینڈ ریسن اینڈ سنز کافی ہاؤس سنس 1880ء تھا۔ یہ وہ آخری جگہ ہوسکتی تھی جہاں وہ آنا چاہتی ہو....وہ واپس پلٹنے لگی.....لیکن قدم تھمے.....یہاں تو وہ ہوگا....ہوسکتا ہے وہ آج ابھی ہی ہو جائے....چند لمحوں پہلے کہی سینٹا کی بات اُس کے کانوں میں گونجی تھی.....اُس نے نظریں اُوپر اُٹھائیں اُن آنکھوں میں چمک سی تھی۔ وہ واپس پلٹی..... پھر تھمی....لیکن کیا جانا صحیح ہوگا....اُسے ایک نظر دیکھ تو سکتی ہوں نا.....اور ویولا کہ گالوں پہ سرخی آئی تھی اور لبوں پہ شرگیں مسکراہٹ....اُس نے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

یہ قدیم انگریزی طرز کی لکڑیوں کا بنا کافی ہاؤس تھا۔ اِس کی ڈیکوریشن بھی کافی پرانی تھی۔ لکڑی کی کرسیاں اور ٹیبل اور پرانے زمانے کہ بنے آتش کدے کہ پاس دو آسمانی رنگ کے سنگل کوزی صوفے رکھے تھے اور درمیان میں ایک سینٹر ٹیبل تھی۔ یہ پورے کافی ہاؤس میں کافی کی مخصوص خوشبو پھیلی تھی۔ ہاں باہر کی نسبت یہاں سردی کا احساس تک نہیں تھا۔ ہاؤس زیادہ تر خالی اِکا دُکا ہی لوگ تھے وہ بھی تنہا ایک تیس بتیس سال کا شخص ایک کونے والی میز پہ اکیلے بیٹھا تھا سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کا کپ رکھا تھا۔ ایک بوڑھا شخص آتش کدے کے پاس والی کرسی پہ بیٹھا تھا اور کانپتے ہاتھوں سے کافی کے کپ کو لبوں سے لگا رہا تھا اور ایسے ہی دو چار اور افراد تھے جو پوری ٹیبل پہ اکیلے بیٹھے تھے۔ جبکہ سامنے کاؤنٹر پہ پرانے سے ماڈل کا سفید کمپیوٹر سسٹم رکھا تھا اور ایک بیس بائیس سال کا خوب صورت سا لڑکا سر جھکائے بیٹھا رجسٹر پہ کچھ لکھ رہا تھا اُس کے بال گولڈن براؤن تھے رنگت گلابی سی تھی' تیکھے کھڑے نقوش اور بڑی بڑی الیکٹرک بلیو آنکھیں جن کی پلکیں لمبی تھیں۔ وہ بلیک اور ریڈ چیک کی شرٹ میں ملبوس تھا سر پہ پیلا کیپ اور گلے میں پیلا ایپرن پہنے تھا جس پہ سرخ رنگ کے دھاگوں سے سر اینڈ ریسن اینڈ سنز کافی ہاؤس سنس 1880ء لکھا تھا.....وہ مصروف دکھائی دیتا تھا، سامنے بہت سی کتابیں اور نوٹس بکھرے تھے وہ لکھتے لکھتے ایک نظر وہاں بیٹھے افراد پہ بھی ڈال رہا تھا....شاید کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو ....اور پھر سر جھکا کے کام میں لگ جاتا تھا۔ کل ویسے بھی کرسمس تھی اس لیے آج کافی شاپ میں وہ معمول کا رش نہیں تھا۔ اُسی لمحے دروازے کے کھلنے

کی آواز آئی' اُس لڑکے نے گردن اُٹھا کے دیکھا۔ دروازہ کھول کے ویولا اندر داخل ہوئی اور سامنے بیٹھے لڑکے کی نظریں حیرت سے پھٹیں۔ یہ وہ آخری انسان بھی نہیں تھی جس کی یہاں اس وقت ہونے کی اُمید وہ کرسکتا تھا۔ ویولا نے ایک نظر اُس پہ ڈالی پورے آٹھ ماہ بعد اُسے دیکھا تھا۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی کاؤنٹر کے پاس آئی۔ ویولا نے گلا کھنکارا۔

''میری کرسمس ایلن۔'' وہ معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ تو اُس لڑکے نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

''میری کرسمس میڈم ویولا پیرش! کہیے کیا خدمت کرسکتا ہوں میں آپ کی؟'' اُس کی انگریزی برطانوی تھی.... ویولا نے پورے آٹھ ماہ بعد اس کی آواز سنی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اُس سے بات کرنا تھوڑا مشکل لگا۔

''تم مجھے صرف ویولا بلاسکتے ہو ایلن'' اُس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا تو لڑکے نے بھنویں اچکائیں۔

''کہیے آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں''.... وہ بولا تو ویولا مسکرائی.... اب تک اتنا ہی رُوکھا ہے۔

''مجھے ایک کیفا چینو چاہیے''.... وہ بولی تو ایلن نے سر کو اثبات میں خم دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پیچھے بنے اوپن کچن کی طرف بڑھ گیا۔ ویولا نے ایک نظر سامنے بکھری چیزوں پہ ڈالیں.... تو وہ آج کے دن بھی پڑھ رہا ہے.... ویولا نے ایک نظر کافی ہاؤس کے ماحول پہ ڈالی اور وہیں کاؤنٹر کے ساتھ رکھی بار اسٹولز پہ چڑھ کے بیٹھ گئی۔ باہر کے مقابلے یہاں خاصی گرمائش تھی اور اپنی موٹے لانگ کوٹ میں ویولا کو گرمی محسوس ہورہی تھی اُس نے کوٹ اُتار کے گود میں رکھ لیا۔

''لیجیے آپ کی....'' کہتے کہتے ایلن رکا تھا اُسے کاؤنٹر کے پاس بیٹھتا دیکھ کر اُس کی نظروں میں ناگواری اُبھری جسے ویولا بھانپ گئی تھی لیکن بے خبر بنی رہی۔ ''آپ کی کافی....'' ایلن نے کپ اُس کے سامنے رکھا۔ اس نے مسکرا کر تھینکس بولا۔ ایلن کی نظریں غصے سے سرخ تھیں لیکن شاید وہ کسٹمر ہونے کی وجہ سے اتنا لحاظ کررہا تھا۔

''آپ چاہیں تو آرام سے ٹیبل پہ بیٹھ سکتی ہیں''.... وہ نظریں رجسٹر پہ جماتے ہوئے بولا۔ ویولا نے جواب دیا۔

''نہیں شکریہ میں یہیں ٹھیک ہوں''.... اُس کے کہنے پہ ایلن کے جبڑے بھینچے تھے۔ وہ کافی کا کپ لبوں سے لگا چکی تھی۔ جبکہ وہ دوبارہ رجسٹر میں مصروف ہوا تھا۔ لیکن چاہ کر بھی مصروف ہو نہیں پارہا تھا۔ ویولا اُس کے جھکے سر کو دیکھ رہی تھی نظروں میں بے پناہ پیار تھا۔ دل میں بے حد خوشی۔ آج آخر اتنے دنوں بعد وہ اُس سے مل رہی تھی.... اور وہ اب تک ویسا ہی تھا۔ جبکہ ایلن کو یہ بہت مشکل لگ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اُسے ہی دیکھ رہی ہے اور وہ اُس کی نظروں سے ہی بچنا چاہتا تھا۔ چند لمحے خاموشی ان کے درمیان حائل رہی۔ پھر ویولا گلا کھنکار کر بولی۔

''ایلن تم اتنا فارمل کیوں ہورہے ہو؟ ہم اجنبی تو نہیں ہیں ناں، تم ہائی اسکول میں میرے سینئر تھے''.... ایلن کا چلتا ہوا قلم رکا تھا۔

''آپ میری کافی ہاؤس میں کافی پینے آئی ہیں اور میں اپنے کسٹمرز سے بہت اچھے سے پیش آتا ہوں اور مناسب بھی یہی ہے کہ میں فارمل رہوں ورنہ انفارملٹی میں کتنی بری طرح نبھا تا ہوں غالباً آپ بہتر جانتی ہیں۔'' ایلن کے انداز میں سنجیدگی تھی اور ویولا کو لگا اندر کہیں کچھ ٹوٹا ہے۔ وہ صرف اپنا سر ہلا کے رہ گئی۔ ہاں یہ تو وہ جانتی ہے۔ چند لمحے خاموشی یونہی چھائی رہی۔

''تو کافی ہاؤس کرسمس پہ بھی کھلا رہتا ہے بھلا آج کون آتا ہوگا کافی پینے'' ویولا نے سرسری انداز میں پوچھا۔ تو ایلن طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ اور ویولا نے پلکیں جھکائی تھیں، وہ جب بھی یوں لبوں کے خط ٹیڑھے کرکے مسکراتا تھا.... بہت پیارا لگتا تھا۔

''آ جاتے ہیں آج بھی آپ جیسے کچھ .....کافی پینے''....اس نے گہری سانس بھری۔انداز' مسکراہٹ' سب طنز سے بھرپور تھی لیکن ویولا کو برا نہیں لگا۔ہاں' سچ تو تھا وہ بھی تو آئی تھی اُس نے ایک سرسری نظر اردگرد کے ماحول پہ ڈالی....وہاں موجود وہ اکا دکا لوگ بھی اسے اس جیسے ہی لگے۔

''ہاں آ جاتے ہیں مجھ جیسے۔'' سرگوشیانہ انداز میں ویولا نے اس کی بات کو دہرایا۔لیکن ایلین کے کانوں میں سرگوشی پڑ چکی تھی۔ وہ جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔

''تو تم ہوٹل مینجمنٹ پڑھ رہے ہو!'' ویولا دھیرے سے بولی۔تو اُس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''کیا اِس کافی ہاؤس کو ہوٹل میں چینج کرنے کا ارادہ ہے!'' ویولا نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں یہ میرا سو سال پرانا خاندانی کافی ہاؤس ہے اور یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔سامنے کھڑکی کے پاس بیٹھے اُس ادھیڑ عمر شخص نے اُسے آواز دی تو وہ اُٹھا۔ویولا خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔وہ شخص بل ادا کر کے چلا گیا۔ایلین نے اب آگے بڑھ کر دوسرے کسٹمرز سے بھی بہت فارمل انداز میں پوچھا شاید ایک نے مزید کافی مانگی تھی۔وہ تیزی میں کچن کی طرف بڑھا اور چند لمحوں بعد ٹرے میں سجی وائٹ کپ پرچ اُس شخص کے آگے رکھ رہا تھا۔وہ واپس اپنی جگہ پہ آ بیٹھا۔اور دوبارہ کام میں لگ گیا۔ویولا نے محسوس کیا کہ وہ سچ مچ محنت کرتا ہے ....لیکن کیوں....کس لیے.....کیا اپنی فیملی کے لیے.....یا اپنے سروائیول کے لیے۔

''جب تم ہائی اسکول میں تھے تو سب تمہارے بارے میں یہی سوچتے تھے کہ یہ جاب کرتا ہے اپنے کافی ہاؤس کو سنبھالتا ہے اور پھر بھی اس کے گریڈز اتنے اچھے آتے ہیں۔حتیٰ کہ ٹیچرز بھی تمہاری تعریف کرتے تھے کہ تم قابل اسٹوڈنٹ ہو....اور....''

''اور سب کو یہی شک تھا کہ میں پیپرز چرا لیتا ہوں یا ٹیچرز کو ہراس کرتا ہوں یا ٹیچرز مجھ سے ڈرتے ہیں یا میں بہت اسمارٹ چیٹر ہوں یا پھر اگر مجھے اچھے گریڈز نہ ملے تو میں خودکشی کرلوں گا ......ہے ناں' یہی خیالات تھے ناں سب کے میرے بارے میں۔'' ایلین' ویولا کی بات درمیان میں کاٹ کر بولا۔اور ویولا کا چہرہ بجھا تھا۔جبکہ درد بھرا ایک طنز ایلین کے چہرے پہ موجود تھا۔ویولا نے تھوک نگلا۔

''میں نے ایسا کبھی نہیں کہا....ہم جانتے تھے تم ذہین ہو محنتی ہو۔'' ویولا نے تردید کی تو وہ تلخی سے مسکرایا۔

''سب جانتے تھے مگر مانتا کون تھا۔سب کو تو یہی لگتا تھا ناں کہ میں پاگل ہوں کیونکہ میرا کوئی دوست نہیں ہے میری کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی میں کوئی گیم نہیں کھیلتا تھا کبھی کسی ایکٹیویٹی میں شامل نہیں ہوتا تھا میں تو نفسیاتی مریض تھا ناں جس سے دور رہنے کے لیے تم سب کے پیرنٹس تمہیں کہتے تھے جسے تمہارے جیسے اُمیر بچوں کے پیرنٹس نے پری اِسکول سے نکلوا دیا تھا کیونکہ وہ بچہ ان کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا بنا یہ سوچے کہ اس کے بعد وہ بچہ پاگل خانے جا سکتا ہے'اگر فادر کرسٹوفر نے اُسے بچایا نہ ہوتا تو.....'' اس نے سرد تاثرات کے ساتھ دل کا غبار باہر نکالا۔ویولا کا دل بہت زور سے دکھا تھا۔

''ایسا نہیں ہے ایلین میں جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو۔'' ویولا نے صفائی دی تو ایلین نے گہرا سانس بھرا۔

''مجھے اِس بارے میں کوئی ڈسکشن نہیں کرنی پلیز'' ایلین کے حتمی انداز میں ویولا خاموشی سے سر ہلا کے رہ گئی۔چند لمحے یونہی خاموش سرکے۔ویولا کی کافی ختم ہوگئی تھی۔اُس نے خالی کپ کو دیکھا پھر ایلین کو وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔وہ سر جھٹکتا اُٹھا

چند لمحوں بعد وہ دو کافی کے کپ لے کر آیا ایک ویولا کے سامنے رکھا ایک اپنے پاس۔

"ویسے یہ کافی ہاؤس کب تک کھلا رہے گا میرا مطلب ہے تم گھر نہیں جاؤ گے!" ویولا نے اب کے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

"جب تک کسٹمرز چلے نہیں جاتے تب تک کھلا رہے گا۔" ایلن نے مختصر جواب دیا۔

"ویسے تمہاری فیملی کہاں ہے' آئی مین تمہاری مم اور بہن... میں نے سنا ہے انگلش فیملیز بہت اہتمام سے کرسمس مناتی ہیں۔" ویولا نے کافی کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اتنے ہی اہتمام سے جتنا کہ اٹالین فیملیز مناتی ہیں۔" اس کی بات پہ ویولا نے پلکیں دھیرے سے جھکائی تھیں... وہ جانتا تھا اُس کے پیرنٹس کی بزی لائف کے بارے میں۔

"میں اپنے دادا کے گھر انوائٹڈ تھی... وہیں سے آرہی ہوں۔" ویولا نے جلدی سے وضاحت کی ہاں یہ سچ ہے وہ دکھی تھی اپنے پیرنٹس کے اُس کے ساتھ نہ ہونے پہ لیکن وہ سب کو یہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

"بالکل ایسا ہی ہوگا تم بہت لکی ہو تمہارے پاس ایک بڑا خاندان ہے۔ ویسے اچھا یہ ہوتا کہ تم بھی اپنے پیرنٹس کے ساتھ انقرہ چلی جاتی وہاں کی کرسمس دیکھنے کا موقع مل جاتا۔" اس نے مشورہ دیا تو ویولا کے گلے میں جاتا گھونٹ پھنسا تھا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ انقرہ گئے ہیں۔" اُس کی آواز میں حیرانی سی تھی۔ ایلن نے کندھے اچکائے۔

"نیویارک کی چند بااثر اٹالین فیملی میں سے ایک ہے تمہارا خاندان اور پھر تمہارے والد شہر کے سب سے مہنگے وکیل... تمہاری مما شہر کی سب سے مشہور فیشن ڈیزائنر تمہیں نہیں پتا کیا۔ کہ تمہارے خاندانی سرگرمیوں کو نیویارک گزٹ فالو نہیں کرتا ہوگا تم سلیبریٹیز کی بیٹی ہو۔" ایلن کی وضاحت سے تو ویولا نے سانس بھرا۔ اوہ ہاں... وہ تو مشہور نہایت امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی یہ کیسے ممکن ہے کہ مقامی اخبار ایسے لوگوں کی خبریں نہ چھاپیں... ویولا سوچتے ہوئے یکدم مسکرائی... تو مسٹر اسٹیلیو ڈا اخبار بھی پڑھتے ہیں... خیر یہ تو سچ ہے کہ وہ ہمیشہ سے جینئس تھا۔ اور وہ سب بھی سچ تھا جو اُس نے کہا تھا... ہاں پری اسکول میں بھی تو وہ اُن کے ساتھ تھا اور اُس جیسے ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والے چند اور بچوں کے پیرنٹس نے اُسے نفسیاتی مریض کہہ کر اسکول سے ڈراپ کروادیا تھا... پھر سنا تھا وہ کونوینٹ چلا گیا تھا۔

"ویسے اتنی سی بات کے لیے تمہیں اپنے پیرنٹس سے خفا نہیں ہونا چاہیے' آخر کو وہ اتنی محنت تمہارے لیے ہی کرتے ہیں۔" ایلن نے کمپیوٹر پہ کچھ ٹائپ کرتا بولا تھا۔ اور ویولا نے اُسے گھور کے دیکھا تھا۔

"ویسے یہ بھی نیویارک گزٹ میں پبلش ہوا ہے کیا۔" اس کے لہجے میں تپش تھی تو وہ دھیما سا مسکرایا۔ وہ مسکراتا بہت پیارا لگتا تھا ویولا نے فوراً نظریں پھیر لی تھیں۔

"یہ تمہارے چہرے پہ پبلش ہوا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تو ویولا بھی مسکرادی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے وہم ہے تمہارا۔" ویولا نے بات بدلنے والے انداز میں کہا۔ تو وہ سر ہلا کے رہ گیا چہرے پہ اب وہ اجنبیت نہیں تھی۔ اُسی پل اُس کے ایک کسٹمر نے اُسے آواز دی تو وہ بل لے کر اُٹھنے لگا۔

"لاؤ دو میں لے آتی ہوں تم نوٹس مکمل کرلو۔" ویولا نے بل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ایلن نے اُسے روک دیا۔

"جہاں بیٹھی ہو وہیں بیٹھی رہو۔" وہ سنجیدگی سے آگے بڑھ گیا۔ ویولا مسکراتے ہوئے واپس اسٹول پہ بیٹھ گئی۔ اس پل وہ بہت اچھا لگا۔ پتا نہیں

کیوں ویولا کو اب دل بہت ہلکا لگ رہا تھا' یہ ماحول یہ فضا بہت آشنا سی لگ رہی تھی' ہر سو چھائی کافی کی خوشبو بہت سوندھی لگ رہی تھی۔ اُس نے آتش کدے پہ نظر ڈالی تو وہاں جلتی ہو آگ اس سے بہت ٹھنڈی سی لگی تھی۔ بہت نرم سی گرمائش اُسے جسم میں اُترتی محسوس ہوئی۔ وہ محوسی آگ کو دیکھ رہی تھی۔ ایلن نے مزید ایک کسٹمر کو فارغ کیا اب ویولا کو ملا کے دو کسٹمرز اور رہ گئے تھے۔ وہ واپس آ کے نوٹس میں لگ گیا۔ ویولا کی نظریں اُس کے تیزی سے چلتے ہاتھ پہ گئیں' اُس کی رائٹنگ بہت صاف تھی۔ اُس نے پہلی بار اس کی رائٹنگ دیکھی تھی... نہیں وہ تو حقیقت میں آج پہلی بار اُس سے ملی تھی... اِس سے پہلے تو صرف دیکھا تھا... اُس کے پراسرار رویے کے باعث وہ اسکول میں بھی کافی پاپولر تھا۔ ویولا چند لمحے خاموش رہی اُس کے پاس کچھ نہیں تھا ایسا جو وہ اُس سے پوچھتی یا کوئی ایسی بات جو اُس سے شیئر کرتی لیکن پھر بھی وہ اُسے بات کرنا چاہتی تھی اُس کی باتیں سننا چاہتی تھی... وہ چند لمحے سوچتی رہی کوئی ایسی اچھی بات جو وہ کر سکتی تھی۔ پھر بات آگے بڑھائی۔

''ویسے تمہارا فیوچر کا کیا پلان ہے''...

''تمہارے سامنے ہے''... وہ مختصراً بولا۔ ویولا کا دل دکھا تھا... وہ بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اُس کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی اور وہ تھا بتانے کو کچھ تیار نہیں۔ ویولا نے گہری سانس بھری۔

''ویسے مجھے یاد ہے تم اسکول کے چند ہینڈسم اور ڈیشنگ لڑکوں میں شامل ہوتے تھے اور اُس وقت کئی لڑکیوں کو تم پہ کرش تھا''... ویولا نے جیسے اس وقت کو یاد کیا تو ایلن نے کمپیوٹر اسکرین دیکھتے ہوئے پیپرز پہ کچھ لکھا اور سر کو اثبات میں خم دیا۔ اُف کانفیڈنس۔

ویولا جواب کے انتظار میں تھی لیکن وہ خاموش رہا تو وہ پھر بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہیں آج تک کوئی لڑکی پسند آئی یا کوئی گرل فرینڈ ملی یا اب تک سنگل ہو''... ویولا نے اب کے ٹیبل پہ تھوڑا سا جھکتے ہوئے شوخی سے پوچھا تھا۔ اور ایلن نے بے زاری سے سر اُٹھایا۔

''ویولا میرے پاس ان فالتو کاموں کا وقت بالکل نہیں ہے اور تم پلیز یہ اُلٹے سیدھے سوالات بند کرو گی میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔'' ویولا کو شرمندگی ہوئی... وہ واقعی اُسے پہلی بار مل رہی تھی... ورنہ اسکول میں تو وہ بس دور بہت دور سے اُسے دیکھا کرتی تھی... کبھی بات نہیں کی تھی... اور اتنی فرینڈلی گفتگو واقعی نامناسب تھی... اور پھر وہ جانتی تھی کہ وہ باتیں نہیں کرتا... لیکن... اگر وہ آج یوں اُسے ملی ہے تو کیوں نا اُس کے لیے کچھ اچھا کرے۔ وہ جانتی تھی اُس کے دوست نہیں ہیں... کیوں نہ وہ آج دوستی کی ایک کوشش کرلے... کیوں نہ وہ اسے نارمل لائف کی طرف لے آئے۔ آخر کو اُسے اسکول سے نکلوا کر نارمل لائف سے دور کرنے والوں میں اُس کے پیرنٹس بھی تو تھے۔ اور اُس کی بُلنگ کرنے والوں میں وہ اور اُس کے دوست شامل تھے۔

''کیا ہم گزری باتوں کو بھلا کر ایک نئی شروعات نہیں کر سکتے ایک اچھی دوستی کی شروعات''... اس کی بات پہ تو ایلن نے سرد نظروں سے اُسے دیکھا۔

''مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے''... ویولا کو اُس کے لہجے سے کوفت ہوئی تھی۔

''تم ہمیشہ اتنے روڈلی کیوں بی ہیو کرتے ہو... میں تمہارا یہ رویہ ڈیزرو کرتی ہوں کیا''... اس نے شکوہ کیا تو ایلن نے ایک نظر اُسے دیکھا... ایک چبھتی ہوئی نظر۔

''تم سمیت تمہاری یہ پوری دنیا میرے اس سے بھی زیادہ برے رویے کی مستحق ہے کیونکہ تم لوگوں نے ہمیشہ مجھے یہ ہی دیا ہے اور میں اب اُسے لوٹا رہا ہوں۔'' ایلن سرد سے لہجے میں بولا۔ اور ویولا پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر رہ گئی... وہ

اس سے پتھر جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اُسی لمحے اُس بزرگ کسٹمر نے ایلن کو اشارہ کیا وہ اُٹھ کر اُس کی طرف گیا وہ بوڑھا بل پے کر رہا تھا.... لیکن ایلن نے مسکرا کر اُسے کچھ کہا اور سارے نوٹ واپس کر دیے۔ ویولا کو اس پل اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ وہ اس کا یہ رویہ ڈیزرو نہیں کرتی تھی لیکن اُسے اندازہ تھا.... کہ وہ اِسے کیوں ایسے رویہ اختیار کر رہا تھا .... وہ ساری دنیا سے اچھا تھا لیکن وہ لوگ جنہوں نے اُس سے دکھ دیا تھا.... وہ کیونکر اُن کے ساتھ اچھا ہوتا..... ہاں پری اسکول میں ویولا کے پیرنٹس بھی اُس میٹنگ میں آئے تھے اور اُنہوں نے بھی باقیوں کی طرح یہ مطالبہ کیا تھا کہ خودکشی کرنے والے شخص کا بیٹا بھی پاگل ہے۔ وہ پولیس والوں اور میڈیا والوں سے لڑتا ہے۔ کلاس میں چلاتا ہے خود کو واش روم میں بند کر لیتا ہے۔ دوسرے بچوں کو مارتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی پاگل ہے اور دوسرے بچوں کے لیے نقصان دہ تو اُسے اسکول سے نکال دیا جائے..... ہاں وہ اسے اس لیے نفرت کرتا تھا اور وہ حق پہ تھا۔ وہ واپس کاؤنٹر پہ آ کے چیزیں سمیٹنے لگا.... تو اس نے پھر ہمت کی۔

''ایلن کیا تم پچھلی باتوں کو بھول کے ایک نارمل زندگی نہیں شروع نہیں کر سکتے..... میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے تمہاری فیملی نے تم نے جو تکلیف سہی ہے وہ بہت بری ہے ..... جو کچھ بھی تمہاری فیملی اور تمہارے ساتھ ہوا وہ سب ہے لیکن۔''

''ایکسکیوز می!'' ویولا کی بات کو اُس نے یکدم درمیان میں کاٹا تھا۔ اور ویولا تھمی تھی..... دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

''کیا جانتی ہو تم؟ میرے بارے میں' میری فیملی کے بارے میں ...... ہاں!'' وہ تیز لہجے میں بولا تو ویولا نے سر نفی میں ہلایا۔ ایلن اب چیزیں کاؤنٹر پہ رکھ چکا تھا۔ گویا اب وہ اس سے بات کر کے ہی دم لے گا۔

''کچھ نہیں آئی ایم سوری!'' اُس کی زبان پھسلی ہے وہ جان گئی تھی۔ ایلن ہرٹ ہوا تھا اُسے اس کا بھی اندازہ تھا۔

''نہیں کیا' بتاؤ کیا جانتی ہو تم میرے اور میری فیملی کے بارے میں کہو وہی جو تمہارے نام نہاد وکیل والد نے بتایا یا مشہور زمانہ ماں نے' کہو'...... اور اس جملے پہ ویولا کے چہرے پہ ناگوار تاثرات اُترے تھے۔

''ایلن پلیز میں کہہ رہی ہوں نا میرا وہ مطلب نہیں تھا میں تو بس مدد کرنا چاہ رہی تھی.....''
ایلن غصے سے ہنسا اُس کی آواز تیز تھی۔

''مدد اور تم ..... رہنے دو..... ویولا یہ تمہارے خون میں شامل نہیں ہے مدد کرنا۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا تو ویولا ناسمجھی سے دیکھتی رہ گئی۔

''اپنی زبان کو لگام دو ایلن تم حد پار کر رہے ہو اگر میں تمہارے بارے یہ باتیں کروں تو 'تمہارے والد کے بارے میں پھر!'' ویولا غصے سے جھنجلائی تو وہ بھڑک اُٹھا۔

''رہنے دو ویولا یہ باتیں۔'' تم لوگ وہی ہو جنہوں نے میرے ساتھ برا کیا تھا اور اب کس منہ سے مجھ سے یہ اُمید رکھتے ہو کہ میں برا نہیں کروں کیا اچھائی نبھانے کی ساری ذمہ داری میری ہے۔'' اس کے لہجے میں تپش تھی ویولا نے حلق سے تھوک نگلا .... ایک سرد لہر اُسے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

''تم میرے بارے میں میرے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ویولا پیرش..... کسے پڑی ہے سچائی جاننے کی.... کون جاننا چاہے گا کہ اچانک اینڈرسن اینڈ سنز کے اونر برینڈن اینڈرسن نے خودکشی کیوں کر لی۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا تھا' ویولا نے بغور اُسے دیکھا اُس کے چہرے پہ درد تھا۔'' کسے پڑی ہے جاننے کی کوئی ثبوت نہ ملنے پہ پولیس اور انٹیلی جنس نے تفتیش نہیں کی پوسٹ مارٹم کلیئر آنے پہ ڈاکٹرز نے کہہ دیا کہ نفسیاتی دباؤ میں آ کے اُس نے زہر کھایا

ہے۔ پولیس نے اسے خودکشی قرار دے کر فائل بند کردی۔ کسے پڑی ہے سچ جاننے کی۔ جبکہ اُس شخص کی بیوی چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ وہ پاگل نہیں تھا... اُسے قتل کیا گیا ہے" وہ کہتے کہتے کاؤنٹر کے پاس رکھی اپنی چیئر پہ بیٹھ گیا۔ "اُسے شک ہے شہر کے مشہور شخص پہ جس کے ساتھ اُن کا چند ماہ پہلے آراضی کا مقدمہ ختم ہوا ہے۔ وہ شخص ہار کر بار بار خاندان کو دھمکا رہا تھا... لیکن کون سنے گا... میڈیکل رپورٹ کہتی ہے وہ پاگل ہے... لیکن کسے پڑی ہے نہ پولیس نہ انٹیلی جنس اور نہ وکیل... اُس شخص کی بیوی شہر کہ بڑے بڑے معروف وکیلوں کے پاس گئی لیکن بے سود ... وہ معروف وکیل اِگنیس فرینیڈ ینٹ پیرش کہ پاس گئی لیکن اُنہوں نے ملنا تک گوارا نہیں کیا کیونکہ غریب لوگوں کے پاس اُن کی فیس بھرنے کے پیسے نہیں ہوں گے... حالانکہ اس کیس کے لیے ماں کاٹی ہاؤس تک بیچنے کو تیار تھی مگر اُن کے پاس کوئی بی کلاس کیس لینے کا وقت نہیں تھا۔ اور تم مدد کی بات کرتی ہو کسے پڑی تھی کہ اُس حادثے کہ بعد ہماری لائف کیا ہو جائے گی اب اُس کے چہرے پہ غصہ تھا اور ویولا کی آنکھوں میں ڈھیر سے آنسو تھے ... "میری ماں میری بڑی بہن دن رات پولیس وکیلوں کے چکر کاٹتی رہیں کہ کسی طرح انصاف مل جائے لیکن بے سود تھا ... آخر کار تھک ہار کر وہ بیٹھ گئی... کسے پڑی تھی کہ ایک نو سالہ بچے سے اُس کا بچپن چھین گیا اُس نے اپنے باپ کی لاش دیکھی ... وہ خوابوں میں ڈرنے لگا وہ منظر اُس کا نائٹ میئر بن گیا ہر وقت پولیس والے اور میڈیا اُس کے گھر آ کے اُس کے باپ کے متعلق طرح طرح کے سوال کرتے کیسے سمجھاتا وہ سب کو کہ اُس کے ڈیڈ بہت اچھے انسان تھے وہ زندہ دل اور خوش تھے وہ ڈرپوک نہیں تھے وہ پریشان بھی نہیں تھے ہم سے ناراض بھی نہیں اور ہم سے لڑتے بھی نہیں تھے بلکہ وہ بہت مزے دار جوکس سناتے تھے" ... وہ ویولا کے چہرے پہ کرب ابھرا تھا... یہ تو سچ تھا کہ اُس کی زندگی بہت بری گزری تھی۔ چند لمحے ایک سنگین خاموشی وہاں چھائی رہی... ایلن نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں وہ رونا نہیں چاہتا تھا شاید اسی لیے لیکن ویولا نے اپنے آنسو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی وہ واقعی رو رہی تھی۔ ایلن نے آنکھیں کھولیں... نظریں سامنے رکھے پیپرز پہ گئیں... اُس نے گہرا سانس بھرا۔

"کبھی سوچا ہے ویولا کیسا لگتا ہوگا جب آپ کا اسکول میں سارے بچے مذاق اڑائیں گے کہ اس کا باپ پاگل تھا اُس نے خودکشی کر لی یہ بھی پاگل ہے... سارے بچے آپ کو پاگل کہہ کر بلائیں... کیسا لگتا ہے ویولا رات کو سوتے ہوئے ہر لمحے اس ڈر کے ساتھ جینا کہ کہیں آپ کے برابر والے کمرے سے آپ کی ممی کی چیخوں اور رونے کی آواز نہ آئے... کیسا لگتا ہوگا اگر خواب میں ہر روز اپنے باپ کا مردہ چہرہ دیکھیں... کیسا لگتا ہوگا جب آپ کے گھر پہ بار بار میڈیا پریس آئے... اور آپ کے تمام خاندانی ریکارڈز چیک کرے کہ کتنے پاگل آپ کے خاندان میں گزرے ہیں اور کتنوں نے خودکشی کی ہے... کیسا لگتا ہوگا جب آپ کو یہ پتا چلے کہ آپ کو آپ کی ماں بہن سے دور بھیجا جا رہا ہے ایک فوسٹر فیملی کے پاس تاکہ آپ صحت مند ماحول میں پلیں... کیسا لگتا ہوگا اپنوں سے دور ہونے کا ڈر... کبھی سوچا ہے"... وہ کرب زدہ نظروں سے ٹیبل پہ رکھے صفحات کو دیکھ رہا تھا۔ اور ویولا کے آنسو اب تھم گئے تھے۔

"جو تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو وہ میں نے جیا ہے ویولا۔" وہ دھیرے سے بولا تھا۔ ویولا نے دھیرے سے اپنے سارے آنسو پونچھے۔

"لیکن ایلن اس سب میں میرا کیا قصور ہے۔ میں چھوٹی تھی ایلن مجھے نہیں پتا تھا تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن تم مجھے اچھے لگتے تھے اور میں بس..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پتا نہیں دل کی بات زبان پہ لانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اُس میں۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم بھی اُن لوگوں میں

شامل تھیں میرا مذاق اُڑانے والوں میں مجھے پاگل بلانے والوں میں تم بھی بالکل ویسی ہی ہو۔" وہ غصے میں کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا وہی خشک اور سرد رویہ ویولا کو پھر غصہ آیا تھا۔

"وہ سب بچپن کی بات تھی میں چھوٹی تھی ایلن اور اب تو......" ایلن نے سخت نظروں سے دیکھا تو وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"اب تو کیا ویولا اب میں اور پہلے میں کیا فرق ہے"....اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ویولا کے لب کھلتے کھلتے رہ گئے۔ اُسی لمحے اُس آخری کسٹمر نے ایلن کو آواز دی تو وہ ایکسکیوز کرتا ہوا اُس کی طرف بڑھ گیا۔ ایلن بل لے کر اُس کے پاس سے ہٹ رہا تھا کہ وہ بولا۔

"کیا وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے ینگ مین"....اُس تیس بتیس برس کے بڑھی شیو والے شخص نے ویولا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ایلن نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"نہ...نہیں تو......" ایلن نظریں چراتا ہوا بولا۔

"مگر تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم اُس سے پیار کرتے ہو۔" وہ شخص بولا تو ایلن اُسے حیرت سے دیکھے گیا۔

"اور تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ وہ بھی تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ تم کام کر رہے تھے اور وہ تمہیں دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہیں دل سے چاہتی ہے۔" وہ شخص پراعتماد لہجے میں بولا۔ اور ایلن اُسے حیرت سے دیکھے گیا۔

"اور ایک بات یاد رکھنا ینگ مین جو ہم سے پیار کرتے ہیں ان سے تلخ رویہ نہیں رکھتے۔ خوش قسمتی ہے جو کوئی چاہنے والا ہو....اس خوش قسمتی کو وقت اور حالات کی باتیں سن کر ضائع مت کرو.....ورنہ ہر کرسمس صرف تنہائی اور کافی وش کرے گی....میری کرسمس دوست۔" وہ کہہ کہ کافی ہاؤس سے باہر نکل گیا تھا اور ایلن حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ایلن واپس اپنی جگہ پہ آیا۔

"ایلن پلیز میں تمہارے اس رویے کی مستحق نہیں ہوں میرے ساتھ یوں مت کرو"....وہ رو رہی تھی ایلن نے غصیلی نگاہ اُس پہ ڈالی۔

"ویولا تم اسی کی مستحق ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ"......وہ سخت لہجے میں بولا۔ دور کہیں ایک آواز مسلسل کانوں میں گونج رہی تھی....وہ تم سے پیار کرتی ہے اس کی آنکھیں صاف کہتی ہیں۔ ویولا چند ثانیوں تک اُسے یونہی دیکھے گئی....شاید وہ اس سے درد میں تھا....یا شاید...ایلن سختی سے جبڑے بھینچ کر چیزیں سمیٹ کے جگہ پر رکھ رہا تھا...گویا اُس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو....اب کافی ہاؤس بالکل خالی تھا صرف وہی دونوں وہاں تھے اور بولتی سی تنہائی...ویولا کی نظریں دوبارہ آتش کدے گئیں...آگ کے شعلے اب ذرا مدھم لگ رہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں ویولا کو یہ آگ بہت دہکتی سی محسوس ہوئی، فضا میں موجود کافی کی خوشبو کا وہ بھبکا اب زہر جیسا کڑوا لگ رہا تھا۔ وہ چیئر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور لانگ کوٹ پہنتے ہوئے بولی۔

"تم سے بات کرنا ہی بے کار ہے۔" کہتے ہوئے اُس نے جیب سے کئی ڈالرز نکال کر کاؤنٹر پہ رکھے۔ ایلن نے نوٹوں کو دیکھا اور اُسے طیش آیا تھا۔

"تمہارے ڈالرز کو یہاں کوئی ویلکم نہیں کرے گا لے جاؤ انہیں....میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسی امیر لڑکیوں کو تمہیں کیا لگتا ہے کوئی بھی لڑکا تمہاری ہائی پروفائل بیک گراؤنڈ دیکھ کر امپریس ہو جائے گا تو یہ غلط فہمی ہے ہر جگہ اپنے پیسوں کو شو آف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس انداز پر ویولا کی آنکھیں پھٹی تھیں وہ اس سب کی اُمید نہیں کر رہی تھی کیا وہ اسے ایسا سمجھتا تھا۔ ایسا لگا جیسے تیز دھار چھری کی سینے پہ کسی نے ماری ہے۔ وہ اُس کے منہ سے بھی اپنے لیے ایسی باتیں نہیں سننا

چاہتی تھی۔ دیولا نے جبڑے بھینچے۔
"تمہیں کیا لگتا ہے میں ایسی ہوں تمہیں اندازہ بھی ہے تم کیا کہہ رہے ہو حالانکہ تم تو مجھے جانتے تک نہیں ہو۔ تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں اپنی دولت کا بھرم تم پہ جما رہی ہوں.... ایلن تمہارا پرابلم ہی یہی ہے تمہیں صرف تم صحیح اور سب غلط لگتے ہیں ...... لیکن ایسا نہیں ہو سکتا ہے ایلن! کہ ہر دفعہ تم صحیح ہو۔ جس دولت کا تم مجھے طعنہ دے رہے ہو اپنی زندگی میں مجھے اسی شے سے سب سے زیادہ نفرت ہے اور تم کہتے ہو میں تم پہ یہ شو آف کر رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے وقت نے صرف تمہارے ساتھ برا کیا ہے سچ یہ ہے کہ وقت کسی کے ساتھ اچھا نہیں کرتا.. ایلن سیموئل اینڈریسن"..... تلخ انداز بھیگے لہجے میں اس نے کہا... آنکھوں کی نمی واضح تھی۔ ایلن نے دیکھنے سے گریز کیا تھا... اُس بھیگی آواز کو سننے میں پتا نہیں کیوں کانوں میں درد سا ہوا تھا.... ہاں وہ اُسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔
"میں تمہاری یہ باتیں یہ رویہ ڈیزرو نہیں کرتی ہوں ایلن .... میں نہیں کرتی ہوں یہ ڈیزرو کہ امیر خاندان میں پیدا ہونے کی مجھے یہ سزائیں ملیں.... میں نہیں ڈیزرو کرتی تھی کہ بچپن میں میری برتھ ڈیز کی پارٹیز میرے بجائے حقیقتاً نیویارک گزٹ کے لیے ارینج کی جائیں۔" دیولا روتے ہوئے بولی... ایلن چہرے پہ سخت تاثرات لیے تمام کپس ٹب میں ڈال رہا تھا... البتہ دل اندر ہی اندر کہیں بیٹھ رہا تھا۔" میں نہیں ڈیزرو کرتی تھی کہ جب میں بیمار ہوں یا پریشان ہوں یا کچھ شیئر کرنا چاہتی ہوں تب میرے پیرنٹس میرے ساتھ نہ ہوں بلکہ ڈیڈ اٹلی اور مام پیرس میں ہوں..... میں یہ نہیں ڈیزرو کرتی تھی کہ گرینی کے سہارے میں اکیلی گھر پہ رہوں اور میرے پیرنٹس کام میں مصروف رہیں ... میں یہ نہیں ڈیزرو کرتی تھی کہ میرے فرینڈز صرف اس لیے میرے فرینڈز بنے کیونکہ اُنہیں میرے مہنگے ٹوائز سے کھیلنے کا موقع ملے.... میں یہ نہیں ڈیزرو کرتی تھی کہ اپنے ٹین ایج ٹائم جو کہ سب سے حساس وقت ہوتا ہے میں اُس میں اپنے گھر میں تنہا پڑی رہی ہوں اور میرے پیرنٹس کام میں بزی ہوں میں یہ نہیں ڈیزرو کرتی کہ میں دو دن تین دن تک اپنے پیرنٹس سے نہ ملوں۔" وہ نظریں میز پہ جمائے کھوئی سی بولی تھی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک رہے تھے اور ایلن کو لگا جیسے کوئی تیز دھار آلے سے جسم کاٹ رہا ہے...." میں یہ ڈیزرو نہیں کرتی کہ میرے اکاؤنٹس میں ڈھیروں پیسے ہوں لیکن میرے پیرنٹس میرے ساتھ نہ ہوں جبکہ میرے سارے کزنز انکل آنٹی اپنے بچوں کے ساتھ ہوتے ہوں۔ بھلے دولت نہ ہو... پر وہ ہوں.... اور تم مجھے کہتے ہو میں یہ ڈیزرو کرتی ہوں۔ نہیں کرتی ہوں میں تمہارا یہ رویہ ڈیزرو۔ نہ ہی میں یہ ڈیزرو کرتی ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے نرم جذبات ہوں۔" اب کے وہ مضبوط لہجے بھیگی آنکھوں سے بولی تھی.... اور ایلن کو لگا دل کی دھڑکن تھمی ہے یا کپ ہاتھوں سے پھسلا تھا۔ "نہ میں تمہیں اسکول میں چھپ چھپ کر دیکھنا ڈیزرو کرتی تھی اور نہ تمہارے بارے میں سوچنا ..... نہیں، میں تم سے محبت کرنا ہی ڈیزرو نہیں کرتی تمہیں مانگنا بھی نہیں..... اور نہ یہ ڈیزرو کرتی ہوں کہ میں کرسمس کے موقعے پہ بھی ہر اچھے موقعے کی طرح اکیلی ہوں اور مام ڈیڈ الغرہ میں .... میں نہیں ڈیزرو کرتی کہ میں اپنے پرخلوص خاندان والوں کے پاس آدھے دل سے رہوں.... ہاں میں نہیں رکنا چاہتی تھی آنٹ نکول کے پاس.... وہاں سب ایک ساتھ تھے۔ سب کے پیرنٹس اُن کے پاس تھے اور مجھے یہ دیکھ کے رونا آرہا تھا.... میں نہیں ڈیزرو کرتی تھی اپنے ساتھ اُنہیں دکھی کرنا.... میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ سب مجھ سے ہمدردی کریں.... اور واقعی نہیں ڈیزرو کرتی اب اپنے گھر جا کر اکیلے اپنی بلی کو گلے لگا کر رونا.... میں یہ سب نہیں ڈیزرو کرتی سمجھے تم .... نہیں ڈیزرو کرتی۔" وہ روتے ہوئے کہہ

کے آنسو پونچھتی دروازے کی طرف بڑھی.....اور ایلن کو ایسا لگا جیسے وہ دمے کا مریض ہے.....سانس لینے میں بہت دشواری ہوئی.....کانوں میں اب تک وہی آواز گونج رہی تھی.....خوش قسمتی ہے جو کوئی چاہنے والا ہو.....اس خوش قسمتی کو وقت اور حالات کی باتیں سن کے ضائع مت کرو.....ورنہ ہر سال کرسمس میں صرف تنہائی اور کافی وش کرے گی.....

ویولا روتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی.....پتا نہیں کیوں دل بے اختیار چاہ رہا تھا آج وہ روک لے بس ایک بار.....وہ روک لے.....لیکن وہ دروازے کی ناب گھما چکی تھی.....ایلن آواز پہ فوراً مڑا.....لب کھولے لیکن.....کوئی لفظ باہر آیا ہی نہیں.....ویولا قدم باہر رکھ رہی تھی لیکن جانے کیوں ایک انتظار تھا شاید وہ کچھ کہہ دے.....شاید.....اور اُس نے دوسرا قدم بھی باہر رکھ دیا اور پشت پہ لگا دروازہ بند ہوگیا.....ویولا کو لگا وہ پتھر ہوگئی ہے۔

کافی ہاؤس کی تنہائی ویسے ہی تھی وہی آتش کدے میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے وہی کافی کی خوشبو.....اور وہی لڑکا جو اب کاؤنٹر پہ کھڑا بند دروازے کو دیکھ رہا تھا.....وہ جا چکی تھی.....چلی گئی تھی.....اُسے آہستہ آہستہ یقین آرہا تھا.....اُس نے اُسے جانے دیا تھا.....اُسے روکا نہیں.....وہ اُسے کیوں روکے گا.....کس کے لیے روکے گا.....اپنے لیے.....ایک مٹی کے جسم کے لیے.....جس کے وقت اور حالات نے تمام جذبات کو ختم کردیا ہے.....وہ جو اُس جیسی معصوم دل والی لڑکی کی سچی محبت کے لائق نہیں ہے.....کس کے لیے.....ہاں وہ جانتا تھا.....وہ جانتا تھا وہ اُس سے محبت کرتی تھی.....وہ جانتا تھا.....وہ چھپ چھپ کے اسکول میں اُسے دیکھا کرتی تھی.....وہ جانتا تھا.....جب اسکول میں بچے اُس کا مذاق اڑاتے تھے تو وہ واش روم میں چھپ کے روتا تھا تب بھی وہ ہی اُس کی بہن کو اُس کا بتاتی تھی.....وہ جانتا تھا

.....وہ اُس کے اسکول سے نکالے جانے پہ روئی تھی.....کیونکہ اُسے اُس کی نیلی آنکھیں اچھی لگتی تھیں.....وہ جانتا تھا وہ سب جانتا تھا.....لیکن وہ خود کیا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا.....وہ ایک کافی ہاؤس کے مالک کا بیٹا تھا.....وہ اُس کے باپ جیسا فنانشل بیک گراؤنڈ نہیں رکھتا تھا.....وہ جانتا تھا اُس کے والدین کون ہیں شہر میں کیا شہرت رکھتے ہیں.....اور اپنا ماضی بھی اُسے یاد تھا.....وہ بہت محنت کرنا چاہتا تھا.....اپنی ماں اور بہن کے لیے اُنہیں ایک اچھی زندگی دینے کے لیے.....لیکن اس میں بہت وقت تھا.....اور وہ جانتا تھا.....ویولا سچ کہہ رہی ہے.....وہ اُس سے محبت کرنا ڈیزرو نہیں کرتی ہے.....وہ بہت اچھی زندگی اور بہت اچھے انسان کو ڈیزرو کرتی ہے.....اور وہ اُسے صرف اس لیے اپنی بجس زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے.....ہاں وہ اُس سے محبت کرتا ہے.....اور ایلن یکدم چونکا تھا.....نظریں سامنے رکھے ڈالرز پہ گئی تھیں۔

☆☆☆

سفید برف چہار سو بکھر چکی تھی۔ ایسے میں اس کالی سڑک پہ سناٹا ناچ رہا تھا۔ ویولا ہاتھ جیبوں میں ڈالے تھکے قدموں سے چل رہی تھی۔ بار بار چہرے پہ ہوا سے اُڑ کے آتے بال آرہے تھے وہ اُنہیں بار بار ہٹا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں.....دل خاموش۔ ابھی چند لمحوں پہلے وہ دل سے بہت جنگ کرکے شانت ہوچکی تھی۔ اس نہج پہ پہنچ کر کہ وہ کچھ نہیں بدل سکتی.....نہ خود کو نہ دنیا کو.....ایسا نہیں ہوسکتا کہ اُس کے پیرنٹس بزنس کو چھوڑ کر اُس کے پاس بیٹھ جائیں اور بھلا کچھ بھی ہوجائے وہ اُس کے پیرنٹس ہیں وہ اچھے تو ہیں۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ وہ کبھی ایلن کو پیار کرنا چھوڑ نہیں سکتی تھی اور بس ایک یہی بات تھی جو دھڑکنوں کو منتشر کررہی تھی۔ وہ خاموش سی سڑک پہ چلتی جارہی تھی۔

''ویولا.... ویولا۔'' پیچھے سے آتی آواز پہ وہ تھمی۔ ''ویولا روکو پلیز!'' آواز شناسا سا تھی۔ ویولا مسکرائی۔ اور چلنے لگی اب قدموں کی دھمک قریب محسوس ہو رہی تھی۔

''اسٹاپ اِٹ ویولا رک جاؤ۔'' ایلن قریب آتے ہوئے بولا۔ وہ ایپرن اور کیپ کے بغیر تھا۔ اپنی شرٹ اور جینز میں ملبوس البتہ اُس نے کوئی کوٹ وغیرہ نہیں پہن رکھی تھی۔ ویولا کی نظریں سڑک پہ تھیں وہ مسکرا رہی تھی۔ ایلن نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''یہ پیسے لو تمہارے پیسوں کو وہاں کوئی ویلکم نہیں کرے گا۔'' وہ جتانے والے انداز میں بولا تو ویولا مسکراتی ہوئی اُس کی طرف گھومی اور ویولا کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چہرے پہ غصیلے تاثرات ابھرے۔

''ایلن اینڈرسن تم میں ذرا عقل نہیں ہے کیا؟ تم مائنس ڈگری میں بغیر لانگ کوٹ کے نکل آئے ہو ایسا بھی کیا پاگل پن ایک پیسے ہی تھے ناں اتنے اہم تو نہیں تھے۔'' وہ غصے میں بولی تو ایلن کھسیانا سا مسکرایا اُس نے شہادت کی انگلی سے گردن کی پشت کھجلائی۔

''نہیں پیسوں سے زیادہ کچھ اہم تھا''..... وہ دھیمے سے بولا تو ویولا نے اُس کی نیلی آنکھوں کو دیکھا۔

''ایک دوست ملا تھا اُس نے کہا کہ کوئی محبت کرے یہ خوش قسمتی ہے اور اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے ورنہ ہر کرسمس پہ تنہائی اور کافی ہی وش کریں گے..... اور میں ایسی کرسمس نہیں منانا چاہتا۔'' وہ بولا تو ویولا حیران سی اُسے دیکھ رہی تھی..... گویا یقین نہ تھا۔

''میں ہر کرسمس پہ تمہارے کیرل سننا چاہتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولا تو ویولا نے بے اختیار منہ پہ ہاتھ رکھ کے باہر آنے والی چیخ کو روکا تھا۔ چہرے کی خوشی واضح تھی۔

''ویولا میں جانتا ہوں میں تمہیں ڈیز رو نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی میں تم سے پیار کرتا ہوں..... وہ بھی تب سے جب تم میری آنکھوں کی وہ بھونڈی سی ڈرائنگ بنایا کرتی تھی۔'' وہ معصومیت سے بولا تو ویولا کی آنکھیں پھٹی تھیں۔

''تمہیں کیسے پتا'' وہ ہاتھ کمر پہ رکھ کے غصیلے انداز میں بولی۔

''مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم نے وہ نیلی آنکھوں والی بلی اسی لیے لی ہے کیونکہ تمہیں میری آنکھیں پسند ہیں۔'' ویولا واقعی شاک ہوئی تھی کہ وہ کس حد تک سے اتنا واقف ہے۔ جبکہ ایلن اب چلنے لگا تھا۔

''تم واقعی کرمنل مائنڈ ہو کہاں سے پتا کیں یہ سب باتیں''..... وہ اُس کے ساتھ چلتی ہوئی بولی تو ایلن مسکرا کر رہ گیا۔

''میں ایک بہت سمپل سی لڑکی ہوں مجھے روز پنک کلر بہت پسند ہے میں میک اپ شوق سے کرتی ہوں اور انٹرٹینمنٹ کی نیوز بہت پڑھتی ہوں۔ میرا فیورٹ سبجیکٹ ہسٹری ہے۔ میں نوڈلز بالز شوق سے کھاتی ہوں اور آج بھی پاور پف گرلز دیکھتی ہوں اور مجھے اپنے فیملی بزنس ڈیڈ کی وکالت اور ممی کی فیشن ڈیزائننگ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی کچھ بننا ہے۔ میں بس ایک دن تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہوں میرے بہت پیارے پیارے دو بیٹے ہوں ..... بس یہی ہوں میں''..... ویولا ہاتھ پیچھے باندھ کے چلتی ہوئی بول رہی تھی..... چہرے پہ معصوم سی شوخی تھی۔ ایلن مسکرا دیا۔

''اور اگر آئندہ کبھی یہ کہا ناں کہ مجھے ڈیز رو نہیں کرتے تو جان سے مار دوں گی سمجھے''۔ وہ سنجیدگی سے بولی تو ایلن نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں میں ہی تو ڈیز رو کرتا ہوں بس۔'' وہ بولا تو نظروں میں چمک سی تھی۔ ویولا کی نظریں بے اختیار نیچے جھک گئیں اور اُسی لمحے آسمان پہ زبردست آتش بازی ہوئی' اُن دونوں نے نظریں

اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ ایلین نے گہرا سانس بھرا۔

"میری کرسمس ویولا۔" وہ دھیرے سے بولا۔ ویولا مسکرائی۔ "میری کرسمس ایلین!" اس نے دھیمے سے بول کر اپنا سر اُس کے کندھے پہ رکھ دیا لیکن پھر جھٹکے سے اُٹھا لیا ایلین نے پلٹ کر دیکھا تو وہ لانگ کوٹ کی بیلٹ کھول رہی تھی.....

"یہ کیا کر رہی ہو تم......!" ایلین بولا تو ویولا نے جواب دیے بنا اپنا کوٹ کھول کے تھوڑا اپنے کندھوں پہ رکھا اور باقی ایلین کے شانوں پہ بکھرا دیا۔

"مجھے تمہیں ابھی بہت کیرلز سنانی ہیں اور اُس کے لیے تمہارا صحت مند ہونا ضروری ہے۔" وہ بولی تو ایلین مسکرا دیا۔

"تو پھر سناؤ میں اب تک چرچ نہیں گیا اور میں نے ایک بھی کیرل نہیں پڑھی۔" وہ بولا تو ویولا مسکرائی۔ دور سے ایک آواز اُس کے کانوں میں گونجی.....خوشیاں موجود ہوتی ہیں ہمارے ارد گرد کبھی مل جاتی ہیں کبھی ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔

"اگر کبھی کوئی کہے ناں کہ سینٹا کلاس اصلی ہوتے ہیں تو مان لینا۔" ویولا بولی تو ایلین نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا.....ویولا نے لانگ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اندر سے ایک ریڈ ریپر میں ریپ ایک گفٹ نکلا، ایلین خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ ویولا نے کھولا تو اُس میں ڈھیر سی چاکلیٹ تھیں۔ ویولا نے مسکرا کے چاکلیٹ کھولی اور ایلین کی طرف بڑھائی۔ وہ دونوں اس خالی سڑک پہ چاکلیٹ کھاتے ہوئے چل رہے تھے اور فضا میں ویولا کی آواز گونج رہی تھی۔

"Dashing through the snow
In a one horse open sleigh
O'er the fields we go,
Laughing all the way
Bells on bob tail ring,
Making spirits bright
What fun it is to laugh and sing

Oh, jingle bells, jingle bells,
Jingle all the way
Oh, what fun it is to ride
In a one horse open sleigh
Jingle bells, jingle bells
Jingle all the way
Oh, what fun it is to ride
In a one horse open sleigh"

☆☆

انعم خان



آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوائیں بھی پرزور تھیں۔ دن میں رات کا سا منظر پیش کرتا ماحول' گہرے راز سے گمبھیر بھیدوں کو ہوا کے پراسرار شور سے چھپانے میں محو سناٹے میں پناہ لینا چاہ رہا تھا' مگر ناکام۔ ماحول لو اداسی کے عکاس کالے بادلوں سے مات کھائے ان ہی کے رحم و کرم پہ تھا۔

کھڑکی کا پٹ وا کیے' اسے مضبوط گرفت میں لیے ہوا کی شدت کا مقابلہ کرتی وہ بھی اپنے کمزور دل کو گہرے کالے بادلوں کے سحر میں جکڑنے سے بچا نہیں سکی تھی۔ قدم بھی اپنی جگہ جم چکے تھے۔ نگاہیں بھی آسمان کی وسعتوں پر چھائی اداسی پر منجمد تھیں۔ البتہ ذہن میں بدترین ہلچل مچی تھی۔ بے شمار الجھی سوچیں اسے کرب کا احساس دلانے لگی تھیں۔ دل تو مدت سے تڑپ رہا تھا' آج دماغ بھی اذیتوں کے بھنور میں اٹکا تھا۔ وہ اک جگہ پر ساکن تھی۔ دماغ البتہ ماضی کی بھول بھلیوں میں پرواز کرنے لگا تھا۔ جسے روکنے کی اس نے ایک ذرا سی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ کرتی بھی کیسے۔ دل میں اب سکت باقی تھی نہ کوئی امید۔

سب مٹنے سے پہلے
سب یاد کرنا۔
سب اسے دیکھنا تھا۔
وہ نابینا نہیں تھی

ہاں رامین فیاض نابینا نہیں تھی' مگر نابینا ہونے سے پہلے آنکھ کی پتلیوں کو ایک جھلک دکھائی تھی۔ جو جذبات و احساس سے شروع ہو کر محبت کا روپ دھارنے کے بعد' کب کیسے اسے نابینا لوگوں میں لائی' ہزاروں پچھتاوؤں کی وجہ بنی تھی۔ نابینا ہونے سے پہلے اسے اپنی زندگی کے ہر پہلو اور ہر فیصلے کو پرکھنا ضروری تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی آسان تھی۔ خوش گواریت سے بسر ہو رہی تھی۔ گھر میں بھی مکمل سکون و خوشحالی تھی۔ بھائیوں کی شادی کے بعد ابو نے اس کا رشتہ بھی اپنے بھانجے سے طے کر دیا۔ فہد خضر ایک خوبرو' بااخلاق نوجوان تھا۔ مالی لحاظ سے بھی مستحکم تھا اور سب سے بڑی بات خاندان بھر کے سامنے پل کر بڑا ہوا تھا۔ رامین فیاض بھی خوب صورت تھی۔ پھوپھو کو شروع سے بہو کے روپ میں پسند تھی۔ رامین کے کالج کے فوراً" بعد رشتے کا پیغام بھائی کو دیا۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ البتہ رامین کو باقاعدہ نسبت طے ہونے سے قبل چھوٹی بہن مدحت سے علم ہوا بعدازاں اسے بتا بھی دیا گیا۔ وہ چپ تھی۔ کچھ نہ بولی۔ ماں باپ کا فیصلہ' کچھ شرم و لحاظ و لاج تھی۔ اس نے حامی بھر لی۔ یوں ایک چھوٹی سی تقریب میں خاندان کے تمام افراد کے سامنے اسے فہد خضر کے نام کی انگوٹھی پہنائی گئی۔

اپنی زندگی میں اس بدلاؤ سے اس نے دانستہ نیا رخ دیتے ہوئے فہد خضر کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو ملتا مبارک باد دیتا' وہ جواباً" مسکرا دیتی۔ یوں دن گزرنے لگے۔ اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا۔ پہلے دن جانے سے قبل فیاض احمد نے اسے اپنے قریب بٹھایا تھا۔



"زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے اٹھا ہر قدم ایک پہیلی ہوتا ہے جسے مضبوط ارادہ اور خود سے جڑے رشتوں کا احساس' بوجھتا ہے۔ جو پہیلی بوجھ لے وہ زندگی کو جیتا ہے اور جو کوشش نہیں کرتا اسے پہیلیاں الجھا دیتی ہیں' تنہا کر دیتی ہیں...!"

باپ کی باتوں کو پلو سے باندھ کر یونیورسٹی میں پہلا قدم رکھا۔ ارادہ ہر پہیلی کو سلجھانے کا تھا۔ بہت سی نئی دوست بنائیں۔ پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔ سو دل جمعی سے ہر کلاس' ہر لیکچر اٹینڈ کرتی۔ ہر روز نئی لگن دل میں لیے اپنے بڑھتے ہر قدم کو پر عزم کیے' فیاض احمد کے کہے ایک ایک لفظ کو دل میں دہراتی۔ یوں ہی دن گزر رہے تھے۔ وہ مطمئن تھی۔

لیکن شاید زندگی کی پہیلی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنا وہ جانچ کر آگے بڑھنا چاہ رہی تھی۔ پہیلی میں الجھاؤ ہی پہیلی کو دلچسپ رخ دیتا ہے۔ امتحان لاتا ہے' آزماتا ہے۔ رامین فیاض کی پہیلی بھی اس کے ہاتھوں کی الجھی لکیروں کی طرح الجھی تھی۔ ایک امتحان اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچانے' اس کی پختہ سوچوں کو متزلزل کرنے اس کے سامنے بڑے دھڑلے سے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے لیے آزمائش تیار تھی۔

آذر شفیق... اس کا کلاس فیلو... بہت صبر اور ہمت مجتمع کرنے کے بعد دل ہاتھوں میں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی غیر متوقع' مگر پرزور پیش کش رامین فیاض کو سکتے میں ڈال گئی تھی۔ وہ آذر شفیق کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی... وہ انتظار کا کہہ کر چلا گیا' مگر جانے سے قبل کئی... گنجل سرے اسے تھما گیا تھا۔ جنہیں سلجھانے کے لیے اس کی بکھری سوچوں نے مزید انتشار کا سامنا کیا تھا۔ دل الگ مضطرب ہوا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھبرائی' تمام دن و رات بے چین رہی... اس کے سوال کا مثبت جواب نہیں ملا تھا۔

اگلے دن اس کے پوچھنے پر صاف انکار کر دیا۔ وہ محبت کے حصار میں تھا۔ انکار پر شدید احتجاج کیا' پھر منتوں کا سہارا بھی لیا۔ دل کی تڑپ و کسک بیان کرتا رہا' چاہت کی شدت بھی پرزور تھی... آنکھوں میں خمار تھا۔

رامین ہچکچاہٹ کا شکار ہوگئی' اس نے پھر انتظار کا کہا۔ وہ منتشر دل و دماغ کے ساتھ گھر واپس آئی۔ روشن آنکھوں میں اس کا فریادی چہرہ رقص کر رہا تھا' مگر اس نے رات گئے سر جھٹکا تھا۔ دماغ کو حواس میں لائی۔ ساتھ ہی فہد خضر کا نام سماعتوں میں گونجنے لگا۔ فیاض احمد کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"نہیں... میں آذر شفیق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی' میرا نام فہد خضر کے نام کے ساتھ منسوب ہوچکا ہے۔ مجھے یہ حقیقت آذر کو بتا کر اس کی ہر امید کو ختم کرنا ہے۔" وہ خود کو سرعت سے حتمی فیصلے پر لے آئی۔ ارادہ مضبوط تھا کہ اب اس کی کسی بات یا فریاد پر نرمی نہیں برتے گی۔ اگلے دن پر عزم انداز میں گئی۔ وہ بتائے گئے مطلوبہ ٹائم پر اس کے سامنے تھا۔ رامین فیاض نے بنا لحاظ برتے' دو ٹوک انداز میں اسے منع کرتے ہوئے اپنی انگیجمنٹ کے متعلق بتایا۔ اول تو وہ ششدر رہ گیا' مگر اندر پنپتی محبت شدت پکڑ چکی

تھی۔ وہ تشنگی کا روگ نہیں پال سکتا تھا' تشنگی کی کوئی گنجائش اس کے اندر بچی ہی نہ تھی۔

"میری محبت تم میں سانس لیتی ہے رامین۔۔۔ یہ عذاب ان سانسوں کی روانی کو مسل دے گا' مجھے زندہ لاشہ بنا دے گا۔" وہ گڑگڑایا تھا۔ محبت نے اسے بے بس و کمزور کردیا تھا۔ ہجر فراق کے قصے وہ نہیں سمیٹ سکتا تھا۔

وہ لڑکھڑاتی زبان سے معذرت کرتی واپس پلٹ گئی' مگر اس بار وہ خود کو اس کی محبت کے واسطے سے باہر نہ نکال سکی۔ آذر شفیق تمام حوالوں سے اس کے ذہن و دل پر قابض ہوچکا تھا۔ آذر شفیق کی محبت بھری پہیلی بوجھنے میں وہ محو ہوئی تو مضبوط ارادے' انتشار کا شکار ہوتے ہی خونی رشتوں کے احساس کو دھند میں لپیٹ گئے۔ پھر نہ باپ کی باتیں دماغ میں گردش کر سکیں نہ فہد خضر سے نسبت یاد رہی۔ خود سے موازنوں کی گٹھڑی کھول کے بیٹھی۔ اندازہ لگایا۔ فہد خضر کو سوچ کر بھی وہ اتنا مطمئن نہیں ہوتی تھی جتنا اب آذر شفیق کی محبت کا احساس اسے سکون بخش رہا تھا۔ اسے آذر شفیق کے حق میں دل کی گواہی ملی تھی۔ وہی گواہی اسے باپ کے مان و غرور پر موٹی چادر چڑھانے پر اکسا گئی تھی۔ وہ محبت کے لیے بہک گئی تھی۔ بہکتے قدم اگلی صبح اسے آذر شفیق کے سامنے لے گئے تھے۔ جواب رامین فیاض کے غیر متوقع جواب کو سن کر مدہوش ہوئے جا رہا تھا۔ اس کی محبت نے تسکین پالی تھی۔

"یہ وقت رقم کرے گا رامین۔۔۔ میری چاہتوں کو' تم نے کرب کی آغوش سے نکال کر ان انمول لمحوں تک رسائی دی ہے۔ جو بکھرے موتی سمیٹ کر عشق کو تسبیح میں پروتے ہیں۔" وہ صدق دل سے بولا تھا۔



ادھورے چاند کا دکھ' ادھوری شام سے شروع ہوکر ادھوری رات کے اخیر میں ختم ہوتا ہے اور ختم بھی نامکمل طور پر ہوتا ہے۔ ادھورے پن کی کسک ہر پل رہتی ہے۔ جو آنکھوں کی روشنی مدھم کیے خواب نوچ لیتی ہے۔ ڈر و خوف کی لہر نیند کو دسترس سے دور کردیتی ہے۔ وقت کا پنچھی ڈیڑھ سال مکمل کیے اپنی اڑان ہنوز جاری رکھے ہوئے تھا۔ یک طرفہ محبت سنگ ملتے ہی مضبوط تر ہوتی گئی تھی۔ رامین فیاض نے خود کو کسی بھی قسم کے خول میں قید کیے بغیر آذر شفیق کو اپنے خوابوں تک رسائی دی اور اس کی آنکھوں میں اپنے نقش گہرے کردیے تھے۔ لیکن گزرتے دن نے آزمائشوں کو سر اٹھانے پر اکسا دیا تھا۔

آخری سمسٹر شروع ہوتے پھوپھو' شادی کا پیغام لے کر فیاض احمد کے پاس آئی تھیں۔ جلد بازی کی وجہ فہد خضر کا روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک جانا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ بیٹے کے جانے سے قبل وہ رامین کو بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ بھائی کو بھی یقین دہانی کروائی کہ رامین کی پڑھائی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ فیاض احمد بہن کا اصرار دیکھ کر انہیں ٹال نہ سکے اور حامی بھرلی' مگر یہ بات جب رامین کے کانوں تک پہنچی تب اسے پاؤں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اگلے دن ہی آذر شفیق سے تمام صورت حال بیان کی۔ کم پریشان تو وہ بھی نہ ہوا تھا۔

"رامین۔۔۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔" وہ تڑپ کر بولا تھا۔ رامین کی آنکھیں بھی ضبط کا پیمانہ لبریز ہونے کے بعد اس کے سامنے تر ہوئی تھیں۔ گھر میں تو کسی سے ذکر تک نہیں کرسکتی تھی۔ واحد آذر تھا جو اس کا غم گسار تھا۔ محبت انہیں اندھیری بند گلی میں لاکر تماش بین بن چکی تھی۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی آذر۔۔۔ فہد سے میرا رشتہ ہماری محبت سے پہلے کا ہے۔ میرا ایک لفظ بھی مجھے گھر والوں کے سامنے مجرم بنا دے گا۔۔۔ میں اختلاف نہیں کرسکتی نہ انکار کی سکت رکھتی ہوں۔ میں بے بس ہوں۔ جو کرنا ہے وہ تم ہی کرسکتے ہو۔۔۔!"

وہ اپنا مدعا بیان کرتی' اگلے قدم کی ذمے داری اسے سونپ چکی تھی۔ لہجے میں آس تھی۔ آذر اسے ناامید نہیں کر سکتا تھا۔

"میں امی سے کہہ کر رشتہ بھیجوں گا۔ سب ٹھیک ہو گا۔ مجھے محبت کی طاقت پر یقین ہے۔ تمہیں خود سے دور نہیں ہونے دوں گا۔" اس کے ہاتھ تھامے وہ پرُوثوق لہجے میں کہہ رہا تھا۔ رامین کو اس کی باتوں نے اطمینان بخشا تھا۔

اگلے چند دنوں میں آذر نے اپنا کہا سچ کر دیا تھا۔ مشکل سے ہی سہی، مگر اس نے اپنے گھر والوں کو قائل کر لیا تھا۔ اس کے گھر والے بیٹے کی بات و اصرار کو اس کی خوشی کی خاطر ٹال نہ سکے اور یوں بات آگے بڑھی اور وہ رشتہ لے کر فیاض احمد کے گھر آئے۔ اول تو وہ لوگ ان کی تمام بات تحمل سے سنتے رہے۔ پھر ان کی بات مکمل ہونے کے بعد، اسی تحمل و سلیقے سے رامین کے فہد خضر سے رشتے کے متعلق انہیں آگاہ کرتے ہوئے مناسب انداز میں انکار کر دیا۔ وہ لوگ غیر متوقع انکار پر متعجب سے کئی پل کچھ بول ہی نہ سکے، مگر پھر حواس سنبھال کر انہیں آذر اور رامین کے مابین محبت کے متعلق آگاہ کیا۔ جس کے بعد فیاض احمد کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔ نہایت بے یقینی سے وہ ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے اپنی سماعتوں پر گویا یقین کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ گھر کے باقی افراد بھی گنگ زبان کے ساتھ مضطرب ہوئے تھے۔ فیاض احمد کے غضب ناک غصے سے تمام خاندان والے بھی واقف تھے اور اب تو معاملہ ہی الگ تھا، لیکن تمام تر حیرانگی و غصے کو سمیٹ کر گھر آئے مہمانوں کا لحاظ کیا تھا۔

"بہن جو آپ کہہ رہی ہیں۔ وہ کسی صورت ممکن نہیں۔ رامین کی شادی میری بہن کے بیٹے کے ساتھ طے ہے اور ہو کر رہے گی۔ میں کوئی بد لحاظی یا بد زبانی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برائے مہربانی یہاں سے چلی جائیں۔ ہم اپنی بیٹی کو سمجھا لیں گے۔" دھیمے لہجے میں رسان سے کہتے ہوئے وہ ان کے سامنے سے ہٹ چکے تھے۔ باقی افراد خاموش تھے۔ وہ لوگ صاف انکار کے بعد بے عزتی محسوس کرتے مزید کچھ کہہ بغیر اٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔ غم و غصے کا ایک الاؤ بھی اندر ابھرا تھا۔

وہ جو دروازے کی اوٹ میں کھڑی سب باتیں سن چکی تھی۔ مضطرب سی بے جان قدموں کو لیے ایک جگہ بیٹھ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد رامین سے خصوصی عدالت میں مجرم بنا کر سوال جواب کا تلخ و غصیلا سلسلہ شروع ہوا۔ سب نے باری باری اسے سخت سنائیں۔ فیاض احمد اس کے ہاتھوں ٹوٹتے اعتبار کی کرچیوں کو چننے کے بعد پوروں سے رستے خون کو آنکھوں میں اتارے اس پر زندگی میں پہلی بار برسے تھے۔ اسے سختی سے تنبیہ کی تھی۔ معاملہ رامین کی مسلسل چپ رہنے سے گمبھیر تو نہیں ہوا تھا، مگر وہ غیر متوقع رد عمل کے بعد کمرے میں خود کو لاک کیے بے بسی و بے چارگی سے روتی رہی۔



چند دن مزید گزرے تھے۔ پھوپھو تمام معاملے سے بے خبر اس کے لیے کچھ سامان، کپڑے وغیرہ لے کر آئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ بنا تاثر بیٹھی رہی۔ جسے پھوپھو نے شرم گردانا، مگر امی اسے تمام وقت گھورتی رہی تھیں۔ پھوپھو کے جانے کے بعد البتہ انہوں نے رامین کو سخت سنائی تھیں۔ بڑی بھابھی نے شوہر سے بھی ذکر کیا۔ بات فیاض احمد کے کانوں تک بھی پہنچی۔ انہوں نے نرم لہجے کو درشتی کا روپ دیتے ہوئے اسے خبردار کرتے ہوئے آئندہ یونیورسٹی جانے پہ بھی پابندی لگا دی تھی۔ لاڈلی بیٹی سے یہ دکھ انہیں بری طرح گھائل کر رہا تھا۔ اسے دربدر نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ سختی ہی واحد حل نظر آئی تھی، مگر

عبادت، ابتدائے محبت

بغاوت، انتہائے محبت

فیاض احمد کا فیصلہ و درشتی اس کے دل پر کاری ضرب لگا گئی تھی۔ محبت کی ابتدا سے وہ انتہا تک آذر کے سنگ سفر طے کر چکی تھی۔ واپسی کی کوئی روشن راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اتنی دور آنے کے بعد اتنی آسانی سے ان تمام رنگوں کو پھیکا نہیں کر سکتی تھی جن سے وہ خوابوں کو رنگین کرتی آئی تھی۔ محبت سے

دستبرداری اب ممکن نہ تھی۔ آذر کو فون پر سب بتایا۔ وہ مضطرب ہوا۔ محبت آزمائش ثابت ہو چکی تھی اور وہ آزمائش میں پورا اترنا چاہتے تھے۔ آذر نے بہت وقت سے فیصلہ کیا تھا۔

"میرا ساتھ چلو رامین۔۔۔ میں تمہیں عزت' محبت' مان اور تحفظ دوں گا۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے!" وہ کہہ رہا تھا۔ رامین فیاض سوچ میں پڑ گئی تھی۔ محبت انہیں انتہا پر لے آئی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی اور جدائی موت۔۔۔ زندگی کی پہیلی اس لمحے الجھنے کے بعد' ان کے فیصلے کی منتظر' سلجھنے کو بے تاب تھی۔ محض ایک لمحہ آخری فیصلے تک درکار تھا۔ وہ دونوں صرف ایک دوسرے کے متعلق فکر مند۔۔۔ باقی تمام رشتوں کا احساس بھلائے مطلب پرست بنے تھے۔ جہاں حتمی فیصلہ ہو جانا بہت آسانی سے رقم ہو چکا تھا۔ آذر اس کا گھر کے باہر انتظار کر رہا تھا اور وہ رات کی تاریکی میں آنکھوں میں روشن مستقبل کے خواب سجائے اپنے بڑھتے قدموں تلے باپ کا مان' غرور اور عزت و دستار' بنا کسی دکھ کے روندھے گھر کی دہلیز پار کر گئی تھی۔



گھر میں رامین کی غیر موجودگی سے برپا ہونے والا کہرام' پریشانی و فکر مندی سمیت سخت اذیت میں بدلا تھا۔ لاڈلی بیٹی ان کے منہ پر کالک مل کر نئی زندگی شروع کرنے انہیں پاتال میں اتار گئی تھی۔ رنج و کرب نے فیاض احمد کے دل کو بے رحم شکنجے میں لے لیا تھا۔ سب ان کی فکر میں ان کی صحت کے لیے دعا گو اسپتال کے آئی سی یو کے باہر کھڑے تھے اور فیاض احمد زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔" بڑا بیٹا ارسلان بپھرا ہوا شیر بنا غرایا تھا۔ عفت شوہر کے غصے سے خائف ہوئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ وہ بدبخت تو چلی گئی تم اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی برباد مت کرو۔۔۔ اسے مارنے سے بھی ہمارا دامن بے داغ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دکھ کا حساب اس سے زندگی کی آزمائش وصول کرے گی۔ وہ بدنصیب بھی خوش نہیں رہ سکتی۔۔۔ باپ کو موت کے منہ میں دھکیل کر وہ کبھی سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکے گی۔۔۔ اپنے کیے پر صرف پچھتاوا ہوگا اس کے پاس۔۔۔ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس سے ضروری تمہارے ابو کی صحت ہے۔ سب ان کی زندگی کے لیے دعا کرو۔۔۔" وہ آزردہ تھیں۔ دکھ بے شک بہت گہرا تھا۔ عمر بھر کی عزت ایک تاریک رات کے بعد مٹ چکی تھی' لیکن باقی گھر کو سنبھالنے کے لیے' بیمار شوہر کا خیال جہاں تکلیف کا باعث بن رہا تھا' وہیں سب کو بکھرنے سے بچانا بھی تھا۔ بیٹے کو روک لیا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔

بات بھی ایسی تھی کہ چھپی نہ رہ سکی۔ فردا" فردا" خاندان کے ہر ایک فرد کو علم ہو گیا۔۔۔ پھر کیا تھا۔ ہر زبان نے بے دریغ استعمال کرتے خیالات کو چہ مگوئیوں کا روپ دیا۔ پھوپھو بھی بے یقین سی تصدیق کے لیے آئی تھیں۔ بھائی کی حالت دیکھ کر دل بھی دکھا تھا۔ رامین کو بددعائیں دیں۔ ان کے ساتھ آیا فہد خضر گہرے صدمے کا شکار چپ کھڑا تھا۔ باقی سب افراد مجرموں کی طرح نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ غلطی ایک کر گئی تھی اور سزا پورے گھر کو مل رہی تھی۔

کچھ دن بہت دشواری سے ہی سہی' مگر گزر گئے۔ فیاض احمد گھر واپس آ گئے۔ ایک لفظ بھی ان کی زبان ادا کرنے سے قاصر ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں بھی خالی پن تیرنے لگا تھا۔ بیٹی پر اندھا اعتماد انہیں اندھیری کھائی میں دھکیل کر کرب کے سوا کچھ نہ دے سکا تھا۔

پھوپھو جہاندیدہ خاتون تھیں۔ کڑے وقت میں ان کے ساتھ رہیں۔ ہمدردی ظاہر کی۔ بھائی سے تعلق ختم نہ کر سکیں۔ بیٹے کی شادی کی تاریخ طے تھی۔ بیٹے سے مدحت کے لیے بات کی' مگر فہد خضر دل پر کاری ضرب لگائے چپ تھا۔ فی الوقت معذرت کے ساتھ ماں کو انکار کر دیا اور جلد از جلد ٹکٹ آگے کروا کر چپ چاپ بیرون ملک چلا گیا۔

دوسری طرف لوگوں کی طنزیہ نظریں، تضحیک آمیز باتیں زور پکڑتی جارہی تھیں۔ رشتے دار بھی غیروں کے ساتھ شامل عمل تھے۔ ان کی زندگی کا سکون عمر بھر کی کمائی عزت تو برباد ہو ہی چکا تھا اب اپنے آبائی گھر میں مزید رہ کر ذلت سمیٹنا اور ہزاروں سوالوں کا جواب دینا اذیت بنتا جارہا تھا۔ جب ہی متفقہ فیصلے سے ایک رات اندھیرے میں دروازے کو تالے لگائے کسی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔



"افسوس۔۔۔ تم نے بہت غلط راستہ چنا رامین۔ جہاں وقتی سکون و پھولوں کی راہ گزر تو ہوتی ہے، مگر اسی راہ میں چھپے کانٹے پھولوں کے مرجھاتے ہی پاؤں میں چبھنے لگتے ہیں۔ تمہیں بھی احساس تو ہوگا، مگر تب بے کار ہوگا۔ یہ میرا آخری میسج ہے۔ بس یہ بتانا تھا کہ کبھی واپس آنے کا خیال دل میں مت لانا کیونکہ اب یہاں نہ کوئی تمہارا منتظر ہوگا، نہ تم اس عزت و محبت کا مداوا کر سکتی ہو جو تم نے کھوئی بھی ہے اور ہمارے دلوں سے نوچی بھی ہے۔۔۔ کبھی خود سے شرمندہ ہو کر بھی ہم سے معافی مت مانگنا۔ تم نے جو کیا وہ معافی لائق نہیں ہے۔"

آذر سے نکاح کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ گھر سے نکلتے وقت قدم تو نہیں ڈگمگائے تھے، مگر کچھ دن بعد مدحت نے اسے میسج کر کے باپ کی بگڑی حالت سمیت تمام ذلت و رسوائی جو وہ ان کے حصے میں ڈال کر آئی تھی اسے بتا کر سخت سنائی بھی تھیں۔ رامین نے باپ کی حالت کا سن کر اسے کال کرنی چاہی تھی، مگر تب مدحت نے اسے ناامید رکھا تھا اور اس آخری میسج کے اس نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

وہ بے حساب روئی جارہی تھی۔ اگلے کئی دنوں تک بار بار رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی، مگر ہر بار ناکام ہوئی۔۔۔ پہیلی سلجھانے میں ناکام وہ جہاں الجھی تھی وہیں سے نئی زندگی کی شروعات نئی آزمائشوں کے ساتھ ہوئی۔ سب پرانی یادوں کا بندھن ٹوٹا نہیں تھا البتہ سوچوں پر نئی، مگر کاری ضربیں لگنی شروع ہو گئیں۔

"ہم نے کٹھن راستہ چنا ہے۔ تم ہر قدم پر دل کو مضبوط رکھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" آذر نے کہا۔ اس کے دل کو ڈھارس ملی۔

دونوں ایک ہو چکے تھے۔ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں تھی۔ اول تو ساس نے بیٹے کی خاطر زبان کو اختیار میں رکھا، مگر جوں جوں دن گزرتے، خاندان والے سوالات کا پٹارا کھولتے۔ اس کے ساتھ جب بات آذر کی ذات و کردار پر آتی تو وہ اندر تک کھولتیں۔ بیٹے کا رامین کی وجہ سے انتہائی فعل انہیں سب کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر جاتا۔ بے عزتی تو ان کے بیٹے کی بھی خاندان بھر میں ہوئی تھی۔ جس کا مداوا ممکن تو نہ، مگر انہوں نے کچھ ہی مدت میں ضبط کا پیمانہ لبریز ہونے کے بعد روایتی روپ دھار کر اٹھتے بیٹھتے رامین کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اس کی تذلیل و تضحیک شروع کر دی تھی۔

"ماں باپ کی عزت تو خاک میں ملائی ہی ملائی ساتھ ہمیں بھی کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ بیٹیاں تم جیسی نہیں ہوتیں جو اپنی تسکین کے لیے محبت کا کھیل رچاتی ہیں اور باقی سب کو تماش بین بنا کر عزت کی زندگی جینا چاہتی ہیں۔۔۔ شرم سے ڈوب مرو۔ ہمیں تو ویسے بھی تم دونوں نے جیتے جی مار ہی دیا ہے۔" وہ اسے سخت ملامت کرتیں۔

آذر کی بڑی بھابھی بھی ساس کے ساتھ بات کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتیں اور وہ نظریں جھکائے، ہر ملامت و کڑوی بات کو چپ کا قفل اوڑھے سنتی جاتی۔ ابتدا میں سب ناقابل یقین تھا۔ آذر کی محبت نے اس رخ کے بارے میں سوچنے ہی نہ دیا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکلتا تو پیچھے رامین کی روح تحمل سے چھلنی کی جاتی۔ باتوں کے نشتر بڑی مہارت سے اس کے دل پر نشانہ باندھ کر لگائے جاتے۔ وہ تڑپ کر رہ جاتی۔ کہہ کچھ بھی نہ سکتی۔ کچھ دن اکیلے ہی سب برداشت کیا، مگر ضبط آخری حد تک پہنچ کر اس کے اندر مزید سمٹ

نہ سکا۔ آذر کے سامنے بے بسی سے رو کر من و عن روز کی تمام باتیں کہہ ڈالیں۔

"ہم کسی کا منہ بند نہیں کر سکتے رامین۔۔۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تم نے جو کیا وہ میری وجہ سے میرے کہنے پر کیا، مگر کسی کو بھی سمجھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ دستور دنیا ہے۔ کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔ تم میری خاطر جہاں اتنا بڑا قدم اٹھا کر آئی ہو، وہاں ایک احسان مجھ پر اور کردو۔۔۔ اپنی سماعت و زبان کو ناکارہ کردو۔۔۔ میری خاطر کسی کو کچھ مت کہو، نہ کسی سے کچھ بھی سن کر ری ایکٹ کرو۔۔۔ تمہارے چپ رہنے اور کچھ نہ بولنے سے سب رفتہ رفتہ معمول پر آجائے گا۔" جواباً" آذر شفیق نے اسے سمجھایا تھا۔

رامین نے اسے سننے کے بعد اثبات میں سر ہلایا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسے یہیں اس گھر میں ان سب کے ساتھ ہی رہنا تھا تو گونگی بہری بننے میں قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ آذر کے پاس کوئی نوکری نہیں تھی۔ پڑھائی بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اوپر سے رامین کی پڑھائی بھی نامکمل تھی۔ ایک دم سے وہ یونیورسٹی بھی نہیں جاسکی تھی۔

"رامین۔۔۔ تم اب یونی مت جانا۔ ہر زبان پر ہم دونوں کا نام ہے۔ مجھ پر بھی سوالیہ نظریں اٹھتی ہیں جن میں تنفر و تضحیک کے ساتھ ملامت بھی ہوتی ہے۔ میں مرد ہوں برداشت کرلوں گا، لیکن تم وہ سب فیس نہیں کرسکوگی۔۔۔ تم پرائیویٹ ہی تعلیم مکمل کرلینا۔" اور کچھ دن بعد تو آذر نے وہاں صورت حال پرکھنے کے بعد اسے منع کردیا تھا۔ جواباً" احتجاج اس کے لبوں پر ہی مچل سکا تھا۔ آذر کے دوٹوک لہجے نے اس کی آواز کو ابھرنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ چپ ہوگئی۔ آذر نے اگلے کچھ دنوں میں نوکری کی تلاش بھی شروع کردی تھی کہ ابو اور بڑے بھائی پہلے تو اس پر سخت غصہ تھے رامین کو لے کر، اب اس کے آنے سے خرچے پر اتنا کوئی خاص فرق تو نہیں پڑا تھا، مگر انہوں نے واضح کہہ دیا تھا۔

"تمہارے ساتھ ہم اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتے۔ رہو بے شک اسی گھر میں، مگر اس کا خرچا خود اٹھاؤ۔" اپنی تئیں وہ بیٹے کو اس کے غلط فیصلے کی سزا بھی دینا چاہتے تھے۔ اسے ذمے داری کا احساس دلانا ازحد ضروری بھی تھا۔ آذر نے باپ کی بات پر خفگی کے بجائے عمل کرنا ضروری سمجھا تھا۔ رامین اسے عزیز تھی۔ اور جب اس سے شادی بھی کرچکا تھا تو پیچھے قدم کھینچنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ نوکری کی تلاش میں اسے کافی دقت کا سامنا بھی رہا، مگر سخت محنت اور رامین کی محبت رنگ لائی تھی۔ اسے ایک چھوٹی سی جاب ملی تھی جسے اس نے تشکر سے قبول کیا تھا۔



آذر شفیق۔۔۔ رامین فیاض سے محبت اور اسی محبت میں کیا گیا جذباتی فیصلہ جو سرزد تو مجبوری میں ہوا تھا، مگر نبھانا مکمل ہوش و حواس میں کشادہ دل کے ساتھ تھا۔ چھ سال گزر گئے تھے۔ مگر ان گزرے چھ سالوں کا ایک ایک دن صدیوں پر محیط ان دونوں کے لیے کڑا امتحان بنا تھا۔ رامین گونگی بہری بھی بنی رہی۔ کوئی کچھ بھی کہتا برداشت کرلیتی، مگر آزمائش یہی نہیں تھی۔ امتحان اور بھی باقی تھے۔ گھر والوں کا رویہ پہلے رامین اور اب اس سے بھی اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ آذر کی قسمت بھی ان سالوں میں ڈگمگائی ہی رہی۔ نہ مالی لحاظ سے مستحکم ہوسکا نہ گھر میں اس کے ہاں وہ خوشی آسکی جو شاید۔۔۔ شاید سب کے دلوں میں رامین کے لیے گنجائش پیدا کرسکتی۔ جو شاید ان دونوں کی غلطی کو سدھار کا روپ دے سکتی۔

شفیق صاحب کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا وقاص شفیق تھا۔ جس کی شادی پندرہ سال پہلے چچازاد کنزیٰ سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اکلوتی بہن عائشہ تھی جس کی شادی کنزیٰ کے بھائی ریحان سے ہوئی تھی۔ ادلے بدلے کی اس شادی میں عائشہ کو اللہ پاک نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا، جب کہ کنزیٰ اور وقاص کے ہاں تلے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں

پیدا ہوئی تھیں۔ پہلی دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد بیٹے کی خواہش نے بیٹیوں کی لائن بنادی تھی اور کنزیٰ کے مسلسل چار آپریشنز کے بعد مزید امکان بچا ہی نہ تھا' جس کا غم باپ سمیت دادا دادی کو بھی تھا' مگر وٹے سٹے کی شادی نے ان کی خواہش کو منوں مٹی تلے دفنا دیا تھا۔

بیٹی اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس کی خوشی کو سلامت دیکھنا چاہتے تھے۔ اب آخری امید آذر شفیق ہی تھا۔ رامین سے اس کی شادی کو انہوں نے دل سے قبول تو نہ کیا تھا' مگر پوتے کی خواہش ان کے دل کو نرم کرنے لگی تھی لیکن۔۔۔ ٹیسٹ کروانے پر پتا چلا کہ رامین کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔ یہ خبر رامین کے ساتھ ساتھ آذر کی بھی ہمت و حوصلہ پست کر گئی تھی۔ وہ رامین کی طرح زاروقطار رویا تو نہ تھا' مگر اسی شدت سے غم زدہ ضرور ہوا تھا۔ رامین کی مضطرب سوالیہ نگاہوں میں اس کی شکست خوردہ حالت بھی اذیت کے آثار مزید نمایاں کرتی' مگر آذر گہری چپ سادھے پہلو بدل کر رہ جاتا۔ وقت بھی گویا کرب و آزمائش سمیٹے ٹھہر سا گیا تھا۔

گھر میں بھی گمبھیر خاموشی بسیرا کرنے لگی تھی۔ رامین کے کانوں میں ساس کے زہر اگلتے الفاظ میں نمایاں کمی آئی تھی۔ کنزیٰ بھی زبان کو قفل ڈالے اپنی بچیوں میں مگن تھی۔ البتہ اس نے محسوس کیا تھا۔ آذر اب اس سے زیادہ ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ اسے مسئلہ تو کوئی نہ تھا' مگر نہ جانے" وہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے سے بہت کم اس کے ساتھ بیٹھ کر باتوں کے بجائے پرسوچ انداز اپنائے رہتا۔ اس کا ذہن الجھنے لگتا۔ تنگ آکر اس سے دبے لفظوں میں گلہ بھی کرتی اور جواباً" وہ سپاٹ انداز میں جواب دیتا۔

"امی کو پوتے کی بہت خواہش تھی۔ افسوس وہ اب تک پوری نہ ہو سکی۔۔۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں رامین' مگر مجھے بہت دکھ ہے۔ اگر ہمارے ہاں اولاد ہوتی تو ہماری زندگی سے افسوس اور تلخی مٹ جاتی۔ ہمارا غلط فیصلہ درست سمت اختیار کر لیتا۔" اس کا انداز عجیب ہوتا۔ رامین کو گہرا دکھ اپنے گھیرے میں لیتا۔ آذر ایسا تو نہ تھا نہ اس کا لب و لہجہ۔۔۔ نہ ہی وہ ڈھکی چھپی بات کرنے کا عادی تھا۔۔۔ پھر اب کیوں۔۔۔ بے شمار الجھے سوال اسے الجھانے لگے تھے۔ اس کی ذہن و دل میں سلجھاؤ کا کوئی سرا نہیں تھا۔ ہر گزرتا دن اسے کرب کے حوالے کرنے لگا تھا۔ یہ حقیقت تھی یا اس کا وہم۔۔۔ آذر شفیق اس سے دور ہو رہا تھا۔ وہ اس سے بدگمان نہیں ہونا چاہتی تھی۔

آذر زیادہ تر وقت باقی گھر والوں کے ساتھ ہی گزارتا۔ رامین کا خیال دل کو بے چین بھی کرتا' مگر وہ کم توجہ دیتا۔ وجہ ماں باپ کی خواہش۔۔۔ اور اس خواہش کی اوٹ میں چھپی دھمکی تھی۔

"تم بے شک رامین کو طلاق نہ دو' مگر تمہیں جویریہ سے شادی کرنی ہوگی۔ ہمیں اس خاندان کا وارث چاہیے۔۔۔ بہ صورت دیگر تم یہ گھر اور جائیداد ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔" شفیق صاحب کا قطعیت بھرا انداز اسے سوچنے پر مجبور کر گیا تھا۔ وہ رامین کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا' مگر جائیداد سے بھی ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ خود مالی لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ گھر چھوڑ کر کرائے اور دیگر جھمیلوں کو برداشت کر سکتا۔ ان سے وقت مانگ کر کوئی بہتر راہ تلاش کرنے لگا۔ رامین سے محبت نے' رامین کو اتنے دور لانے کے بعد رامین کے ساتھ کی ہی گواہی دی تھی۔

لیکن جویریہ پچھلے کئی سالوں سے ماں کی پسند اور خالہ زاد تھی۔ خالہ کو بھی اپنی بیٹی کے لیے آذر کا رشتہ منظور تھا۔ وہ شوہر کی وفات کے بعد خود طبیعت خرابی کے باعث زندگی سے بے زار بیٹی کو بیاہنا چاہتی تھیں۔ ان کی اپنے سسرال میں کبھی کسی سے نہ بنی تھی کہ وہاں بیٹی کی بات آگے بڑھاتیں۔ کچھ ابتدا سے جویریہ آذر کے لیے جذباتی بھی تھی۔ یوں ان سب کے لیے فیصلہ بے حد آسان تھا' مگر مشکل میں آذر پھنسا تھا۔

مشکل سے نکلنے کا حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ رامین کی آنکھوں میں بھی ہر وقت سوال رقص

کرتے۔ کئی دن اس نے پریشانی میں گزارے تھے، مگر فرار کی راہیں بند گلی میں آکر رک گئی تھیں۔ اسی نے سخت لفظوں میں اس سے جواب طلب کیا تھا اور تب محض ان کا غصہ شانت کرنے کے لیے ان نے اثبات میں سرہلا دیا تھا کہ اب آگے جو ہو گا دیکھ لیا جائے گا۔



"میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے عزت' محبت اور مان ہے۔ میں تمہیں تحفظ دینا چاہتا ہوں۔ تم سے بھاگ نہیں رہا۔ مجھے اپنا ہر وعدہ یاد ہے' لیکن یہ فیصلہ مجبوری کے تحت کرنے کے باوجود انتہائی اہم تھا۔ ورنہ ہم دونوں کو دربدر کی ٹھوکریں ہی ملتیں۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو نا رامین۔۔۔!" وہ ہمت مجتمع کرتا تمام صورت حال اسے بتاتے اب آہستگی سے کہہ رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا۔ انداز نارمل تھا۔ لب و لہجہ اسے قائل کرنے میں محو تھے۔ جب کہ وہ نم آنکھوں کے ساتھ گنگ زبان لیے کھڑی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم نے میری وجہ سے بہت درد سہا ہے۔ اپنے گھر والوں کو چھوڑا ہے۔ میرے گھر والوں کی ہر غلط بات کو میری وجہ سے برداشت کیا ہے۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا یا شاید اسے قائل کرنے کے لیے اعتراف کر رہا تھا۔

"مجھے آج بھی تم سے محبت ہے اور بے پناہ محبت ہے' لیکن محبت تلخ حقیقت و مشکلات کا مقابلہ جتنا چاہے کرلے' مگر ایک مقام پر تھک جاتی ہے۔ زندگی کی حقیقت محبت کی طاقت سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ بات صرف میری ہوتی تو میں ایسے ہی مزید چھ ہزار سال بھی تمہارے ساتھ گزار دیتا لیکن۔۔۔!" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے رامین فیاض کے لبوں نے جنبش کی تھی۔

"لیکن زندگی کی پہیلی کو جو غلط بوجھ لے وہ تمہارہ جاتا ہے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ کئی سال پہلے کہے گئے باپ کے الفاظ نے اس کے کمزور دل کو بری طرح مضبوط شکنجے میں جکڑا تھا۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گا رامین!" آزر نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"میں تمہاری شراکت داری ایک ہی گھر میں کیسے برداشت کرسکتی ہوں آزر۔" وہ درد سمیٹ رہی تھی۔ رامین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھا تھا۔

"میں حالات سے مجبور ہوں۔" اس نے عذر پیش کیا۔ اپنے فیصلہ سے پیچھے ہٹنا اس کے بس میں اب نہیں تھا۔

"اور میں۔۔۔؟"

"تم واپس جا نہیں سکتیں۔۔۔ میں تمہیں یوں چھوڑ نہیں سکتا۔ سمجھوتا واحد حل ہے۔" وہ بولا تھا۔

"چھ سال میں نے سمجھوتا ہی تو کیا ہے۔ ہر بات برداشت کی۔ لبوں کو سی کے رکھا۔ جانتی ہوں میرے لیے واپسی کی کوئی گنجائش نہیں ہے' لیکن حال اور مستقبل۔۔۔ ان سے کیسے نظریں چراؤں۔۔۔ تمہارے ساتھ کسی اور کو میں نہیں دیکھ سکتی۔۔۔" وہ ضبط کی حدیں پار کرتی اس کے سامنے پھٹ پڑی تھی۔ یاسیت سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ شاید اب پروا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نرمی کا لبادہ اوڑھ کر بات کرنا بات کو بڑھاوا دے رہی تھی۔

"نہیں دیکھ سکتیں تو نابینا بن جاؤ۔ یوں سمجھو کہ اب تک زبان و سماعت ہی ناکارہ تھیں، مگر آگے بصارت سے بھی محروم ہو جاؤ گی۔ رہنا تو تمہیں میرے ساتھ اسی گھر میں ہے۔ تم سے محبت کا لحاظ ہے۔ طلاق نہیں دینا چاہتا تمہیں' لیکن صرف محبت کی وجہ سے گھر و جائیداد سے بے دخل نہیں ہونا مجھے۔۔۔ میں جویریہ سے شادی کروں گا۔ تمہیں بتانا میرا فرض تھا۔ باقی میں کوئی وضاحت نہیں دوں گا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔" ایک ایک لفظ واضح کہتا وہ اسے بری طرح مایوس کرتا کمرے سے جا چکا تھا۔

اور اس کے جانے کے بعد رامین فیاض بے جان قدموں سے چلتی کھڑکی کے قریب آئی تھی۔ اندر دل و دماغ حیرانگیوں کو سمیٹتے بری طرح انتشار کا شکار تھے۔ وہ

پل بھر میں بکھر چکی تھی۔ آج چھ سالوں بعد پہلی دفعہ اسے شدت سے اپنے غلط فیصلے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ آنسوؤں سے تر آنکھوں کو خالی ہاتھ کی الجھی لکیروں پر جمائے وہ کرب و اذیت کے نئے دور سے گزری تھی۔ جہاں وہ تمام چہرے اپنا عکس نمایاں کرتے اس پر غم وغصے کا اظہار کرتے اس کے فیصلہ کو لعنت ملامت کر رہے تھے جنہیں وہ محض محبت کی خاطر تاریک رات میں اپنے روشن مستقبل کی خاطر بے رحم پیروں تلے کچل کر نیا خوشیوں بھرا گھر بسانے ان سے بہت دور بہت آگے نکل آئی تھی۔

پچھتاووں نے الگ اس کے گرد گھیرا تنگ کر لیا تھا۔ یہ حقیقت بڑی تلخی سے اس کے اوپر کھلی تھی کہ جو قدم رات کی تاریکی میں عزتوں کو پامال کر کے اٹھائے جائیں وہ کیسے روشن منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ جس پہیلی کو دانستہ الجھایا جائے وہ محض محبت کا منتر پڑھنے سے کیسے سلجھ سکتی ہے اور جو محبت خونی رشتوں کا خون کر کے پروان چڑھائی جائے وہ راحت کیسے دے سکتی ہے۔ یہ احساس اسے نادم کیے جا رہا تھا۔ آج آنکھ سے آنسوؤں کی روانی بھی شدید تھی۔

وہ ہنوز اسی جگہ کھڑی تھی۔ گہرے کالے سیاہ بادل اب ہواؤں کی شدت کو جذب کرتے طوفانی بارش برسا رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کے دکھ میں شریک اس کا غم بانٹ رہے ہوں۔ ماضی سے حال میں آتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے حقیقتاً "تاریکی نظر آئی تھی۔

"آہ۔ میں نابینا ہی تو تھی۔!" وہ آزردہ اندر ہی اندر چلائی تھی۔ یادوں کا کرب ناک سفر اختتام پذیر ہوتے ہی اسے احساس دلا گئے تھے۔

"نابینا ہی تو تھی میں جو محبت کی عارضی روشنی کے پیچھے اپنے سگے، مخلص رشتوں کی چمک نہ دیکھ سکی۔ نابینا ہی تو تھی جب ہی اندھیرے میں اٹھتے قدموں تلے روندھی جانے والی اپنے ماں باپ بھائیوں کی عزت نہ دیکھ سکی۔ اگر دیکھ لیتی تو کبھی بڑھتے قدموں کو کھائی کے کنارے نہ لاتی، کبھی خوشیوں سے بھرے دامن کو خالی کر کے خوشیاں تلاش نہ کرتی۔ کبھی خالی ہاتھ نہ ہوتی۔!" افسوس کا نیا باب کھلا تھا۔ وہ خالی ہاتھوں کو دیکھ کر تڑپی تھی۔

"کاش میں وہ ایک غلط قدم نہ اٹھاتی۔ کاش۔!"

وہ اپنے ہی غم میں بے حال بیٹھی تھی۔ جب ہی کمرے میں داخل ہوتے آذر شفیق کی اسے خبر نہیں ہوئی تھی۔ آذر نے اندر آتے ہی اسے دیکھ کر خود کو آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل بھی رامین کو روتا دیکھ کر آزردہ ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو کیا تھا۔

"رامین۔!" اسے پکارا۔

آواز پر وہ گویا ہوش میں آئی تھی۔

"ہم سب خالہ کے گھر جا رہے ہیں۔ تم دروازہ لاک کر لو۔!" وہ سپاٹ انداز میں کہتا بنا اس کا جواب نے، بنا اس کی آنکھوں میں دیکھے الٹے قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

رامین کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری تھی۔ آذر کا یوں نظر چرا کر جانا اسے آئندہ کی کہانی کا مرکزی خیال سمجھا گیا تھا۔ مگر وہ اسی لمحے آئندہ کی پہیلی کو سلجھانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ مزید اذیت، آزمائش اور مستقل تشنگی اس کے حصے کا روگ بننے جا رہے تھے۔ آخری بار اس نے کھڑکی سے نظریں بارش پر ڈالی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بارش میں مانگی گئی دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ **مستجاب** ہوتی ہیں۔ اور آج جب اسے احساس ہو چکا تھا تو آزردہ دل سے لبوں پر دعا مچلی تھی۔

"امی ابو۔ اگر ہو سکے تو اپنی اس بدنصیب کو معاف کر دیجیے گا۔ افسوس میں عمر بھر آپ لوگوں سے مل نہیں سکتی مگر جو دکھ میں نے آپ کو دیا اس سے کڑا دکھ اب ساری زندگی جھیلنا ہی میرا مقدر ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔" وہ معافی کی خواستگار تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے وقت آنکھوں کو رگڑتی وہ جبراً" مکمل نابینا بھی بن چکی تھی۔

☆ ☆

آسیہ مرزا

من مورکھ کی بات نہ مانو

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کرلیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے' مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے' مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا' مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی سے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے' حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہ ہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے' فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے' مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنالیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات



وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ بابر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے بابر سے ہرگز نہیں ملنا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔ (اب آگے

بائیسویں قسط



سر مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے
پہلے اک روزن در توڑا تھا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے

بابر اپنے روم میں صوفے پر ترچھا بیٹھا تھا اور سر صوفے کی پشت پر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے تھا جب عاظمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ وہ صدمے سے چور دکھائی دے رہی تھیں۔

''یہ کیا کر دیا تم نے بابر۔'' وہ بابر سے الجھ پڑیں۔ ''تمہیں کچھ خبر ہے وہ جا رہی ہے۔'' ان کی آواز میں خوف تھا۔ بہت کچھ کھو جانے کا۔

''اسے جانا ہی ہے تو کون روک سکتا ہے۔'' بابر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا لہجہ دھیما تھا جس میں گہری سنجیدگی تھی۔

''تم نے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' عاظمہ کم سن بچے کی طرح ناراض ہو کر بولیں۔ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کی بند سلائنڈ سے باہر تاریکی کو گھورنے لگا۔ جو دھیرے دھیرے اپنے قدم جما رہی تھی۔

''مگر تم علی شاہ کے بغیر کیسے رہو گے اور میں۔۔۔ میں اس کے بنا کیسے رہوں گی بابر۔ مجھے تو اس کی عادت ہے۔'' عاظمہ تڑپ کر اس کے نزدیک آئیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''اسے روک لو بابر۔ کوشش تو کرو۔ دیکھو وہ جا رہی ہے۔''

''آپ کسی کے دل میں زبردستی داخل نہیں ہو سکتے چاہے لاکھ کوشش کر لیں۔ اس کا یہاں رہنا سوائے اذیت کے کچھ نہیں میرے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ اسے جانے دیں اس کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' عاظمہ کا ہاتھ اس کے شانے پر بمارہ گیا۔ وہ دکھ کے احساس کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''پتا نہیں وہ اتنی سنگ دل کیوں ہو رہی ہے حالانکہ وہ تو بہت نرم دل لڑکی ہے پھر۔۔۔ پھر کیوں اس کا دل تمہارے لیے اتنا سخت ہو گیا ہے۔'' باوجود ضبط کے کئی قطرے عاظمہ کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

''کیا کمی ہے تم میں۔ وہ کیوں تم سے محبت نہیں کرتی۔ تم بے پناہ محبت کرتے ہو، کیا وہ جانتی نہیں ہے۔ پھر پھر کیوں وہ اتنی ظالم بن رہی ہے۔''

''محبت خالص پن مانگتی ہے اور شاید میری محبت خالص نہیں تھی اس لیے اس کے دل پر اثر نہیں کر سکی۔'' وہ آزردگی سے ہنسا پھر رائٹنگ ٹیبل پر رکھا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ اسے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ مگر پھر اس کا ہاتھ رک سا گیا۔ بے خیالی میں اٹھایا ہوا پیکٹ عاظمہ کی موجودگی کا خیال کر کے اس نے دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا اور اضطرابی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے بابر! بس مجھے لگتا ہے میرا دل بند ہو جائے گا اس گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔'' وہ خود بھی صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑیں۔

''مام کیا ہو گیا ہے آپ کو، صبح بھی آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ چلیں اٹھیں میں آپ کو روم میں لے جاؤں۔'' وہ ان کے رونے پر یک دم پریشان ہو گیا اور نرمی سے ان کے کندھوں سے تھام کر انہیں اٹھانے لگا۔

''بابر تم۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے نا۔'' وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر بابر کو دیکھنے لگیں ان کی آنکھوں کی ایک انجانا خوف تھا۔ بابر نے تڑپ کر ان کو کندھوں سے تھام لیا۔

''وہاٹ آر یو سیئنگ مام (آپ کیا کہہ رہی ہیں مام!) میں آپ کو کیوں چھوڑ کر جاؤں گا۔''

''خفا ہو کر اس گھر سے۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ حوریہ سے۔۔۔ دکھی ہو کر۔'' عاظمہ بے بسی سے بولیں۔

''کم آن مام۔ ایسا کچھ نہیں کرنے والا میں، آئی شیور۔'' وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یقین دلاتے ہوئے بولا۔ تب وہ یک دم کسی ٹوٹی ڈال کی طرح بابر کے سینے سے جا لگیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''میں کتنی مجبور اور بے بس ہوں بابر۔ چاہتے ہوئے بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ کوئی خوشی نہیں دے سکتی تمہیں۔''

''آپ میرے پاس ہیں یہی بہت ہے میرے لیے۔ بہت قیمتی رشتہ ہے میرا آپ سے۔ آپ ماں ہیں آپ کی دعا۔ گفٹس ہیں میرے لیے۔''

''دعا۔'' عاظمہ کے جھل جھل بہتے آنسو ٹھہر گئے۔ انہوں نے بابر کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی انہونی بات سن لی ہو۔

''ہاں ماما آپ کی دعائیں سب کچھ ہیں میرے لیے۔ آپ بس سویٹ سی دعائیں کیا کیجیے میرے لیے اور اپنے لیے بھی۔'' اس نے محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

عاظمہ کے دل کو اذیت کی کوئی لہر گویا کاٹتی ہوئی گزر گئی ان کا دل شرمندگی کے پاتال میں اترنے لگا۔ دعا تو کبھی انہوں نے مانگی ہی نہیں۔ نہ حازم کے لیے نہ بابر کے لیے۔ انہیں تو شاید دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ کبھی عباد کی زندگی کے لیے دعا نہیں مانگی۔

میں ایک بہت بری اور نادان عورت ہوں بابر...... ماں ہو کر میں نے کبھی تمہارے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائیں نہیں مانگیں۔ بیوی ہو کر ایک شوہر کی زندگی اور تندرستی کی دعا نہیں مانگی۔ میری جیسی بدنصیب ماں اور بیوی اور کون ہوگی۔ ان کا دل رونے لگا۔ وہ بابر سے یہ سب کہنا چاہتی تھیں مگر لفظ گرفت میں نہیں آرہے تھے۔ احساس ندامت نے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ وہ دل گرفتہ ہو کر رہ گئیں۔ بابر نے انہیں نرمی سے تھام کر کھڑا کر دیا۔

''آیئے کمرے میں چلیے کچھ دیر ریسٹ کر لیں۔'' وہ انہیں زبردستی ان کی خواب گاہ میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر نفیسہ کو ان کا خیال رکھنے کی تاکید کرنے لگا۔

☆☆☆

سوگوار لوگوں کو، بے قرار لوگوں کو
زندگی میں کوئی بھی ضابطہ نہیں ملتا
روح کی زمینوں پر اک عجیب عالم ہے
درد اور تمنا میں فاصلہ نہیں ملتا

حوریہ کے لیے ہر گزرتا لمحہ اعصاب شکن تھا اسے لگ رہا تھا وہ عجیب دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف علی شاہ اس کا مستقبل۔۔۔ اس کی خوشیاں ایک طرف اپنا مان۔۔۔ بھرم۔۔۔ ایگو۔

وہ اپنا سامان پیک کر چکی تھی۔ روانگی سے قبل اس نے سوچا کم از کم عاظمہ سے اسے ضرور مل کر جانا چاہیے۔ مگر دوسرے پل اس کی عقل نے اسے، اس اقدام سے باز رکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ بھی یہ سوچ کر سہم گئی اگر عاظمہ سے ملنے گئی تو ان کے آنسو ان کا اصرار ان کی گڑگڑاہٹیں اس کے قدموں کو جکڑ لیں گی۔ اس کے ارادوں کو ڈگمگا دیں گی۔ اسے کمزور کر دیں گی۔ اور وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گیلانی ہاؤس سے ناتا چھوٹ جائے گا تو وہ یقیناً پرسکون ہو جائے گی۔ زندگی میں ٹھہراؤ اور ضابطہ آجائے گا۔ یہ جو بے قراری ہے اسے قرار آجائے گا۔

وہ عاظمہ کے روم کی طرف جانے کے بجائے پارکنگ ایریا کی طرف چلی گئی۔ ڈرائیور کو سامان دیا اور خود گاڑی میں جا بیٹھی۔

آہستہ روی سے گاڑی پارکنگ ایریا سے نکل گئی۔ گیلانی ہاؤس کا پھاٹک بند ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

دیوہیکل سیاہ گیٹ خودکار انداز میں بند ہوگیا تھا۔

ایک پل اسے لگا اس کا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوبا ہوا اور یک دم سناٹا چھا گیا ہو۔ ایسا سناٹا جو ہوا سے محروم چاند پر ہوتا ہوگا۔ یا کسی اجاڑ ویران اسٹیشن پر جہاں سے گاڑی گزر جاتی ہے اور اپنے پیچھے ویرانہ چھوڑ جاتی ہے۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں اور سر سیٹ کی پشت سے لگا لیا اور اس احساس سے نجات پانے کی شعوری کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

عاظمہ ٹرینکولائزر کے زیر اثر سو رہی تھیں، بابر گاڑی کی چابی اٹھائے باہر نکل گیا۔ اسے یک دم گیلانی ہاؤس میں وحشت سی ہونے لگی تھی۔ در و دیوار سے ویرانی اور سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ لابی میں پڑے علی شاہ کے کھلونے اس کے اعصاب کو متاثر کر رہے تھے۔

''ان سب چیزوں کو علی شاہ کے روم میں احتیاط سے رکھوائیے امیر علی! کوئی بھی چیز خراب نہ ہو۔ نہ ادھر ادھر ہو۔'' وہ امیر علی سے کہتا۔ اس کی بے بی سیٹر پر ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔

وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی بھگانے لگا۔ امیدیں دم توڑ جائیں۔ ولولے، امنگیں، خواب بکھر جائیں تو زندہ رہنا' بے کار شغل بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی بے معنی سی شے محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اس بھاگتی دوڑتی زندگی کا بے کار عضو ہو کر رہ گیا ہو۔

ایک چھوٹی سی امید کی کرن آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے مگر جب اس کرن کا آسرا بھی ٹوٹ جائے تو آدمی یاسیت کی آخری اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے، بے حسی کے خلا میں اتر جاتا ہے۔ ایسا خلا جہاں نہ کوئی سوچ اترتی ہے نہ خیال۔ بس ویران صحرا جیسا سناٹا۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔

پتا نہیں یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے یا دائمی۔ اس نے آدھ جلی سگریٹ بجھا کر شیشے سے باہر پھینکتے ہوئے سوچا۔ اور ہلکے سے ہنس دیا۔ ایسی ہنسی جو خود پر ہنستی معلوم ہو۔

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

جہاں رنگ کے سارے خس و خاشاک سب صنوبر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے سال پر

کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر

بنتے بنتے رہ گیا ہے

وہ اک گھر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں

بس اک دن کی لوح محفوظ پر

اچانک رات اترے گی!

☆☆☆

حوریہ کی پاور ہاؤس میں واپسی نے سب کو چونکا دیا تھا اور متفکر بھی کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی چند ضروریات کی چیزوں کے ہمراہ آئی تھی مگر اس بار اس کا سامان دیکھ کر ہر کوئی ٹھٹکا تھا۔ دن تو نکل گیا رات رقیہ بھابھی سے رہا نہیں گیا۔

''تم رہنے آئی ہو یا وہاں سے جھگڑ کر چلی آئی ہو۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ مومنہ! یاور علی سب کی

نظریں بیک وقت حوریہ پر اٹھی تھیں۔
''چلیں شکر میرے وجود کا کسی کو خیال تو آیا۔'' وہ علی شاہ کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے استہزائیہ ہنسی۔
''میں سمجھ رہی تھی اب میرے ہونے نہ ہونے کا احساس ہی مٹ گیا ہے یہاں۔''
''غلط بات مت کرو حوریہ'' رقیہ بھابھی خفگی سے اسے ٹوک گئیں۔ ''جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''
''ہاں ہمیشہ کے لیے آگئی ہوں۔ مگر گیلانی ہاؤس سے اب کے اجازت نامہ لے کر آئی ہوں۔'' پھر مومنہ کی اٹھنے والی نگاہوں سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔
''میری بات کا یقین نہ آئے تو بابر کو فون کر کے پوچھ لیں۔ میں جھگڑ کر آئی ہوں نہ چھپ کر بابر اور عاظمہ آنٹی کی رضامندی سے آئی ہوں۔''
''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم ہر فیصلہ بغیر سوچے سمجھے خود کیوں کر لیتی ہو۔''
رقیہ بھابھی کے لیے یہ خبر کسی بھاری پتھر کی طرح تھی۔ یاور علی اور مومنہ بھی یک دم گم صم ہو کر رہ گئے تھے۔ مومنہ کے چہرے پر ایک تکلیف دہ رنگ آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس کے حافظے میں بابر سے ہونے والی گفتگو محفوظ تھی۔ یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی باتوں کا فوری ردعمل ہوگا۔ بے شک وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ حوریہ کو فیصلہ کرنے کا حق ضرور دے بابر۔ مگر باوجود اس کے اس کا دل دکھ کی اتھاہ میں ڈوب رہا تھا۔
''مجھے لگتا ہے میرا یہاں چلے آنا آپ سب کے لیے شاک ثابت ہوا ہے۔'' وہ طائرانہ نگاہ میز پر ڈالتے ہوئے بولی۔ اور کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی۔
''نہیں ایسا نہیں ہے، مگر تمہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے ماں باپ سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے تھا۔'' یاور علی نرمی سے گویا ہوئے۔ تاہم انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔
''کیا مشورہ؟''
''یہی کہ تمہیں اپنا گھر اس طرح ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آنا چاہیے یا نہیں۔'' رقیہ بھابھی کرسی دھکیل کر اٹھ گئیں۔
''کیا مطلب! میرا گھر وہ نہیں یہ ہے اور میں اپنے گھر میں واپس آئی ہوں۔'' وہ برا مان کر بولی۔ ''مگر مجھے لگتا ہے آپ کو بہت برا لگا ہے میرا آنا۔'' اس نے رقیہ بھابھی کو شکایتی نظروں سے دیکھا اور علی شاہ کو اٹھا لیا۔
''یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ مگر حوریہ اس طرح کے فیصلے ضد اور غصے میں نہیں کیے جاتے۔ علی شاہ کا پورا فیوچر ہے تمہارے سامنے۔ اسے تم نظر انداز کیسے کر سکتی ہو۔''
''یہ میرا بیٹا ہے اس کی ذمہ داری میری ہے بابر کی نہیں اور اگر آپ لوگ مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہیں تو فکر مت کریں میں اپنا بوجھ خود اٹھاؤں گی اپنا کما کر کھاؤں گی۔ آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔'' وہ غصے سے علی شاہ کو اٹھا کر کمرے میں چلی گئی اور دروازہ کھٹ سے بند کر دیا۔ رقیہ بھابھی وہیں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ یاور علی نے فقط ہلکی سانس کھینچی اور اسٹک کے سہارے پلٹ کر اپنے روم میں چلے گئے۔
''وہ تو ہے ہی کم عقل مگر آپ کو ابھی اس سے الجھنا نہیں چاہیے تھا۔'' مومنہ ٹیبل پر سے برتن سمیٹنے لگی۔ رقیہ بھابھی نے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا اس نے یہاں آ کر حماقت کا ثبوت نہیں دیا۔''
''نہیں...... بالکل نہیں۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اسے یہ احساس کیوں دلا رہے ہیں ہم لوگ کے اس کا یہاں رہنا آنا ہمارے لیے خوشی کا نہیں، فکر کا باعث ہے۔''
''ہاں تو فکر تو ہے ناں۔'' رقیہ بھابھی نے کہا تو مومنہ نے متاسفانہ سانس کھینچ کر رقیہ بھابھی کی کم عقلی پر گویا ماتم ہی کیا تھا۔

”ضروری تو نہیں کہ ہم اپنی فکروں کو اس پر ہر بار ظاہر کرتے رہیں۔ اسے جتاتے رہیں۔ اسے یہ احساس دلاتے رہیں کہ ہمیں اس کی اور علی شاہ کی فکر ہے۔ اس کا وجود ہمارے لیے پریشانی بن رہا ہے۔“

”پھر کیا کرتی میں؟“ رقیہ بھابھی کا لہجہ پست ہو گیا ندامت ان کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی ظاہر تھی۔ ”اس کی طرف دیکھتی ہوں تو اس کے اجڑنے کا غم نئے سرے سے دل پر ٹپکنے لگتا ہے اور اباجی کو تم نے دیکھا کتنے گم صم سے ہو گئے ہیں۔ انہیں بھی حوریہ سے اتنے جذباتی پن کی امید نہیں تھی۔“

”ایسا نہیں ہے رقیہ بھابھی! ہم جو سوچتے ہیں ضروری نہیں وہ ہی ٹھیک ہو۔ بہت سی باتیں بظاہر غلط دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ فیصلے اذیت ناک ہوتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ وہ غلط ہی ہوں۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرتا ہے۔ اور ہمیں صبر اور سمجھ داری سے کام لینا ہوگا۔ حوریہ ہمارے ایسے رویے سے زیادہ پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ بہت حساس ہے اسے ہمارا ہمارے دلاسوں اور محبت آمیز رویوں کی ضرورت ہے سرزنش اور نصیحتوں کی نہیں۔“ مومنہ رسان سے بولی۔ رقیہ بھابھی نے سر ہلا دیا اور ڈھیلے ہاتھوں سے میز سے برتن سمیٹنے لگیں۔

”آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ آپ اپنی جگہ غلط نہیں ہیں۔ ماں ہونے کے ناتے یہ آپ کی محبت کی انتہا تھی کہ آپ پریشان ہو گئیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔“ انہیں نادم اور افسردہ دیکھ کر مومنہ نے ان کے کندھے پر نرمی سے تسلی آمیز انداز میں تھپکی دی۔

گہرے ملال سے ایک دو قطرے رقیہ بھابھی کی آنکھوں سے پھسل پڑے۔ جسے وہ جلدی سے پونچھ کر بولیں۔

”میں ذرا اباجی کو دیکھ آؤں۔ کتنے افسردہ سے ہو کر کمرے میں گئے تھے۔“ انہیں یاور علی کا خیال آیا۔ وہ پلٹ کر وہاں سے چلی گئیں مگر پہلے کچن سے نکل کر حوریہ کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ وہ چپ چاپ ڈھیلے قدموں سے چلتی یاور علی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

رات مومنہ حوریہ کے کمرے میں آئی تو وہ وارڈروب میں علی شاہ کے کپڑے تہ کر کے رکھ رہی تھی۔ علی شاہ فرش پر بیٹھا تھا کھلونے اس کے ارد گرد بکھرے ہوئے تھے۔

”آپ سب لوگ میری وجہ سے پریشان ہیں، دادا جان بھی اور ابو بھی خفا ہیں مجھ سے اور شاید آپ بھی۔“ وہ وارڈروب بند کر کے مومنہ کی طرف پلٹی۔

”میں اپنے ہی گھر میں جیسے اجنبی ہو کر رہ گئی ہوں۔“ ایک کرب آمیز ہنسی اس کے لبوں پر پھیل کر منجمد ہو گئی۔

”پگلی تم اب بھی ہمارے لیے وہی لاڈلی پیاری سی حوریہ ہو۔ ایسا کیوں سوچا تم نے۔“ مومنہ نے پیار سے اسے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر خود سے قریب کر لیا۔

”چھوڑیں پھپھو۔ ایسا لگتا ہے حازم کو کھو دینے کے بعد میں نے باقی سارے رشتے بھی کھو دیے ہیں، ان رشتوں کی محبتیں بھی چھن گئی ہیں مجھ سے۔“ وہ بیڈ کے کنارے پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز کم سن نادان بچے کی طرح تھا۔

”یہ تمہاری سوچ ہے۔ ہاں ایسا ہے کہ اب فکر بڑھ گئی ہے اولاد کے لیے ماں باپ ساری عمر فکر مند رہتے ہیں بس نوعیت بدلتی رہتی ہے۔“ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی پھر پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگی۔

”ایک گھر جب تعمیر ہو رہا ہوتا ہے نا تو تم دیکھو گی اس گھر کے مکینوں کے چہروں پر ایک الوہی خوشی ہو گی۔ مگر جب تعمیر شدہ گھر ملبے کی صورت پڑا ہو گا تو چہروں پر فکروں کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی فکر۔“

''تو آخر کب تک۔ کب تک یہ فکریں رہیں گی پھپھو۔'' وہ دلی گرفتگی سے کراہ کر رہ گئی۔
''جب تک تعمیر کا کام شروع نہ ہو جائے۔''
''تو کیا اس کا حل صرف شادی ہی ہے۔'' اس نے ناراضی سے مومنہ کی طرف دیکھا۔
''مومنہ نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر سر جھکایا۔'' چلو چھوڑو ان باتوں کو بس تم خوش رہو اگر تم اپنے فیصلے پر مطمئن ہو تو۔ ہمیں کیا اعتراض بھلا۔ ہمارے لیے تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔''
حوریہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر جھلکنے لگا۔ مومنہ نے پر شفیق مسکراہٹ سے اس کا ہاتھ تھپکا تو وہ ان کے کندھے سے لگ گئی۔
''مجھے یقین ہے آپ امی کو بھی سمجھا لیں گی۔''
''وہ ماں ہیں۔ بس اس لیے پریشان جلدی ہو جاتی ہیں۔ تم ہمارے لیے بوجھ ہرگز نہیں ہو۔'' مومنہ نرمی سے بولی پھر علی شاہ کی طرف اس کی توجہ ہو گئی جو کھلونوں کو ہاتھ مار کر ادھر ادھر جھٹک رہا تھا۔ جیسے اپنا غصہ ان پر نکال رہا ہو۔
''اللہ اللہ کیا ہوا بھئی۔ کیوں اتنا غصہ آ رہا ہے چندا کو۔'' مومنہ نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ ''کیا ہمارے بچے کو کھلونے پسند نہیں آ رہے ہیں۔'' وہ منہ بسور رہا تھا پچکارنے پر باقاعدہ رونے لگا۔ حوریہ علی شاہ پر ایک نگاہ ڈال کر پھر کھلونے سمیٹنے لگی۔
''لگتا ہے اسے بھوک لگ رہی ہے۔'' مومنہ اسے تھپکتے ہوئے بولی۔
''نہیں بس ضد چڑھی ہے اسے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔
''ضد۔۔۔ کس بات کی ضد۔'' جواباً وہ ہلکی سانس بھر کر نظریں چرا گئی اور پست آواز میں بولی۔
''ہو جائے گا عادی۔ ابھی جگہ تبدیل ہوئی ہے نا۔ اس لیے اپ سیٹ ہے۔ وہ رات بابر کے روم میں سوتا تھا نا۔'' پھر کھلونوں کی باسکٹ اٹھا کر ٹیرس کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
''بابر نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ کچھ وقت تو لگے گا ناں اسے یہ سب بھولنے میں۔'' وہ ٹیرس کا گلاس ڈور کھول کر باہر نکل گئی۔
مومنہ کا ہاتھ علی شاہ کی پشت کو سہلاتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ انہوں نے گھائل نظروں سے حوریہ کو دیکھا تھا۔
''اس دنیا میں ایک بچے ہی تو ہیں جو محبت کے رنگ پہچانتے ہیں محبت کی قدر کرتے ہیں۔ ہم تو بس اپنی اپنی انا کے مارے کبھی محبت پا کر بھی کھو دیتے ہیں اور کبھی کھو کر عمر بھر روتے رہتے ہیں۔'' وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

محفل آرا تھے مگر پھر کم نما ہوتے گئے
دیکھتے دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوتے گئے
ناشناسی دہر کی، تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جدا ہوتے گئے

بابر یاور علی کے پاس آیا تھا۔ پھر دونوں مغرب کی نماز اکٹھے پڑھنے گئے۔ واپسی پر بابر نے گاڑی میں ہی بیٹھ کر ان سے کچھ ضروری باتیں کرنی چاہیں۔ تو یاور علی اسے گھر چلنے پر اصرار کرنے لگے۔
''اچھا نہیں لگتا۔ اب حوریہ بھی وہاں ہے وہ برا مانے گی۔''
''ارے نہیں نہیں۔ وہ کیوں برا مانے گی۔ تم پہلے بھی آتے رہے ہو مجھ سے ملنے۔ اور سچ تو یہ ہے بابر کہ حازم کے بعد تمہارے آنے سے وہ کمی دور ہو جاتی ہے۔ وہ خلا پر ہونے لگتا ہے۔'' یاور علی کی آواز بوجھل ہو گئی۔

"تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے مجھے۔"
"مجھے بھی آپ کے پاس آکر سکون ملتا ہے۔" وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔
"یقین کریں مجھے آپ نے مسجد کا جو راستہ دکھایا ہے یہ احسان میں آپ کا کبھی نہ چکا سکوں گا۔ میری بے قراری اور اضطراب کو ایک سکون سا ملتا ہے۔" یادر علی کے لبوں پر محبت آمیز مدھم مسکراہٹ بکھر گئی۔
"ہاں...... یہ سکون تو بس سجدے میں ہی ملتا ہے۔ دراصل انسان کا ایک جز روحانی ہے جو اسے رحمن سے ملاتا ہے اور مسلمان کو یہ بڑی سعادت حاصل ہے کہ اسے روحانی سہارا میسر ہے۔ اس کا تعلق رحمان سے جڑا ہوا ہے اور اٹوٹ ہے۔ یہی وہ دروازہ ہے جس سے انسان اطمینان قلب حاصل کرتا ہے یقین کرو اس کے در پر کھل جانے والا سر پھر کسی آستانے پر کھلنے کا محتاج نہیں رہتا۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جس نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنایا وہ اسلام تھا اور طارق بن زیاد سے جس نے کشتیاں جلوا دیں اور کہلوایا ہر ملک، ملک ما است کہ ملک خدائے ما است۔" وہ اسلام تھا۔ جس نے خوں خوار مغلوں میں تیمور اور بابر پیدا کیے وہ دین اسلام تھا۔ ورنہ اس نسل میں ہلاکو اور چنگیز پیدا ہوتے تھے اور "آتش سوزاں" کا لقب پاتے تھے۔ اسلام نے انہیں فاروق حق و باطل بنا دیا۔ بس اللہ لاشریک کی وحدانیت کا اقرار دلوں کو سکون بخشتا ہے۔ عقیدے کو راسخ کرتا ہے۔ حق و باطل میں تمیز پیدا کر کے کردار کی تکمیل کرتا ہے۔ معجزانہ طور پر ہمارے قلب کو سکون کی نعمت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

جو مضطرب ہے اس کی طرف التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

بس بیٹا یہی فنا ہے جس میں بقا کا راز ہے یہی وہ شکستگی ہے جس میں فتح اور فلاح ہے۔ یہی وہ عاجزی ہے جس میں بلندی ہی بلندی ہے۔"
یادر علی کا نورانی چہرہ اور مہربان باتیں بابر کے دل پر ٹھنڈی پھوار کی طرح گر رہی تھیں۔ وہ عقیدت مندانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ وہ جب یادر علی کے پاس آتا تھا اسے احساس ہوتا تھا کہ طمانیت قلب کہاں ہے سکون کی منزل کسے کہتے ہیں۔ وہ خود کو ان بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا جو اپنے اندر کا سارا بوجھ پانی کی صورت زمین پر اتار کر ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔
"تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ...... میں ہمیشہ تمہیں باتوں میں الجھا دیتا ہوں۔ تمہارا بہت سا وقت لے لیتا ہوں۔" یادر علی مسکرائے اور اس کے کندھے کو تھپکا۔
"ارے نہیں۔ میں تو خود بہت خوش ہوتا ہوں آپ سے مل کر۔" بابر نے عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم لیے۔ یادر علی کو لگا حازم زندہ ہو کر ان کے پہلو میں آ بیٹھا ہو۔ وہ بھی اکثر بڑی محبت سے ان کے ہاتھ کو تھام کر چوم لیا کرتا تھا۔
"آپ کو کچھ امانتیں دینی تھیں یادر صاحب۔" بابر چند لمحے خاموشی کے بعد سنجیدگی سے اپنے آنے کا اصل مقصد واضح کرنے لگا۔ اس نے ڈیش بورڈ سے ایک براؤن لفافہ نکالا اور پچھلی سیٹ سے ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا کر یادر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
"یہ حوریہ کی امانت ہے۔ اسے آپ اس تک پہنچا دیں۔ بڑا مشکور رہوں گا آپ کا۔" یادر علی نے چونک کر لفافے کو اور پیکٹ کو دیکھا۔
"یہ حوریہ کا گولڈ ہے جو حازم نے اسے گفٹ کیا تھا۔ کچھ بری کا تھا جو بہرحال حوریہ کا ہی ہے۔ شرعی طور پر۔" بابر نے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور لفافے کو کھول کر اس میں ایک اور لفافہ ڈالا پھر بولا۔

"اور یہ کچھ پراپرٹیز ہیں جو حازم نے حوریہ کو گفٹ کی تھیں' اس کے کچھ ڈاکومینٹس (دستاویزات) ہیں اور لیگل پروسیسنگ ابھی ہوگی کچھ ایسٹس (اثاثے) ہیں جو حوریہ کے نام ٹرانسفر ہونے ہیں۔ اس سلسلے میں حوریہ کو میر الائر (وکیل) زحمت دے گا۔"

یاور علی حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ الجھن ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ بابر دھیرے سے مسکرایا۔

"یہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہا ہوں۔ یہ حوریہ کا اور علی شاہ کا حق ہے۔ اس کی امانت دے رہا ہوں۔"

"مگر میں یہ سب حوریہ کو کیسے دے سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" یاور علی کا دل بھاری ہونے لگا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اپنا لرزتا ہاتھ بابر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے۔ "اسے ابھی تم اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ وہ جب گیلانی ہاؤس میں آئے تب تم اسے خود دے دینا۔"

"نہیں یاور صاحب ...... یہ حوریہ کی امانت ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ اب کبھی گیلانی ہاؤس میں آنا چاہے گی۔ وہ جہاں رہے خوش رہے۔ بہر حال یہ سب اس کی امانتیں ہیں۔"

"مگر میں یہ سب اسے نہیں دے سکتا۔ وہ سمجھے گی کہ ہم اسے بوجھ سمجھتے ہیں اور تم سے ان چیزوں کا مطالبہ کیا ہے۔ نہیں بابر تم یہ خود اسے دے دینا۔ ابھی لے جاؤ۔" یاور علی کا ہاتھ اس پیکٹ پر لرزنے لگا۔ جانے اس کا کیا ردعمل ہو۔

"کم آن یہ کیسی بات کی آپ نے۔ میں اسے اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہا ہوں یہ سب تو اس کا شرعی حق ہے یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں۔"

یاور علی بابر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی انوکھی زبان بول رہا ہو۔ ان کے اعصاب منتشر ہو گئے تھے۔ بابر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' جس میں ایک بجھی بجھی دل گرفتگی بھی اترنے لگی تھی۔

"میں اگر اس سے ملوں گا۔ یا خود دوں گا تو وہ یہ بات پسند نہ کرے۔ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی یاور صاحب۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

یاور علی نے لرزتے ہاتھ سے لفافے کو تھام لیا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ بابر نے ان کے لرزتے کے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر نرمی سے تھپکا۔

"میں کل آتا ہوں۔ مغرب کے وقت ہم جا کے مسجد میں بیٹھیں گے آپ کے استاد محترم کا فیض بھی حاصل کریں گے۔"

یاور علی کے لب یوں ہلکے سے مسکرائے جیسے کوئی کرب کو اندر ہی اندر دھکیل کر مسکراتا ہو۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے کچھ سوچ کر بولے۔

"بابر ایک بات کہوں مانو گے۔"

اس نے بڑے احترام سے یاور علی کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور سر کو اثباتی جنبش دی۔

"ضرور۔"

"تم شادی کر لو۔ عاظمہ بھی بہل جائے گی۔ وہ بہت فکر مند ہے تمہارے لیے۔" بابر کے سینے سے بے اختیار ایک ہلکی سی سانس آزاد ہوئی۔

"حوریہ بہت نادان ہے اور ضدی بھی۔ مگر میں نہیں چاہوں گا کہ تم اس کی نادانی اور ضد میں اپنی زندگی کو خراب کر دو اور اپنی ماں کو دکھی کرو۔ وہ تمہیں یقیناً آباد دیکھنا چاہے گی۔ تم اس کی آخری امید اور تمام تر خواہشوں کا مرکز ہو۔ اور ماؤں کو آزردہ نہیں کرتے۔ بہت قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں یہ۔" بابر کو لگا یاور علی اس کے دل کے اندر

جھانک کر یہ بات کہہ رہے ہوں۔ اس کے دل پر جمی اداسی کی کائی کچھ اور گہری ہونے لگی۔
''میں شادی کا نہیں سہی مگر آپ کی بات پر غور کرنے کا وعدہ ضرور کرتا ہوں۔'' وہ بولا تو اس کی آواز ایسے ابھری جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔
''دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔''
یاور علی کے اترنے کے بعد اس نے آہستگی سے گاڑی آگے بڑھادی۔ یاور علی کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں پھر پلٹ آئیں تو ان میں نمی کی گہری اور دبیز چادر بچھی ہوئی تھی۔
روح پر پھیلا اضطراب گویا پہلے سے لیکن اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے ایک دل گرفتگی سے اس پیکٹ اور لفافے کو دیکھا۔ اور آگے طے کرنے والے مرحلے کے بارے میں سوچنے لگے۔

☆☆☆

لائبہ نے گیلانی ہاؤس میں آنا جانا پھر سے شروع کردیا تھا۔ عاظمہ اس کے آنے سے کافی حد تک بہل گئی تھیں۔ وہ عاظمہ کو زبردستی اپنے ساتھ لانگ ڈرائیونگ پر لے جاتی۔ آج بھی لائبہ ان کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ وہ فریش دکھائی دے رہی تھیں۔
رات بابر ان کے پاس آیا تو وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی اپنا میک اپ ٹشو سے صاف کررہی تھیں۔
''لائبہ چلی گئی۔'' وہ اندر آگیا۔
''ہاں بس ابھی گئی ہے۔ اصرار کرکے لے گئی تھی مسز قمر کے بیٹے کو دیکھنے میں، میرا تو جانے کا ارادہ بالکل بھی نہیں تھا۔'' انہوں نے ٹشو ڈسٹ بین میں پھینکا اور کریم اٹھا کر بیڈ پر آکر بیٹھ گئیں۔ ''اس کے آنے سے بڑا آسرا رہتا ہے دل بہل جاتا ہے۔ بڑی فکر ہے اسے بھی میری۔''
''ہوں...... اچھی بات ہے نکل جایا کریں اس کے ہمراہ کہیں نا کہیں...... ٹائم بھی پاس ہو جائے گا اور سوچنے کے لیے آپ کے پاس ٹائم ہی نہیں ہوگا۔'' بابر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ ۔ اپنی ایکٹیوٹیز میں مصروف ہوگئی ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے۔ اکیلے پڑے پڑے بے کار کی سوچیں گھیرے رکھتی ہیں۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر سوچتے ہوئے بولیں۔
''ایک بات کہوں بابر!'' بابر نے سر اٹھا کر ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ ایک پل کے لیے ہچکچا گئیں۔
''ایک کیوں سو باتیں کریں مام۔'' وہ مسکرایا۔
''لائبہ اب بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے تم چاہو تو لائبہ اب بھی تمہاری زندگی میں آسکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے عاظمہ نے جانچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا بابر خفا ہو کر یکدم بھڑکے گا۔ مگر خلاف عادت بابر چپ رہا۔ البتہ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے سلگنے لگی تھیں۔
''اس کے آنے سے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔'' اسے خاموش پا کر عاظمہ کی کچھ ہمت بڑھی۔ وہ کہنے لگیں۔
''شادی تو تمہیں کرنی ہی ہے تو پھر لائبہ میں کیا برائی ہے۔ وہ تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔ اس گھر میں وہ آجائے گی تو اس گھر کی ویرانی دور ہو جائے گی بابر۔''
''آپ لائبہ کی خوشیوں کی دشمن کیوں ہوگئی ہیں مام۔'' وہ بظاہر چھیڑنے کے انداز میں بولا۔ مگر باوجود کوشش کے اس کے لب مسکرانہ سکے تھے اور آنکھوں میں سنجیدگی مستور رہی۔
''اسے جینے دیجیے۔ اس کا فیانسی اچھا لڑکا ہے وہ دونوں لائف کو انجوائے کریں گے۔ کیوں اس بے چاری

کو میری زندگی میں لاکر اس کے جذبوں اور خواہشوں کا قتل کر دینا چاہتی ہیں۔" عاظمہ نے اس کی طرف رنج سے دیکھا اور بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئیں "اور آپ اب میری شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیجیے۔" اس نے کرسی سے اٹھ کر ان کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"تم عباد کی طرح ضدی بھی ہو اور محبت میں اس کی طرح اڑیل بھی۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"ہاں شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر فرق یہ ہے کہ پاپا نے محبت پا کر بھی کھو دی اور میں نے پانے کی خواہش میں خود کو کھو دیا۔" ایک افسردہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ اس نے عاظمہ پر ایک نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

یاور علی نے بابر کی دی ہوئی تمام چیزیں حوریہ کو دیں تو وہ حیرت اور صدمے سے گنگ رہ گئی چند لمحوں کے لیے۔

"میں نے انکار کیا لینے سے مگر وہ مصر رہا۔"

"ہاں وہ مجھے کمزور سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے بچے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔" وہ صدمے سے نکل کر غم و غصے سے بولی۔

"نہیں تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ تو تمہارا حق دے رہا ہے یہ شرعاً تمہارا ہی ہے۔" یاور علی نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"یہ وراثت کے معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں بدقسمتی سے ہمارے یہاں بہت سے لوگ سمجھتے نہیں ہیں اور جو سمجھتے ہیں ان میں بھی کئی کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ جاتی ہے۔ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں اور بابر جیسا شخص جس سے مجھے اس عمل کی امید نہیں تھی اس کا یہ طرز عمل حیران کن ہی نہیں قابل ستائش ہے۔" یاور علی کے لہجے میں اس کے لیے ستائش بھی تھی اور ایک پدرانہ محبت بھی۔

"اگر وہ نیک نیتی سے یہ سب کر رہا ہے، تمہارا حق دے رہا ہے تو تم اس کی نیت پر شک کر رہی ہو۔ اتنا منفی مت سوچو حوریہ کہ شک کے ساتھ ساتھ تہمت کی مرتکب ہو کر گناہ گار ہوجاؤ۔" انہوں نے ترشی کے ساتھ اسے گھر کا اور جیولری کا اور لفافہ اس کے آگے رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

"دکھ کی بات یہ ہے کہ کوئی برا بن کر ہمیں ملتا ہے تو ہم اس سے نفرت کرتے ہیں اس کی برائی سے نہیں اس کی ذات سے بھی اور جب وہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ہر عمل کو شک کی نظروں سے مار ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے سنبھالو، اپنے لیے نہیں تو علی شاہ کے لیے۔" وہ ناراضی کے ہمراہ پلٹ کر اپنے روم میں چلے گئے۔

حوریہ...... گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ اس کی نظریں جیولری کے لفافے پر جمی تھیں۔ پھر لرزتے ہاتھوں سے اس نے وہ لفافہ کھولا۔ چمکتے خوب صورت زیورات اس کی آنکھوں کو دھندلانے لگے۔ اس کی نگاہیں خوش نما لاکٹ پر گئیں، جس میں بڑی خوب صورتی سے حازم لکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے پانی اترنے لگا۔

مومنہ نے پیچھے سے اس کے دونوں کندھوں پر نرمی سے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا۔ اس نے سر اٹھا کر نم آنکھوں سے مومنہ کو دیکھا۔

"بابر نے ایسا کیوں کیا پھپھو۔" اس کا لہجہ چیختا ہوا، تڑپتا ہوا تھا۔ "وہ جانتا ہے، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ حازم تھا، تب تک میرے لیے ہر شے میں دلکشی تھی۔ اب...... اب یہ سب چیزیں میرے کس کام کی۔" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر "حازم" کے نام والا لاکٹ اٹھا لیا اور لبوں سے لگانا چاہا۔ مومنہ نے نرمی سے وہ لاکٹ ہاتھ سے لے کر لفافے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "اسے جا کر لاکر میں رکھ دو۔" حوریہ نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔

"اتنی حقیقتوں کو برتنے کے بعد بھی اب بھی یادوں سے بہلنا چاہتی ہو۔" مومنہ نے اسی کی اٹھتی نگاہوں کو گرفت میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یادیں سب ہی دل کو بہلاتی نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ ادھیڑ کر رکھ دیتی

ہیں۔انہیں کسی صندوق میں ڈال کر تالا لگا دو۔" حوریہ مضطرب سے کرسی سے اٹھ گئی۔ "ماضی سے نکل کر حال میں رہو۔علی شاہ کے بارے میں سوچو۔ایک مضبوط عورت بننے کے لیے حقیقت پسند بننا ضروری ہے۔ کمزور رہو گی تو، ایک ہی نصیحت کریں گے تمہیں کہ...... شادی کرلو...... مضبوط ہو جاؤ گی"۔

"پھپھو۔" حوریہ نے تڑپ کر شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ "اتنی سفاک کیوں ہو گئی ہیں، آپ میرے لیے، اتنی سخت دل۔" "تمہیں میری باتیں سفاک اس لیے لگ رہی ہیں کہ تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ روتی رہوں۔ میں نے کہا نہ حوریہ یادیں مار ڈالتی ہیں۔ان سے شعوری کوشش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔اگر اپنا اور علی شاہ کا خود سہارا بننا چاہتی ہو تو ایسا کرکے دکھاؤ، ادر وائز، (ورنہ) تم۔"

"پلیز......" وہ یوں بلبلائی جیسے مومنہ نے اس کی گردن پر چھری رکھ دی ہو۔ پھر پلٹ کر بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔مومنہ نے رنج سے اسے دیکھا۔

"کب تک خود کو دھوکا دو گی حوریہ...... تم درحقیقت بابر سے نہیں بھاگ رہی ہو۔اس احساس سے بھاگتی پھر رہی ہو جو تمہیں کمزور کر رہا ہے۔" اس نے خود کو کرسی پر یوں گرا لیا جیسے پیروں میں جان نہ رہی ہو۔حوریہ کا غم، اس کا اضطراب، اس کی یہ بے قراریاں۔خود اسے بھی قرار نہیں دے رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی حوریہ اس شاخ کی طرح ہے جو دو طرفہ ہوا میں گری ہوئی تھی۔

☆☆☆

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو بابر۔" وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔آفس جانے کے لیے تیار دکھائی دے رہا تھا۔موبائل پر کسی سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے عاظمہ کو دیکھا، پھر سلسلہ منقطع کرکے موبائل میز پر رکھ دیا۔

"اکرام صاحب بتا رہے تھے کہ حازم کی ساری پراپرٹیز اور سارا گولڈ وغیرہ حوریہ کو دے رہے ہو۔" عاظمہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہوں...... ایسا ہی کر رہا ہوں۔"

"مگر کیوں......؟"

"اس لیے کہ یہ حوریہ اور علی شاہ کا رائٹ ہے مام۔"

"مگر اس طرح تو دولت تقسیم ہو جائے گی اور بزنس پر برا اثر پڑے گا۔اتنی رقم اور یہ سب......"

"مام پلیز......" بابر نے انہیں بولنے سے روک دیا۔" اور متاسفانہ نظروں سے عاظمہ کو دیکھا۔" آپ کے خیال میں مجھے علی شاہ اور حوریہ کا حق غصب کر لینا چاہیے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔مگر تم جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔"

"جلدی......" وہ ہنسا۔اس کی ہنسی میں تمسخر تھا۔" علی شاہ سال بھر سے اوپر ہو گیا ہے حازم کی ڈیتھ کو اتنا وقت گزر گیا ہے تو افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اتنی دیر کر دی۔" عاظمہ کے حلق میں چائے جیسی سیال شے بھی جیسے اٹک کر اتر رہی تھی۔ "میں یہ سب کچھ حوریہ کی محبت میں نہیں کر رہا ہوں مام۔ایک عالم کے مشورے سے کر رہا ہوں اور میرا دل مطمئن ہے کہ حازم کی تمام تر جائداد کی حق دار حوریہ اور علی شاہ ہیں۔ پاپا اور آپ کی یا اپنے حصے میں سے کچھ نہیں دے رہا ہوں۔آپ فکر مند نہ ہوں۔حق دار کا حق دینے سے بزنس پر برا اثر نہیں، اچھا مگر ضرور پڑ سکتا ہے۔"

وہ کھڑا ہو گیا اور میز سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے عاظمہ کو دیکھا۔جو کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔پھر آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆☆

حوریہ کے دل پر ایک بے کلی طاری تھی۔ بابر کے اس اقدام نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے سوچا اسے بابر کو یہ بات بتا دینی چاہیے کہ اسے ان چیزوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ اس طرح اس کی نظروں میں معتبر بننا چاہتا ہے تو یہ اس کی کوشش بے کار ہوگی۔ نیند تو اسے یوں بھی نہیں آتی تھی۔ اس نے گھڑی میں ٹائم نہیں دیکھا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اس نے بس غصے میں بابر کا نمبر ڈائل کر لیا۔ دوسری بیل پر بابر کی بھاری آواز اس کے سیل فون پر گونجی۔ وہ یک دم ایک بے نام سی اذیت سے لب بھینچ کر رہ گئی۔

''میں جانتا ہوں۔ تم خفا ہو۔ بہت غصے میں ہوگی اور مجھے برا بھلا کہہ رہی ہوگی، بلکہ میرے اس اقدام کو میری کوئی سازش سمجھ رہی ہوگی۔'' اس کی خاموشی پر بابر خود ہی دھیرے سے بولا۔ اس کا لہجہ دھیما اور شکستہ سا تھا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بے اختیار کہہ بیٹھی۔ ''ان فیکٹ مجھے ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں ہے بابر۔ تم نے ناحق زحمت کی۔''

''حق ضرورت دیکھ کر ادا نہیں کیا جاتا۔ اسے ہر حال میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ میری طرف سے گفٹس نہیں ہے، نہ کوئی خیرات، یہ تمہاری اور علی شاہ کی امانت تھی میرے پاس، وہ لوٹا رہا ہوں۔''

''اور اگر میں اپنے اس حق سے خود ہی دست بردار ہونا چاہوں تو......''

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔'' بابر کے لہجے میں خفگی اتر آئی۔ ''تم علی شاہ کو اس کے حق سے کیسے محروم کرسکتی ہو۔ وہ ناسمجھ ہے، نابالغ ہے۔'' اس کے لہجے میں کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔ شاید اسے حوریہ سے اس طرح کے جملے کی توقع نہیں تھی۔ ''تم اسے دست بردار کیسے کرسکتی ہو، اس کا جائز حق ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں علی شاہ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' وہ جلدی سے سنبھل کر وضاحت دینے لگی۔ بابر کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ سخت برا مان گیا ہے، اس کی اس بات سے۔

''میں آل ریڈی (پہلے ہی) بہت اپ سیٹ (پریشان) ہوں حوریہ۔ پلیز جو میں کر رہا ہوں مجھے کرنے دو۔ بیلیو می (میرا یقین کرو) نہ یہ کوئی میری سازش ہے، نہ میں کوئی سرخرو ہونے کے لیے کر رہا ہوں، نہ اس کے پیچھے کوئی مقصد ہے میرا۔ میں حازم کے سامنے ایٹ لیسٹ (کم از کم) کھڑا تو ہوسکوں گا۔'' اس کے لہجے کے بکھراؤ نے حوریہ کو چپ سا کر دیا۔ وہ اس سے مزید الجھ نہ پائی۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتی دل گرفتگی اس کے دل پر اثر انداز ہونے لگی۔ وہ بے بسی سی محسوس کر کے رہ گئی۔ چند لمحہ ایک مضمحل سی خاموشی دونوں کے مابین طاری رہی۔ وہ لائن بھی منقطع نہ کرسکی۔ بس یوں ہی موبائل کان سے لگائے لگائے بیڈ کراؤن سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے اتنا ہی اس کے بس میں تھا۔

''حوریہ!'' چند خاموش ساعتیں دبے پیر گزرنے لگیں تو بابر نے اسے دھیرے سے پکارا۔ دوسرے پل اس کے سانسوں کے زیر و بم سے اس کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بتاؤ۔ اتنی رات ابھی تک جاگ کیوں رہی تھیں۔ سوئی نہیں۔'' اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''بس یوں ہی۔'' اس نے جلتی آنکھیں کھول دیں۔

''اتنی ڈپریسڈ کیوں ہو۔ دیکھو حوریہ۔ علی شاہ کے لیے خود کو کمپوز کرو اور مجھے...... ایک برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ اپنے ماضی کو دفن کردو اور اپنی نئی زندگی شروع کرو۔''

''کہاں سے شروع کروں۔'' اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔ بابر لحظہ بھر چپ سا رہ گیا۔ ''زندگی ہے کوئی ریل تو نہیں کہ پٹری بدل کر پھر چلنا شروع ہو جائے۔ یہ تو رک جاتی ہے۔ کسی کے چلے جانے سے، چھن جانے سے، جذبے مرجاتے ہیں تو یہ ٹھہر سی جاتی ہے۔''

''نہیں حوریہ! آئی ایم ناٹ اگریڈ (میں متفق نہیں ہوں۔) زندگی کبھی رکتی نہیں ہے۔ تم نہیں گزارتیں تو زندگی تمہیں گزار دے گی۔'' بابر نے اس کی بات کی نفی کی۔

''جب دل میں تقاضے اور خواہشیں ہی نہ رہی ہوں تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ زندگی ہمیں گزار دے۔'' اس کا لہجہ سوکھے پتوں کی طرح سوکھا بنجر اور غیر متوازن تھا۔

''اگر ایسا ہے، تم نے خود کو حالات کے بہتے دھارے پر چھوڑ دیا ہے تو پھر اتنی اپ سیٹ کیوں ہو۔ کس بات کا ڈپریشن ہے۔'' وہ غیر محسوس طور پر چونک گئی، بابر کے اس جملے پر اور سوچنے لگی کہ وہ بابر سے بھلا اتنی باتیں کیوں کیے جا رہی ہے، کیا تعلق تھا اس سے...... مگر شاید...... اس لیے کہ اسے سکون مل رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کا واقف حال تھا۔ اس کے ہر زخم سے واقف۔ اسے خود کو نئے سرے سے کھولنا نہیں پڑ رہا تھا ناں۔ وہ جانتا تھا اسے، سمجھتا تھا، اس کے اندر تک جھانک سکتا تھا۔

''اتنی شدت سے نہ سوچا کرو حوریہ۔ زندگی کو سادہ سے انداز میں دیکھو۔ تمہارے آگے بہت لمبی زندگی پڑی ہے۔ اتنا الجھ الجھ کر چلو گی تو تھک جاؤ گی۔ علی شاہ کو دیکھ کر جیو۔'' وہ بڑے خلوص اور اپنائیت سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ''میں نے جو کیا ہے وہ اپنے لیے کیا ہے، اپنی آخرت سنوارنے کے لیے۔ کوئی نیکی تو نہیں کی تمہارے ساتھ۔'' بابر کا لہجہ، اس کے جملے اس کا انداز اس کا دل جکڑنے لگے۔ وہ یک دم کسی خیال سے گھبرا کر بولی۔

''عاظمہ آنٹی کیسی ہیں۔''

''ہوں...... بہتر ہیں۔'' وہ ہلکی سانس کھینچ کر رہ گیا۔ ''تم ان سے مل کر نہیں گئیں۔ یہ بات ان کو ہرٹ کر گئی تھی۔''

''کبھی کبھی ہمیں ایسے مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں جو دل کے خلاف ہوتے ہیں۔'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔

''ہاں...... آئی اگریڈ، کبھی کبھی دوسروں کی خوشی اور ان کی بہتری کے لیے ہمیں دل کے خلاف ایسے مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔'' بابر کا لہجہ خود کلامی سا تھا۔

حوریہ نے لائن کاٹ کے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ بابر سے بات کر کے اس کا اضطراب تو جیسے کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ بے کلی سوا ہو گئی تھی۔ اسے یک دم کھلی ہوا کی طلب ہونے لگی۔ گھٹن کا احساس جیسے بڑھ سا گیا تھا۔ وہ ٹیرس پہ چلی آئی۔ ہلکی ہلکی ہوا، اور خنکی کا احساس چہرے سے ٹکرایا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ اپنے رخسار پر ہلکے سے ہاتھ پھیرا اور یوں سانس کھینچی جیسے پھیپھڑوں میں یہ ہوا اتار لینا چاہ رہی ہو۔

تمہیں کیا خبر بابر...... دل کے اندر بہت حدت ہو۔ بہت گھٹن ہو جائے تو یہ بیرونی ہوا بھی شاید اس گھٹن کو کم نہیں کر پاتی۔ پھر یک دم سے لگا جیسے بابر اس کے نزدیک کھڑا آہستگی سے کہہ رہا ہو۔ منفی سوچ کو دھکیل کر مثبت انداز اپناؤ۔ ایک کمزور سی دیوار ہی تو ہے انا کی، خوف کی، ہار جانے کے خوف کی، اسے ہٹا دو، پھر دیکھو، کیسے حدت ختم ہوتی ہے، کیسے اندھیرے کا دم ٹوٹ جاتا ہے، کتنی روشنیاں دکھائی دیں گی۔

اوف...... یہ کیا سوچنے لگی ہیں۔ وہ گھبرا کر ریلنگ سے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹی۔ یوں جیسے حقیقتاً بابر اس کے نزدیک کھڑا ہو گیا ہو۔ اسے نرم نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ اسے اپنا پورا وجود ان دیکھی آگ میں جلتا محسوس ہونے لگا۔ یوں جیسے اسے جلتے ہوئے شعلوں میں کسی نے دھکیل دیا ہو۔

☆☆☆

زندگی گزر رہی تھی یا زندگی اسے گزار رہی تھی، مگر گزر تو رہی تھی، محبت کے بغیر، بہت سوں کی گزری ہے ایک اس کی بھی سہی۔ وہ تنہا تو نہیں تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے رشتے تھے، سچے مخلص، اس کی خوشی میں خوش ہونے والے...... اس کے غم میں غمگین ہونے والے، ہاں وہ تنہا تو نہیں تھی۔ اور دل کا کیا ہے، بہل ہی جائے گا۔ وہ دھیرے دھیرے خود کو کمپوز کر رہی تھی۔ اپنی تمام تر شعوری کوشش کو بروئے کار لا کر۔

☆☆☆

آج بھی شہر میں پاگل دل کو
تیری دید کی آس رہی
حدت کی گم صم تنہائی
آج بھی میرے پاس رہی
آج بھی شام اداس رہی

وہ باغیچے میں رکھی کین کی کرسی پر بدن کو ڈھیلا چھوڑے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رکھی کین کی خوش نما میز پر کچھ فائلیں رکھی تھیں۔ اس کا مطلب تھا وہ کام کرتے کرتے تھکن اتارنے کو کچھ دیر سستا رہا تھا۔ جب عاظمہ کے ہاتھ کا نرم دباؤ بابر اپنے کندھے پر محسوس کر کے چونک گیا۔

''اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور تم کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنے ہو۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ جبکہ وہ فضا میں بڑھنے والی خنکی سے بے نیاز تھا۔ نیلے رنگ کی ہاف سلیوز ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پیروں میں سادہ سی سیاہ چپلیں ڈالے، ان کی بات پر فقط مسکرا دیا۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیر کر فائلوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''امیر علی سے کہیے ایک گرما گرم چائے کا کپ بنا دے۔ بس یہ کچھ ضروری کام تھے، سوچا نپٹا لوں۔'' وہ نیلے رنگ کی فائل اٹھا کر کھولنے لگا کہ عاظمہ نے اس کے ہاتھ سے فائل لے کر دوبارہ میز پر رکھ دی۔

''بس دن رات ان ہی میں سر کھپاتے دکھائی دیتے ہو، پتا بھی ہے وقت کس تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔'' اس نے کوئی مداخلت نہ کی، بس فائل پر ایک نظر ڈال کر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔

''لائبہ کی شادی کو بھی سال گزر چکا ہے وہ دبئی چلی گئی اسے بھی دو ہفتے گزر گئے۔ کس تیزی سے وقت گزرتا جا رہا ہے''

''ہوں۔ وقت کا کام تو گزرنا ہے۔ وقت کب رکتا ہے۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں کہ وقت رکتا نہیں ہے۔ یہ گزرتا رہے گا اور تم تیزی سے بوڑھے ہوتے چلے جاؤ گے۔'' عاظمہ نے اپنے لہجے کی یاسیت کو سمیٹتے ہوئے لہجے میں خوش گواری کا تاثر سمونے کی کوشش کی۔

''اوہ! یعنی میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ کمال ہے مجھے تو خیال ہی نہیں آیا'' وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ جواباً عاظمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''بوڑھے ہو جاؤ گے۔ ہوئے نہیں ہو''

''وہ تو ایک دن سب کو ہونا ہے سوئٹ مدر! اینی ویز!'' اس نے ہلکی سی سانس کھینچی۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ چند ہفتوں کے لیے آپ دبئی چلی جائیں۔''

''ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں۔ کچھ ایسا ہی یوں بھی میرا تو دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ کوٹھی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔''

''میں کرتا ہوں ویزے کا''

''نہیں ابھی نہیں۔ تمہارا بھی تو پلان تھا۔ دبئی شفٹ ہونے کا۔''

بابر ہلکے سے ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''اچھا ہے تم بھی چلے چلو۔ دل بہل جائے گا۔ ماحول بدلے گا تو سوچ بھی بدلے گی۔''

جواباً بابر کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھر کر گم ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے جماتے ہوئے پھر سر کرسی کی پشت پر ٹکا لیا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آزما کر دیکھ لو''

''خوشی کا تعلق کسی خطے علاقے سے ریلیٹڈ نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے اندر ہوتی ہے اور اگر اندر نہیں ہے تو پھر کہیں بھی نہیں ہے'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ اس کی نظریں پام کے درخت پر مرکوز تھیں۔ ''ہم دراصل اپنے آپ سے فرار چاہتے ہیں۔ اس خطے سے نہیں۔ صرف اپنی سوچوں سے۔ جو ممکن نہیں۔ ہم اپنا دل اپنا ذہن اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہوتے ہیں۔'' وہ مبہم انداز میں مسکرایا پھر ہلکی سانس بھر کر عاظمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''انسان کا اختیار ہی کیا ہے محض اپنی ناسمجھی سے وہ خود کو بااختیار خیال کرتا ہے۔ جبکہ۔ یہ کام قدرت غیر محسوس طریقے سے کر دیتی ہے۔ بس اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ ایک آسان ساحل۔ بہت سے غم غلط ہوتے چلے جاتے ہیں نہیں تو ان کا احساس کم ضرور ہو جاتا ہے ان کی روانی میں سستی ضرور آ جاتی ہے۔ بے قراری کو قرار ضرور آ جاتا ہے۔''

عاظمہ نے اسے بغور نظر دیکھا۔ بدل تو وہ بہت گیا تھا مگر کتنا یہی وہ جاننا چاہ رہی تھیں۔

''تم واقعی پرسکون ہو بابر''

''نو ڈاؤٹ مام۔'' (بے شک مام)

''تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ میرا کہا کیوں نہیں مان لیتے''

''شادی ایک الگ میٹر ہے۔ اس سے سکون کا کیا تعلق'' پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر جیسے کسی خیال کو جھٹکا تھا۔

''وقت بھی بڑا ظالم ہے۔ وقت نئے تجربات ہماری جھولی میں ڈالتا چلا جاتا ہے گزرے واقعات کو بے معنی کرتا چلا جاتا ہے۔''

''تو۔۔۔ تو کیا حوریہ۔ وہ جذبات وہ سب۔ بے معنی ہو گئے ہیں۔''

عاظمہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور جیسے اپنی بات پر اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنا چاہا۔

بابر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ اس نے کھوئی کھوئی عاظمہ کو دیکھا تھا۔

اضطراب پل بھر کو اس کی خوش نما آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھائی دیا تھا۔ دوسرے پل وہ نظریں چرا گیا اور میز سے فائل اٹھا کر کھولنے لگا۔

عاظمہ کا یکلخت بجھ سی گئیں۔

بس اوقات آدمی خاموشی کی چادر اوڑھ کر چھپنا چاہتا ہے فرار کی ادنیٰ سی کوشش۔

''میں چائے بجھواتی ہوں تمہارے لیے'' ایک بجھی بجھی سی سانس کھینچ کر وہ کرسی سے اٹھ گئیں۔

☆☆☆

حوریہ نے گھر کے نزدیک گرلز اسکول میں ٹیچنگ کرنی چاہی تو عادل بھائی برہم ہو گئے۔ اور صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔

''بہل جائے گی وہ' ذہن بھی بٹا رہے گا' آخر حرج ہی کیا ہے۔'' کمرے میں آ کر رقیہ بھابھی انہیں سمجھانے لگیں۔ درحقیقت وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ حوریہ مصروف ہو جائے۔

''تم کیا سمجھتی ہو اسے میں ساری عمر اسی دہلیز پر بٹھائے رکھوں گا۔''

''میں تو فقط ابھی کی بات کر رہی ہوں۔ آگے کا کس نے سوچا ہے۔''

''میں سوچتا ہوں بلکہ سوچ چکا ہوں۔'' عادل بھائی نے چائے کا مگ تپائی پر پٹخنے کے انداز میں رکھ دیا۔

رقیہ بھابھی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی پن دکھائی دے رہا تھا۔

"فی الحال تم ایک کام کرو۔ یہ چائے گرم کر کے لے آؤ میں اباجی کے روم میں ہوں۔"

"بات سنیئے۔۔۔" رقیہ بھابھی لپک کران کی طرف بڑھیں۔

"خدا خدا کر کے زندگی معمول پر آئی ہے اب پھر کچھ ایسی ویسی بات نہ کر دیجیے گا۔"

"میں باپ ہوں اس کا، اس کی بہتری کے لیے ہی سوچوں گا، میں نا بے خبر ہوں نہ آنکھیں بند رکھی ہیں۔"

وہ نرمی سے کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ رقیہ بھابھی الجھی الجھی سی چائے کا مگ اٹھانے لگیں۔

☆☆☆

اباجی کے کمرے میں بیٹھ کر عادل بھائی نے ہمیشہ کی طرح بغیر تمہید کے بات شروع کر دی۔ کہ ان کے بہت اچھے دوست اپنے بیٹے کے لیے حوریہ کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ لڑکا ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ دبئی میں اس کی بہت اچھی جاب ہے باپ کا کراچی میں بزنس ہے وہ کسی طور پر اس رشتے کو رد کرنے کو تیار نہیں تھے، پہلے بھی کئی رشتے آئے مگر انہوں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اب کے وہ حد سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے اس رشتے پر۔

حوریہ کے اعصاب پر گویا پتھر ہی پڑے تھے۔ وہ تڑپ گئی۔ بلبلا اٹھی مگر باپ کے سامنے شور نہ مچا سکی۔ رقیہ بھابھی پر چڑھ دوڑی۔

"یہ کیسے ممکن ہے میں کہہ چکی ہوں مجھے شادی وادی نہیں کرنی آپ سب لوگ مجھے اپنی مرضی سے جینے کیوں نہیں دیتے۔"

"یہ ہمارا نہیں۔ تمہارے ابو کا فیصلہ ہے۔" وہ دامن بچانے لگیں۔

"یہ صرف ابو کا فیصلہ نہیں ہے آپ سب لوگ ان کی ہمنوا ہیں" اس نے یہ کہتے ہوئے تخت پر دھاگوں میں الجھی مومنہ کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ اس کا دل چاہا ان کے یہ دھاگوں کا ڈبا، کپڑے، قینچی۔ ہر شے اٹھا کر دیوار پر دے مارے۔

آپ نے کہا تھا نا پھپھو۔ آپ ہمیشہ میرا ساتھ دیں گی،۔ مومنہ نے دانتوں سے دھاگا توڑا اور قمیص ایک طرف رکھتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں کہا تھا۔ مگر یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری ہر بہتری اور بھلائی میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"تو آپ کے خیال میں یہ جو ہو رہا ہے میرے حق میں بھلائی ہے۔ میری بہتری ہے۔"

"حوریہ۔" انہوں نے ذرا تنک کر اسے گھر کا۔ "وہ باپ ہیں تمہارے تمہارے لیے دن رات فکر مند رہتے ہیں۔ تم تو اپنے اردگرد ایک خول چڑھا کر اس میں بند ہو گئی ہو یہ کوئی حل نہیں ہے۔ زندگی اس طرح نہیں گزرتی۔"

"آپ بھی تو اسی طرح زندگی گزارتی آئی ہیں" وہ تلخی سے ہنسی تب کسی کو اس حجرے کو۔۔۔ اس خول کو توڑنے کا خیال نہیں آیا تھا۔"

"حوریہ۔ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔" رقیہ بھابھی نے غصے سے اسے ٹوکا۔ "تم اباجی کو بلیم کر رہی ہو۔"

مومنہ کا دل دکھ کی اتھاہ میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

"میں زندگی کو گزارتی کہاں آئی ہوں۔ میں نے تو اسے اپنے اندر مار ڈالا تھا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر دھاگا ریل میں لپیٹ کر تخت سے نیچے اتری۔

"جس پل صراط سے میں گزری ہوں اس سے تمہیں گزرتا نہیں دیکھنا چاہتی۔"

حوریہ نے تکلیف کے احساس کے ساتھ انہیں دیکھا پھر جھٹکے سے پلٹ کر اپنے روم میں جا کر بند ہو گئی۔

☆☆☆

عادل بھائی نے تو گویا ٹھان لی تھی کہ اب حوریہ کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ انہوں نے آتے جمعہ کو لڑکے والوں کو اپنے یہاں مدعو کر لیا تھا۔ یاور علی نے بھی دانستہ چپ اوڑھ لی تھی۔ حوریہ کو شکوہ سب سے زیادہ مومنہ سے تھا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ یوں دامن بچالیں گی۔ مجھے اکیلا کردیں گی'' وہ اسے ٹیرس میں ریلنگ کے پاس کھڑا دیکھ کر چلی آئی۔

''اکیلا تم نے خود اپنے آپ کو کر دیا ہے حوریہ۔ تمہاری انتہا پسند سوچ نے تمہیں تنہا کر دیا ہے۔'' مومنہ اس سے کہنا چاہتی تھی مگر چپ رہی۔

''کسی بھی حال میں کسی اجنبی کو اپنی اور علی شاہ کی زندگی میں داخل نہیں کر سکتی۔'' وہ ان کی خاموشی پر بری طرح ہرٹ ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''بابر۔۔۔ تو تمہارے لیے اجنبی نہیں تھا علی شاہ کے لیے اجنبی نہیں تھا۔''

نیلے رنگ کی گرم شال کو کندھوں پر جمائے ہوئے مومنہ نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا پھر متاسفانہ سانس کھینچتے ہوئے بولی

''دو سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے حوریہ۔ فیصلہ کرنے کے لیے ذہن کو ایک راہ پر لانے کے لیے۔ میرا خیال تھا تم گیلانی ہاؤس کو چھوڑ کر آؤ گی۔ مگر تمہارے دل میں کہیں کسی گوشے میں اپنے اس فیصلے کا پچھتاوا ضرور چھپا ہو گا کچھ کمی محسوس کرو گی۔ مگر تم میرے اندازے سے زیادہ ناقدر شناس نکلیں۔ تم نے محبت کی قدر نہیں کی حوریہ! تم وقت کو بہت بے رحمی سے گزرتے دیکھتی رہیں۔ پلٹ کر نہیں دیکھا کہ یہ گزرتا وقت کس کی جھولی میں کیا ڈال رہا ہے۔ کون کیسے تڑپا ہے۔ تم آنکھیں بند کیے بس حازم کے نام کی تسبیح پڑھ کر یہ سمجھتی رہی ہو کہ تم حازم کی محبت کا حق ادا کر رہی ہو۔ تم ایک باوفا عورت ہو نہیں بلکہ تم ایک کم عقل عورت ہو۔

میں نے تمہیں سمجھایا تھا حوریہ۔ انسان سے انسان کی محبت اسے اندر ہی اندر مار ڈالتی ہے اسے تنہا کر دیتی ہے یہی محبت خدا سے ہو تو اسے بلند درجوں پر لے جاتی ہے اسے عزت اور شرف بخشتی ہے اس کے لیے ٹھنڈک چھاؤں بن جاتی ہے۔ نوحہ عمر بھر نہیں ہوتا نہ ماتم۔

محبت چھین جائے تو اس کا آزار ہوتا ہے محبت خدا کی رحمت کو سونپ دی جائے اس پر ماتم نہیں ہوتا۔

مگر تم نہیں سمجھیں۔ بابر یہ نقطہ جان گیا اور وہ پا گیا۔''

حوریہ فرط رنج سے کھڑی رہ گئی مومنہ پلٹ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

مومنہ سخت آزردہ تھی کل بابر نے اسے کال کی اور بتایا تھا کہ وہ بہت جلد دبئی ہمیشہ کے لیے سیٹل ہو رہا ہے اور اس نے مومنہ سے بڑی عاجزانہ درخواست کی تھی کہ علی شاہ کی کچھ پکس وہ انہیں واٹس اپ کر دیں۔

رات بھر مومنہ اس آزردگی کی لپیٹ میں رہی تھی وہ چاہتی تھی کہ بابر کو روک لے۔ مگر وہ اسے روکنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔

اس نے کتنے کرب سے کہا تھا۔

''آپ سے کہا تھا نا۔ میں یہ بازی اگر ہار گیا تو۔ اور آپ نے کہا تھا ہارنے کے ڈر سے ہار نہ جانا کہیں بابر؟ وہ ہلکے سے ہنسا۔ جیسے خود کو کمپوز کر رہا ہو۔'' واقعی سچ کہا تھا اگر میں اسے روک لیتا تو یقیناً ہار جاتا۔ مگر میں ہارا

نہیں میں نے اسے کھو کر بہت کچھ پالیا۔ جس سے اب تک بے خبر اور دور تھا۔"

بڑی صبر آزما ساعتوں سے مومنہ رات بھر بابر کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کامیابی اور ناکامی کا موازنہ کرتی رہی۔ اس کے لہجے کا بکھراؤ اسے اندر ہی اندر سے توڑتا رہا۔ اور اب یہ سارا دھواں حوریہ پر نکال کر وہ کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھیں۔

ادھر حوریہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی ان کے رویوں پر غور کرتی رہی۔ ان کے جملے۔ اور بہت سے جملوں کا پس منظر اس کے دل کو کوٹ رہا تھا۔

"تو آپ مجھے کم عقل، ناقدر شناس عورت سمجھتی ہیں۔ اس لیے کہ میں نے بابر کی محبت کی قدر نہیں کی۔ یہ سچ ہے وہ پتھر سے کندن بن گیا ہے، وہ ناکام ہو کر بھی کامیاب ہو گیا ہے۔

مگر آپ کو کیا خبر۔ پھپھو۔ کچھ محبتیں بڑی اذیت دیتی ہیں۔ کانٹوں کی طرح آپ سے لپٹ جاتی ہیں۔ باوجود چاہنے کا آپ گلے بھی نہیں لگا سکتے اور پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے۔ یہ رگ رگ میں گھسی چلی جاتی ہیں۔ انسان تڑپتا رہتا ہے۔

میں حازم کے غم میں کہاں رو رہی ہوں۔ اسے تو سونپ دیا خدا کی رحمت میں۔ میں تو اس اذیت کا ماتم کر رہی ہوں۔ جو میری رگ رگ میں گھسی ہوئی ہے۔ اس پر تڑپ رہی ہوں۔"

ایک سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

وہ بستر پر لیٹی بابر کے بارے میں سوچ جا رہی تھی۔ پھر سوئے ہوئے علی شاہ کی پیشانی پر دھیرے سے لب رکھ دیے۔

میں جانتی ہوں تمہیں بابر سے زیادہ کون چاہے گا کئی آنسو اس کی پلکوں پر ٹھہر گئے۔ مجھے معاف کر دو علی شاہ۔ میں نے تمہارے سر سے اتنی مضبوط چھت چھین لی۔

☆☆☆

جمعہ کو لڑکے والے آئے تھے لڑکے کی ماں اور بہن کو حوریہ بے طرح پسند آئی تھی۔ انہوں نے علی شاہ کو بھی قبول کر لیا تھا بس لڑکا نیم راضی تھا۔ جس پر عادل بھائی کا خیال تھا علی شاہ کو وہ اپنی کسٹڈی میں رکھ لیں گے۔

یاور علی بھی اس بات سے متفق تھے۔ ادھر حوریہ کے لیے یہ ساری باتیں وحشت ناک تھیں۔ وہ علی شاہ پر کسی غیر آدمی کا سایا تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نہ اس سے ایک پل کے لیے دست بردار ہو سکتی تھی۔

وہ سخت پراگندہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے ہی گھر میں وہ بالکل اکیلی، تنہا ہو کر رہ جائے گی۔ اپنوں کے رویئے اسے یوں ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ عادل بھائی کے ارادے اسے خوف زدہ کرنے لگے تھے ہر آنے والا لمحہ اسے سنگین ترین حالات کا نقشہ کھینچتا دکھائی دے رہا تھا وہ جانتی تھی اب وہ مزید مقابلہ نہیں کر پائے گی اور جبر کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ ایسے میں اسے بابر اندھیرے میں روشنی کی طرح دکھائی دینے لگا۔

گیلانی ہاؤس واحد جائے پناہ محسوس ہونے لگی۔ بابر اسے نجات دہندہ لگا۔

اس نے بابر سے رابطہ کر لیا۔ ادھر رات بابر تہجد پڑھ کر ہی سویا ہی تھا کہ حوریہ کی کال نے اسے حیران کر دیا۔

"ہیلو"

"بابر۔ پلیز مجھے بچا لو۔ وہ چھوٹتے ہی تڑپ کر رونے لگی۔ فقط بابر کی آواز سے ہی اس کے اندر طاقت امڈ آئی مجھے بچا لو بابر۔"

"حوریہ۔" پریشان ہو کر بابر نے اسے پکارا۔ مگر وہ تو بس روئے چلی جا رہی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

آسیہ مظہر چوہدری

دو کوڑی کی عورت



دعیں (سورج) کی نارنجی کرنیں ابھی پوری طرح دھرتی کے گوشوں سے الگ نہیں ہوئی تھیں۔ دعیں کا شوخ بھڑکتا چمکیلا پن دھرتی کے چاروں اور جا بجا ہر سو بکھرا پڑا تھا۔ دھرتی اس سمے کندن کی مانند مہک رہی تھی۔ اس نے سورج کی نارنجی کرنوں کو جی بھر کے دیکھا اور صحن میں بکھری جا بجا چیزیں سمیٹنے لگی۔ دعیں ڈوبنے کا منظر ہمیشہ سے ہی اس کو بھاتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔

اس نے تمام چیزیں سمیٹ کر جھاڑو اٹھالی تھی۔ بڑی آپا کے بچوں کے اودھم کودنے صحن کافی گندہ کردیا تھا۔ ابھی اس نے جھاڑو لگانے کا عمل شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر بڑے زور کا کھٹکا ہوا۔ اس مخصوص دستک سے اس کا دل سینے سے پھڑپھڑاتا حلق تک آپہنچا تھا۔ اس نے خوشی سے جھاڑو دور پٹخا اور فوراً بیرونی دروازے کی جانب بھاگی تھی۔

"کون ہے؟" جان کر بھی انجان بنی۔

"شبنم میں ہوں، دلاور۔" یہ سنتے ہی دروازہ وا ہو گیا تھا پر دلاور کے ساتھ کھڑے دوسرے نفوس کی چمک نے اسے سیاہ کردیا تھا۔ دعیں کی کرنیں آہستہ آہستہ دھرتی کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں جیسے اس کا پھڑپھڑاتا سانس اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہا تھا وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرتی چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔

✲ ✲ ✲

"شبنم! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ عشق کرتا ہوں تم سے، تم نہ ملی تو مرجاؤں گا۔" مرد نے عورت کو زیر کرنے کے لیے پہلا جال پھینکا تھا جس میں عورت بڑی آسانی سے پھنستی چلی گئی تھی۔

"دلاور! ایسی باتیں تو مت کرو۔" اس نے دہل کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"میں، اب جلد ہی ابا سے بات کرتا ہوں تمہارے رشتے کی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ اس بات پر مسکرا اٹھی تھی۔

"میں چاہتا اگلی دفعہ جب میں گھر آؤں تو تمہیں بیوی کے روپ میں اپنے سامنے کھڑا پاؤں۔" دلاور کی اس بات نے شبنم کے چہرے پر ان گنت دیے روشن کردیے تھے۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ پیار کی روشنی پا کر مزید دہک اٹھا تھا۔

"دلاور! ایک بات پوچھوں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"ایک کیا ہزار پوچھوں۔" دلاور نے شوخی سے اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"تم مجھے دھوکا تو نہیں دوگے۔" ازلی خدشہ جاگ اٹھا تھا۔

"شبنم! دلاور کو تم ایسا سمجھتی ہو۔" وہ جواباً ناراضی سے گویا ہوا۔

"نہیں نہیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ صفائی دینے لگی تھی۔

"شبنم! ہر خوف، خدشہ دل سے نکال دو، تم ۔۔۔ تمہاری ذات میرے لیے بہت اہم ہے، میں نے پہلے بھی کہا نہ میں تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہوں۔" وہ مخمور لہجے میں اسے قائل کرنے لگا۔

"میں جانتی ہوں، تم ثابت نہ بھی کرو تو بھی مجھے تم پر سو فیصد یقین ہے، دلاور۔" وہ قائل ہو چکی تھی اور ایک مرتبہ پھر عورت ہی مرد کے سامنے جھکی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کسی گھوڑے کی پیشانی پر گری ہوئی ایال۔ مرد آج بھی ویسے ہی شان و شوکت کے ساتھ اونچے سنگریزے پر براجمان تھا۔

✲ ✲ ✲

اوائل جنوری کی وہ کچھ دھندلی سی سرما کی سرد ہوا سکھ چین اور املتاس کے درختوں میں سے سکڑ کر ٹھٹھری ہوئی رفتار کی مانند بہہ رہی تھی۔ اسی صبح ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ ایک پاکیزہ، مضبوط رشتہ ان دونوں کے درمیان جڑ چکا تھا۔ شبنم کی حالت ایسی تھی جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس کے پاؤں دھرتی کے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے۔ اس کا من کررہا تھا کہ وہ رقص کرے، جھومے، گائے اور ساری

دنیا کو بتائے کہ وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اسے پریم امرت کا جام مل چکا ہے۔ وہ عشق زادی بن چکی ہے' وہ اپنی ذات' تن من سب عشق زادے کے نام کر چکی ہے۔ دیکھو مجھے مجھ جیسا کوئی خوش نصیب ہے؟ بتاؤ مجھے۔ اس کے من کی آوازیں نقارے کی مانند ہر جانب گونج رہی ہیں۔ وہ مدہوش ہوتی جارہی ہے۔ اس عشق میں گھلتی جارہی ہے دنیاوی عشق میں فانی عشق میں جس کی کوئی اوقات نہیں تھی جس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

شادی کی پہلی صبح اسے آج سے پہلے کبھی اتنی سحر انگیز نہیں لگی تھی۔ پوری رات پیا کے پریم گیت کسی رسیلے ملار کی مانند اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ دلاور کی محبت کی شدت اسے ہواؤں میں اڑا رہی تھی اور اس کے دل کو سکون پہنچاتا جملہ کسی پریم کتھا کی طرح اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

"شبنم میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں صرف تمہارا ہی بن کر رہوں گا' میرے دل میں تمہاری ہی تصویر سجے گی۔" دلاور کا یہ جملہ شبنم کے تن من کو شانت کر گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اسی سے دیوی بن گئی ہے پر یہ شبنم کی بھول تھی اس عورت کی بھول تھی۔

شادی کے تین دن کسی رنگین خواب کی مانند گزرے تھے۔ شبنم نے ان خوابوں کو چھو کر دیکھا تھا۔ ان خوابوں کی دنیا میں وہ اور دلاور بستے تھے۔ اسے لگا تھا ان تین دنوں میں غم نامی شے کو وہ ہمیشہ کے لیے بھول گئی ہے بس خوشیاں اس کے گرد بسیرا کیے ہوئے ہیں (ہونہہ عورت سے بڑی خوش فہم دنیا میں کوئی اور شے نہیں) دلاور محکمہ جنگلات کے ایک اونچے عہدے پر فائز تھا۔ اس لیے اسے اب واپس جانا تھا۔ شبنم اس کے جانے کا سن کر اداس ہو گئی تھی۔

"شبنم جان کیوں اداس ہو رہی ہو' میں بہت جلد تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔" دلاور نے اس کے سانولے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر تسلی بھرا لہجہ اختیار کیا تھا۔ یہ سن کر وہ شدت سے رو پڑی تھی۔

"دلاور! میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"بس چند ماہ کی بات ہے' میں بہت جلد بلالوں گا اور خط پھر بھی باقاعدگی سے بھیجتا رہوں گا' پلیز اب تم رو مت رات میرا جانا مشکل ہو جائے گا۔" دلاور نے پیار سے اس کا چہرہ سہلایا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یوں دلاور اپنی پریم دیوانی کو چھوڑ کر پریم نگری سے دور بہت دور چلا گیا تھا۔



اور وہ چند ماہ شبنم کے زندگی میں کبھی نہ آسکے تھے۔ دلاور کے جانے کے چوتھے دن اسے اس کی خیر خیریت کا پتر ملا تھا۔ وہ شانت ہو گئی تھی۔ ہر پتر میں اس کے لیے چند ماہ کے انتظار کا در کھلا ہوتا اور وہ اک آس کے تحت ہجر کی کالی راتیں اکیلے ہی کاٹتی جاتی۔ دلاور کو گئے دو سال ہو گئے تھے جن میں صرف وہ چار مرتبہ گھر آیا تھا۔ شبنم اس کے آنے پر سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اسے یہ تک یاد نہ ہوتا تھا کہ دلاور نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا بھی وعدہ کر رکھا ہے۔

"دلاورے تیری شادی کو خیری نال دو ورے (سال) ہو گئے ہیں اور ابھی تک شبنم کی گود خالی ہے تو اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا۔" اس مرتبہ وہ گھر آیا تو بڑی آپا نے اس سے دو بدو پوچھا تھا کیونکہ انہیں پتا تھا شبنم کی اپنی مت ماری گئی تھی وہ جو دلاور کہتا یقین کر لیتی۔

"آپا اگلی دفعہ آیا تو لے جاؤں گا۔" دلاور نے ہمیشہ کی طرح ہی بات ٹالی تھی۔

"تیری اگلی دفعہ ہور کتنی آنی ہیں' شرم کر کچھ 'جوان جہاں بیوی کو تو بڈھے پیو (باپ) کے سپرد کر گیا ہے جو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتا وہ نوں (بہو) کی کیا کرے گا۔" بڑی آپا نے اسے خوب لتاڑا تھا۔ وہ شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گیا تھا۔

"بڑی آپا سے تم نے میری شکایت لگائی ہے۔" رات کو وہ کمرے میں دودھ کا گلاس لے کر آئی تو دلاور

نے اس سے پوچھا تھا۔
"کون سی شکایت؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے تکنے لگی تھی۔
"یہی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے کر جارہا۔" وہ بولا تھا۔
"نہیں دلاور میری کوئی بات آپا سے نہیں ہوئی اور میں بھلا کیوں یہ بات آپا سے کہوں گی۔" وہ جواباً" سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔
"دیکھو شبنم! میرا خود دل چاہتا ہے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں پر میں مجبور ہوں، مجھے ابھی سرکاری علیحدہ گھر نہیں ملا ہے۔ شاید سال تک مل جائے تو میں تمہیں فوراً" سے پیشتر یہاں سے لے جاؤں گا۔ تم تو میری ہر بات سمجھتی ہو۔" وہ اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔
"کوئی بات نہیں دلاور جہاں دو سال انتظار کرلیا وہاں سال انتظار کیا معنی رکھتا ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر قائل ہوگئی تھی۔ عورت کی گھٹی میں قائل ہونا ازل سے لکھا ہے۔



ان چند ماہ کی طرح یہ سال بھی گزر گیا تھا۔ پر پریم دیوانی ابھی تک انتظار کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا اس کا پریم زادہ اسے ضرور ساتھ لے کر جائے گا اس دفعہ نہیں تو اگلی دفعہ۔ اگلی دفعہ نہیں تو اس سے اگلی دفعہ۔۔۔ بس اسے انتظار کی چوکھٹ پر بیٹھنا منظور تھا۔ اب تو محلے والے بھی باتیں بنانے لگے تھے۔ بڑی آپا محلے کی باتوں کا سارا غصہ اس پر نکالتی تھیں اسے کوستی سمجھاتیں پر وہ خاموش لب سیے بیٹھی رہتی پر ہاں جہاں دلاور کی ذات پر کوئی بات آتی الزام اٹھتا وہ فوراً" صفائی دینے کے لیے پیش پیش ہوجاتی۔ تین سال کی یہ کتھا ایسے ہی چلتی گئی تھی۔
دعیں کی نارنجی کرنیں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ وہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ جاتی سردیوں کا غروب ہوتا سورج اسے ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ اس نے سورج کی ایک کرن کو اپنے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔ کرن جب غروب ہوتی تو اسے پیغام آس دے جاتی کہ انتظار کرمیں تیرے لیے صبح ضرور آؤں گی۔ وہ انتظار کرنے لگ جاتی پر در حقیقت وہ سورج کی کرن کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ وہ دلاور کے آنے کی امید کو زندہ کرتی تھی۔ پر وہ آج قطعی یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہ بے مول ہونے والی ہے 'پریم امرت' چھلکنے والا ہے۔ اگر جان جاتی تو کبھی سورج کی کرن کو ہم جولی نہ بناتی۔۔۔ پر کہا تھا نہ وہ اک عورت تھی خوش فہم عورت۔۔۔



آج اتوار کا دن تھا۔ اس لیے بڑی آپا اور ان کے پانچ بچے کل رات کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپا ان کے ساتھ والے گاؤں میں ہی رہتی تھیں۔ اس لیے ہر ہفتے ان کے ہاں چکر ضرور لگاتیں۔ ہفتے کی رات قیام کرتیں اور اتوار کی صبح اپنے گھر سدھار جاتیں۔ ان کے اس طرح یہاں آنے سے شبنم کا جی بہل جاتا تھا کیونکہ بیمار ابا تو ہر وقت اپنے کمرے میں بند پڑے رہتے تھے۔ یوں شبنم گھر میں اکیلی بولائی بولائی پھرتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے گھر صاف کرنا شروع کردیا۔ کیونکہ آپا کے شرارتی بچوں نے کافی گند پھیلا رکھا تھا۔ اندرونی حصہ صاف ستھرا کر کے اس نے بیرونی احاطے کا اندازہ کیا۔ وہ بھی بچوں کی اودھم سے میدان جنگ کا منظر پیش کررہا تھا۔
"چل شبنم شروع ہوجا۔" یہ کہہ کر اس نے دوپٹا کسا اور جھاڑو اٹھالیا۔ اس نے چند گز زمین پر جھاڑو لگایا ہی تھا کہ بیرونی دروازے پر بڑے زور کا کھٹکا ہوا۔ وہ اس مخصوص دستک کو فوراً" پہچان گئی تھی اور کیسے نہ پہچانتی پریم امرت کا جام پی کر اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کیسے سواگت ہوتا۔ دروازہ وا ہو گیا تھا اور آگے اس کا پریم زادہ کھڑا تھا۔ جس کو دیکھ کر اس کا سلونا رنگ کندن وانگوں دہک اٹھا تھا۔ پر ساتھ کھڑی زرتار کپڑوں والی عورت نے اس کا کندن رنگ راکھ بنادیا تھا۔ سیاہ

راکھ۔

"شبنم اندر آنے کو نہیں کہو گی۔" دلاور کی آواز نے اسے ہوش کی دنیا میں پہنچایا تھا۔ یہ رنگین خواب نہیں تھے۔ ایک تلخ حقیقت مجسم بنی کھڑی تھی۔

"یہ کک۔۔ کون ہے دلاور۔" زبان کو تالو کے شکنجے سے بڑی مشکل سے چھڑایا تھا۔

"یہ میری بیوی ہے مہرجان۔" یہ الفاظ نہیں تھے پگھلا سیسہ تھے۔ جو اس کے کانوں میں انڈیلے جا چکے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی تھی اور پھر نیچے ہی نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔



"میں مجبور تھا۔ شبنم اگر شادی نہ کرتا تو میری نوکری چلی جاتی۔" وہ بت بنی شبنم کے سامنے صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ لاتعداد وضاحتیں لاتعداد دلیلیں۔۔۔ اک آس، ایک امید کہ ہر دفعہ کی طرح وہ پھر قائل ہو جائے گی۔ میں اسے قائل کرلوں گا۔ پکا ٹھوس یقین۔ پر اب ایسا کچھ نہ ہونا تھا۔ کیونکہ وہ اب پریم دیوانی نہیں رہی تھی۔ عشق زادی بھی نہیں رہی تھی۔ پریم امرت کا جام بھی چھلک سے ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ وہ اب دو کوڑی کی عورت بن چکی تھی۔ جس کی اتنی اوقات بھی نہیں تھی کہ وہ ان الفاظ کو سن لیتی۔ یا سمجھ لیتی۔ بس چپ بیٹھی تھی۔ بالکل چپ۔

"شبنم کچھ تو بولو۔" دلاور نے اس کی خاموشی دیکھ کر اسے جھنجوڑا تھا۔

"میں بھول گئی تھی سب بھول گئی تھی۔" وہ الفاظ یک دم آنسو کے ساتھ رواں ہوئے تھے۔

"جان، بوجھ کر بھی انجان بنی رہی پر عورت تھی نا پھر اعتبار کر بیٹھی اپنی ذات بے مول کر بیٹھی اب میرا اپنے سر پر راکھ ڈالنے کو جی چاہتا ہے دلاور کہ کاش میں عورت ہی رہتی۔ دیوی بننے کی کوشش نہ کرتی تو آج یہ سب نہ ہوتا کچھ بھی نہ ہوتا۔ پر میں نے دنیاوی محبتوں کی چاہ کی۔ وہ محبتیں جو کسی کی نہ ہو سکیں دکھ مجھے تمہاری شادی کا نہیں ہے بس اس بات کا ہے کہ تمہاری نظر میں، میں ہمیشہ دو کوڑی کی ہی عورت تھی۔ پر مجھے سمجھنے میں بہت دیر ہو گئی، بہت دیر ہو گئی۔۔۔۔۔ دکھی مت ہونا میں آج بھی قائل ہو جاتی پر اگر پریم دیوانی ہوتی۔ اب تو میں دو کوڑی کی عورت ہو گئی دلاور جاؤ مہرجان تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اب اسے قائل کرنے کے حربے آزماؤ تم مردوں کا یہی تو کام ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے طلاق بھجوا دینا۔ کیونکہ تمہیں ہمیشہ پریم زادی کی ضرورت رہے گی دو کوڑی عورت کی نہیں۔" وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ دعیں کی نارنجی کرنیں آہستہ آہستہ سیاہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اور دو کوڑی کی عورت آہستہ آہستہ ان کرنوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دور بہت دور۔۔۔۔



مکمل ناول

نادیہ احمد

جنوں سا لا

سرخ گلابوں سے سجا کشادہ کمرہ بہار کا منظر پیش کررہا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھے جہازی بیڈ پہ بچھے قیمتی مخملی بیڈ کور پہ اس کے پہلو بدلنے سے پڑنے والی شکنیں دل کے اندر مچی ہلچل کی غماز تھیں۔ وسط گرما کے باوجود کمرے میں ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈک اس کی مہندی رچی نازک اور مخروطی انگلیوں میں اترتی انہیں یخ بستہ کررہی تھی۔ کچھ پھولوں کی بھینی مہک، کچھ اے سی کی سرد ہوا۔۔۔ اس پہ نئی زندگی کا خمار، آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں لیکن دروازے کی ناب گھمانے کی آواز کانوں تک پہنچی تو وہ ایکدم چوکس ہوکر بیٹھ گئی۔ آنے والے کے قدموں کی چاپ دل کی دھڑکن تیز کررہی تھی۔ اپنی بھیگی ہتھیلیوں کو مسلتے وہ پلکیں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے بالکل پاس پہنچ کر قدم ٹھہر گئے۔ وہ تھوڑا اور محتاط ہوئی۔

''ضوفشاں''۔ سرخ لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ سجائے اس نے پلکیں اٹھائیں۔

''یہ میرا بیٹا ہے''۔ اپنے پاس کھڑے نوعمر سرخ وسفید بچے کا ہاتھ تھپتھپاتے وہ مزید بولا۔ ''اور آج سے یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ یوں سمجھو میری طرف سے تمہارے لیے یہ ہماری شادی کا تحفہ ہے''۔ اس نے تحیر سے اپنی رونمائی کے تحفے کی جانب دیکھا۔ بچہ پرشوق نظروں پر سنجیدہ تاثرات لیے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ سینے سے ایک گہری سانس نکلی پر اگلے ہی پل لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوکر آنکھوں تک پہنچی۔ محبت سے ہاتھ بڑھا کر اس نے بچے کو اپنی جانب کھینچا۔ وہ بلا اعتراض پاس چلا آیا۔

''آپ بے فکر رہیں یہ آج سے میرا بیٹا ہے اور میری ذمہ داری ہے۔'' کیا خوب شب عروسی تھی اور کیا ہی شاندار رونمائی تھی۔

شفقت سے اس کا ماتھا چومتے وہ شیریں لہجے میں بولی۔

☆☆☆

دھند کے پردے میں چھپا سورج کا تھال دلہن سا شرمایا اپنی چھب دکھلا کر بادلوں کی اوٹ میں جاچکا تھا۔ شہر اور اس کے گردونواح میں پچھلے دو دن سے شدید دھند چھائی تھی، رات کو اکثر درجہ حرارت نقطۂ انجماد کو چھو لیتا تھا۔ سہ پہر تک اندھیرا چھا جاتا، چہار سو خاموشی ڈیرے ڈال لیتی تھی۔ تین ساڑھے تین بجے دھند زمین کا رخ کرنے لگتی اور اس کے ساتھ سڑکوں پہ ٹریفک بتدریج کم ہوتی جاتی، گلیاں ویران ہوجاتیں۔ رگوں میں لہو جماتی سردی نے کاروبار دنیا کو بری طرح متاثر کررکھا تھا۔ آج بھی صبح سے ہر طرف خاموشی چھائی تھی ماسوائے سکندر ولا کے۔۔۔ جہاں اوپری منزل کے ایک کمرے میں طوفان مچا ہوا تھا۔ یہاں سے وہاں بھاگتی، سر کھجاتی، ناک منہ چڑھاتی وہ کبھی درازیں کھنگال رہی تھی تو کبھی الماریوں کے دروازے بج رہے تھے۔ چہرے پہ شدید ہونق پن تھا۔ آنکھوں میں بلا کی بے زاری تھی۔

''بھئی میں پوچھتا ہوں اس کمرے میں اتنا اودھم کیوں مچا رکھا ہے؟'' سکندر حسین نے دروازے

کی اوٹ سے منہ نکالا۔ ''ایسا لگتا ہے دشمن نے مورچوں میں گھس کر اینٹ سے اینٹ بجادی ہو۔ آخر پتا تو چلے یہ شب خون کس بناء پر مارا گیا''۔ کمرہ بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ وہ بلاتامل اندر چلے آئے اور داخل ہوتے ہی سوال داغا۔

''بابا ہٹ جائیں پلیز مجھے جانا ہے''۔ الماری سے کپڑے نکالتے اس نے احتجاج کیا۔

''کیا مطلب جانا ہے۔ میں تو سمجھا تم پہ ہفتہ صفائی منانے کا جنون سوار ہوا ہے جو سارا سامان الماریوں سے نکال کر پھینکا ہوا ہے''۔ سکندر حسین متعجب ہوئے۔ بیڈ پہ آٹھ دس جوڑے بمعہ ہینگر موجود تھے پاس ہی ایک چھوٹا سا سفری بیگ اور اس کا ہنڈ بیگ کھلا ہوا تھا جس میں چیزیں بے ترتیبی سے ٹھونسی گئی تھیں۔

''رابیل یہ تمہارا سوٹ استری ہو گیا''۔ مزینہ



بے جھجک کمرے میں داخل ہوئی اور ایک تہ شدہ جوڑا اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے فائ فٹ بیگ میں ڈال لیا۔ مزینہ بھی اس کی مدد کرنے لگی۔ وہ دونوں ہی ان کی موجودگی کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

''تھینکس آپی''۔ سیاہ برنٹڈ شارٹ شرٹ اور آف وائٹ ٹراؤزر پہ سیاہ سویٹر پہنے وہ تقریباً تیار تھی۔ شولڈر کٹ بھورے بالوں کو کیچر میں جکڑ رکھا تھا پر چندہ آوارہ لٹیں اس بھاگ دوڑ میں دودھیا گالوں کو چھو جاتی تھیں۔ میک اپ کے نام پہ فقط ایک سرخ لپ اسٹک تھی جس نے ہونٹوں کو سجا رکھا تھا۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ نارمل تھی پر اس کا دراز قد، متناسب جسامت اور اس کا اسٹائل توجہ بٹورتا تھا۔

''تو کیا تم نے سچ میں گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ جانے سے پہلے کم سے کم باپ کو تو بتا دو''۔ مارے تجسس ان کا حال خراب ہو رہا تھا۔

''بابا''۔ وہ پلٹی اور دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر آنکھیں گھمائیں۔

''اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ وعدہ نہیں کرتا لیکن ہائی کمانڈ سے بات کروں گا۔ میری طرح تمہیں بھی کسی کونے میں سر چھپانے کی جگہ مل جائے گی''۔ وہ باقاعدہ ہار یا ننے والے انداز میں بولے، چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔

''بابا میں ہاسپٹل جا رہی ہوں''۔ رابیل نے دایاں ہاتھ سر پہ مارتے بلند آواز میں کہا۔

''اچھا تو وہ رکھ لیتے ہیں گھر بدر ہونے والے ڈاکٹروں کو''۔ وہ اب بھی نہایت سنجیدہ تھے پر آنکھوں میں شرارت چغلی کھا رہی تھی۔

''بابا رابیل کی ڈیوٹی ہے چھتیس گھنٹے کی۔ آج جائے گی پرسوں واپس آجائے گی''۔ رابیل زچ ہوئی جبکہ مزینہ نے وضاحت کی۔

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے لیے یہ سب ساتھ لے جا رہی ہو۔ کیا ہسپتال میں ڈاکٹری نہیں چل رہی جو عورتوں کا جمعہ بازار کھولنے کا سائڈ بزنس پلان کر رہی ہو''۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے وہ قریبی صوفہ پہ براجمان ہو گئے۔

''جی نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس کپڑے سلیکٹ کر رہی تھی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا کون سے لے کر جاؤں''۔ رابیل نے منہ بناتے بیڈ پہ بکھرا پلندہ الٹ پلٹ کیا۔ وہ اب تک کنفیوز تھی۔

''اسی لیے میں تمہارے ڈاکٹر بننے کے خلاف تھا۔ یہاں کپڑے سلیکٹ کرنے میں الجھی ہو وہاں مریضوں کو دوا دینے پہ اٹک جاتی ہو گی۔ گلابی ٹیبلیٹ کے ساتھ سفید نہیں سبز کیپسول کا کمبینیشن بنے گا۔۔۔ سرخ شربت کے ساتھ نیلا کیپسول دیا جائے یا نہیں''۔ اپنی ایسی ہی باتوں کی بدولت وہ اچھے خاصے سنجیدہ ماحول میں ہنسی کے رنگ بکھیرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس گھر میں رابیل کے بعد سب سے زیادہ شور مچانے والوں میں سکندر حسین کا نام سرِ فہرست تھا۔ بقول ان کی بیگم اس گھر پہ چڑیا گھر کا گمان ہوتا ہے اور ان دونوں کی موجودگی میں گھر سے خاموشی اور سنجیدگی بنا اجازت واک آؤٹ کر جاتی تھی۔

''تو آج پھر تمہاری سواری روانگی کو تیار ہے؟'' شگفتہ کی آمد نے رابیل اور مزینہ کو چوکس کیا تھا۔ ماتھے پہ بل ڈالے انہوں نے سوال کیا تو رابیل نے نچلا لب کاٹا۔

''ممی میری ڈیوٹی ہے''۔ نظریں جھکائے اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو روز ہوتی ہے۔ اسپتال میں بس لے دے کر ایک تم ہی فارغ ہو جو آئے دن تمہارا بلاوا رہتا ہے''۔ ان کا انداز استہزائیہ تھا۔ رابیل نے نظریں نہیں اٹھائیں۔

''بیگم صاحبہ آپ کی بیٹی ڈاکٹر ہے وہ بھی نہایت مشکل سے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے اسے ہسپتال میں حاضری لگوانی پڑتی ہے''۔ سکندر حسین نے بروقت مداخلت کی وہ ان تمام موقعوں پہ بیٹیوں کی دفاعی ڈھال ہوتے تھے جب ان کی بیگم کا پارہ چڑھا ہوتا تھا۔

"یہ کپڑے کیوں پھیلا رکھے ہیں؟" ان کی بات کو یکسر نظر انداز کر کے وہ اب بھی اسی سے مخاطب تھیں۔

"ممی میں سمیٹ دیتی ہوں"۔ مزینہ نے جلدی جلدی ہینگر اٹھانا شروع کیے۔

"کوئی ضرورت نہیں، یہ رابیل کا کمرہ ہے اور اس کی ذمہ داری ہے اپنا پھیلاوا اٹھائے۔ تم چلو میرے ساتھ کچن میں کام ہے"۔ حکمیہ لہجے میں کہتیں وہ کمرے سے نکل گئیں۔ ان کی ناراضی کے خوف سے مزینہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو دیکھا اور کندھے اچکا کر اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

"ہائی کمانڈ کی سرخ بتی (خطرے کا نشان) جل چکی ہے"۔ صوفے پہ بیٹھے سکندر حسین نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

"وہ تو ہر وقت ہی جلتی رہتی ہے"۔ وہ پیر پٹختی بیڈ پہ جا بیٹھی۔ "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میں ان کی سگی اولاد نہیں ہوں۔۔۔۔ بالکل سوتیلوں والا سلوک کرتی ہیں مجھ سے"۔ اپنا اسٹیتھو اسکوپ بیگ میں ٹھونستے رابیل نے منہ بنایا۔ اور دونوں باپ بیٹی مل کر کمرے کی چیزیں واپس رکھنے لگے۔

"ہائے کچھ ایسا ہی غم مجھے بھی ہے چندا۔ آج تک کبھی سگے شوہر والا سلوک نہیں کیا مجھ سے ہمیشہ سوتیلا برتاؤ کیا ہے تمہاری ماں نے"۔ کمرہ اب پہلے والی حالت میں واپس آ چکا تھا اور اس کے ساتھ ان کا موڈ بھی۔ گردن کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہوئے انہوں نے انتہائی درد بھرے انداز میں کہا کہ رابیل کا خراب موڈ دم دبا کر بھاگ گیا۔ وہ بے اختیار ہنسی تھی۔

☆☆☆

شہر کے پوش علاقے میں وسیع سبزہ زار میں گھری قیمتی پتھر اور شیشوں سے تعمیر شدہ یہ عمارت سر کے تاج سی شان و شوکت اور آن بان سے کھڑی تھی۔ "آشیانہ" کی اوپری منزل پہ بنے ماسٹر بیڈ روم کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے اس نے خود پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ سلور ٹائی کی ناٹ درست کر کے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی کلون کی بوتل سے خود پہ چھڑکاؤ کیا۔ سیاہ جیکٹ کا بٹن لگا کر اپنے نم بالوں میں انگلیاں چلاتے ان کی ترتیب درست کرتا وہ اب اپنا موبائل فون چیک کر رہا تھا جہاں بے شمار مسڈ کالز اور میسجز بلنک کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ بیگ اٹھائے دوسرے ہاتھ سے موبائل اسکرین اسکرول کرتا وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور تیز قدموں سے چلتا وہ ڈرائیو وے تک آیا۔ سفید لگژری کار کے پاس کھڑے ڈرائیور نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، اس کا بیگ تھاما اور پچھلا دروازہ کھولا۔ کال مل چکی تھی وہ اب سیل فون پہ بات کر رہا تھا۔ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا گیا تھا۔ گھر سے دفتر تک کے سفر کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ فون پہ کالز کا تانتا بندھ گیا۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری کال اٹینڈ کرتے وہ ساتھ ساتھ میسجز کے جوابات بھی دے رہا تھا۔ تمام کالز کاروباری نوعیت کی تھیں۔ ڈرائیور محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ اس کے معمول سے باخبر تھا۔ گاڑی مناسب رفتار میں سڑک پہ دوڑتی لمحہ بہ لمحہ اپنی منزل تک پہنچ رہی تھی کہ اچانک ایک ٹرالر کو اوورٹیک کرنے کی کوشش میں اسٹیئرنگ پھسلا۔ "گل خان دیکھ کے"۔ تمام دھیان فون پہ ہونے کے باوجود وہ پوری طرح چوکس تھا پر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ تیز رفتار ٹرالر، گاڑی کے اگلے حصے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔ گاڑی بے قابو ہو کر سڑک پہ قلابازیاں لگاتی آنِ واحد میں سڑک کے دوسری جانب الٹی پڑی تھی۔ اس کا اگلا حصہ بری طرح اڑ گیا تھا۔

☆☆☆

سکندر ولا کے لاؤنج کی بتیاں روشن تھیں اور حسبِ معمول شگفتہ بیگم کا موڈ بری طرح آف تھا۔ موضوعِ گفتگو بس ایک تھا اور ہمیشہ کی طرح ان کی بات کو سکندر حسین نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ فقط آپ کی دی ہوئی ڈھیل ہے جو یہ لڑکی

مجھے تو کسی گنتی میں ہی نہیں لکھتی"۔ رابیل کے نکلتے ہی شکوے شروع ہو گئے تھے۔

"بیگم صاحبہ گنتی تو آپ سے آگے پہنچی ہی نہیں، ہائے دل کے ارماں دل میں ہی رہ گئے ظالم"۔ مزینہ کی ہنسی نکل گئی۔

"سکندر حسین میں انتہائی سنجیدہ ہوں"۔ شگفتہ کے گھور کر دیکھنے پہ وہ ایکدم سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی اور کن انکھیوں سے بابا کی سمت دیکھا جن کے چہرے پہ اب بھی شرارت عروج پہ تھی۔

"لیکن اب ایسی باتوں پہ سنجیدہ ہونے کا کیا فائدہ، وہ دن تو بیت گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے"۔ وہ بے جا اپنا سر کھپا رہی تھیں اتنا تو جانتی تھیں۔ سکندر حسین چکنے گھڑے تھے کم ہی ان سے سنبھلتے تھے۔

"پرسوں سالگرہ ہے رابیل کی اور غالباً یہ پروگرام بھی آپ کا ہی طے کردہ تھا کہ اسے سرپرائز پارٹی دی جائے گی"۔ انہوں نے یاددہانی کرائی۔

"ہاں تو ہم کہاں مکر رہے ہیں۔ پارٹی ہوگی اور بالکل ہوگی۔ کیوں بھئی مزینہ"۔ سکندر صاحب نے پاس بیٹھی مزینہ کو مخاطب کیا۔

"جی بابا، میں نے اور شجاع نے سب انتظامات کر لیے ہیں"۔ فلور کشن پہ بیٹھی مزینہ نے تفصیلات بتائیں۔

"میرا خیال ہے سالگرہ کی تقریب میں اس شخص کی شمولیت بھی ضروری ہوتی ہے جس کی سالگرہ ہو۔ یا پھر آپ دونوں باپ بیٹی اس کا بھی کوئی شاندار حل نکال چکے ہیں۔ کیک کی تصویر اس کو واٹس ایپ کردی جائے گی اور جواباً وہ اس پہ الیکٹرانک چھری چلا کر آپ کو ارسال کر دیں گی"۔ شگفتہ نے طنز کیا۔

"بھئی واہ واہ، سائنس کی ترقی نے آپ کے دماغ کو بھی چلا ہی دیا۔ کیا زریں طریقہ بتایا ہے۔ بہت اعلا"۔ سکندر حسین نے داد دی۔

"ماما رابیل دوپہر تک واپس آجائے گی، کہہ کر گئی ہے۔ آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں"۔ مزینہ بے چاری ان موقعوں پر ہمیشہ پستی تھی۔ اس نے اپنے تئیں تسلی دی پر شگفتہ کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

"مجھے تم سب چین سے بیٹھنے دیتے ہی کب ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ ہے اس گھر میں اور باقی کی کسر یہ پوری کر دیتے ہیں اپنی اولاد کے ساتھ مل کر۔ پھر کہتے ہیں پریشان مت ہو"۔ وہ نروٹھے پن سے کہتیں پیر پٹختیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"بابا آپ کیوں ہر وقت ماما کو تنگ کرتے رہتے ہیں"۔ مزینہ کی بات پر سکندر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

"یار یہ اس عمر میں ہم بڈھوں کے رومانس کا ایک انداز ہے۔ تم ٹینشن مت لیا کرو"۔ کیا خوب وضاحت دی گئی تھی۔

"اچھا تو پھر جائیں انہیں منائیں وہ ناراض ہوگئی ہیں"۔

"لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یعنی میں شیر کی کچھار میں اکیلا اتر جاؤں۔ نہ بابا نہ، زندگی بہت قیمتی شے ہے اور میں بھرے بڑھاپے میں شہید نہیں ہونا چاہتا"۔ انہوں نے باقاعدہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"یوں کرو، تم بھی ساتھ آجاؤ مل کر مناتے ہیں تمہاری ماما کو، کیا خیال ہے"۔ سر ہلاتی مزینہ ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

شہر کے پوش علاقے میں بنی اس نئی کالونی میں چھوٹے کوٹھی نما گھر جو باہر اور اندر سے تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ فرق تھا تو بس مکینوں کا، ان کی عادات کا، طرز زندگی کا۔ حاصل کی دوڑ میں اچھے حال سے بے حال ہو رہے ہجوم سے ہٹ کر بھی ابھی چند لوگ تھے جو زندگی کو زندگی کی طرح جیتے تھے۔ جن کے قہقہے مصنوعی نہیں تھے۔ جہاں خلوص کی مٹی میں گندھے رشتے سکون کا باعث تھے۔ کل چار نفوس پہ مشتمل یہ چھوٹا سا گھر قہقہوں سے گونجتا یہاں کے مکینوں کی زندہ دلی کی شاندار مثال تھا۔ یہاں دولت کی چاہ سے بڑھ کر رشتوں کی محبت تھی جو دلوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ سکندر حسین ریٹائرڈ پروفیسر تھے اور شگفتہ خاتونِ خانہ، کسی زمانے میں وہ بھی کالج میں

لیکچرار رہ چکی تھیں لیکن پھر گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی وجہ سے انہوں نے ریزائن کردیا تھا۔ گھر کا ماحول تعلیمی تھا اور دونوں بیٹیاں نہایت ذہین۔ مزینہ تو ماسٹرز کے بعد گھر پہ ہی تھی کیونکہ اسے ملازمت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی دوسرے گریجویشن میں ہی اس کا نکاح اس کے ماموں زاد شجاع سے ہوچکا تھا۔ رابیل کو ڈاکٹر بننا تھا۔ سکندر حسین اور شگفتہ دونوں ہی اس بات کے حق میں نہیں تھے کیونکہ میڈیسن جیسی مشکل اور سنجیدہ پڑھائی رابیل کے مزاج سے یکسر مختلف تھی۔ وہ انتہائی غیر سنجیدہ، بے حد باتونی اور سب سے بڑھ کر غیر ذمہ دار تھی جس پہ اکثر اس کی ممی سے کھنچائی ہوتی رہتی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پہ وہ اپنے مزاج کے برعکس اپنی پڑھائی اور پروفیشن دونوں میں بے حد سنجیدہ تھی۔ مقامی اسپتال سے اپنی ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد وہ اب اسی اسپتال کے شعبہ حادثات میں کام کررہی تھی۔ پچھلے دنوں دو ڈاکٹروں کی سالانہ چھٹیوں کی وجہ سے آج کل آن ڈیوٹی ڈاکٹروں پہ کام کا بوجھ زیادہ تھا اسی لیے اس کا گھر سے زیادہ وقت اسپتال میں گزر رہا تھا۔ شگفتہ کی ناراضی کی وجہ بھی اس کا ضرورت سے زیادہ خود کو پریشر میں رکھ کر کام کرنا تھا اور ان دنوں وہ اس سے خفا تھیں جس کا اظہار وہ اپنے مخصوص انداز میں کرتی رہتی تھیں۔ سکندر حسین اس کے سب سے بڑے حامی تھے کیونکہ وہ ان کی بے حد لاڈلی تھی۔ سکندر حسین اور مزینہ کی دفاعی شیلڈ نہ ہوتی تو یقیناً شگفتہ کی باتیں اسے تھوڑا بہت بدل دیتیں لیکن وہ دونوں وفاداری کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ان کے عتاب سے بچالیا کرتے تھے۔

☆☆☆

اسپتال میں معمول کی گہما گہمی تھی لیکن شعبہ حادثات کی طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ایسے میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک سے پیدا ہونے والا شور فضا میں گونج رہا تھا۔ وہی دوپہر والے لباس پہ سفید اوور آل پہنے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے وہ پوری طرح چاق و چوبند تھی۔ بال اب بھی کیچر میں لپٹے تھے اور بھوری لٹیں کچھ اور پریشان نظر آرہی تھیں۔ کانوں میں دمکتے زرقون کے ٹاپس جو اس کے جسم پہ واحد زیور تھا اور اس کے چہرے پہ جچ رہا تھا۔

''ڈاکٹر رابیل رنگ روڈ ایکسیڈنٹ کیس کو آپ اٹینڈ کررہی ہیں''؟ ایمرجنسی انچارج، ڈاکٹر شفقت کیانی کے تیز قدموں سے قدم ملاتے وہ ان کے ہمراہ ایمرجنسی روم کی طرف بڑھی۔ ہاتھ میں پکڑی فائل پہ نگاہ ڈالتے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

''جی سر میں اور ڈاکٹر عاصم ۔۔۔۔ ہم دونوں کی ڈیوٹی ہے ایمرجنسی میں''۔ چلتے چلتے وہ دونوں کیس بھی ڈسکس کررہے تھے۔

''تو کیا اپ ڈیٹ ہے''؟ ڈاکٹر کیانی نے سوال کیا۔

''ڈرائیور کی تو آن دی اسپاٹ ڈیتھ ہوگئی تھی۔ اس کی ڈیڈ باڈی ہم نے اس کے لواحقین کو ضروری کارروائی کے بعد ہینڈ اوور کردی''۔ عادتاً نچلا لب دباتے اس نے تفصیلات بتانا شروع کیں۔

''ویری سیڈ، اور وہ دوسرا مریض؟'' ڈاکٹر کیانی نے مزید پوچھا۔

''ہی واز ان کانشس ود مائنر انجریز'' (وہ بیہوش تھا معمولی زخموں کے ساتھ)
فوری طبی امداد کے بعد وہ مستحکم ہے۔ ہوش میں آجائے تو آئی تھنک اسے روم میں شفٹ کیا جاسکتا ہے''۔ وہ دونوں پیشہ ورانہ انداز میں باتیں کرتے ایمرجنسی روم تک پہنچ چکے تھے۔

''کچھ پتا چلا کون ہے وہ، اس کے ورثاء کو اطلاع دی؟'' ڈاکٹر کیانی نے مزید پوچھا۔

''سر کوئی ازلان شاہ ہے۔۔ انتظامیہ نے اس کی فیملی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شاید ملک میں نہیں۔ باقی اس کا اسٹاف ہے یہاں''۔ ایمرجنسی روم کا دروازہ کھولتے رابیل نے ان تک معلومات پہنچائی۔

''کیا ٹریٹمنٹ دیا ہے آپ نے انہیں؟'' وہ

دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ وسیع کمرے میں کل چار بیڈ لگے تھے جنہیں پردوں کی مدد سے الگ کیا گیا تھا۔ ایک پردہ ہٹا کر وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

''سر یہ فائل میں ڈیٹیلز ہیں ساری''۔ بستر پہ لیٹے مریض پہ نگاہ ڈالتے اس نے بتایا۔ وہ اس وقت ہوش میں تھا۔

''ہیلو مسٹر اذلان۔۔۔۔میرا نام ڈاکٹر شفقت کیانی ہے اور یہ ڈاکٹر رابیل ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس بار اسے مخاطب کیا تھا۔ ''کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟ ویسے آپ بہت خوش قسمت ہیں جو اتنے خطرناک حادثے میں سروائیو کر گئے ہیں''۔ وہ خاموش تھا۔ ڈاکٹر نے بشاش لہجے میں کہا۔

''خوش قسمت؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ چہرہ بے تاثر تھا۔

''اسٹاف بی پی چیک کریں''۔ پاس کھڑی ڈیوٹی نرس کو ہدایت دی گئی تھی۔ نرس نے بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ درست کرتے اس کا بازو تھاما۔ اس کے خاموش وجود میں حرکت ہوئی تھی۔

''اسٹاپ۔۔۔۔ڈونٹ ٹچ می''۔ وہ تقریباً دھاڑا تھا۔

''مسٹر شاہ وہ آپ کا بی پی چیک کریں گی''۔ ڈاکٹر کیانی نے نرمی سے سمجھایا پر اس کے چہرے پہ وحشت تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پہ نرس نے ایک بار پھر اس کا بازو تھامنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہا خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔'' وہ شدید مشتعل تھا۔ احتجاج اتنا شدید تھا کہ نرس اور ڈاکٹر دونوں ہی ششدر تھے۔ آنکھوں میں شدید غصہ تھا جس کا اظہار اس نے ہاتھ پہ لگا کینولا کھینچتے ہوئے کیا۔ بے دردی سے سوئی نکالتے خون کے ننھے قطرے ہاتھ کے بیرونی حصے پہ نمودار ہوئے تھے۔

''اُف!'' رابیل نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ وہ ایک مضبوط توانا مرد تھا اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی جس سے رابیل کو شدید جھٹکا لگا اور کوٹ کی جیب میں اٹکا اس کا فاؤنٹین پین ٹائل فلور پہ گر کر دو ٹکڑے ہو گیا مگر رابیل نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔

''چپ''۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی چھوٹے بچے کو ڈپٹتا ہے۔ وہ بے یقینی سے اس نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا جو بے حد سنجیدہ اور تنبیہہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

''اسٹاف آپ بی پی چیک کریں''۔ نرس کو حکم دیتے وہ خود روئی سے ہاتھ پہ لگا خون صاف کرتے اب اس کا کینولا دوبارہ لگا رہی تھی۔ وہ بغور اسی کو دیکھ رہا تھا پر احتجاج دم توڑ چکا تھا۔ سر تکیے پہ گراتے وہ اب مشتعل نہیں مگر بے چین تھا۔ رابیل نے جھک کر اپنے قلم کے دونوں ٹکڑے اٹھائے۔ اس کے چہرے پہ تاسف تھا سر جھٹکتے اس نے ایک نظر اس عجیب مریض کو دیکھا اور قلم کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ چند منٹ اس کی طبیعت، دواؤں اور طریقہ علاج پہ تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے دوسرے مریض کے پاس چلے گئے تھے۔ بستر پہ لیٹے اذلان کا سر مسکن دواؤں کی وجہ سے بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، چند منٹ میں وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☆☆☆

رابیل اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی اپنے ڈنر سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب ڈاکٹر عاصم ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھامے اندر داخل ہوا۔ اسے مزے سے پیزا اڑاتا دیکھ کر ماتھے پہ تیوریاں چڑھائیں اور پھر چائے کا مگ میز پہ پٹخنے کے سے انداز میں رکھا گیا تھا۔

''سننے میں آیا آپ کا وہ سنہری قلم اس دار فانی سے کوچ کر گیا ہے''۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے اس نے وضاحت کی اور اصل مدعا کی طرف آیا۔ یقیناً ڈیوٹی نرس کی بدولت ایمرجنسی کا واقعہ اس تک پہنچا تھا۔

''ٹھیک سنا ہے آپ نے''۔ رابیل نے لب بھینچے۔ اس کے چہرے پہ تاسف در آیا تھا۔

''بہت افسوس ہوا۔ یقیناً نہایت نایاب قلم ہو گا

جسے آپ یوں ہر پل دل سے لگا کر رکھتی تھیں۔ فرعون کے زمانے کا تو ہوگا؟'' ڈاکٹر عاصم اس کا بیچ میٹ تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور ہاؤس جاب کے بعد دونوں ملازمت بھی ایک ہی اسپتال اور ایک ڈیپارٹمنٹ میں کر رہے تھے۔ عاصم کی بذلہ سنج طبیعت اور رابیل کی شرارتی شخصیت کی بدولت دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ ڈاکٹر عاصم سے اس کی اتنی پرانی دوستی تھی کہ اس کی فیملی اسے گھر کا فرد ہی سمجھتی تھی۔

''بابا نے گفٹ کیا تھا مجھے ایم بی بی ایس میں ایڈمیشن کے بعد''۔ رابیل کو اپنے پین سے شدید محبت تھی۔ پچھلے کئی سال سے وہ پین اس کے پاس تھا اور بہت بار مذاق کا نشانہ بننے کے باوجود اس نے اس کا استعمال ترک نہ کیا تھا۔ وہ بہت مہنگا نہیں پر بہت خاص تھا کیونکہ اس کے پیارے بابا کا تحفہ تھا اور وہ اسے ہمیشہ بہت سنبھال کے رکھتی تھی جو آج ایک مریض کے ہنگامے کو ہینڈل کرنے میں اس کے کوٹ سے گر کر ٹوٹ چکا تھا۔

''ایک منٹ میں ٹوٹ گیا''۔ اس نے تاسف سے کہا۔

''تو پھر آپ نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں''۔ ڈاکٹر عاصم نے اسے چھیڑا۔

''کس کی؟'' اس نے ناک چڑھائی۔

''جس نے قلم توڑا''۔ انداز استہزائیہ تھا۔

''وہ تو پتا نہیں عجیب ہی چیز ہے۔ ذرا سی بات پہ ایمرجنسی میں واویلا مچا دیا اس نے۔ میرا خیال ہے وہ شاک میں تھا''۔ وہ یکدم سنجیدہ ہوئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرایا تھا جب چہرے پہ جنون اور پھولے تنفس کے ساتھ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یقیناً ہوگا، آپ جیسی تیس مار خاں کی گھوریوں کے بعد کوئی بھی نارمل انسان شاک کی کیفیت میں جا سکتا ہے''۔ ڈاکٹر عاصم نے حسب معمول جملہ کسا جس پہ رابیل نے مصنوعی خفگی سے دیکھا پھر چائے کا مگ اٹھا کر مزے سے گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

قیمتی پتھروں سے تعمیر کردہ پرانی طرز کی عمارت مکینوں کی شان و شکوہ اور حسب نسب کی چغلی کھاتی تھی۔ بلند دروازے کے ستونوں پہ لگی تختی پہ عمارت کا نام کندہ تھا۔ ''گلفشاں''۔۔۔۔ لمبی چوڑی ڈرائیو وے کے بعد محل نما کوٹھی دکھائی دیتی تھی جسے دو اطراف سے خوبصورت اور وسیع لان نے گھیر رکھا تھا۔ عمارت کے پچھلی جانب مصنوعی جھیل بنائی گئی تھی۔ دھوپ میں اس کے پانی سنہری ہوتے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

سورج کی کرنیں ابھی کچھ دیر پہلے گلفشاں پہ اپنی آخری نگاہ ڈالتی رخصت ہوتیں جھیل کے سونے رنگ کو سیاہ کر گئی تھیں۔ عمارت کے بیرونی حصے کی زرد مدہم روشنیاں جل چکی تھیں جبکہ اندرونی حصہ قیمتی فینسی لائٹوں اور کرسٹل جھومر کی چکاچوند روشنیوں سے منور تھا۔ اپنے ہمسفر کا بازو تھامے وہ سرشاری اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ سنہری کامدار ساڑھی میں اس کا دلکش سراپا ستم ڈھا رہا تھا۔ گلے کے گہرے کاٹ سے نمایاں ہوتی گردن کی ہڈی اور تنی ہوئی صراحی دار گردن میں جھلملاتا قیمتی گلوبند، اس پہ مناسب میک اپ۔۔۔ بالوں کو جوڑے میں سمیٹے وہ سچ میں دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی۔ اس کے شوہر کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ اور اطمینان اس بات کا غماز تھا کہ وہ پہلو میں کھڑی ضوفشاں کی قربت میں مطمئن و شاد ہے۔ وہ خود قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ ان دونوں کی تیاری بتا رہی تھی کہ وہ کہیں باہر جا رہے ہیں۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی ان دونوں کی نگاہ ایک ساتھ شکیل الدین پہ پڑی جو اس کے بیٹے کو گود میں اٹھائے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ بچے کے گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا اسے؟'' ضوفشاں کو پرے دھکیلتا وہ بے اختیار بچے کی طرف بڑھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ بچہ زار و قطار رو رہا تھا۔ ضوفشاں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ایک عجیب سی ذلت محسوس ہوئی

تھی اس پل کہ وہ چاہ کر بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ قدموں کو زمین نے جکڑ لیا تھا۔

"صاحب بابا سائیکل چلاتے گر پڑے"۔ ملازم نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ ہمایوں بخت بچے کے زخمی پیر کا معائنہ کر رہا تھا۔

"تو تم اس وقت کہاں تھے، ہزار بار سمجھایا ہے بابا کے ساتھ ساتھ رہنا ہے"۔ اچانک ضوفشاں ہوش میں آئی تھی۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے شکیل الدین کو سخت لہجے میں سرزنش کی۔ اس کے شوہر نے نہ شکیل الدین کی روتی صورت پہ توجہ دی تھی نہ ہی ضوفشاں کے لہجے پہ وہ تو بس متفکر سا اپنے اکلوتے بیٹے کے زخم سے رستے خون کو دیکھ رہا تھا۔

"اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں"۔ اس بار مخاطب ضوفشاں تھی۔

"آپ ریلیکس رہیں، بچے کھیل کود میں گر جاتے ہیں۔ میں ہوں نا پھر کس بات کی پریشانی ہے"۔ اس کے چہرے کے تاثرات پل بھر میں بدلے تھے۔ چند لمحے پہلے والی سختی کی جگہ اب بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ نرمی سے اسے اپنے شوہر کی گرفت سے نکال کر اس کا ماتھا چوما۔ ضوفشاں کے لہجے کی مٹھاس اور تسلی دونوں ہی اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھیں۔

"چلیں جی ماما آپ کو میڈیسن لگائیں گی اور اب بالکل نہیں رونا میرے بیٹے نے"۔ اسے محبت سے پچکارتے وہ اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔ بچہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ باپ کا پریشان چہرہ بھی پرسکون ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بستر پہ چت لیٹے اس نے داہنے بازو سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا پر وہ اپنے ارد گرد سے لاعلم نہ تھا۔ اس کا مینیجر ہارون سعید اور ڈاکٹر رابیل سکندر بیڈ کے پاس کھڑے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے جس میں اسے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ تھی۔ ہارون اس کی صحت کے متعلق استفسار کر رہا تھا اور رابیل پیشہ ورانہ انداز میں تسلی دے رہی تھی۔

"ڈاکٹر کیانی نے اوکے کر دیا ہے اب آپ انہیں روم میں شفٹ کروا سکتے ہیں باقی کا ٹریٹمنٹ وہاں جاری رہے گا"۔ فائل پہ ریمارکس لکھتے اس نے ہارون کو بتایا۔ ہارون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ جانے سے پہلے رابیل نے ایک نگاہ بستر پہ لیٹے مریض کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی وہ جاگ رہا ہے اور یقیناً اس گفتگو کو سن بھی رہا ہے۔ اخلاقاً بھی اس نے شکریہ کہنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سر جھٹکتے وہ دوسرے مریض کے پاس چلی گئی تھی۔ ہارون اسی وقت باہر نکل گیا تھا شاید وہ استقبالیہ پہ کمرے کے متعلق بات کرنے گیا ہو۔

ازلان نے گہری سانس لیتے اپنا بازو آنکھوں سے ہٹایا۔ پردے کے پار سے رابیل کی آواز اب بھی ازلان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی تھی۔ چہرہ اور جسم دونوں ہی بری طرح تھکے ہوئے تھے پر وہ ایکٹیو تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے من مرضی کے کام سے اکتاتا نہیں۔ کام جبراً کیا جائے تو دلچسپی نہیں رہتی پر وہی سب اگر شوق سے ہو تو دلچسپ بھی لگتا ہے اور آپ مطمئن رہتے ہیں۔ رابیل کے لیے بھی اس کا پیشہ، اس کی ملازمت ذمہ داری سے بڑھ کر اس کا شوق، اس کا جنون تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ باخوشی لمبی چوڑی ڈیوٹیاں کر لیتی تھی۔ آج اس کی سالگرہ بھی تھی تو صبح ہی ڈاکٹر عاصم اور دوسرے اسٹاف نے اسے مبارک باد دی تھی۔ ڈاکٹر عاصم نے ہر سال کی طرح گفٹ ہضم کر لیا تھا اور حسب سابق اس کا گفٹ ادھار تھا جو یقیناً کسی خاص موقع پہ اکٹھے واپس ہوں گے۔۔۔ ایسا رابیل کا کہنا تھا۔ کمال حیرت گھر میں ہو کا عالم تھا ورنہ عام حالات میں تو شور کی آوازیں باہر پورچ سے ہی سنائی دیتی تھیں اور کبھی کبھی تو مچھلی بازار سا گمان بھی ہوتا تھا۔ (شگفتہ بیگم

کے طنز)۔ لاؤنج کی لائٹس بند تھیں اور اندر کسی بندہ بشر کا گمان بھی نہ تھا۔ سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا لیکن لائٹ آن نہیں ہوئی (لائٹ گئی ہوئی پر یو پی ایس بھی خراب ہے کیا) اچانک اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کا احساس ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے پیر گھسیٹتی وہ سیڑھیوں تک پہنچی اب تو نیند سے بھی حالت خراب ہو رہی تھی اس پہ یہ اندھیرے کا خوف۔ دل کیا الٹے پیروں گھر سے باہر بھاگ جائے اور وہ کر بھی گزرتی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا، روشنی اور شور ایک ساتھ برآمد ہوا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے ڈیئر رابیل، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''۔ مزینہ کے ہاتھ میں کیک تھا جس پہ ڈھیروں موم بتیاں روشن تھیں۔ لہک لہک کر گاتے ان سب نے اسے چونکایا تھا۔ سکندر حسین، شگفتہ، مزینہ، شجاع۔۔۔ سب لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ ایکدم چہرے پہ بے پناہ مسرت جھومنے لگی تھی پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔

''آپ لوگوں نے تو جان ہی نکال دی تھی میری۔۔۔ جانتے بھی ہیں اندھیرے سے کتنا خوف آتا ہے مجھے۔'' وہ لگ بھگ رو دینے کو تھی۔

''ارے بھئی آج کے دن جان نکل جاتی تو مستقبل کا ایک خرچا کم ہو جاتا۔ سالگرہ اور برسی اکٹھی منا لیتے ہم''۔ سکندر حسین کی بات پہ اس نے ابرو اچکاتے منہ بنایا۔

''مطلب آپ کو میرے مرنے کا کوئی غم نہ ہوتا''۔ شگفتہ بیگم نے سر پیٹ لیا۔

حدود ہوتی ہے فضول گوئی کی بھی۔ سالگرہ والے دن یہ کیا نحوست بھری باتیں شروع کر دی ہیں آپ دونوں نے''۔ انہوں نے باقاعدہ ڈپٹا تو رابیل اور سکندر حسین دونوں گلا کھنکارتے موضوع بدل گئے۔

''دس از سو سویٹ اینڈ تھینک یو''۔ مزینہ کے ہاتھ میں پکڑے کیک کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''جیتا رہ میرا بچہ''۔ سکندر حسین نے شفقت سے اس کا ماتھا چوما۔

''تھینک یو بابا۔ آئی لو یو''۔

''آئی لو یو ٹو جانِ بابا''۔

''آپ دونوں باپ بیٹی کے بیچ اگر تھوڑی سی محبت بچی ہو تو میں بھی مبارکباد دے دوں''۔ شگفتہ بیگم کی بات پر وہ جلدی سے ماں سے لپٹ گئی۔

''سالگرہ مبارک ہو۔ سو سال جیو''۔ انہوں نے اسے محبت سے گلے لگایا اور ایک بڑا سا پیکٹ تھما دیا۔

''تھینک یو ماما لو یو''۔

اب سب لوگ لاؤنج میں رکھے صوفوں پہ بیٹھ چکے تھے۔ مزینہ نے دل کی شکل کا کیک کافی ٹیبل پہ رکھا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

''لو بھئی رابیل میرے اور مزینہ کی طرف سے تمہارا تحفہ اور جلدی سے اس دل پہ آری چلا دو''۔ وہ لوٹی تو ہاتھ میں پلیٹیں اور چھری کانٹے تھے۔ شجاع نے گفٹ پیک رابیل کی جانب بڑھایا۔ وہ سکندر حسین کی بہن کا بیٹا تھا اور اس حساب سے ان کا دہرا رشتہ تھا۔

''شجاع بھائی ویسے آپ بڑے کنجوس ہیں۔ ایک گفٹ پہ ٹرخا دیا''۔ گفٹ تھامتے منہ بنایا گیا تھا۔

''یار اب تک دو ہزار تحفے وصول کر چکی ہو تم، رحم کھاؤ میرے حال پر بی بی چند ماہ بعد شادی ہے میری''۔ اس عزت افزائی پہ اس نے سر پہ ہاتھ مارا۔

''نہیں ہوتے دیوالیہ آپ، ایک ہی تو سالی ہوں آپ کی''۔ رابیل کے طنز پہ مزینہ کی ہنسی نکل گئی۔

''ماموں جان آج میرا خیال ہے یہ طے ہو جائے آخر اس بندی سے میرا اصل رشتہ ہے کیا ۔۔۔ کبھی ماموں زاد بہن بن کر لوٹ لیتی ہے کبھی سالی بن کر جیب پہ ڈاکا ڈال لیتی ہے''۔ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر شجاع نے سکندر حسین کو مخاطب کیا۔

''خوش نصیب ہیں جناب ایک ہی بندی نے بہن اور سالی کا خانہ پر کر رکھا ہے''۔ اس کا موڈ ٹھیک ہوا تو نیند اور تھکاوٹ دونوں دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ یہی تو کمال تھا ان بہت پیارے اپنوں کا جن

کے بیچ مشکل وقت بھی آسان ہوجاتا تھا۔ جن کا التفات زندگی میں روشنی بکھیرے ہوا تھا۔ ایک طویل ڈیوٹی کے بعد یہ ہلکی پھلکی نوک جھوک اور شرارتیں اس کی اعصابی تھکن کو کم کرتیں اسے پرسکون کررہی تھیں۔

''اللہ رحم کرے اس بے چارے پہ جس کی قسمت میں تم جیسی زنانہ ہٹلر لکھ دی گئی ہے۔'' شجاع نے باقاعدہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''ویسے مزینہ یہ ہماری رابیل آج تک اندھیرے سے ڈرتی ہے''۔ شجاع نے چھیڑا۔

''لائٹ بھی اکثر جلا کر سوتی ہے ورنہ دو دو زیرو پاور کے بلب لگا رکھے ہیں۔ اسی لیے میں آج تک اس کے کمرے میں نہیں سوئی''۔ مزینہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''چھوٹی تھی ایک بار اندھیری جگہ سے خوف زدہ ہوگئی تھی بس اسی وقت سے ڈر بیٹھا ہے اس کے دل میں۔ حالانکہ تمہارے بابا نے بہت کوشش کی پر اس کا یہ خوف کم نہیں ہوا''۔ شگفتہ بیگم نے رابیل کی طرف محبت سے دیکھا۔

''یقیناً آسیب دیکھ لیا ہوگا''۔ شجاع ڈرامائی انداز میں بولا۔

''اور وہ اس پہ عاشق ہوگیا ہوگا۔ اسی لیے تو سب رابیل سے اتنا ڈرتے ہیں۔'' وہ بھی آج اسے جی بھر کے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''یہ آپ لوگوں کو میری سالگرہ کا دن ہی ملا تھا میری برائیاں کرنے کے لیے''۔ اس نے منہ بنایا۔ یہ طبلِ جنگ تھا۔ اس سے پہلے کہ باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہوتا مزینہ نے چھری اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ آخر کیک بھی تو کاٹنا تھا جس پہ جلتی موم بتیاں آخری سانسیں لے رہی تھیں اور بجھنے سے پہلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ زندگی کے ایک اور حسین اور خوبصورت سال کا اختتام ہوا تھا۔ امیدوں بھرے نئے سال کی شروعات ہوئی تھی جہاں آگے چل کر کیا ہوگا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

سیل فون کان سے لگائے وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔ ان کی جھنجلاہٹ کچھ اور بڑھی تھی۔ میک اپ کی مہین تہ تلے ماتھے کی سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔ بے چینی ان کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ بار بار کی ناکامی کے بعد ایک اور سعی کی گئی تھی۔ اس بار چہرے کا اطمینان اس بات کا غماز تھا کہ دوسری طرف بیل جارہی ہے۔

''ازلان کیسا ہے؟'' کال ملتے ہی بے اختیار سوال کیا گیا تھا۔

''وہ ٹھیک ہیں میم''۔ ہارون کی آواز سن کر ایک پرسکون سانس سینے سے خارج ہوا تھا۔

''میں کوشش کررہی ہوں جلد سے جلد پاکستان پہنچ جاؤں، چانس یہ ہے آج کی فلائٹ اگر مل گئی تو ان شاء اللہ میں کل پہنچ جاؤں گی''۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنا پلان بتایا۔

''یس میم''۔ وہ مودبانہ انداز میں بولا تھا۔ اگلے چند منٹ وہ اس سے ڈاکٹر کی رائے، طریقہ علاج اور اس کی طبیعت کو لے کر گفتگو کرتی رہیں۔

''میرے بیٹے کا خیال رکھنا ہارون وہ اس وقت تمہاری ذمہ داری ہے''۔ یہ حکم میں لپٹی التجا تھی۔

''میں خیال رکھوں گا میم''۔ جواب فوراً آیا تھا۔ انہیں کبھی بھی اس کی وفاداری پہ شبہ نہیں تھا۔

''تم جانتے ہو وہ میرے لیے کتنا اہم''۔ ان کے لہجے میں خوف تھا۔

''آئی ایم فلی اویئر آف اٹ میم'' (میں پوری طرح آگاہ ہوں میم) ہارون نے یقین دہانی کرائی۔ رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔

''میم کل پہنچ رہی ہیں مسٹر شاہ''۔ کال بند کرتے ہی اس نے بستر پہ بیٹھے ازلان کو مطلع کیا۔ بیڈ ریسٹ سے ٹیک لگائے وہ اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ ہارون اور ڈاکٹر کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے اپنا لیپ ٹاپ منگوالیا تھا اور اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے انہیں اس کی بات ماننا پڑی

تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا وہ تین دن سے اسپتال میں تھا ورنہ اپنی تکلیف کی پروا کرنا اس کی فطرت سے ہٹ کر تھا۔ ہارون کی یک طرفہ گفتگو وہ کام کے دوران سن چکا تھا مگر اس اعلان پر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

''ویسے پرسوں تک آپ کو بھی ڈسچارج کر دیا جائے گا''۔ وہ اب بھی مکمل انہماک سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ڈیوٹی نرس اس کی ادویات رکھنے آئی تو اسے لیپ ٹاپ میں محو دیکھ کر کچھ کہنا چاہا پر ہارون نے اشارے سے منع کر دیا۔ نرس نے برا سا منہ بنایا بہر حال وہ خاموش رہی۔ ان وی آئی پی کمروں کے وی وی آئی پی مریضوں کے رویے اس کے لیے نئے نہیں تھے۔

''اسٹاف!'' نرس کمرے سے نکلنے لگی تھی جب اسے آواز دے کر روکا گیا۔

''وہ ڈاکٹر جس نے مجھے ایمرجنسی میں اٹینڈ کیا تھا وہ کہاں ہے؟'' اس نے پہلی بار سر اٹھایا تھا۔ لہجہ کسی حد تک سرد اور چہرے کے تاثرات بے حد سنجیدہ تھے۔

''کون ڈاکٹر رابیل سکندر؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''رابیل سکندر۔۔۔'' اذلان نے زیرِ لب دہرایا۔

''وہ تو شعبہ حادثات میں ہوتی ہیں۔ ویسے آج ان کی چھٹی ہے''۔ آنکھیں سکیڑے وہ کسی گہری سوچ کے زیرِ اثر چند لمحے اس بند دروازے کو دیکھتا رہا جہاں کچھ دیر پہلے نرس کھڑی تھی۔ ہارون سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا پر کچھ کہا نہیں۔ وہ جانتا تھا اسے بے موقع سوالات سے چڑ ہے۔

☆☆☆

طویل ڈیوٹی کے بعد تھکاوٹ شدید تھی اور نیند سے آنکھیں الگ بوجھل ہو رہی تھیں اس لیے وہ لمبی تان کر سوئی تھی۔ صبح مزینہ نے بمشکل اسے جگایا حالانکہ اس کا جاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا پر چونکہ شگفتہ بیگم کی طرف سے حکم نامہ جاری ہوا تھا لہٰذا اٹھتے ہی بنی۔ اب دو دن چھٹی تھی تو انہوں نے دھر لیا۔

سگھڑاپے پہ لیکچر، شادی کے بعد سسرال میں ماں کی ناک کٹوانے (جو ہر معمولی سی بات سے کٹ جاتی تھی اور اب تو کٹ کٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ چکی تھی) کے طعنے تشنوں کے علاوہ اسے دوپہر کا لنچ بنانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی تھی۔ مزینہ کو ان حالات میں اس پہ ہمیشہ کی طرح ترس آتا تھا۔ آج بھی چھپ چھپا کر اس کی مدد کروا دی تھی۔ شام کی چائے ان دونوں نے ٹیرس میں بیٹھ کر پی۔ مزینہ ساتھ کباب فرائی کر لائی تھی۔ سردی کی دھند بھری شام، الائچی کے دم والی خوشبودار چائے اور خستہ شامی کباب۔ دونوں مزے لے کر کھاتیں ساتھ ساتھ گپیں لگا رہی تھیں۔ رابیل کے پاس اسپتال کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں جو وہ مزینہ کو سنانے بیٹھ جاتی۔ کبھی مریضوں کے مسائل، کوئی ایسا حادثہ جو اسے پریشان کرتا یا پھر ڈاکٹر عاصم کے چٹکلے۔ آج موضوعِ گفتگو اذلان تھا۔ ایک ایسا مریض جس نے شکریہ ادا کرنے کے بجائے الٹا اس کا نقصان کر دیا تھا اور پھر معذرت بھی نہیں کی تھی۔ پین ٹوٹنے سے بات اس کے عجیب و غریب رویے اور ضرورت سے زیادہ خاموشی پہ جا ٹھہری۔

''مجھے تو وہ کوئی سائیکو لگتا ہے''۔ یہ مزینہ کا تبصرہ تھا۔

''اونہو، سائیکو نہیں ہے۔'' گرما گرم کباب حلق میں انڈیلتے رابیل نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا تو پھر نارمل تھا''؟ مزینہ نے ابرو اچکائے۔

''نہیں وہ نارمل بھی نہیں تھا لیکن میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی وہ سحر جو اس کی شخصیت میں تھا۔ خوف۔۔۔ کشش۔۔۔ تکبر۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ پر وہ بہت الگ تھا۔

''ایک بات بتاؤں، اس کی آنکھوں میں عجیب سا جنون تھا۔ حالانکہ بڑی دلیر بن کر میں نے اس کا بازو پکڑ تو لیا لیکن یقین جانیں فرسٹ ٹائم کینولا

لگاتے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے"۔ اپنی طرف سے اس نے بہت بڑے راز سے پردہ اٹھایا تھا۔ آواز دھیمی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پہ محظوظ ہوتے وہ خود ہی ہنس پڑی تھی۔

"بابا کو پتا چلا تو انہوں نے تمہارا کیا ہی مذاق بنانا ہے"۔ مزینہ بھی کھلکھلا کر ہنسی۔

"پلیز اب آپ مت بتا دینا بابا کو پہلے ہی انہیں شک ہے میں کچھ دے دلا کر ڈاکٹر بنی ہوں"۔

"ارے بھئی یہ کیا دینے دلانے کی باتیں ہو رہی ہیں میری غیر موجودگی میں"۔ سکندر حسین ٹیرس میں داخل ہوئے اور ان دونوں کو سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر گلا کھنکارا۔ ان کے کانوں تک بس رابیل کا آخری جملہ ہی پہنچا تھا۔

"کچھ نہیں بابا، کچھ بھی نہیں ہم تو بس ---ایسے ہی"۔ رابیل فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ایک بات کان کھول کے سن لو تم دونوں، اس مہینے ایک روپیہ اضافی نہیں ملے گا کسی کو۔ پہلے ہی تمہاری ماں نے خرچا کروا کروا کر میری کمر توڑ دی ہے"۔ وہ انگلی اٹھا کر تنبیہہ انداز میں کہتے وہیں خالی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ ان کی آمد سے باتوں کا رخ بدل چکا تھا۔ وہ تینوں کچھ دیر یونہی گپیں لگاتے رہے اور پھر اندر چلے گئے۔ رات خوب صورت اور اوس میں بھیگی دبے پاؤں اتر رہی تھی۔ سردی کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کے وی آئی پی روم کے گرم اور آرام دہ کمرے میں بستر پہ نیم دراز وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا۔ ہلکے بھورے بال بے ترتیبی سے ماتھے پہ بکھرے تھے۔ شیو تھوڑی سی بڑھی ہوئی تھی۔ ماتھے پہ زخم کا نشان نمایاں تھا جو اب بھرنے لگا تھا۔ اس رف حلیے میں بھی وہ اپنی پرکشش شخصیت کی بدولت منفرد نظر آ رہا تھا۔ کمر کے بل لیٹے اس کی گہری سیاہ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ مرکوز تھیں جن میں ہمیشہ کی طرح بے نام سی اداسی تھی۔ بیڈ کے بالکل پاس ایک ادھیڑ عمر خاتون موجود تھیں جو مہنگا اور جدید لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ دودھیا مخروطی انگلیوں میں قیمتی ڈائمنڈ رنگز سجی تھیں البتہ چہرہ میک اپ سے عاری تھا جس پہ تھکن اور پریشانی نمایاں تھی۔

"اللہ کا شکر ہے تم ٹھیک ہو میرے بچے، تم اندازہ نہیں کر سکتے پچھلے تین دن میں نے کس عذاب میں گزارے ہیں"۔ ہاتھ آگے بڑھا کر انہوں نے بس ایک لمحے کو اس کے بے ترتیب بالوں کو چھوا تھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں جھنجلاہٹ نمودار ہوئی تھی۔ فوراً ہی انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ ان کی آواز میں خوف تھا اور خوف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ کچھ کھو دینے کا خوف، کسی انہونی کا خوف--- کسی بہت پیارے کی تکلیف کا خوف--- وہ بھی اس پل کچھ ایسے ہی خوف سے گزر رہی تھیں۔

"ڈونٹ وری ممی، اب تو آپ کی تسلی ہو گئی نا"۔ ازلان نے نگاہیں دائیں جانب تھمائیں اور انہیں تسلی دی۔ اس کا لہجہ نرم اور آواز دھیمی تھی۔ مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کی تھی اس نے پر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اس کا انداز انہیں مطمئن کر گیا تھا کہ وہ ٹھیک ہے حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اسے اپنی تکلیف کہنے کی عادت نہیں پر اس پل اس کے چہرے پہ ہلکا سا تاثر دیکھ کر پچھلے تین دن کی پریشانی رخصت ہوئی تھی۔ دل کو راحت ملی تھی۔

"گل خان کی موت کا بہت افسوس ہوا"۔ اچانک انہیں یاد آیا تھا۔

"ہارون اس کی فیملی کیسی ہے"۔ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ پیچھے کھڑے اپنے منیجر سے مخاطب تھا۔

"صدمے میں ہیں سر"۔ ہارون سر جھکائے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"ان کا خیال رکھنا، انہیں کسی چیز کی پریشانی نہ ہو"۔ انداز حکمیہ تھا۔ ہارون نے تائید میں سر ہلایا۔

"گل خان کی سیلری ہر ماہ باقاعدگی سے اس کی بیوی کو ملنی چاہیئے اور وہ گھر جہاں اس کی رہائش ہے

اسے خرید کر اس کی بیوی کے نام کروادو۔
میں نہیں چاہتا اس کی فیملی کو اس کے بعد کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا ہو۔ گل خان کی صورت ان کا جو خسارہ ہوچکا وہ ناقابلِ تلافی ہے لیکن۔۔۔
۔۔" اپنے اسٹاف کے لیے وہ اتنا ہی متفکر تھا یہ بات وہ اچھے سے جانتی تھیں اور یہ بھی انہیں معلوم تھا کہ گل خان اس کا بہت قریبی ملازم تھا۔ اس کی سخاوت بھی ان سے پنہاں نہ تھی گو وہ کم ہی ظاہر کرتا تھا پر وہ بھی اس کی ساری خبر رکھتی تھیں۔
"ریلیکس اذلان۔ تم کیوں اتنا اسٹریس لے رہے ہو۔ تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے میری جان۔ ہارون اور میں سب دیکھ لیں گے بس تم ریسٹ کرو۔ اینڈ ڈونٹ ٹیک ٹینشن۔ او کے؟" اس سے پہلے کے ہارون جواب دیتا انہوں نے ٹوکا۔ اس وقت تو وہ بس اسی کی جانب سے پریشان تھیں اسی لیے اتنی لمبی فلائٹ کے بعد گھر جانے کی بجائے سیدھی اسپتال آئی تھیں۔
"ہارون تم میرے ساتھ آؤ مجھے ڈاکٹر کیانی سے ملنا ہے"۔ اسے آرام کا کہہ کر وہ ہارون کے ساتھ اس کے معالج سے ملنے چلی گئی تھیں۔ اذلان کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ کمرے میں سناٹا ہوگیا تھا۔
☆☆☆
"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی ضوفشاں کے لبوں کی مسکراہٹ رخصت ہوئی تھی۔ چہرے پہ غصہ اور نفرت سجائے اس نے تقریباً چیخ کر کہتے اسے بیڈ پر دھکیلا تھا۔
"ہر وقت اودھم مچایا ہوتا ہے گھر میں اور اسی چکر میں چوٹیں لگوا لیتے ہو۔" اس کی کمر پہ دو دھپ لگا کر وہ اپنا ردعمل ظاہر کرتی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
شرم تو جیسے چھو کر نہیں گزری۔ بدتمیز۔۔۔ ماں نے تربیت کی ہی نہیں۔ منحوس خود تو مر گئی میرے لیے عذاب چھوڑ گئی"۔ بچہ خوف سے تھر تھر کانپتا اس حسین چہرے کے پیچھے چھپی بدصورتی سے سہما ہوا تھا۔ اس پہ خوف اس قدر شدت سے حاوی تھا کہ وہ اس پل رو بھی نہ سکا تھا۔
"آہ"۔ میڈیکل باکس سے ڈیٹول کی بوتل نکال روئی پہ لگایا اور زخم پہ رکھ دیا۔ بچہ جلن سے کرلایا۔ ضوفشاں نے دانت کچکچاتے ایک اور تھپڑ مارا۔
"خبردار منہ سے اگر آواز نکالی ورنہ جان لے لوں گی"۔ اس تنبیہہ پہ وہ معصوم بری طرح ڈر گیا۔ "اور اگر اپنے باپ کو بتایا تو اتنا ماروں گی اتنا ماروں گی ساری عمر یاد رکھو گے سمجھے"۔ جان چھڑانے والے انداز میں جلدی جلدی دوا لگا کر اسے بستر میں پٹخا۔ اس کا موڈ اس مداخلت پہ بری طرح خراب ہوچکا تھا۔
"خبردار جو کمرے سے باہر نکلے ورنہ رات کو بھوکا سونا پڑے گا"۔ اندر کی بھڑاس نکال کر اسے تنبیہہ کرتی وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ بچہ خوف اور درد کی شدت سے کانپتا بستر میں دبک کر رونے لگا پر اس کی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھی۔ دروازہ بند ہوچکا تھا اور باہر اس کا باپ اپنی حسین اور خوب صورت بیوی کے ہمراہ پارٹی میں جاچکا تھا۔
☆☆☆
اذلان آہستہ آہستہ روبہ صحت تھا۔ زخم بھر رہے گئے تھے نشان ابھی باقی تھے۔ گھر واپسی کے اگلے ہی دن وہ دفتر پہنچ گیا تھا۔ ماں نے اس کی تیاری دیکھ کر منع کرنا چاہا پر اس کے تاثرات نے کچھ کہنے ہی نہ دیا۔ وہ جانتی تھیں اپنے سوا وہ کم ہی کسی کی سنتا مانتا ہے۔ اسے اپنے فیصلوں میں کسی اور کی دخل اندازی پسند نہیں پھر بھلے وہ اس کا کوئی بہت اپنا ہی کیوں نہ ہو۔
دفتر میں اس کی غیر موجودگی کے باعث جو خلا آیا تھا اسے پر کرنے میں وقت لگتا حالانکہ وہ اسپتال سے بھی وقتاً فوقتاً کام نبٹاتا رہا تھا لیکن آج صبح سے اس کے پاس سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔
"ہارون مجھے اس کا مکمل بائیو ڈیٹا چاہیے"۔ دن کے اختتام پر اپنے منیجر کو مخاطب کرتے اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''مل جائے گا سر''۔ ہارون سعید نے کاغذ پہ لکھا نام پڑھتے مودبانہ انداز میں کہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ہمیشہ کی طرح سپاٹ جیسے وہ انسان نہیں کوئی روبوٹ ہو اور جس کا کنٹرول اذلان کے ہاتھ میں ہو۔

''پیدائش سے لے کر آج تک ہر معلومات ۔۔۔ اس کا فون نمبر، ای میل ایڈریس، دوست، رشتے دار ۔۔۔ سب کچھ''۔ پین انگلیوں میں گھماتے وہ کمرے میں نصب شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہا تھا۔ شہر اس وقت کسی راز کی صورت گہری دھند کی تہ میں لپٹا ہوا تھا۔

''کل تک ہو جائے گا مسٹر شاہ''۔ وہ گہری سوچ کے حصار میں تھا۔

''وٹیس آل سر؟'' خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تھا۔

''سینرجی گروپ کی فائل میں دیکھ چکا ہوں بٹ آئی تھنک اٹس ناٹ کا گڈ ڈیل''۔ (لیکن میرا خیال ہے یہ اچھا سودا نہیں) وہ چونک کر پلٹا اور خود کو کمپوز کرتے بولا۔

''میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں''۔ دو ٹوک کہتے اذلان نے میز پہ رکھی ای میلز دیکھنا شروع کر دیں۔

''ٹھیک ہے سر میں انفارم کر دیتا ہوں''۔ ہارون سعید کمرے سے نکلنے لگا۔

''یہ کام پرائرٹی بیسس (ترجیح بنیاد) پہ کرنا ہے''۔ ہارون سعید کے ہاتھ میں پکڑی چٹ کو انگلی سے پوائنٹ کرتے اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ ہارون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر آ کر ہارون نے ایک بار پھر کاغذ پہ لکھے اس نام کی تصدیق کی جو اذلان نے اسے دیا تھا۔ اسے شدید حیرت ہوئی تھی پر اپنے باس کی باتوں پہ حیرت کا اظہار کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔ وہ حکم کا غلام تھا اور اس وفاداری کے عوض بھاری معاوضہ وصول کرتا تھا۔ ہارون جانتا تھا اذلان شاہ اپنے جمع تفریق سے چلتا ہے۔ رشتے ہوں یا کاروبار، وہ ہر فیصلہ دماغ سے کرتا تھا کیونکہ جذبات کا اس سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔ زندگی کا حاصل وہ تھا جو آج اس کی مٹھی میں تھا۔ محنت اور سخت محنت کے ساتھ اپنی بہترین کاروباری فہم و فراست کو بروئے کار لا کر بہت مختصر وقت میں شاہ گروپ آف انڈسٹری کی اونچی عمارت کھڑی کرنے کا سارا کریڈٹ تنہا اذلان کو جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ترقی کے اس سفر کے میں وہ ''ون مین شو'' تھا۔ وہ کسی مشین کی طرح کام کرتا تھا اور بلا کا اینٹی سوشل تھا۔ بلا ضرورت گفتگو سے اجتناب برتتا اور حد درجہ لوگوں سے ملنے سے احتراز رکھتا۔ اسے ہجوم سے الجھن ہوتی تھی اسی لیے بہت کم وہ دعوت نامے قبول کرتا تھا سوائے چند ضروری جگہوں کے جہاں اس کا جانا ناگزیر ہوتا۔ پھر ایسی کیا وجہ تھی کہ وہ ایک ایسے انسان کے متعلق تفصیلات جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا جس سے اس کا بلواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اذلان پہلی بار دماغ سے نہیں دل سے سوچ رہا تھا۔ عقل کے بجائے جذبات کے آسرے فیصلہ کر رہا تھا۔

''رابیل سکندر ۔۔۔ آج سے پہلے کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ اذلان طیب شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے لیکن تم نے یہ غلطی کی ہے اور تمہیں اس کی قیمت چکانی ہوگی''۔ کمرے کے اندر بیٹھے اذلان شاہ نے مٹھی میں پکڑا قلم بھینچتے دانت پیستے دہرایا۔

☆☆☆

وسیع سبزہ زار میں گھری آشیانہ کی دھندلی عمارت کے ڈائننگ ہال میں مدھم روشنیاں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں۔ وسیع میز پہ دھرے کرسٹل اسٹینڈز میں شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ کمرے میں ناگوار خاموشی تھی جسے وقفے وقفے سے چھری کانٹوں کا پلیٹوں سے ٹکراتا شور توڑتا تھا۔ دو ملازم ہاتھ باندھے میز کے پاس موجود تھے۔ میز کے گرد مخالف سمتوں میں بیٹھے وہ دو نفوس انتہائی خاموشی سے اپنی پلیٹوں پہ جھکے کھانے میں مشغول تھے۔ اچانک بیگم

شاہ نے سر اٹھا کر پہلے ازلان کو اور پھر دونوں ملازمین کی سمت دیکھا۔ ان کا اشارہ پا کر وہ سر جھکائے کمرے سے نکل گئے تھے جبکہ ازلان سر جھکائے اپنے اردگرد سے بے نیاز ڈنر میں مشغول تھا۔

''کیوں بچے جیسا بی ہیو کرتے ہو۔ تم ایک شدید ایکسیڈنٹ سے گزرے ہو۔ کل گھر پہنچے آج دفتر چل پڑے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے''۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے کہنی میز پر ٹکائے وہ کچھ خائف سی تھیں۔

''آپ کو یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو آپ نے ہی کہا تھا حادثے ہوتے رہتے ہیں ان میں اٹک نہیں جاتے۔۔۔ جسٹ موو آن''۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے وہ دونوں بازو میز پہ ٹکائے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ سنجیدہ۔۔۔ سرد۔۔۔۔۔ بے حس۔

''اِس حادثے میں اور اس حادثے میں فرق ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔ یہ جسمانی تھا وہ۔۔۔۔'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔ گزرا وقت دہرانا تکلیف دہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر اس کے سامنے ماضی دہرا کر وہ اسے مزید تکلیف نہیں دے سکتی تھیں۔

''جسم کے گھاؤ بھر جاتے ہیں ممی انفیکٹ بھر چکے ہیں''۔ وہ عام سے لہجے میں بولا اور ایک بار پھر اپنی اسٹیک کھانے لگا۔

''تم شادی کرلو''۔ اس کا ہاتھ ایک پل کو رکا مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''میرا بھی دل کرتا ہے میرا بیٹا اپنی لائف میں سیٹل ہوجائے۔ اس کی زندگی میں خوشیاں ہوں، رونق ہو۔ میں اب تمہاری طرف سے مطمئن ہونا چاہتی ہوں''۔ بیگم شاہ کچھ آگے کو جھکیں اور اسے رسانیت سے سمجھایا۔

''یہ جو آپ مجھے خوشیوں بھری آسودہ زندگی کے سبز باغ دکھا رہی ہیں نا یہ سب دھرے رہ جائیں گے جب آپ کا واسطہ حقیقت سے پڑے گا اور مجھے پچھتانے کا کوئی شوق نہیں''۔ اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

''تم اتنا منفی کیوں سوچتے ہو۔ ہر عورت بری نہیں ہوتی۔ ہر عورت موقع پرست نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھو کیا میں ایک وفا شعار بیوی نہیں تھی۔ کیا میں دھوکے باز ہوں''۔ وہ سنجیدہ مگر نرم لہجے میں بولیں۔ ازلان کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''آپ کو اگر ایسا لگتا ہے آپ مجھے اپنی مثالیں دے کر ایموشنلی قائل کرلیں گی تو آپ غلط سوچ رہی ہیں کیونکہ میری زندگی میں جنس مخالف کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے''۔ حسب توقع وہ قائل نہیں ہوا تھا۔

''تو پھر میں دعا کروں کی تمہاری زندگی میں وہ جگہ جلد بن جائے، کوئی ایسی لڑکی تمہاری زندگی میں آئے جس سے نا چاہتے ہوئے بھی تمہیں محبت ہوجائے۔ پھر میں دیکھوں گی تم کیسے اپنی احمقانہ سوچ کی خاطر محبت سے لڑو گے''۔ جب کوئی لاکھ کوشش کے باوجود آپ کی بات نہیں مانتا تو زچ ہو کر کچھ ایسی ہی باتیں زبان پہ آتی ہیں۔ وہ بھی جذبات کی رو میں بہ کر ایسی ہی بے سر پیر کی کہہ بیٹھی تھیں۔

''بددعائیں دے رہی ہیں''۔ وہ ہنسا۔

''ماں ہوں بددعا تو مر کر بھی نہیں دے سکتی''۔ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کررہا تھا۔

''اسے دعا بھی نہیں کہتے۔'' جتاتے ہوئے اس نے نیپکن میز پہ پھینکا۔

''مجھے اسٹڈی میں کچھ کام ہے میری کافی وہاں بھجوادیں پلیز''۔ سنجیدگی سے کہتا وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور متانت سے چلتا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا پیچھے وہ سر پکڑے بیٹھی رہیں۔ یہ کوشش بھی ناکام گئی تھی ازلان نے ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

''گلفشاں'' میں اپنی آمد کے چند ماہ میں ضوفشاں اس قصر کے سیاہ و سفید کی مالکن بن گئی تھی۔ یہ اختیار اسے کسی اور نے نہیں اس کے شوہر نے دیا تھا جو اس پہ سو جان سے فدا تھا۔ اپنی اداؤں، نرم لہجے اور بے پناہ حسن کی بدولت وہ اس کی زندگی اور دل دونوں میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔ وہ اس کی سنگت میں خوش اور مطمئن تھا۔ اپنی پہلی شریکِ حیات کی دس

سالہ رفاقت کو بھولنے میں دس ماہ بھی تو نہیں لگے تھے اسے اور اس کا زیادہ کریڈیٹ ضوفشاں کو جاتا تھا جس نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی نہ دیا تھا۔ وہ ضرورت بن کر آئی تھی پر خواہش بن چکی تھی۔ مرد کا دل ضرورت پہ مائل ہوتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کب وہ ضرورت چاہت بننے لگتی ہے۔ کہنے کو تو یہ شادی اس نے فقط اپنے کم سن بیٹے کی وجہ سے کی تھی۔ ماں کی موت کے بعد اس کی زندگی میں جو جمود آگیا تھا اسے توڑنے کی خاطر ہی یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ دولت کی دیوی اس پہ مہربان تھی، اونچے حسب نسب کا ٹیگ نام کے ساتھ سجا تھا ایسے میں اس کی پہلی شادی اور بیٹے پہ کون توجہ دیتا، اس تک بھی بے شمار اونچے گھرانوں کی نگاہ ٹکی تھی پر اس کی نگاہ انتخاب ضوفشاں تھی جس سے اس کی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔

بہار اپنی چھب دکھلا کر رخصت ہو رہی تھی۔ پیڑوں پہ نئی کونپلیں پھوٹ کر سنہری ہو چکی تھیں۔ انہی دنوں وہ اپنی سائٹ کے معائنہ کے لیے اسلام آباد گیا تھا اور وہاں سے ایک دن کے لیے بھوربن جہاں اسے ضوفشاں ملی جو وہاں گھومنے پھرنے آئی تھی۔ اس کا ایک روزہ قیام ایک ہفتے میں کیسے بدلا یہ تو بس وہ جانتا تھا مگر اس مختصر وقت میں وہ ضوفشاں سے شادی کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اس کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا تھا مگر جتنا جانتا تھا اس کے اطمینان کے لیے کافی تھا۔ وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود بات چیت اور مزاج میں شہزادیوں سی آن بان رکھتی تھی۔ اس کا انداز، اس کا آفاقی حسن اور سب سے بڑھ کر دلچسپ گفتگو سامنے والے کی توجہ بٹورتے تھے اور وہ جو خود کو بہت سنجیدہ مزاج اور رکھ رکھاؤ والا سمجھا جاتا تھا اس کی انہی خصوصیات پہ کھنچا چلا گیا۔ اس سے شادی کا فیصلہ دل و دماغ کا یکجا تھا۔ ضوفشاں اس کی پہلی شادی اور بچے سے باخبر تھی اور اسے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا کہ وہ خود اس کے قدموں میں دل ہارنے کا دعوا کر چکی تھی۔ شادی کے اوائل دنوں میں ہی وہ جان چکا تھا کہ اس کی بیوی اس سے بڑھ کر اس کے بیٹے کا خیال رکھتی ہے اور ایسا تھا بھی۔ چند ہی دن میں بچہ اپنی نئی ماں سے حد درجہ مانوس ہو چکا تھا۔ وہ اس کے سونے، جاگنے، کھانے، پینے حتیٰ کہ اسکول تک کے معمولات کا خیال رکھتی۔ آہستہ آہستہ گھر کا سارا انتظام سرک کر ضوفشاں کی جھولی میں آگرا تھا۔ وہ اس پہ حد درجہ بھروسا کرنے لگا تھا۔ اور اب یہ دل تھا کہ سینے سے نکل کر پارے کی طرح ضوفشاں کی ہتھیلی پہ جا ٹکا تھا۔ وہ فقط دل نہیں اس کی ذات پہ قابض ہو چکی تھی۔ اس کی من پسند ہونے کے باوجود وہ اس کے سامنے کسی داسی کی طرح رہتی جو اپنی ذات، اپنا آپ اس پہ نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ وہ دیوتا تھا اور ضوفشاں پجارن ۔۔۔۔۔ اس مندر کی جسے محبت کرنے والے دل کہتے ہیں۔

پر یہ سب ظاہری تھی ۔۔۔ ضوفشاں کا باطن، اس کے ارادے وہ نہیں جانتا تھا۔ چہرے پہ خوبصورت سی مسکراہٹ سجائے، اپنے میٹھے لہجے سے اپنے شوہر ہی نہیں وہ اس گھر کے ملازموں تک کو اپنی مٹھی میں لیے گھوم رہی تھی۔ فقط چند ماہ میں ملازمین کی وفاداریاں بدل چکی تھیں۔ وہ اس کی آنکھ کے اشارے سمجھتے تھے، اس کے حکم پہ چلتے تھے۔ وہی کرتے تھے جو وہ چاہتی تھی اور وہ کیا چاہتی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی جان بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ اس کے راز میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا سوائے اس کے ۔۔۔ جس کی پلاننگ پہ وہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا درد کی شدت سے اس کا سانس رک جائے گا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، سسک رہا تھا پر بے بسی کی انتہا تھی کہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کر لینا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔ جلن کا احساس پل پل اسے موت کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کی قوت مدافعت لمحہ بہ لمحہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ناچ رہا تھا اور پھر دھیرے دھیرے اس کا وجود کسی گہری کھائی میں

گرتا چلا گیا۔

وہ لرز کر بستر سے اٹھا تھا۔ پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا تنفس تیز چل رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں اس کی تیز سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔

سالوں بعد بھی وہ لمحے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کے پردوں پہ نقش تھے۔ ہر ایک پل نشتر تھا جو آج بھی دل و دماغ کو چھلنی کرتا اس کی خاموش زندگی میں زہر گھول رہا تھا۔ زندگی بہت آگے بڑھ کر بھی آج وہیں کھڑی تھی۔ ڈری، سہمی اور ---خوف زدہ۔

☆☆☆

وہ ابھی دس منٹ پہلے دفتر سے گھر پہنچا تھا، لباس تبدیل کر کے لاؤنج میں آیا تو ضوفشاں اسی کی منتظر تھی۔

''سنیے جی یہ سفیان ہے۔ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا میرے خالہ زاد بھائی''۔ اس کے ساتھ ستائیس اٹھائیس سال کا ایک آدمی تھا جو لباس اور صورت شکل دونوں سے ہی واجبی سا لگتا تھا۔ ضوفشاں نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف کرایا۔

''ارے ہاں، یہ آگئے---نائس ٹو سی یو''۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر ذہن پہ زور ڈالا اور پھر اچانک اسے یاد آگیا۔ ضوفشاں اکثر اس سے اپنے خاندان والوں کا ذکر کرتی تھی۔ یوں تو اس کا اس دنیا میں ایک بڑی بہن کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ اپنے والدین کی وفات کے بعد وہی اس کا واحد آسرا تھی جو دوسرے شہر رہتی تھی اور اب اس سے ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر تھا پر اپنے ایک کزن کا ذکر وہ اکثر کرتی تھی جو اس کی خالہ کا بیٹا تھا۔ ابھی چند روز پہلے بھی ضوفشاں نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ (اور یقیناً یہ سب گھڑی گھڑائی باتیں تھیں جو خود کو کور کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں)

''شکریہ بھائی''۔ سفید قمیص اور گرے پینٹ میں ملبوس شخص کے لہجے میں چاپلوسی تھی اور چہرے پہ عیارانہ مسکراہٹ۔ دونوں ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھائے وہ ضرورت سے زیادہ عاجزی دکھا رہا تھا۔

''سفیان اور میری امی میں بہت پیار تھا۔ امی اور خالہ کی وفات کے بعد رابطے کم ہوتے گئے لیکن اب یہ شہر آئے ہیں ملازمت کے لیے اور مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے بلا لیا''۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ صوفہ پہ بیٹھ گیا۔ ضوفشاں بھی اس کے پہلو میں جا بیٹھی اور اس کا بازو تھامے مزید بولی۔

''بھائی تو کیا واقعی آپ کی کمپنی میں میرے لیے جگہ موجود ہے''۔ ان دونوں کی تقلید میں سامنے والے صوفہ پر بیٹھتے وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

''بھئی اب ضوفشاں کی سفارش ہے تو گنجائش نکالنی ہی پڑے گی۔ ہماری بیگم کہیں اور ہم نہ مانیں ایسے تو حالات نہیں''۔ اس کی طرف دیکھتے وہ مسکرایا جس پہ ضوفشاں نے اترا کر گردن اکڑائی۔

''بہت بہت شکریہ بھائی جان''۔ وہ ایک بار پھر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر کمر تک جھک کر اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ اس کی ممنونیت پہ مسکراتے اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''تم ایسا کرو کل میرے آفس آجانا اور ہاں یار تمہارا کزن آیا ہے کچھ خاطر تواضع کرو''۔ انداز ہلکا پھلکا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصا کم گو تھا اور پھر اس سسرالی رشتے دار سے بار بار تشکرانہ کلمات سننا اسے بور کر رہا تھا۔

''جی میں بس ڈنر لگواتی ہوں''۔ وہ دھیمے لہجے میں کہتی اپنا قیمتی لباس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ ہمارے صاحبزادے نظر نہیں آرہے کیا آج پھر جلدی سو گئے ہیں''۔ اس کی توجہ اب سامنے چلتے ٹی وی کی اسکرین پہ تھی۔

''وہ جلدی نہیں سویا آپ لیٹ آئے ہیں''۔ وہ مسکراتے ہوئے رکی۔

''یار اب اتنا بھی لیٹ نہیں ہوا وہی آج کل بہت جلدی سونے لگا ہے اور اسکول جاتے ہوئے بھی مجھ سے مل کر نہیں جاتا''۔ یہ تو اب جیسے روز کا معمول بن چکا تھا۔ کام میں الجھا وہ پہلے بھی اس کو بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اس کی شادی کرنے کی ایک

بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ وہ تمام عمر بچے کو ملازموں پہ چھوڑ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا اور ضوفشاں سے شادی کے بعد وہ واقعی ریلیکس ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی پریشانی اور بوجھ بانٹ لیا تھا پر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شروع کے دن نکال کر وہ زہریلی ناگن اب آہستہ آہستہ اپنا زہر ان کی زندگی میں اتارنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ بچے کو بات بے بات ڈانٹتی، مارتی یہاں تک کہ معمولی معمولی باتوں پہ کھانا پینا بند کر دیتی۔ کبھی اسٹور تو کبھی باتھ روم میں لاک کر کے سزائیں دیتی۔ بچے پہ اس کا خوف اس قدر شدت سے حاوی ہو چکا تھا کہ وہ معصوم مزید سزا کے ڈر سے باپ کو بھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔

''وہ اس لیے کیونکہ آپ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں اور آپ کی نیند ڈسٹرب نہ ہو اسی لیے ہم آپ کو جگاتے نہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کی روٹین ایسی ہی ہوتی ہے نیند پوری نہیں ہو گی اس کی تو سارا دن اپ سیٹ ہو جائے گا''۔ اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ان باپ بیٹے کا سامنا کم سے کم ہو۔ اسے اسکول کے بہانے جلدی سلا دیا جاتا حالانکہ وہ بے چارہ رات دیر تک اکیلا اپنے کمرے میں سسکیاں لیتا رہتا تھا۔ صبح باپ کے جاگنے سے پہلے وہ اسکول چلا جاتا۔ ویک اینڈ پہ بھی کچھ نہ کچھ مصروفیت چلتی ہی رہتی اور جو وقت وہ دونوں ساتھ گزارتے تو اس دوران وہ خود بھی موجود ہوتی۔ اور اس کا خوف تو اب ایسا تھا کہ وہ شکایت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''اوکے باس جیسے آپ کی مرضی ہم تو یہ سب معاملات آپ پہ چھوڑ چکے ہیں اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے''۔ وہ جیسے ہار مانتے ہوئے بولا پر اس ہار میں بھی محبت تھی۔ اس کے شہد لہجے کے آگے کون ظالم حجت کر سکتا تھا۔

''میں کھانا لگواتی ہوں''۔ مسکراتے ہوئے ضوفشاں کمرے سے نکل گئی۔ خود اس کی توجہ اب بھی ٹی وی پر تھی جبکہ ٹھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے سفیان اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتا رہا اس وقت تک جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس باکمال اداکاری پہ وہ باقاعدہ کھڑے ہو کر اس کے اعزاز میں تالیاں بجاتا۔ وہ دل ہی دل میں معترف ہوا تھا کیونکہ اب تک وہ یہی سوچتا تھا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کمینہ کوئی دوسرا نہ ہو گا لیکن آج اس کے خیال کی نفی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شیشوں سے جھانکتی دھند بھری خنک صبح کا سحر اپنی جگہ پر آفس کے اندر سینٹرل ہیٹر کی گرمائش سکون دیتی تھی۔ طبیعت خراب ہونے کے باوجود ازلان ابھی کچھ دیر پہلے ہی دفتر پہنچا تھا۔ اپنے کیبن میں تنہا وہ پورے انہماک سے کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں کی بورڈ پہ وقفے وقفے سے چلتی اس کی انگلیوں سے اٹھتا شور دراڑ ڈالتا تھا۔ دروازے پہ دھیمی دستک کے ساتھ ہارون کی آمد ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا فولڈر مؤدبانہ اس کی میز پہ رکھ کر وہ اب اگلے حکم کا منتظر تھا۔

''پرائیوٹ اینڈ کانفیڈینشل''۔۔۔ اپنے سامنے رکھے فولڈر کے اوپر لگے لیبل پہ نگاہ ڈالتے ازلان نے ہارون کی سمت دیکھا جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میز سے فولڈر اٹھا کر اس نے ابرو اچکائے ہارون کو دیکھا جس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور پھر جس خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اسی خاموشی سے باہر چلا گیا۔ ٹھوڑی کھجاتے ازلان نے فولڈر کھولا جس کے پہلے صفحے پہ ہیڈنگ کی صورت ''رابیل سکندر'' لکھا تھا اور نیچے اس کی تصویر چسپاں تھی۔ سرخ لباس پہ سفید اوور آل پہنے۔ ہونٹوں پہ سرخ لپ اسٹک اور کانوں میں سنگل اسٹون اسٹڈز۔۔۔ بال البتہ کھلے تھے۔ وہ اس بار بھی اسے واجبی ہی لگی تھی لیکن اس کے چہرے کی دھیمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بلا کی شرارت اسے منفرد و نمایاں کرتی تھی۔ جانے کیوں اس لڑکی میں اسے بلاوجہ انٹرسٹ ہونے لگا تھا۔

اگلے چند صفحات میں رابیل کے تمام کوائف

درج تھے۔ اس کی عمر، والدین کے نام اور پیشے، بھائی بہن و قریبی رشتے داروں کے نام اور ان کے متعلق ضروری معلومات۔ وہ گہری نظروں سے ان کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک مقام پر جا کر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ کچھ سوچ کر اس نے انٹر کام اٹھایا۔

''ہارون''۔ دوسری جانب کال ریسیو ہوتے وہ عجلت میں بولا تھا۔

''سینر جی کو جواب بھیج دیا؟'' اس کا انداز متفکرانہ تھا۔

''نہیں سر ابھی ڈرافٹ تیار کروا رہا ہوں''۔ ہارون کی تاویل پہ ایک سکون بھری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی تھی۔

''ہولڈ آن۔۔۔۔ میں وہ کمپنی خریدنا چاہتا ہوں''۔ اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''لیکن سر۔۔۔'' ہارون متعجب سا ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا دوسری طرف رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سفیان اگلے ہی دن اس کے شوہر کے ہمراہ دفتر پہنچ گیا تھا۔ ضوفشاں کا حوالہ تھا اسی لیے بنا کسی ہچکچاہٹ اسے اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ پہ رکھ لیا گیا تھا۔ شروع کے چند دن تو کام سیکھنے اور دفتری معاملات سمجھنے میں گزرے اور اس دوران سفیان نے اس پہ اپنا اعتبار کچھ انداز میں قائم کیا تھا کہ وہ اسے کئی معاملات میں براہ راست شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے صلاح مشورہ بھی کرنے لگا تھا۔ اس کے سامنے بھیگی بلی بنا سفیان اپنے مخصوص چاپلوسانہ انداز کی بدولت اس کی گڈ بکس میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اس شہر میں اجنبی تھا اور فی الوقت رہائش کا کوئی مناسب انتظام بھی نہ تھا تو اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان دونوں نے اسے اپنے گھر کے گیسٹ روم میں ٹھہرایا ہوا تھا اور اس طرح وہ گھر اور دفتر دونوں جگہ یکساں اثر انداز ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے سفیان خود بھی یہی چاہتا تھا آخر یہ سب بھی تو ایک پلان کا حصہ تھا۔

ایکسپو جرمنی میں اس کی شمولیت ضروری تھی ایسے میں اس کی غیر موجودگی میں سفیان سے زیادہ قابل بھروسا اور کون ہوتا جسے گھر اور دفتر دونوں کی نگرانی سونپی جاتی پر وہ غافل یہ نہیں جانتا تھا وہ اس چور کے ہاتھ اپنی تجوری کی چابی تھما کر جا رہا ہے جو ایک لمبے عرصے سے اس پہ نقب لگائے بیٹھا تھا اور آج گھر کا بھیدی بن کر اسے برباد کرنے والا ہے۔ اس کی موجودگی میں بھی سفیان دیر تک دفتر میں اس کے ساتھ رہتا تھا مقصد اس پہ نظر رکھنا تھا اور آج کل تو وہ ملک میں تھا ہی نہیں لہٰذا وہ دیر سے ہی گھر پہنچتا تھا۔ نو بجے وہ گھر پہنچا اور دھڑلے سے سیدھا ضوفشاں کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بنی سنوری کھڑی خود کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی جب اس نے اسے بانہوں کے گھیرے میں لیا۔

''اوفوہ کیا کر رہے ہو کسی کی نگاہ پڑ گئی تو قیامت آجائے گی''۔ اس نے احتجاج کیا پر اسے خود سے الگ نہ کیا۔ در پردہ وہ بھی اس شرارت سے محظوظ ہوئی تھی۔

''قیامت تو آ چکی ہے میری جان، اس ٹھاٹھ باٹھ میں کیا ستم ڈھا رہی ہو میرا تو دل ہی ہاتھوں سے نکلے جا رہا ہے''۔ اسے سینے سے لگاتے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

''اپنے دل کو ابھی قابو میں رکھو منزل اتنی آسان نہیں ذرا سی بے دھیانی ساری بازی پلٹ سکتی ہے''۔ اسے خود سے پرے دھکیلتی وہ مسکراتے ہوئے بیڈ پہ جا بیٹھی۔

''نخرے کرنے لگی ہو میری رانی، ویسے کمال کی اداکارہ ہو تم۔ اس سیٹھ کو کیا خوب قابو کیا ہے''۔ سفیان بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''چپ رہو بنا بنایا کھیل مت بگاڑ دینا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں''۔ ضوفشاں نے اس کے کندھے پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

''وہ لائے ہو''۔ اچانک اسے یاد آیا تھا۔ سفیان نے اثبات میں سر ہلاتے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''یہ لو''۔ سفید کاغذ کی بنی ایک پڑیا اس کی

طرف بڑھائی تو ضوفشاں کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا نہ، میرا مطلب یہ ایکدم مر تو نہیں جائے گا''۔ آنکھیں سکیڑے اس نے تصدیق چاہی۔

''ارے میری بلبل، ڈرتی کیوں ہے۔ بس ایک قطرہ ہر روز پلاتی جاؤ۔۔۔۔سالا آہستہ آہستہ لاغر ہوتا جائے گا اور ایک دن اس کا کام تمام''۔ اس کے گالوں کو چھوتے وہ شوخی سے بولا۔

''سب کو یہی لگنا چاہیے یہ کسی موذی مرض کا شکار ہو کر طبعی موت مرا ہے''۔ وہ سنجیدہ تھی۔

''ایسا ہی ہوگا سرکار''۔ سفیان نے دھیمی آواز میں کہتے اس کی گردن کو چھوا۔

''اور تم آہستہ آہستہ اس کا اعتبار جیتو، دفتر کا ہر معاملہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اس کی زمین، جائیداد، بنک بیلنس شیئرز۔۔۔ تمہارے پاس ہر چیز کی پوری معلومات ہونی چاہیے''۔ وہ مزید بولی لیکن وہ اب اس کے حسن کے سامنے مدافعت کھونے لگا تھا۔ اس کی خوشبو سے ہوش و خرد کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔

''تم بے فکر ہو جاؤ بس اس بلے کو سنبھالنا میں وہاں آکٹوپس کی طرح اس کو اپنے شکنجے میں ایسے جکڑ لوں گا کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود میری گرفت سے نکل نہیں پائے گا''۔ اسے اپنی گرفت میں لیتے سفیان گمبھیر لہجے میں بولا۔ رات کے اس پہر شیطان ان دونوں پہ اتنی بری طرح حاوی تھا کہ اپنے مکروہ فعل کا پردہ رکھنے کو دروازہ بھی لاک نہیں کیا گیا تھا۔ گھر میں کوئی ملازم رات کو نہیں ٹھہرتا تھا اور وہ تو یہی سمجھے تھے کہ بچہ اب تک سو چکا ہوگا پر یہ ان کی بھول تھی۔ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں گھستے سفیان کو تو وہ دیکھ چکا تھا اور پھر دروازے کی جھری سے جھانکتی نظروں نے انہیں ایک ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔ خوف سے کانپتے وہ تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے تک آیا تھا اور دروازہ لاک کر کے جانے کتنی ہی دیر روتا رہا تھا۔ ان کی بدکاری کا وہ واحد چشم دید گواہ تھا۔ عمر کے اس حصے میں اس کا معصوم دماغ ان کی گھناؤنی حرکت کا سیاق و سباق نہ جانتا تھا پر اسے یقین واثق تھا کہ جو ہو رہا وہ ٹھیک نہیں۔۔۔ وہ غلط ہے۔ وہ بہت غلط ہے پر وہ چاہ کر بھی یہ سب کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

مزینہ کی شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی باقاعدہ تیاریوں کا آغاز ہوگیا۔ حالانکہ شگفتہ بیگم سالوں سے اس کی شادی کو لے کر کچھ نہ کچھ اکٹھا کیے ہوئے تھیں پر اب لگ رہا تھا سب کچھ نئے سرے سے شروع کیا جا رہا ہو۔ آئے دن وہ اور مزینہ بازاروں کے چکر لگا رہی تھیں۔ ایک کے ساتھ چار نئی چیزیں آتی اور دو پھر چھوٹ جاتیں جس پہ گھر آکر شور مچتا، شگفتہ کا بی پی بڑھتا اور سکندر حسین کی جیب کا وزن کم ہو جاتا۔ رائیل حسب معمول اسپتال میں الجھی ان تیاریوں کو کم ہی وقت دے پاتی تھی مگر مزینہ کی تمام شاپنگ دیکھ کر اس پہ اپنی رائے ضرور دیتی۔ آج بھی ان دونوں کی واپسی کے بعد سب سامان لاؤنج میں بکھرا تھا۔ رائیل بھی اتفاق سے اسی وقت لوٹی تھی تو منڈلی جمی ہوئی تھی۔

''آپی یہ والا سوٹ تو بہت ہی زبردست ہے، میرا خیال ہے اس کے ساتھ یہ سیٹ ظالم لگے گا''۔ آلیو گرین کلر کے کامدار سوٹ کو سراہتے اس نے اپنی رائے دی۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی اور یہ جھمکے کیسے لگ رہے ہیں۔ اس ریڈ کے ساتھ میچ کریں گے نا''۔ مزینہ نے جھمکے کان سے لگاتے رائے مانگی۔

''قسم سے ایک دم فرسٹ کلاس۔'' اس نے بھرپور انداز میں داد دی۔ تھکاوٹ اور لمبی ڈیوٹی کے بعد بھی وہ خوشگوار موڈ میں تھی البتہ چہرے سے تھکن نمایاں تھی۔

''اب بہن کے جہیز کی چیزیں دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہو گی یا اپنے لیے بھی کوئی فیصلہ کرو گی''۔ شگفتہ بیگم بیٹی کا اترا ہوا چہرہ بغور دیکھتے بولیں۔

''ماما آپ پھر شروع ہوگئی ہیں''۔ جب سابق اس کا منہ بن گیا تھا۔

''تمہاری عمر میں میرے دو بچے ہوگئے تھے بی بی''۔ جتاتے انداز میں مثال وموازنہ حاضر تھا۔

''مزینہ کا تو چلو نکاح ہو چکا تھا چار سال پہلے پھر شجاع باہر پڑھنے چلا گیا اس لیے وقت نکل گیا لیکن تم نے آخر کیا سوچا ہے کہ اپنا گھر کب بساؤ گی؟'' وہ ان دنوں سنجیدگی سے رابیل کی شادی کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ان کی خواہش تھی مزینہ کی شادی کے بعد جلد از جلد اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہوا جائے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ بڑی بیٹی سالوں سے منسوب تھی جبکہ اس سے فقط ایک سال چھوٹی کے لیے اب تک رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی اور وجہ وہ خود تھی کیونکہ اپنی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے وہ کسی جھنجٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی تھی دوسرے سکندر صاحب کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ اس مشکل روٹین میں اس کا دھیان کسی اور طرف لگایا جائے لہذا وقت گزر رہا تھا لیکن اب تو ماما جانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ کل ہی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اسے رخصت کردیں۔

''ماما تو کیا یہ میرا گھر نہیں؟'' رابیل رنجیدہ سی بولی۔

''بالکل ہے، سو فیصد تمہارا ہی گھر ہے پر میری گڑیا آخر سب بیٹیوں کو بیاہ کر ایک نہ ایک دن تو دوسرے گھر جانا ہوتا ہے نا'' انہوں نے پچکارا۔

''ہاں تو ہوجائے گی شادی بھی میرے سر میں کون سے سفید بال آگئے ہیں''۔ وہ تنگ کر بولی۔

''شادی تو اس وقت ہوگی جب تم کوئی گھرداری بھی سیکھو گی۔ نمک اور چینی میں فرق کا تو پتا نہیں تمہیں۔ اگلے گھر جاکر ڈسپرین کی گولیوں اور پینسلین کے انجکشنز پلاؤ گی انہیں''۔ ان کے لاکھ کہنے کے بعد بھی وہ کم ہی گھر کے کاموں کو ہاتھ لگاتی تھی، اس لیے نہیں کہ اسے کچھ پکانا نہیں آتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ جو بھی کرلے شگفتہ بیگم کوئی نا کوئی معمولی نقص ڈھونڈ کر چار باتیں سنا ہی دیتی تھیں۔ اپنی طرف سے تو یہ سب ان کا اصلاح کا ایک انداز تھا پر وہ منہ بسورتی پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ نارمل سا کھانا تو پکا ہی لیتی تھی وہ تو بس یہی ٹھیک تھا۔ ویسے بھی مزینہ کے ہوتے اسے کم ہی کچن میں جانے کا موقع ملتا۔ اب بھی اسے چینی نمک کے فرق پہ صلواتیں سنادی تھیں۔

''اس معاملے میں تو یہ بالکل آپ پہ گئی ہے یاد ہے آپ کے ہاتھ سے بھی کتنی ہی بار نمک والی چائے پی تھی ہم نے''۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سکندر صاحب کی کب سے بے چین ٹانگ درمیان میں آگئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ پھلجڑی چھوڑی کہ شگفتہ بیگم کو مرچیں لگادیں۔ لب دبائے مزینہ نے سامان سمیٹا اور رابیل جوتے ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ کھسک لی۔

''کچھ تو خدا کا خوف کریں، بارہ مسالوں کی بریانی اور نہاریاں اپنے ان گناہ گار ہاتھوں سے پکا کر کھلاتی رہی ہوں تمام عمر آپ کو۔ پر یاد رہی تو نمک والی چائے''۔ سیڑھیاں چڑھتے اس کے کانوں سے شگفتہ بیگم کی تاسف میں ڈوبی آواز ٹکرائی۔

☆☆☆

سفیان کا تعلق لوئر مڈل کلاس کے ایک ایسے گھر سے تھا جہاں غربت، اخلاقیات کو کھا جاتی ہے۔ ایک موذی بیماری سے اپنے جواں سال باپ کی موت کے بعد اس نے زندگی میں بدترین وقت دیکھا تھا۔ بھوک اور افلاس سب سے پہلے عزت نفس کو اژدھا بن کر نگل لیتے ہیں اور اس کا عملی مظاہرہ اس نے اپنے گھر میں دیکھا جہاں چار بچوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خاطر اس کی ماں نے اپنی سب سے قیمتی چیز بیچ ڈالی تھی۔ وہ جو سونے میں تل کر بھی واپس نہیں آسکتی تھی اس عزت کو بیچ کر اولاد کے لیے روٹی خریدی گئی تھی۔ حالات کا مارا انسان فطرتاً جلد باز ہے اسی لیے توکل کا مفہوم نہیں جانتا۔ یہ سودا دنیا و آخرت دونوں میں خسارے کا تھا۔ حرام مال سے اولاد کی پرورش کرنے والے ان کی رگوں میں زہر

بھرتے ہیں اور پھر وہ زہر معاشرے کا ناسور بن جاتا ہے۔ سب سے بڑا بیٹا ہونے کے سبب سفیان اپنے خاندان کی خستہ حالی سے واقف تھا تو ہر اس گالی کا مفہوم بھی جانتا تھا جو ایک جسم بیچنے والی ماں کی اولاد کو ملتی ہے۔ حالات تو خیر کبھی نہیں بدلے تھے پر وہ اپنی قسمت بدلنے گھر سے نکل گیا تھا۔ ان نامساعدہ حالات کے باوجود سفیان نے انٹر کیا تھا لیکن کہیں بھی ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملی تھی۔ اس کے باقی بھائی بہن تو خیر یہ بھی نہیں کر سکے تھے۔ ماں کی موت سے پہلے ہی وہ گھر چھوڑ چکا تھا۔ وہ اپنی قسمت خود بنانا چاہتا تھا اور قسمت اسے ستارہ بائی کے پاس لے آئی تھی۔

ضوفشاں کا تعلق اسی بدنام زمانہ بازار سے تھا کہ شرفاء میں جس کا نام لینا بھی اپنی توہین سمجھا جاتا تھا۔ وہ ستارہ بائی کی سب سے حسین، کم سن اور نخریلی بیٹی تھی۔ چونکہ اب اونچی پگڑے والوں کی اس بازار میں جاتے شان گھٹنے لگی تھی تو ستارہ نے بھی اپنا اصل ٹھکانا چھوڑ کر شریفوں کی بستی میں سکونت اختیار کی۔ وہ اسی مٹی کی بود و باش تھی جو مردوں سے تعلقات فقط ایک چیز کے لیے قائم کرتی ہیں اور وہ ہے پیسا اور یہاں بھی وہ اس سے محروم نہیں ہوئی تھی۔۔ پر اپنی روایت کے برعکس ضوفشاں محبت کا روگ لگائے بیٹھی تھی وہ بھی سفیان رفیق سے جو راتوں رات دولت کمانے کی ترکیبیں سوچتا، ہوائی قلعے بناتا اور دن میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا۔ نئے علاقے میں رئیسوں کو ایسے گھروں کا راستہ سفیان کی بدولت پتا چلتا بدلے میں وہ اسے کچھ نہ کچھ عنایت کرتے۔ ضوفشاں کو اس کام میں دلچسپی نہ تھی۔ اسے سفیان کے ساتھ گھر بسانا تھا۔ بچے پیدا کرنے تھے۔ شریفانہ زندگی گزارنی تھی اسی لیے ایک دن اس کی خاطر رات کے اندھیرے میں ستارہ بائی کا سارا زیور اکٹھا کر وہ سفیان کے ساتھ بھاگ گئی۔ وہ تو اس سے فورا شادی کرنا چاہتی تھی لیکن سفیان کا فی الحال اس سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ غریب پیدا ہوکر غریب نہیں مرنا چاہتا تھا۔ ضوفشاں جو ماں کا زیور لائی تھی وہ بھی اس کے لیے باعثِ تسلی نہ تھا۔ اسے کروڑوں چاہیے تھے جو کبھی ختم نہ ہوتے اور اس کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ کسی رئیس کے گھر ڈاکا ڈالا جاتا اور اس کے کروڑوں ہی ہتھیا لیے جاتے کیونکہ اتنا پیسا سفیان اپنی زندگی میں کما تو سکتا نہیں تھا لہٰذا سوچ سمجھ کر پلان کے تحت ہمایوں بخت کا انتخاب کیا گیا تھا۔ بھوربن میں ضوفشاں کی ہمایوں بخت سے ملاقات اسی سازش کا حصہ تھی جس کا ماسٹر پلانر سفیان تھا۔ اسے ضوفشاں میں اس لمبی چوڑی جائداد سے بڑھ کر دلچسپی نہ تھی۔ ہمایوں بخت جیسی بڑی آسامی کو پھانسنے کے لیے ضوفشاں کانٹے میں پھنسی بیٹ تھی اور آج اس کی بدولت چند ماہ میں سفیان اس کے گھر اور دفتر دونوں میں جگہ بنا چکا تھا۔ اگلا مرحلہ مشکل تھا پر وہ دونوں پوری تیاری کر چکے تھے لیکن جس راز کو وہ دونوں اب تک چھپاتے آئے تھے اس میں کوئی تیسرا شریک ہو چکا تھا۔

☆☆☆

موسم نے کروٹ بدلی تو سورج نے اپنی چھب دکھلائی۔ بہار کی آمد آمد تھی ایسے میں پورا شہر کاسنی اور پیلے پھولوں کے رنگوں سے سجا تھا۔ موسم بدلا تھا پر زندگی کا معمول نہیں۔ اپنا راؤنڈ مکمل کر کے وہ اسٹاف روم میں چلی آئی۔ اتفاق سے کمرہ خالی تھا تو صوفے پہ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ آج تو آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسی وقت ڈاکٹر عاصم کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں دو مگ تھام رکھے تھے۔

''یہ لیجیے آپ کی چائے''۔ آتے ہی ایک کپ رابیل کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو سو مچ، اس وقت سچ میں اس کی طلب ہو رہی تھی''۔ کپ تھامتے رابیل نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

''کیا ہوا خیریت، دشمنوں کی طبیعت ناساز لگ رہی ہے''۔ صوفے پہ بیٹھتے ڈاکٹر عاصم نے سوال کیا۔ رابیل کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی چغلی کھا رہے تھے۔

''نہیں بس تھکاوٹ بہت زیادہ ہے۔ آپی کی شادی ہے نا تو کاموں کا ایک انبار ہے اور پھر یہ ڈیوٹیاں۔'' گھونٹ بھرتے رابیل نے ہلکے پھلکے انداز میں وضاحت کی۔

''تو چھٹی لے لیں۔ میں کور کرلوں گا''۔ ڈاکٹر عاصم نے تجویز کے ساتھ مدد کی آفر کردی۔

''تھینک یو سوچ، شادی کے لیے تو لیوا پروو ہے میری ان دنوں آپ کو ہی منیج کرنا ہوگا لیکن ابھی تو کام چل رہا ہے''۔ رابیل اس خلوص پہ متشکر تھی پر چہرہ اب بھی اداس تھا یا شاید متفکر۔

''کیا بات ہے رابیل آپ کو پہلے کبھی اتنا خاموش نہیں دیکھا، کیا کوئی اور بات بھی ہے۔ میں آپ کا دوست ہوں آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں اگر مناسب سمجھیں تو''۔ عاصم کو فکر ہوئی۔ ان دونوں کا برسوں پرانا ساتھ تھا اور رابیل کم ہی اتنی سنجیدہ ہوتی تھی۔

''بات ہے بھی اور نہیں بھی۔'' رابیل نے بتانا شروع کیا۔

''آج کل ماما روز میری شادی کا قصہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پہلے تو بابا کی وجہ سے مذاق میں بات ٹل جاتی تھی لیکن اب وہ بھی ان کے ساتھ مل چکے ہیں''۔ یہ بات کوئی نئی نہیں تھی کہ شگفتہ بیگم اس کی شادی کا قصہ نکال کر بیٹھی ہوتی تھیں مگر کل رات جب سکندر صاحب نے بھی ان کی تائید کی اور رابیل کو سنجیدگی سے کوئی فیصلہ کرنے کا کہا تو وہ الجھ سی گئی۔ اب تک زندگی جن ہنگاموں میں الجھی ہوئی تھی شادی کے متعلق دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ اپ سیٹ ہونے والی بات تھی بھی اور نہیں بھی۔

''تو پھر''۔ عاصم تشویش سے بولا۔ رابیل کے لیے اس کے دل میں جذبات دوستی سے بڑھ کر تھے۔ یہ اور بات وہ کبھی کھل کر اظہار نہیں کر پایا تھا کیونکہ رابیل کا مزاج عام لڑکیوں سے قطعاً مختلف تھا۔ پر عاصم کی پسندیدگی دراصل محبت تھی۔

''بس پھر کیا۔۔۔۔ ماما کی وارننگ ہے اس بار جو پہلا رشتہ میرے لیے آیا اس کے ساتھ مجھے کان پکڑ کے رخصت کردیا جائے گا''۔ رابیل بے بسی سے ہنسی۔

''رابیل میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کافی عرصے سے لیکن بس۔۔۔۔'' شاید اب وقت آچکا کہ عاصم اپنے دل کا حال رابیل کو کہہ سنائے ورنہ یہ خاموشی اس کے مخالف ہوجاتی۔ کچھ سوچ کر اس نے بات کا آغاز کیا لیکن قاصد کو دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ یہ پیکٹ آپ کے لیے آیا ہے''۔ قاصد نے ایک چھوٹا سا پیکٹ رابیل کی طرف بڑھایا جو خوبصورت گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔

''میرے لیے؟'' رابیل نے تحیر سے پہلے اس سنہری پیکٹ کو دیکھا پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے عاصم پہ ڈالی۔

''جی کوئی آدمی ریسیپشن پہ دے کر گیا تھا اس پہ آپ کا نام بھی لکھا ہے''۔ قاصد نے وہ بتایا جو اس کے علم میں تھا۔

''اسٹرینج''۔ پیکٹ پہ واقعی رابیل کا نام لکھا تھا۔

''اچھا جی شکریہ''۔ پیکٹ کو الٹ پلٹ کرتے رابیل نے قاصد سے کہا۔ وہ الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

''کس نے بھیجا ہے؟'' عاصم نے سوال کیا۔ اس کی بات تو خیر ادھوری ہی رہ گئی تھی۔

''بھیجنے والے کا نام نہیں''۔ رابیل نے بتایا۔

''کھول کے دیکھیں''۔ عاصم کی طرف دیکھتے رابیل نے کچھ سوچتے ہوئے سنہری کاغذ کھولنا شروع کیا۔ اندر ایک میٹل باکس تھا جس پہ ایک چھوٹا سا کاغذ چسپاں تھا۔

''ازالہ!'' رابیل نے کاغذ اتار کر عاصم کو دکھایا۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر عاصم کی کال آگئی اور وہ اسٹاف روم سے نکل گیا۔ رابیل اب تنہا تھی۔

''پین؟'' باکس کھولا تو ایک قیمتی کرسٹل جڑا سلور پین مخملی ڈبیا سے نکلا۔ حیرت در حیرت تھی۔

''Swarovski Crystal'' یہ ایک

انتہائی مہنگا قلم تھا جس کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ رابیل کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ غائبانہ ملنے والے اس تحفے کو بھیجنے والے کے نام کا اندازہ وہ نہیں لگا پائی تھی کیونکہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں الجھے اب اتنے ماہ بعد بھی وہ واقعہ کسے یاد رہتا۔

☆☆☆

مزینہ کی شادی تک کیا بھاگم بھاگ مچی تھی۔ شاپنگ، تیاریاں، گہما گہمی اور شور شرابا۔ شادی کا دن آیا اور گزر گیا۔ آج ولیمہ کی تقریب تھی جس کا اہتمام مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا۔ شجاع کا حلقہ احباب چونکہ اس کے دفتری لوگ تھے لہٰذا تقریب محدود پر شاندار تھی۔ سیاہ شیفون پہ ہلکا سا کام والا انگرکھا اور جامہ وار ٹراوزر کے ساتھ کامدار دوپٹے میں وہ بہت اسٹائلش لگ رہی تھی۔ بال کھلے تھے اور کانوں میں آویزے اس کی تیاری کو مکمل کرتے تھے۔ اسٹیج پہ کچھ وقت مزینہ اور شجاع کے ساتھ گزار کر وہ چند رشتے داروں سے ملتی ملاتی پول سائڈ پہ نکل آئی۔

''میں سوچ رہا تھا یہ یقیناً آپ ہوں گی''۔ ایک غیر شناسا سا آواز پہ وہ چونک کر پلٹی۔

''ڈاکٹر رابیل سکندر۔ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز''۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ دل جلانے کی حد تک ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو، پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے جتانے والے انداز میں بولا۔

''مسٹر شاہ۔۔۔ نائس ٹو سی یو''۔ رابیل اپنی حیرت پہ قابو پاتے بمشکل مسکرائی۔

''آپ یہاں؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ جگہ ان کی پرائیوٹ تقریب کے لیے بک تھی تو پھر اذلان طیب شاہ کا یہاں کیا کام۔

''مجھے مسٹر کمال نے انوائٹ کیا ہے''۔ وہ متحیر ہوئی، عادتاً ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔

''وہ میری کمپنی میں کام کرتے ہیں''۔ اذلان نے مزید بتایا۔

''اوہ۔۔۔ شجاع کمال میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور میری بہن کے شوہر''۔ اسے ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔

''گڈ مبارک ہو آپ کو بہت''۔ اس کے ہونٹوں پہ بڑی موہوم سی مسکراہٹ تھی۔

''شکریہ''۔ رابیل کو اس کا مسکرانا اچھا لگا تھا ورنہ تو اسپتال میں دو دن وہ بس اینگری ینگ مین ہی بنا رہا تھا۔ اپنے حساب سے وہ بات ختم کر چکی تھی لہٰذا پلٹ کر وہاں سے جانے لگی پر اذلان شاید بات اب شروع کر رہا تھا۔

''میں سمجھا تھا میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے آپ یقیناً مجھے کال کریں گی۔۔ لیکن۔۔۔ انی وے۔۔۔'' اس نے مڑ کر دیکھا۔

''کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں''۔ یہ شخص اسے مستقل حیران کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ ایک تو ویسے ہی وہ اس کی نظروں سے کنفیوز ہو رہی تھی۔ کچھ وہ پہلے ہی اس کی شخصیت سے متاثر تھی اور اب یہ کوئی نئی بات نکال کر بیٹھ گیا تھا۔

''حالانکہ مشکل بات تھی نہیں ویسے بھی میں نے آپ کا نقصان کیا تھا ''ازالہ'' تو بنتا تھا پھر شکریہ کیسا''۔ اس ایک لفظ پہ زور دیا گیا۔

''ازالہ''۔۔۔''ایک منٹ ایک منٹ۔۔۔ وہ پین آپ نے بھیجا تھا''۔ رابیل کے سسپنس کا خاتمہ ہوا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا''۔ اس پزل کو اس نے خود ہی حل کر دیا تھا۔

''آپ کو وہ نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ اگر اس پہ بھیجنے والے کا نام پتا لکھا ہوتا تو میں اسی وقت واپس بھجوا دیتی''۔ یہ جان کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی پر رابیل آج تک اس قیمتی تحفے کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ انجان لوگوں سے تحائف وصول کرے اس لیے کچھ خفگی کا اظہار کیا۔

''شاید یہی سوچ کر نہیں لکھا تھا''۔ نچلا لب دبائے اذلان نے مسکراہٹ روکی۔

''میں بس ایکسکیوز کرنا چاہتا تھا اپنے طریقے

سے"۔ اس نے مزید کہا تو رابیل نے نفی میں سر ہلایا۔
"اس کی ضرورت نہیں تھی اور وہ پین بہت مہنگا ہے میں اتنے مہنگے پین کا کیا کروں گی۔ مجھے ضرورت نہیں اس کی"۔ رابیل نے صاف گوئی سے بتایا۔
"وہی کیجیے گا جو اس پین سے کرتی رہی ہیں جس کے ٹوٹنے پہ آپ کا چہرہ پل میں مرجھا گیا تھا۔ یقیناً اس سے مہنگا تو نہیں ہو سکتا وہ"۔ ازلان نے تمسخر سے کہا اور رابیل کو اس کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔
"وہ مہنگا نہیں قیمتی تھا۔ کچھ چیزوں کی اہمیت ان کا پرائس ٹیگ نہیں، دینے والے کی محبت اور اس کا خلوص ہوتا ہے۔ وہ میرے بابا کا گفٹ تھا اور اس کا کوئی متبادل نہیں ہو سکتا۔" اپنی ناپسندیدگی کو لفظوں میں ڈھال کر اس نے ازلان پہ یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کے پیسوں سے متاثر نہیں ہوئی۔
"اچھا فلسفہ ہے۔ امتحان میں اچھے نمبر ملتے ہیں ایسی باتیں لکھنے پر"۔ وہ ازلان شاہ تھا۔ سامنے والے کی نفسیات پڑھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کے طنز کا برا مانے بغیر وہ بہت اعتماد سے بولا۔ اس سے پہلے کہ رابیل کوئی جواب دیتی وہاں شجاع آ گیا۔ یقیناً اسے ازلان کی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔
"ویلکم سر۔۔۔ آپ کی آمد نے میرا مان بڑھایا ہے۔ میں بہت مشکور ہوں"۔ وہ مؤدب بولا اور پھر پاس کھڑی رابیل سے ازلان کا تعارف کروانے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں یہ جان کر اسے حیرت ہوئی تھی۔
"آپ نے خلوص سے بلایا تھا اس لیے چلا آیا۔ ویسے بھی پیار اور خلوص انمول ہوتے ہیں ان کا کوئی متبادل نہیں۔۔۔ ایسا ابھی کچھ دیر پہلے سنا ہے میں نے"۔ بڑا جتاتا سا انداز تھا اس کا مفہوم شجاع کو تو سمجھ نہیں آیا تھا کیونکہ وہ پس منظر سے واقف نہ تھا پر پاس کھڑی رابیل ضرور جانتی تھی یہ اسے سنایا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔ شجاع — ازلان کے ساتھ اب مزینہ سے اس کا تعارف کروانے اسٹیج کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

عورت ذات سے تو اسے ویسے ہی چڑ تھی اس پہ ایک عام سی لڑکی کا یہ اعتماد، وہ اسے بالکل اچھی نہیں لگی تھی پر اسے ذہن سے نکال بھی نہیں سکا تھا۔ اس سے چڑ زیادہ تھی یا اس کی کشش، ازلان خود کو وہ سب کرنے سے روک نہیں پایا جو آج سے پہلے اس کے نزدیک ہرگز منطقی نہ تھا۔ وہ جو سب کو ان کے مقام پہ رکھتا تھا، لڑکیوں کو تو ویسے ہی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی غیر جذباتی طبیعت اور خشک مزاجی کی بدولت اس کی پیٹھ پیچھے اسے مغرور کا طعنہ ملتا تھا پھر اچانک رابیل سکندر سے حادثاتی ملاقات نے اس کی زندگی میں طوفان برپا کر دیا۔ اس نے واقعی اسے سر پہ سوار کر لیا تھا۔ اسی لیے تو اس کے کوائف حاصل کرنے کے بعد ایک ایسی کمپنی خرید لی جس میں اس کی دلچسپی صفر بھی نہیں تھی۔ شجاع اسی کمپنی میں کام کرتا تھا اور رابیل تک پہنچنے کا اس سے اچھا اتفاقی ذریعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہارون اس کے فیصلے پہ حیران تھا اور جانتا تھا یہ سب ہرگز عقل مندانہ نہیں کیونکہ اگر اس کا باس رابیل کو پسند کرتا ہے تو اس طریقے سے اس تک پہنچنا حماقت ہے پر وہ ازلان کے سامنے اعتراض کرنے والا کون ہوتا تھا۔ دوسرے اسے کیا معلوم محبت اور نفرت کے انداز الگ ہوتے ہیں۔
ازلان نے وہ قیمتی پین رابیل کو بھیجا تو اسے اندازہ تھا شاید وہ اس کا سراغ پا جائے مگر رابیل ایک تو اس واقعے کو بھول چکی تھی دوسرے اپنی مصروفیات میں الجھی رہی۔ جب ازلان سے اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو اس نے شجاع کو اکسایا۔ وہ شادی کے لیے لیو اپلائی کر رہا تھا ازلان نے اسے ایسا الجھایا کہ وہ خوشی خوشی اس کی میز پہ دعوت نامہ رکھ آیا۔ اس کے لیے تو یہ خوشی کی بات تھی گو اسے یقین نہیں تھا وہ ویسے پہ پہنچ جائے گا پر اس نے ازلان کی آمد کو اعزاز کی طرح لیا تھا کہ یہ تھا بھی ایک اعزاز پر یہ اس کے لیے نہیں تھا۔
صبح کا آغاز غیر متوقع تھا۔ اس نے اپنی میز پہ وہ کرسٹل پین بمعہ شکریہ نوٹ دیکھا۔ رابیل نے ایسا

کر کے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ مڈل کلاس لڑکی اذلان طیب کا لاکھوں کا تحفہ اس کے منہ پر مار رہی تھی۔ اس کے غصے میں اضافہ ہوا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے رابیل کا نمبر ملایا۔

''جانتی ہیں کسی کا تحفہ واپس کرنا بھیجنے والے کے خلوص کی توہین ہوتی ہے''۔ بنا تمہید شکوہ کیا گیا تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں مگر میں نے آپ کو اسی دن بتا دیا تھا میں اتنی قیمتی چیز ایکسیپٹ نہیں کر سکتی''۔ تو کیا پیسوں کی اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں۔ اذلان متاثر ہوا تھا۔ وہ اسے اگر اپنے پیسوں سے متاثر کرنا چاہ رہا تو وہ نہیں ہوئی تھی۔ اسے شدید حیرت ہوئی۔ رابیل کو اندازہ نہیں تھا وہ اسے ڈائریکٹ کال کر دے گا۔ (پتا نہیں اس شخص کے پاس میرا ذاتی نمبر کہاں سے آیا) وہ بس سوچ ہی سکی۔

''میں تو سمجھا تھا آپ کے نزدیک چیزوں کی قیمت ان پہ لگا پرائس ٹیگ نہیں بلکہ بھیجنے والے کا خلوص ہے''۔ کل شام کے حوالے سے جتایا گیا تھا۔

''مسٹر شاہ وہ صرف اس صورت جب دو لوگوں کے درمیان کوئی رشتہ ہو اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی کہ ہمارا ایسا کوئی تعلق نہیں''۔ اسے اس آدمی کی یادداشت پہ حیرانی ہوئی تھی۔ اپنی عجیب فطرت کے باوجود وہ اسے مرعوب و متاثر کر رہا تھا۔

''تعلق ملنے جلنے سے بنتے ہیں۔ ویسے سنا ہے آپ دوستی خوب نبھانا جانتی ہیں اور بدقسمتی سے میری زندگی میں دوستوں کی شدید کمی ہے''۔ کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''اور یہ بات بھی یقیناً آپ تک اسی ذریعہ سے پہنچی ہو گی جہاں سے آپ نے میرا کانٹیکٹ نمبر حاصل کیا''۔ اس بات کے بعد رابیل کے پاس شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یقیناً اذلان اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

''فون پہ معذرت قبول نہیں کرتا میں، وہ بھی اس صورت جب کال میری طرف سے کی گئی ہو۔ آپ نے میرا تحفہ ٹھکرایا ہے ایک کپ کافی تو ساتھ پی سکتی ہیں''۔ اس کی بات کو نظر انداز کر کے اذلان نے عجیب فرمائش کی تھی۔ رابیل شدید کنفیوز ہو رہی تھی۔ کہاں تو نظر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا کہاں یہ توجہ وہ بھی اتنی چھوٹی سی بات پہ۔ اس کا دماغ کل رات سے سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا تھا اور اب تو مزینہ بھی نہیں تھی جس کو ساری بات بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتی یا مشورہ ہی لے لیتی۔

☆☆☆

''کچھ اپنے بارے میں بتائیے''۔ مقامی فائیو اسٹار ہوٹل کے کافی شاپ میں دھیمی سی موسیقی ماحول کو پرفسوں بنا رہی تھی۔ رابیل سلور گرے سلک شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں ہمیشہ کی طرح سادہ اور اسٹائلش نظر آ رہی تھی۔ بال آج باندھ رکھے تھے۔ اذلان نے اسے کافی پہ مدعو کیا تھا اور وہ اسے انکار نہیں کر پائی تھی۔ اذلان اس کے بالکل سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بری طرح کنفیوز کر رہا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی متاثر کن لگ رہا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔ رابیل اسے پہلی بار بھی اگنور نہیں کر سکی تھی وہ آج بھی نظر انداز ہونے والوں میں نہیں تھا۔

''میرے بارے میں۔۔۔۔ ہمم۔ ہم کل چار لوگ ہیں۔ ماما، بابا، مزینہ آپی اور میں''۔ ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ ویسے تو ان دونوں کو ہی تعارف درکار تھا پر پہل اذلان نے کی تو رابیل اپنے متعلق بتانے لگی۔

''بابا بہت دلچسپ انسان ہیں۔ ایک انتہائی قابل پروفیسر ہونے کے باوجود بہت مختلف اور غیر سنجیدہ۔ ماما کہتی ہیں مجھے بگاڑنے میں سو فیصد ہاتھ بابا کا ہے۔ ان کے ہوتے گھر میں کوئی سنجیدہ اور خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر وقت شرارتیں اور ہنسی مذاق۔ ان کی وجہ سے گھر گھر لگتا ہے۔ زندگی زندگی لگتی ہے''۔ اذلان کا چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر تھا۔ رابیل کے گالوں کی لالی گہری ہو رہی تھی۔ مسکراہٹ

بدستور اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اپنی خوبصورت زندگی کے متعلق بتاتے اس کی آنکھوں میں جگنو تھے۔ ایک آسودہ زندگی کو بیان کرتے فرحت کا حسین احساس تھا جو ازلان کی نظروں سے چھپ نہیں پایا تھا۔

ویسے وہ بہت سپورٹیو ہیں انفیکٹ میرے دونوں پیرنٹس۔۔۔۔ آج اگر زندگی میں ہم کسی قابل ہیں، ہماری انفرادی حیثیت ہے، ہم معاشرے کے ذمہ دار شہری ہیں تو اس کا مکمل کریڈیٹ ہمارے والدین کو جاتا ہے۔'' کافی کا سپ لیتے رابیل نے مزید بتایا۔ ازلان کے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔ اسے عجیب وحشت نے آگھیرا تھا۔

''آئی ایم سوری''۔ سامنے پڑا کافی کا کپ پرے دھکیلتے وہ خشک لہجے میں بولا۔

''جی؟'' وہ جو اپنی ہی باتوں میں مگن تھی ایک دم چونکی۔

''میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا''۔ وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔ میز پہ چند نوٹ رکھتے اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ قدم سے قدم ملاتی حیرت میں ڈوبی رابیل اس کے ساتھ ہی باہر نکلی۔

''میں آپ کو ڈراپ کر دوں''۔ اس نے انتہائی سنجیدہ اور کچھ کچھا اکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''شکریہ۔ میرے پاس گاڑی ہے''۔ اپنی اس سے زیادہ تذلیل اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ غصے میں کہتی وہ پارکنگ کی طرف چل پڑی۔

''رابیل''۔ اپنے پیچھے ازلان کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے پاس آچکا تھا۔

''آپ بہت سادہ اور معصوم ہیں اور میں نہیں چاہوں گا کوئی آپ سے آپ کی یہ معصومیت چھین لے۔ شاید ہمیں کبھی نہیں ملنا چاہیے تھا''۔ اس غیر جذباتی انسان کے ان جذباتی لفظوں کو وہ سرے سے نہیں سمجھی تھی۔ وہ اسے کیا کہنا چاہتا تھا، کیا سمجھانا چاہتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس کی طرف قدم بھی ازلان نے بڑھائے تھے اور اب یہ گریز بھی اسی کی جانب سے تھا تو رابیل اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتی۔ یہ شخص وہ پزل تھا جس کے سارے ٹکڑے رابیل تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ وہ خاموش اسے دیکھتی رہی جبکہ ازلان واپس جا چکا تھا۔ رابیل بھی اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی مگر دل اس پل بوجھل ہو رہا تھا۔۔۔ لیکن کیوں؟

☆☆☆

''اوہ میرے اللہ، بابا آپ کو تو تیز بخار ہے؟'' شکیل الدین کمرے میں آیا تو اس کا ننھا وجود بخار میں بری طرح تپ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گود میں اٹھا لیا اور پاس پڑا پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔ ایک ہی گھونٹ میں اس نے پورا گلاس ختم کر دیا۔

''بابا وہ نئی ماما''۔ خشک لبوں پہ زبان پھیرتے وہ خوف سے بولا۔

''کیا کہا نئی ماما نے''۔ شکیل الدین نے کریدا۔ ضوفشاں کا رویہ اس سے چھپا ہوا تو تھا نہیں۔ بس ایک وہی تھا جو دل سے ہمایوں بخت کا وفادار تھا اور جسے آج تک ضوفشاں خرید نہ سکی تھی لیکن اس کی غربت اتنا بڑا جرم تھی کہ وہ کچھ بھی کہتا الزام اسی پہ آتا۔

''کل رات۔۔۔۔ وہ پاپا کے کمرے میں۔۔۔۔ انکل''۔ یہاں وہاں دیکھتے بچہ سہمے ہوئے انداز میں بولا پر ضوفشاں کو دروازے پہ دیکھ کر آگے کچھ بھی کہہ نہ پایا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ اور تم اب تک اسکول کے لیے تیار کیوں نہیں ہوئے؟'' تیز لہجے میں کہتی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''بیگم صاحبہ بابا کو تیز بخار ہے''۔ شکیل الدین گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بابا ٹھیک ہی کب ہوتا ہے۔ روز کوئی نا کوئی مصیبت ڈالی ہوتی ہے۔ سب اس کے اسکول نہ جانے کے بہانے ہیں''۔ طنزیہ لہجے میں کہتی وہ اسے بری طرح گھور رہی تھی۔ بچے کا تو سانس خشک ہو گیا۔

''تم نکلو یہاں سے میں خود دیکھتی ہوں اسے''۔ شکیل الدین سر جھکائے باہر چلا گیا۔

''کیا بکواس کر رہا تھا اس بڈھے کو۔'' ضوفشاں نے اس کا کان مروڑا۔ وہ تلملایا۔

''زمین سے اگا نہیں ہو، بونا اور تانگ جھانک شروع کر دی۔ تیرا تو وہ حال کروں گی کبھی دوبارہ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔'' اسے بازو سے گھسیٹتی وہ باورچی خانے میں لے گئی جہاں گرما گرم چمٹے سے اس کی کمر دہکاتے اس کا دل ایک بار بھی نہیں کانپا۔ کمر کی کھال جھلسنے پہ بچہ بلک بلک کر روتا فریاد کر رہا تھا لیکن اس ظالم عورت پہ ہرگز اثر نہ ہوا۔

☆☆☆

ہوٹل سے نکل کر وہ سیدھا ریس کورس چلا آیا تھا۔ اے سی گاڑی سے نکل کر پگڈنڈی تک جاتے گرم ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ لباس جگہ سے میل نہیں کھاتا تھا پر اپنی فرسٹریشن نکالنے کی اس سے بہتر جگہ اس کے پاس نہیں تھی۔ ٹریک پہ سرپٹ دوڑتے اس نے خود کو کوسا۔ کتنا غلط کرنے جا رہا تھا وہ۔ اپنی کم مائیگی کا بدلہ کسی ایسے انسان سے لینا جو ہرگز اس کا قصوروار نہ ہو کہاں کی دانش مندی تھی۔ پر ازلان خبیب شاہ عقل مند تھا بھی کہاں۔ وہ اگر عقل والا ہوتا تو آج تک ماضی میں نہ جی رہا ہوتا۔ درد کو کلیجے سے لگائے کانٹوں پہ نہ چلتا۔ زندگی نے اس سے اگر بہت کچھ چھین لیا تھا تو بے تحاشہ لوٹایا بھی تو تھا۔ پھر بھی وہ اپنی اذیت سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں سے زخم کھا کر وہ گرتا پڑتا بہت دور نکل آیا تھا لیکن آج بھی اس تکلیف کے ساتھ زندہ تھا تو یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ رابیل ہو یا کوئی اور وہ عورتوں سے شدید نفرت کرتا تھا تو یہ اس کی چوائس تھی۔ رابیل اس کی مجرم نہیں تھی۔

''اپنے جنون میں بہت برا کرنے جا رہا تھا میں اس کے ساتھ۔ میرے جیسے ادھورے انسان کو کوئی حق نہیں پہنچتا اپنے زخموں کا بدلہ کسی ایسے انسان سے لے جو میرے درد کی وجہ نہیں۔''

وہ اسے تکلیف پہنچانے کا سوچ رہا تھا پر وہ ایسا کر نہیں پایا تھا۔ اس سے خوشیاں چھینی گئی تھیں لیکن وہ رابیل کی خوشیاں چھین نہیں سکتا تھا اور شاید وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ خود سے اعتراف کرنا مشکل تھا۔۔ بہت مشکل۔ کیونکہ اعتراف پتھریلی چٹانوں پہ برہنہ پا چلاتا ہے۔ صحرا میں دودھ کی نہر کھدواتا ہے۔ گیروا لباس پہن کر خیرات منگواتا ہے۔ کچے گھڑے پہ چناب پار کراتا ہے۔ یہ عشق آساں نہیں ہوتا اس کے لیے بڑی قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

''رابیل''۔ سکندر حسین کمرے میں داخل ہوئے تو وہ صوفہ پہ پاؤں لپیٹے سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔

''جی بابا۔۔ جی''۔ اس نے سر اٹھایا۔

''کیا ہوا یہ سورج آج مغرب سے طلوع ہوا تھا کیا۔ تم گھر میں ہو اور اتنی خاموشی''۔ وہ متفکر ہوئے۔

''اچھا آپ کا کہنے کا مطلب ہے گھر میں شور میری وجہ سے ہوتا ہے''۔ مسکراتے ہوئے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔ بابا کو نہیں بتاؤ گی''۔ اس کے پاس بیٹھتے انہوں نے محبت سے سوال کیا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں''۔ حالانکہ مسئلہ نہیں مسائل تھے پر اس نے بات گول کرنا چاہی۔

''تو پھر یہ چہرے پہ بارہ کیوں بجے ہیں''۔ وہ اسے اس سے بہتر سمجھتے تھے۔ وہ کبھی اتنی خاموش اور سنجیدہ نہیں رہتی تھی۔

''بابا وہ ڈاکٹر عاصم ہیں نا۔۔۔ انہوں نے مجھے پرپوز کیا ہے''۔ ان کے زور دینے پہ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں تو اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ اس بے چارے کے کون سے سارے پیچ کسے ہوئے ہیں''۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اسے غصہ آجاتا پر اب تو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ ایک ازلان والا معاملہ بھی آج کیا کم ٹینشن والا تھا کہ عاصم نے نیا کھاتہ کھول دیا۔ رابیل نے اسے ایک دوست کے سوا کبھی

کچھ نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک غیر متوقع بات تھی جس نے اسے واقعی بوکھلا دیا تھا۔ انکار کرتی تو دوستی اثر انداز ہوتی اقرار پہ دل نہیں مانتا تھا۔

"ویسے میرے حساب سے خاصا معقول انسان ہے اور ہمارا دیکھا بھالا بھی ہے۔ رشتہ قبول کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں"۔ سکندر حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن بابا۔۔۔۔" رابیل نے احتجاج کرنا چاہا۔

"کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو"۔ سکندر حسین بات کو گھما پھرا کر کرنے والوں میں سے نہیں تھے اور یہی صاف گوئی وہ اپنے بچوں سے بھی چاہتے تھے۔

"میں بس ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی" ۔رابیل نے نظریں چرائیں۔

"دیکھو رابیل میں ان والدین کے سخت خلاف ہوں جو اولاد پہ اپنی مرضی حکم کی طرح نافذ کر کے ان کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے راستے بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میں تم دونوں کو اتنا کچھ تو سکھا ہی چکا ہوں کہ زندگی میں اپنے لیے فیصلہ لیتے تم کنفیوز نہ ہو۔ دوسرے مروت میں آ کر جھوٹ بولنا یا اپنی مرضی کے خلاف زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کانٹوں پہ چلنا پڑتا ہے۔ آسان راستہ ہمیشہ سچ کا ہوتا ہے۔ سیدھا اور کھرا۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد تم جو چاہو گی اور جیسے چاہو گی میں تمہارے ساتھ ہوں"۔ کتنی آسانی سے وہ اسے دریا پار کرا گئے تھے۔

"تھینکس بابا۔ آپ نے سچ میں میرا مسئلہ حل کر دیا ورنہ میں یہی پریشان ہو رہی تھی ڈاکٹر عاصم کو انکار کیسے کروں۔ وہ میرے بہت پرانے اور بہت اچھے دوست ہیں، میں چاہتی ہوں ہمارے درمیان یہ تقدس قائم رہے"۔ اگر والدین بچوں کے دوست بن کر ان کے مسائل کو سمجھیں اور پھر ان کی جگہ خود کو رکھ کر مشورہ دیں تو آدھے مسئلے تو یونہی نبٹ جاتے ہیں۔ وہ بھی فیصلہ کر چکی تھی اور اب واقعی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

"چلو یہ معاملہ حل ہوا۔ اب اس کے متعلق کب بتاؤ گی؟" رابیل کی طرف بغور دیکھتے انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کی شاید ضرورت نہ پڑے"۔ رابیل نے لب کاٹتے سر جھکایا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی تھی۔ روح بے چین ہوئی تھی پر اس نے لب بھینچ لیے۔

☆☆☆

اس کی جرمنی سے آمد ایک ہفتہ تاخیر سے ہوئی تھی۔ اس دوران ضوفشاں اور سفیان کو من مانی کرنے کا بھرپور موقع مل گیا تھا۔ باپ کو دیکھ کر اسے ملتے ہوئے بچہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا جسے ضوفشاں نے اس کی طویل غیر موجودگی سے کور کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال بچے کی گرتی ہوئی صحت اور اس کا کم صم انداز اسے چونکا گیا تھا تو دوسری طرف شکیل الدین کا اچانک غائب ہو جانا بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"میرے کئی بار ٹوکنے کے باوجود شکیل الدین اس معصوم سے ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا۔ وہ تو بھلا ہو سفیان کا جو اس نے دیکھ لیا اور لگائیں دو تو بھاگ گیا خبیث"۔ اداکاری تو یوں بھی اس پہ ختم تھی۔ لہجے میں درد، آنکھوں میں آنسو لائے ہمایوں کے پاس بیٹھی وہ مکاری سے بولی۔

"کمال ہے، ایسا تو نہیں لگتا تھا۔ سالہا سال سے میرے اعتبار کا آدمی تھا"۔ ہمایوں بخت کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا اتنا پرانا ملازم اس کے بیٹے کے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک کرتا ہو گا پر وہ دونوں جس اعتماد سے جھوٹ بول رہے تھے اس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"آپ نے کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے رکھی تھی اسے، ملازم یونہی تو من مانی نہیں کرتے نا اور میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔ پیٹھ دیکھیں اس کی کیسے ظالم نے برا حال کیا ہے میرے معصوم بچے کا"۔ ضوفشاں نے برا سا منہ بناتے بچے کی قمیص سے کپڑا اٹھایا جہاں جلنے کے نشانات نمایاں تھے۔ نرم جلد بری

طرح جھلسی ہوئی تھی۔
"مار پیٹ کرنے کی بجائے سیدھا پولیس میں دینا چاہیے تھا اسے باقی میں خود دیکھ لیتا"۔ ہمایوں بخت کا غصے سے برا حال ہوگیا۔ اس کا تو اب بس نہیں چل رہا تھا شکیل الدین اس کے سامنے ہوتا تو وہ اسے لمبی چوڑی سزا دلواتا۔ بچہ گم صم سا باپ سے چمٹا کن انکھیوں سے اپنے مجرموں کو دیکھتا رہا۔
"بھائی جان میں بھی یہی کرنے والا تھا۔ وہ قصائی موقع ملتے ہی فرار ہوگیا"۔ سفیان میسنے انداز میں بولا۔ ہمایوں بخت اس سے زیادہ مزید کیا ردعمل دکھاتا۔ اسے تو بس اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی غفلت اور ملازموں پہ ضرورت سے زیادہ بھروسا کرنے کا خمیازہ اس کے بیٹے کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ سفیان اور ضوفشاں اب مطمئن تھے کیونکہ ان کی بات پہ ہمایوں یقین کر چکا تھا اور انہیں کیا چاہیے تھا۔ تکمیل کے مرحلے پہ پہنچ کر ان کا پلان ناکام ہو جائے ایسا انہوں نے کہا سوچا تھا لہٰذا اس کی زباں بندی نہایت ضروری تھی۔ بچے کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنا کر اسے ڈرا دھمکا دیا گیا تھا۔ ضوفشاں کی ویسے بھی اس پہ کڑی نگاہ تھی مگر شکیل الدین بھی اب ضرورت سے زیادہ جان چکا تھا۔ وہ فقط زبان بندی تک محدود نہ رہ پاتا اسے راستے سے ہٹانا نہایت ضروری تھا اور سفیان شوکت نے اسے ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی تھی الٹا اس غریب پہ چوری اور تشدد جیسے گھناؤنے الزام لگا کر اس کی کردار کشی کی گئی تھی۔ بگڑی ہوئی گیم ایک بار پھر ان دونوں کے ہاتھ میں آچکی تھی۔

☆☆☆

رابیل اور اس کی ملاقات کو کئی ماہ بیت گئے تھے۔ دوبارہ اس نے پلٹ کر دیکھا نہ رابیل نے ہی کبھی رابطہ کیا۔ جنوں کی طرح محبت پہ بھی بند باندھے ازلان وہی تکی بندھی زندگی گزار رہا تھا۔ رابیل سے تعلق کی ڈور جڑ کر بھی نہ جڑ پائی تھی اس کا ملال اپنی جگہ پر وہ اس کے قابل نہیں یہ اطمینان اس کی بے چینی کو قرار دیتا تھا۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات ایک اتفاق، ایک حادثہ تھا اور دل میں خواہش پیدا ہوتی کاش کبھی اچانک اتفاق سے ہی اس سے دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ ویسے تو ازلان پہلے کی طرح اتفاق پلان کر سکتا تھا پر وہ اب ایسا چاہتا نہیں تھا۔
چھٹی کا دن تھا۔ وہ گھر پہ ہی موجود تھا۔ لاؤنج میں آیا تو مسز شاہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔ نیوز چینل لگا تھا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کر انہوں نے ریموٹ سے والیم آہستہ کیا۔ وہ ٹی وی بہت کم دیکھتا تھا سوائے بزنس نیوز کے اسے باقی کسی بات میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ باقی حالات حاضرہ کا پتا تو اخبار اور انٹرنیٹ سے چل جاتا تھا۔
"یہ بھی عجیب سلسلہ چل نکلا ہے۔ سب کام چھوڑ کر دھرنوں کے ذریعے مطالبات منوانے کا یہ بھلا کون سا طریقہ ہے۔ کون کہے گا یہ ہمارا ٹاپ پروفیشنل طبقہ ہے"۔ تنخواہوں میں اضافے سے متعلق ڈاکٹروں کی ہڑتال کی فوٹیج ٹی وی پہ دکھائی جا رہی تھی۔ بینر اور پوسٹر اٹھائے بہت سے لوگ اسکرین پہ نظر آ رہے تھے۔ ان کی بات پہ ازلان نے اسکرین پہ نگاہ کی۔ انہوں نے ٹی وی آف کرنا چاہا۔
"رابیل...." وہ آنکھیں سکیڑے حیرت سے بولا۔ مسز شاہ کا ہاتھ تھم گیا۔
"کون رابیل... تم ان میں سے کسی کو پرسنلی جانتے ہو"۔ ان کے سوال پہ وہ لب کاٹتے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ازلان کہاں جا رہے ہو میری بات تو سنو"۔ انہیں کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا وہ پیچھے سر پکڑ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ ضرورت سے زیادہ محتاط انسان تھا ڈرائیو بھی احتیاط سے کرتا تھا لیکن آج وہ اپنے ہی قاعدے کے الٹ بے تحاشا تیز گاڑی دوڑاتا اس کے گھر پہنچا تھا۔ وہ سب لائیو نہیں تھا اور رابیل اس وقت اپنے گھر پہ ہی تھی۔ اسے کال کر کے باہر بلایا

گیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ اکھڑے ہوئے موڈ کے ساتھ اس نے اسے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ رابیل کے لیے یہ مزید حیرانی کی بات تھی۔ بہرحال وہ گاڑی تک اس کے ساتھ چلی آئی۔ جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھی ازلان نے کار چلادی۔

''میں تمہیں ایک سلجھی ہوئی عقل مند انسان تصور کرتا تھا''۔ ڈرائیو کرتے اس نے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا میں بے وقوف ہوں''۔ رابیل کو اس کا انداز سلگا گیا تھا۔

''حرکتیں تو کچھ ایسی ہی کر رہی ہو''۔ وہ مزید تپا۔

''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر شاہ'' ۔رابیل نے ٹوکا۔

''اور جو تم کر رہی ہو وہ سب تو بالکل ٹھیک ہے''۔ اس طنز کا مفہوم وہ اب تک نہیں سمجھ پائی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے''۔ اس نے باقاعدہ احتجاج کیا۔

''سڑکوں پہ بینر اٹھا کر ٹکے ٹکے کے لوگوں کے سامنے اپنا تماشا بنوانا اور پوری دنیا میں اپنے پروفیشن اور اپنے ملک کی رسوائی کرنا تو انتہائی قابلِ تحسین عمل ہے انفیکٹ اس پہ تو کھڑے ہو کر تالیاں بجانی چاہئیں''۔ پتا نہیں اسے کیوں اتنا غصہ آرہا تھا۔ رابیل کو اس حق جتانے پہ حیرت ہوئی۔

''آپ تصویر کا فقط ایک رخ دیکھ کر رائے دے رہے ہیں۔ آپ کو احساس ہی نہیں ان مسائل کا جو ہم برداشت کرتے ہیں اور بدلے میں ہمیں ملتا کیا ہے''۔ رابیل نے دفاع کیا۔ ازلان طنزیہ ہنسا۔ گاڑی اب ریس کورس کی پارکنگ میں پارک ہو چکی تھی۔

''تو کیا بس ایک یہی واحد راستہ ہے۔ تم عورتوں کا مسئلہ ہی یہ ہے۔ عقل سے پیدل ہوتی ہو سب کی سب اور خود کو عقلِ کل سمجھتی ہو۔ معاشرے نے آزادی کیا دے دی اپنا تقدس، اپنی حیا چھوڑ کر سڑکوں تک پہنچ گئی ہو بھلے گھر میں باپ بھائی کا سر شرم سے جھک ہی کیوں نہ جائے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی عورت کے پاس اگر حیا نہ رہے تو باقی کچھ نہیں بچتا''۔ ازلان بس کہتا چلا گیا۔

''آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے ایسی بات کرنے والے۔ اور کیا بے حیائی کر رہی تھی میں بتائیں۔۔۔۔ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا کوئی غلط بات نہیں''۔ ٹریک پہ وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلتے جارہے تھے۔ رابیل نے دفاع کیا پر ازلان متفق نہ تھا۔

''آواز اٹھانا غلط نہیں یہ انداز غلط ہے اور میں تمہیں اس طرح سڑکوں پہ تماشا لگانے کی اجازت نہیں دوں گا''۔ وہ انتہائی سنجیدہ اور دوٹوک بولا۔

''آپ کا مسئلہ کیا ہے اور آپ ہوتے کون ہیں مجھ پہ یہ دھونس جمانے والے۔ میں جو مرضی کروں جیسے مرضی زندگی گزاروں آپ کا مجھ سے کیا تعلق؟'' چلتے چلتے رابیل ایک دم اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ سینے پہ ہاتھ باندھے اس نے ناراض لہجے میں پوچھا تو ازلان یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ چند پل خاموشی کے گزرے۔ اس کی خود پہ جمی نگاہوں سے پریشان رابیل نے نظریں جھکا دیں۔

''یہ تو تم اپنے دل سے پوچھو رابیل جواب وہی آئے گا جو اس پل میری آنکھوں میں ہے۔ آئی لو یو ڈیم اٹ اور میں اس طرح تمہیں خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا''۔ اس کا ہاتھ تھامتے ازلان دھیمے لہجے میں بولا تو رابیل کی سانسیں تھم گئیں۔ یہ انکشاف ناقابلِ یقین تھا۔ کبھی کبھی ہوتا وہ یونہی سن رہ جاتی جیسے آج اور ابھی ہوئی تھی۔

''تو پھر مت چھوڑیں۔۔۔۔'' بھوری آنکھوں نے سیاہ آنکھوں میں دیکھتے فرمائش کی اور اس کے آگے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ لفظوں کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ خاموشی ہمکلام تھی۔ خزاں میں بہار کا منظر بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

اسے بھولنا آسان نہ تھا پر بھولنا تو کچھ بھی

آسان نہیں ہوتا اور ازلان تو یوں بھی مشکل پسند تھا۔ مشکلوں کے ساتھ جینا اس کی فطرت تھی تو یہ مشکل بھی سینے سے لگالی۔ اس عام سی لڑکی نے بڑی خاص جگہ بنائی تھی ازلان کے دل میں جو اتنی آسانی سے تو بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے چاہنے لگا تھا اور آج اسے ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ کر وہ خود کو اظہار سے روک نہیں پایا تھا۔ رابیل سے کہہ چکا تھا تو پھر ان سے کہنا کون سا مشکل تھا۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ آخر میری زندگی میں بھی وہ دن آ ہی گیا جس کا مجھے کب سے انتظار تھا۔ ویسے مجھے یقین ہے وہ لڑکی بہت خاص ہوگی جس نے میرے بیٹے کے دل کے بند دروازوں کو کھول لیا''۔ حسب توقع وہ خوشی سے نہال ہوگئی تھیں۔

''بس اب جلد سے جلد میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ کل ہی اس کے گھر والوں سے مل کر تمہارے رشتہ کی بات کرتی ہوں''۔ ان کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔ جب وہ مان چکا تھا تو پھر انہیں کون روک سکتا تھا۔ بس اب وہ جلد از جلد اپنی بہو کو گھر لانا چاہتی تھیں۔

''میں رابیل سے شادی کا فیصلہ کر تو چکا ہوں پر یہ سوچ کر خوف بھی آرہا ہے کہ میں یہ تعلق نبھا پاؤں گا یا نہیں''۔ ازلان کی الجھن سے وہ اب بھی ناواقف تھیں۔

''خود کو انڈر اسٹیمیٹ کرنا چھوڑ دو ازلان۔۔۔ تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تم ہر رشتہ بخوبی نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہو اور ہر طرح سے لائق ہو۔ زندگی میں خوشیوں کو تم سے زیادہ شاید ہی کوئی دوسرا ڈیزرو کرتا ہے''۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ اسے رسانیت سے سمجھایا۔

''میرا دل نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہے۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے محبت میرے اختیار میں نہیں۔ میری طاقت، میرا کنٹرول ایک لڑکی کی محبت میں مجھے بیس سال پہلے والی کیفیت میں لے گیا۔ میں اس وقت بھی بے بس تھا میں آج بھی بے بسی کی انتہا پہ ہوں''۔ بس ایک وہی تھیں جن کے سامنے وہ کھلی کتاب تھا۔ جو بنا کہے بھی سب جانتی تھیں۔ ان سے بڑھ کر اس کا راز داں اور کون تھا۔ آج اگر وہ کچھ تھا تو انہی کی بدولت۔ ان سے اپنے دل کا حال کہنا اس لیے بھی مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ اسے اس سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔

''اسی کو قسمت کہتے ہیں۔ جو ہو چکا وہ مقدر میں ایسے ہی لکھا تھا۔ جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو کیونکہ یہ تمہاری تقدیر میں ہے اور میری ایک بات یاد رکھنا ازلان، ہماری تقدیر بنانے والا ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ برے کو بھول کر اچھے کی طرف دیکھو۔ میری دعا ہے تم رابیل کے ساتھ بہت خوش رہو گے''۔ وہ محبت سے سمجھاتی رہیں۔

''لیکن کیا وہ بھی میرے ساتھ خوش رہ پائے گی؟'' اس پل وہ انہیں بہت معصوم لگا تھا جو یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کر رہا تھا۔

''تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہو گے''۔ انہوں نے یقین دلایا۔

☆☆☆

رابیل کے لیے ازلان طیب شاہ کا رشتہ آنا شگفتہ بیگم کو بوکھلا گیا تھا۔ البتہ مزینہ بے تحاشا خوش تھی۔ ازلان میں رابیل کی دلچسپی اس کے علم میں تھی اور شاید سکندر حسین کو بھی اس بات کا اندازہ تھا۔ رابیل کے مزاج کے اتار چڑھاؤ اور اس کی خاموشی ان سے چھپی ہوئی تو تھی نہیں۔

''میری تو سمجھ سے باہر ہے یہ سب''۔ شگفتہ بیگم کو اس رشتے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''تو اس میں آپ کی سمجھ کا قصور ہے ورنہ بات تو شیشے کی طرح صاف ہے''۔ سکندر حسین نے بے ساختہ ٹوکا۔

''شادی بیاہ اپنے برابر کے لوگوں میں ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے اور ہمارے کلاس ڈفرنس میں زمین آسمان کا فرق ہے''۔ ان کی بات بھی

مناسب تھی۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی تھیں اور انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل بہت عزیز تھا۔

"تخلیق کائنات سے یہ زمین اور آسمان یونہی نظام کائنات کا حصہ ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زمین تو تھی پر آسمان غائب ہو گیا"۔ سکندر حسین بھی ڈٹ گئے۔ رابیل اور مزینہ خاموش تھیں۔

"کائنات کا حصہ ضرور ہیں لیکن کبھی ملے نہیں اور قیامت تک مل نہیں پائیں گے"۔ شگفتہ بیگم کی بات پہ رابیل نے لب کاٹے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"شگفتہ بیگم اپنی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھیں اور یہ بات اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیں۔" سکندر حسین نے ایک نظر رابیل کے اداس چہرے کو دیکھا۔ رابیل نے سر جھکا لیا۔

"پھر بھی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ وہ بہت اونچا گھرانہ ہے ہمارا ان کا کیا مقابلہ"۔ شگفتہ بیگم نے پسپائی اختیار کی بہرحال اس کی خوشی تو انہیں بھی عزیز تھی۔

"کوئی کشتی نہیں لڑنی ہم نے بیٹی بیاہنی ہے۔" سکندر حسین تلملا کر بولے۔

"رابیل کی شادی وہاں ہو گی جہاں وہ چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ یا میں اس پہ بالکل کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ فیصلہ ہو چکا"۔ آخری فیصلہ تو بہرحال ان کا ہی ہونا تھا جو وہ کر چکے تھے اب اس سے آگے شگفتہ بیگم بھی خاموش ہو گئیں۔ مزینہ نے چہک کر رابیل کو گلے لگا لیا جو بابا کی طرف دیکھتی دھیما سا مسکرائی تھی۔

☆☆☆

وہ دسمبر کی ایک خنک رات تھی۔ شام سے ہی آسمان پہ گہرے بادل چھائے تھے اور اب موسلادھار مینہ برس رہا تھا۔ کھڑکیوں کے مہین ریشمی پردوں سے تواتر سے برستی بارش کی بوچھاڑ اور بجلی کی چمک جھانکتی دل میں ہلچل مچاتی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور سیاہ لباس میں ملبوس وہ اپنی ازلی سنجیدگی اور وقار سے چلتا آبنوسی پلنگ تک پہنچا جہاں سرخ کامدار قیمتی لباس میں سر جھکائے رابیل بیٹھی تھی۔ ازلان کے قدموں کی آہٹ اپنے قریب پا کر رابیل کی گھنی پلکوں میں ارتعاش ہوا۔ کوٹ کے بٹن کھولتا وہ اس کے بالکل سامنے جا بیٹھا۔ رابیل نے نظریں نہیں اٹھائیں۔ اس کی گود میں دھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے کچھ دیر وہ اس کی مہندی لگی ہتھیلی کو دیکھتا رہا اور پھر ایک ہیروں جڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی۔ رابیل محتاط سی اب بھی اسے دیکھنے سے گریزاں تھی۔ اپنے ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی پہ دائرے بناتے وہ اب بھی خاموش تھا جیسے گہری سوچ کے حصار میں ہو۔ ایک گہرا سانس لیتے اس نے رابیل کی انگوٹھی کو لبوں سے چھوا۔ وہ کچھ اور چونکی ہوئی۔ ازلان اب اس کے جھکے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ سجا سنورا دلکش روپ دل میں اترتا روح پہ دستک دے رہا تھا۔ بے اختیار اس نے رابیل کی سنہری بندیا کو چھوا۔ اسے درست کرتے ماتھے پہ جمایا۔ انگلی پہ اس کی آوارہ لٹ کو گھماتے وہ بدستور رابیل کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی قربت کا احساس رابیل کو بے اختیار کر رہا تھا۔ آنکھیں بھینچے اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ ازلان نے ہاتھ کھینچ لیا۔ رابیل منتظر تھی پر وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ اچانک وہ تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پہ چونک کر رابیل نے آنکھیں کھولیں۔ وہ تنہا تھی۔ ازلان جا چکا تھا۔

☆☆☆

شکیل الدین کی موت کے بعد ایک بار پھر وہ دونوں تسلی سے اپنے کام میں جت گئے تھے۔ معاملہ کنٹرول میں تھا اور اب اگلا مرحلہ تھا ہمایوں بخت کو راستے سے ہٹانا اور اس کی دولت جائداد پہ قبضہ کرنا۔ گھر پہ ضوفشاں اور دفتر میں سفیان ---- ہمایوں ان کے جال میں برا پھنسا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ انتہائی خاموشی سے ضوفشاں نے ہمایوں کو دودھ میں وہ زہر ملا کر دینا شروع کر دیا تھا جس کے اثرات آہستہ آہستہ اس کی صحت پہ دکھائی دینے لگے تھے۔ جسمانی نقاہت اور تناؤ بڑھتا جا رہا تھا جس کے باعث وہ اکثر

اب دفتر جانے کے بجائے گھر پہ آرام کرتا۔ سفیان سیاہ وسفید کا مالک بنا اس کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر جس بھی کاغذ پہ چاہتا اس کے دستخط حاصل کر لیتا۔ بس اب یہ ہوا کہ ہمایوں کے گھر پر رہنے کی بدولت بچے پہ عتاب کم ہونے لگا تھا لیکن اب ضوفشاں کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بچہ اس کے سائے سے خوف کھاتا تھا۔ کچھ باپ کی بیماری اور اس کے بستر پہ لگنے سے وہ اور بھی ہراساں تھا۔ ڈاکٹر بھی اپنا تھا لہذا ٹیسٹ وغیرہ میں تو سب کلیئر نکلتا پر ہمایوں کی زندگی ہاتھ سے نکلے جا رہی تھی۔ سفیان اب تک تقریباً ہر اس ضروری کاغذ پہ ہمایوں سے دستخط کروا چکا تھا جن کی بدولت پاور آف اٹارنی اس کو منتقل ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو اب اور چاہیے بھی کیا تھا لہذا گھر میں بھی کھل کر ضوفشاں کا کردار سامنے آنے لگا۔ وہ اب کم ہی ہمایوں پہ توجہ دیتی اور جلی کٹی باتوں سے اپنی بھڑاس نکالتی۔ ہمایوں کو افسوس ہوتا پر وہ اسے اپنی مستقل بیماری سے نتھی کرتا پھر بھی اس نے ضوفشاں کے متعلق کوئی منفی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی تھی جب تک خود اس کی تصدیق نہ ہو گئی۔

☆☆☆

وہ رات ان دونوں نے الگ الگ کمروں میں تنہا جاگ کر گزاری تھی۔ رابیل کے لیے ازلان کا رویہ شاکنگ تھا۔ محبت کا دعوا کر کے اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانے والے کا یہ گریز اسے بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تمام رات وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی آخر ایسی کیا وجہ ہوئی کہ وہ کچھ بھی کہے بنا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا حالانکہ وہ جب آیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ صبح تک دماغ سوچوں کے انبار سے شل ہو رہا تھا پر جواب صرف ازلان کے پاس تھا۔ جاگ جاگ کر سر میں درد الگ ہو رہا تھا۔ وہ بیڈ پہ بے ترتیب سی لیٹی تھی۔ کپڑے بھی وہی رات والے پہن رکھے تھے جب کمرے کا دروازہ کھلا اور ازلان اندر آیا۔ رابیل یک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''نیند ٹھیک آئی رات کو؟'' وہ خود بھی رات والے شکن آلودہ لباس میں تھا۔ ٹائی اور کوٹ البتہ غائب تھے۔ آنکھوں کی لالی بے خوابی کی چغلی کھاتی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ لہجہ نارمل تھا پر یہ تو وہی جانتا تھا اندر کیا وحشت برپا ہے۔ رابیل کو حیرت ہوئی۔ تو کیا اپنے اس عجیب وغریب عمل پہ اسے کوئی صفائی نہیں دینی چاہیے تھی۔

''آپ کہاں تھے''؟ رابیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کچھ مصروفیت تھی۔ تم فریش ہو جاؤ ممی ناشتے پہ انتظار کر رہی ہوں گی''۔ بڑا نپا تلا اور دوٹوک انداز تھا۔ رابیل کی مزید کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نا ہوئی کجا شکوہ شکایت کرنا۔ وہ خود اس کی طرف دیکھے بنا واش روم میں گھس گیا۔ تھکے تھکے انداز میں رابیل بستر سے اٹھی اور وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ نئی زندگی کی پہلی صبح اتنی الجھی ہوئی بھی ہو سکتی تھی اس نے کہاں سوچا تھا لیکن شاید یہ تو ابھی شروعات تھی اس مشکل سفر کی جس کا انتخاب رابیل نے انجانے میں کر لیا تھا۔

☆☆☆

ولیمہ کے فنکشن کے بعد رسم کے طور پہ رابیل کو شگفتہ بیگم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ وہاں سے اس کی واپسی دو دن بعد ہوئی تھی۔ ازلان نے ہی اسے اس کے گھر سے رات کے کھانے کے بعد پک کیا تھا۔ آلیو گرین خوبصورت کڑھائی والے قیمتی سوٹ پہ ہلکی سی ڈائمنڈ جیولری پہنے وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔ تمام راستے ازلان کا موڈ نہایت خوش گوار تھا۔ بات چیت زیادہ رابیل ہی کرتی رہی کیونکہ ازلان بہرحال باتوں میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، وہ فطرتاً کم گو تھا جبکہ رابیل کے پاس سنانے کے لیے دنیا جہان کی باتیں تھیں۔ اسے رابیل کو سننا اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی میں اس نئے رنگ کا اضافہ حسین لگ رہا تھا۔ راستے میں اس کی فرمائش پہ آئسکریم اور کافی انجوائے کرنے کے بعد وہ دونوں رات کو کافی دیر سے گھر پہنچے تھے۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی رابیل اپنی جیولری اتار رہی تھی جب اس نے شیشے میں اپنے پیچھے

کھڑے ازلان کو دیکھا اور دھیما سا مسکرائی تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے ازلان نے اپنا قیمتی ونڈ وپن سیاہ کوٹ اتار کر بیڈ پہ پھینکا تھا اور اسی وقت لائٹ چلی گئی۔

''اوہ مائی گاڈ''۔ خوف سے رابیل کی دبی دبی چیخ نکل گئی اور گھبرا کر پلٹتے وہ اپنی پشت پہ کھڑے ازلان سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے سینے پہ سر ٹکائے خوف سے کانپ رہی تھی۔ ازلان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یوں لگا جلتے ہوئے انگارے ہیں جو اسے اندر تک سلگا رہے ہیں۔ وہ شدید اذیت کا شکار تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی اس سے لپٹی رہتی تو یقیناً وہ تکلیف سے مر جاتا۔

''رابیل''۔ بے اختیار ہو کر اس نے اسے خود سے الگ کرتے پیچھے دھکیلا تھا۔

''آوچ''۔ فضا میں رابیل کی سسکی گونجی۔ اگلے ہی پل کمرے میں روشنی ہوگئی تھی۔ چند سیکنڈ لگے تھے ازلان کو خود کو سنبھالنے میں۔ آنکھیں اندھیرے کے بعد روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے رابیل کو دیکھا جو نیچے بیڈ کے پاس گری پڑی تھی اور ہتھیلی سے پیشانی تھام رکھی تھی۔ وہ بے یقینی سے ازلان کو دیکھ رہی تھی جو خود سن کھڑا تھا۔

''آئی ایم سو سوری رابیل''۔ رابیل کی پیشانی سے رستے خون پہ نگاہ پڑی تو ہوش میں آیا تھا۔ نیچے جھک کر اس نے تاسف سے معذرت کرتے اس کا ہاتھ نرمی سے پیشانی سے جدا کیا تھا۔ وہاں اچھا خاصا کٹ گیا تھا جو یقیناً اندھیرے میں بیڈ کے میٹل کونے سے ٹکرانے کے باعث لگا تھا اور جہاں سے اچھا خاصا خون نکل رہا تھا۔

''آئی ڈونٹ مین ٹو ہرٹ یو۔ میں بینڈیج کر دیتا ہوں''۔ شرمندگی سے کہتے اس نے زخم کو ہلکا سا دبایا تاکہ خون رک جائے۔ رابیل نے ایک دم اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی ازلان اتنی سی بات پہ اتنا برا ردعمل کر سکتا ہے۔

''کوئی ضرورت نہیں میں خود کرلوں گی''۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ اپنی ہتھیلی سے آنکھوں کے نم گوشے رگڑتی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''میں معذرت کر رہا ہوں۔ تم اس طرح اچانک میرے قریب۔۔۔۔'' اس نے آگے بڑھ کر صفائی دینا چاہی۔ رابیل دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''اندھیرے سے خوف آتا ہے ورنہ اتنی بے اختیار نہیں کہ اپنی حد قائم نہ کرسکوں اور نہ ہی اتنی گئی گزری ہوں کہ بہانے سے آپ کے قریب آنے کے موقعے تلاش کروں''۔ وہ تنگی سے بولی تھی۔ حالانکہ یہ ایک انتہائی معمولی بات تھی اس رشتے کے آگے جو ان دونوں کے درمیان تھا پھر بھی ازلان نے جس انداز میں اسے جھٹکا تھا رابیل کی انا کو یہ احساسِ توہین نگاہ نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ازلان اپنی صفائی میں کچھ کہتا رابیل پیر پٹختی واش روم میں گھس گئی تھی۔ اپنے احساسِ کم تری کا بدلہ اس نے واش روم کے قیمتی دروازے سے لیا تھا جس کے بند ہونے کی اونچی آواز پہ ازلان نے لب کاٹتے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ ایک خوبصورت شام کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کرنے کے بعد وہ مزید کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

یہ رابیل کی دوسری رات تھی جو اس گھر اور اپنے کمرے میں تنہا گزری تھی۔ ازلان سے اس کی ملاقات صبح ناشتے کی میز پہ ہوئی تھی جس نے بس ایک نگاہ رابیل کے ماتھے پہ لگی بینڈیج کو دیکھا تھا۔ البتہ اس کی ساس پریشانی سے اس کی چوٹ کے متعلق سوال جواب کرتی رہی تھیں۔ رابیل نے بہانہ بنایا کہ اس کا پاؤں واش روم میں پھسل گیا اور دروازے سے ماتھا ٹکرا گیا۔

''یاسر!''۔ ازلان کی حکمیہ آواز پہ سیکورٹی گارڈ محتاط سا دوڑا چلا آیا تھا۔

''کل رات میرے کمرے کی لائٹ کیسے گئی''۔ اس کا لہجہ کافی سخت تھا۔ گھر میں آٹومیٹک جنریٹر موجود تھا جو بجلی کے جاتے ہی چل پڑتا تھا تو یقیناً کوئی

مکینکل مسئلہ تھا۔

"وائر کا ایشو تھا اسی لیے جنریٹر خود سے آن نہیں ہوسکا"۔ گارڈ نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"یہ مسئلہ دوبارہ نہ ہو۔ ٹیکنیشن کو بلاؤ، سیکنڈ بیک اپ ارینج کرو۔ گھر کی روشنی بند نہیں ہونی چاہیے"۔ دوٹوک انداز میں کہتے وہ کچھ کھائے پیے بغیر ناشتے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔ پیچھے رابیل نے ناراضی سے سر جھٹکا۔ کل رات کا منظر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا تھا۔

وہ دفتر آتو گیا تھا پر اس کا دھیان کام میں نہیں تھا۔ صبح سے اب تک وہ آفس بوائے سے لے کر ہارون تک کو بات بے بات ڈانٹ چکا تھا۔ خود کو بارہا اپنے فیصلے پہ کوس چکا تھا جو اس نے رابیل سے شادی کی صورت کیا تھا۔ وہ محبت میں ہارا تھا پر خود سے آج بھی اس کی جنگ جاری تھی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا تھا کہ اپنی خود غرضی میں ایک معصوم لڑکی کی زندگی داؤ پہ لگا بیٹھا تھا۔ جس اذیت میں برسوں سے مبتلا تھا اس میں رابیل کو شامل کرنے کا کیا حق تھا اسے پر یہ دل تھا جس نے بے بس کر دیا تھا ورنہ اذلان شاہ نے تو کبھی مقدر سے بھی مات نہیں کھائی تھی۔

"شِٹ"۔ اپنا باقی کا غصہ اس نے پیپر ویٹ پہ نکالا تھا جو شیشے کی نازک میز کو کرچی کرچی کرتا پوری طاقت سے فرش سے جا ٹکرایا تھا۔

"تم ایک بزدل اور ناکام انسان ہو اذلان شاہ تمہیں کیا حق تھا رابیل کی زندگی تباہ کرنے کا"۔ اپنی مٹھیوں میں بالوں کو جکڑے اس نے خود کو دھتکارہ تھا۔

"اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں میں۔ اسے دیکھتا ہوں تو زندگی حسین لگنے لگتی ہے"۔ دل نے صدا دی تھی۔

"ایسی محبت کس کام کی جو دوسرے کی ذات میں ادھورا پن اور تشنگی چھوڑ جائے۔ خود تو جل رہے اسے بھی اپنے ساتھ اس آگ میں جلانا چاہتے ہو۔ اپنے ساتھ ہوئے ظلم کا بدلہ ظلم اس سے لو شاہ"۔ ضمیر نے جھنجوڑا تھا۔ اس نے بے بسی سے سر کرسی کی پشت پہ ٹکا لیا۔

"میں رابیل کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں اس کے بغیر کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اسے خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔ کبھی نہیں!"۔ آنکھیں موندے اس نے اعتراف کیا تھا۔

☆☆☆

"ڈنر پہ چلیں"؟ وہ گھر پہنچا تو رابیل بالکونی میں تھی۔ وہ اس کے پیچھے وہیں چلا آیا تھا۔ بالکونی سے لان اور ڈرائیو وے صاف نظر آتا تھا یقیناً وہ اس کی گھر آمد سے باخبر تھی۔ اسے نظر انداز کرتے رابیل اب بھی بس سامنے دیکھ رہی تھی۔ اذلان نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"کچھ کہہ رہا ہوں میں"۔ رابیل نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ صلح جو انداز میں مسکرایا تھا۔

"میرا موڈ نہیں"۔ سپاٹ لہجے میں کہتی وہ سائڈ سے نکل کر کمرے کی طرف بڑھی۔

"رابیل میں پوچھ نہیں رہا بتا رہا ہوں اور میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں"۔ اس نے ایک دم اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لہجہ سنجیدہ لیکن دوستانہ تھا۔

"آئی ایم سوری میں آرڈر نہیں لے سکتی"۔ رابیل نے کندھے اچکاتے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"ریکوئسٹ تو ایکسیپٹ کر سکتی ہو (درخواست تو قبول کر سکتی ہو نا)؟" پیشانی کے زخم کو دو انگلیوں سے چھوتے اس نے تاسف سے اس گہرے کٹ کو دیکھا تھا جہاں سے اب بھی ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ پر اب وہ حصہ بینڈیج سے آزاد تھا بلکہ رابیل نے بالوں کی لٹ سے اسے چھپا لیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی بینڈیج کی وجہ سے سب کا دھیان اس کی چوٹ پہ جائے اور سوال و جواب کا سیشن شروع ہو یا پھر وہ اذلان کو مزید شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ صبح بھی وہ اس کی بینڈیج دیکھ کر خاصا شرمندہ نظر آرہا تھا اور رابیل کو تمام دن اس بات کا شدید افسوس رہا تھا کہ اس نے بھی اس کے ساتھ تھوڑی زیادتی کر دی۔ یقیناً اس نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ پر اب جو

وہ منا رہا تھا تو رابیل کو اس پہ انداز لطف دے رہا تھا۔
''کچھ باتوں میں آپ چاہ کر بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اسے میری مجبوری سمجھو یا کمزوری۔ میں دو چیزوں میں آج بھی کنٹرول لیس ہوں''۔ وہ اب اس کی لٹ کو انگلی پہ لپیٹے گہری سوچ میں تھا جیسے اپنی کیفیت سمجھانے کے لیے لفظوں کی تلاش میں ہو۔
''تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دے سکتا۔ میں کوشش کر رہا ہوں جلد خود پہ قابو پالوں لیکن اب تک ہر کوشش ناکام رہی ہے''۔ اس نے رابیل کو سچ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ الجھن ان کی زندگی میں غلط فہمیوں کا آغاز کرے اسے رابیل کو اعتماد میں لینا تھا۔
''جس طرح میں آج تک آپ کو سمجھنے میں ناکام رہی ہوں''۔ اپنی حیرت پہ قابو پاتے رابیل نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''مجھے سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا۔
''یا پھر آپ خود نہیں چاہتے کوئی آپ کو سمجھے؟''
''مجھے سمجھنے کے لیے میری زندگی جینا پڑے گا رابیل اور میری دعا ہے تم پہ ان لمحوں کا سایہ بھی نہ پڑے جس کی بدولت آج میں اس عذاب سے گزر رہا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔
''اذلان ہمارا تعلق اتنا کمزور تو نہیں کہ آپ مجھ پہ اعتبار نہ کرسکیں''۔ رابیل کا انداز شکوہ لیے تھا۔
''میری بات ابھی ادھوری ہے رابی، تم میری دوسری کمزوری کے متعلق جاننا نہیں چاہتیں''۔ رابیل نے لب کاٹتے اثبات میں سر ہلایا۔
''وہ تم ہو۔'' اذلان نے دائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو تھامے رابیل کا چہرہ اونچا کیا۔
''میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں، تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کیا تمہیں میری بات پہ اعتبار ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔
''آپ نہ بھی کہتے تو اعتبار تھا، ایسے ہی تو آپ کا ساتھ نہیں چنا۔ ایک بات یاد رکھیں اذلان میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں اور آپ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرے لیے آپ کی محبت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔ جب بھی ہاتھ بڑھائیں گے مجھے اپنے ساتھ پائیں گے''۔ رابیل نے اس کا ہاتھ تھامے سنجیدگی سے کہا۔ یہ اقرار ہی اذلان کی روح کو سیراب کرنے کے لیے کافی تھا۔
''اس کے لیے ایک بار پھر سوری''۔ اس نے نرمی سے اس کے ماتھے لگے کٹ پہ بوسہ دیا تھا۔

☆☆☆

دن ہفتوں میں بدل رہے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا سوائے اذلان کے۔ اس کا پل پل بدلتا موڈ رابیل کے لیے دردسر بنا ہوا تھا۔ سب کے سامنے تو وہ اس سے نارمل بات چیت کرتا اور اکثر اکیلے میں بھی ٹھیک ہی ہوتا لیکن وہ رابیل سے آج بھی اتنے ہی فاصلے پہ تھا جتنا شادی کی پہلی رات۔ اذلان کا یہ گریز رابیل کو دن بہ دن ڈپریس کر رہا تھا۔ اچانک وہ اسے بے تحاشا اہمیت دینے لگتا اور اگلے ہی پل اسے بری طرح اگنور کرتا۔ کبھی ساری ساری رات کمرے میں نہ آتا اور جب آتا تو بھی وہاں موجود نہ ہوتا۔ رابیل اس کی غیر موجودگی میں جتنی اذیت سہتی اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف وہ اس کی موجودگی میں برداشت کرتی جب اس سے پیٹھ موڑے وہ رات گزار دیتا۔ آج بھی ایک ویسی ہی رات تھی۔ نیند رابیل کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا ڈپریشن ان دنوں غصے میں بدلنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے اذلان سے وعدہ کیا تھا وہ اس کا ساتھ دے گی، اس کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس سے بھی شکایت نہیں کرے گی اور وہ اپنا وعدہ نبھا رہی تھی۔
کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے وہ بے مقصد سیاہ آسمان کو گھور رہی تھی ساتھ ہی ساتھ اپنی اذلان کی زندگی میں حیثیت اور اہمیت کے متعلق سوچ رہی تھی۔
''ماما پلیز مجھے مت ماریں۔ ماما مجھے بہت درد ہو رہا ہے''۔ اذلان کی آواز پہ چونک کر رابیل نے پیچھے دیکھا۔

"ماما نہیں۔۔۔جل رہا ہے۔" اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ دھیمی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

"اذلان"۔ رابیل تیز قدموں سے چلتی اس کے پاس چلی آئی۔

"میں جل رہا ہوں ماما"۔ اس کے چہرے پہ کرب تھا۔ سرد رات میں وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

"اذلان اٹھیں"۔ رابیل نے ایک دم گھبرا کر اسے جھنجوڑا۔

"نہیں"۔ وہ چلایا۔ آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ شاید وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

"اذلان پلیز اٹھیں"۔ رابیل نے التجا کی۔

"تم؟" اذلان نے آنکھیں کھولیں اور بے یقینی سے پاس بیٹھی رابیل کو دیکھا جو متفکر چہرے سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

"آپ شاید خواب دیکھ رہے تھے"۔ وہ اب بھی چت لیٹا خالی نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہا۔

"ہاں۔۔۔شاید خواب ہی تھا"۔ وہ بے یقینی سے بولا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" رابیل دھیرے دھیرے اس کے نم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں؟" وہ اس کے سوال پہ متحیر تھی پر کوئی ری ایکٹ نہیں کیا۔

"تم سو جاؤ۔۔۔میں ٹھیک ہوں"۔ کچھ پل گزرے اور اذلان کی تیز چلتی سانسیں مدھم ہونے لگیں۔ رابیل کا ہاتھ ہٹا کر اس نے اسے اپنے پہلو میں کھینچ لیا۔ کہنی کے بل لیٹی رابیل اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی جذبہ کھوج رہی تھی۔ وہاں اس پل فقط وحشت تھی۔ تھکاوٹ تھی۔ اضطراب تھا۔

"آپ بھی سونے کی کوشش کریں"۔ آنکھیں موندتے رابیل دھیمے لہجے میں بولی۔ وہ نہیں جانتی تھی ایسے خواب اذلان کو کئی راتیں سونے نہیں دیتے۔ اب بھی اسے جاگ کر صبح کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

کل رات جو کچھ ہوا اس نے رابیل کو صحیح معنوں میں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اذلان کے ساتھ یقیناً کوئی مسئلہ تھا۔ رابیل نے صاف صریحاً اس کی التجائیں سنی تھیں۔ اس کا خوف سے تڑپنا، اس کی بے بسی اور جاگنے کے بعد وہ وحشت و بے یقینی۔ وہ کوئی عام انسان بھی ہوتی تو اس واقعہ کو نظر انداز نہ کر سکتی لیکن وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ بھلے آج تک بیماری کا علاج کیا تھا پر اذلان کے مرض کا کچھ کچھ اندازہ اسے بھی ہو چکا تھا۔ صبح اذلان ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند تھا لیکن اس سے کھنچا کھنچا۔ اس سے نظریں ملائے بغیر وہ آفس چلا گیا تو رابیل کے لیے سوالات کا انبار چھوڑ گیا۔ ایک سرا ہاتھ لگا تھا اسی کے آسرے اسے یہ تھی سلجھانی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ اذلان کی اسٹڈی میں چلی آئی۔ یونہی الٹ پلٹ کرتے اذلان کی دراز سے ایک فائل نکلی جسے دیکھ کر رابیل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تو اس کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔

یہ فائل ڈاکٹر چغتائی کے کلینک کی تھی جس میں اذلان کی چند ماہ پرانی اپائنٹمنٹ کے ساتھ، اینٹی ڈپریسنٹ ادویات کا ایک نسخہ اور ڈاکٹر کا بل موجود تھا۔ ڈاکٹر چغتائی شہر کے مشہور ماہر نفسیات تھے۔ رابیل کے لیے تو ان کا درجہ استاد کا تھا گو وہ ان کی بالواسطہ شاگرد نہ تھی پر ان کی شہرت اور کام سے اچھی طرح واقف تھی۔

دوسری کوئی تفصیل اس فائل میں نہیں تھی۔ سراغ ملا بھی تو ادھورا۔ پر اسے یہ مسئلہ کسی سے تو شیئر کرنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ نغمانہ کے پاس چلی آئی۔ ڈاکٹر چغتائی کے پائے کی نہ سہی پر نغمانہ بھی ماہر نفسیات تھی۔ اس کے پاس جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ رابیل کی نا صرف اچھی دوست تھی بلکہ اس کے لیے نہایت قابل اعتبار بھی تھی۔

سچ کہوں تو مجھے یہ صاف صاف PTS (Post Traumatic Stress) (صدمے کے بعد کا ذہنی دباؤ) کا کیس لگ رہا ہے"۔ ساری بات سننے کے بعد نغمانہ اس نتیجے پہ پہنچی تھی۔

''آر یو شیور؟'' رابیل کے لیے یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

''تم جو علامات بتا رہی ہو۔ اس کا خواب میں ڈرنا، تمہارے ساتھ عجیب و غریب رویہ۔ اور پھر ڈاکٹر چغتائی کی اپائنٹمنٹس۔۔۔ یہ سب کچھ ایسی ہی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔'' نغمانہ نے تفصیلاً بتایا۔

''تمہارا کہنے کا مطلب ازلان نفسیاتی مریض ہے؟'' اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا لیکن تمام حقائق اسی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

''تمہیں بھی تو یہی احساس ہوا نا اسی لیے تو تم میرے پاس آئی ہو''۔ رابیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ سمجھ تو وہ بھی گئی تھی پر دل نہیں مان رہا تھا۔

''کبھی کبھی وہ میرے ساتھ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اتنے لونگ اور کیئرنگ کہ خود پہ رشک آتا ہے لیکن اگلے ہی پل وہ بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں مجھے بے یقینی دکھائی دیتی ہے جیسے انہیں مجھ پہ اعتبار ہی نہیں''۔ یہ سب سہنا جتنا مشکل تھا اسے دہرانا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

''تم خود سوچو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے تم سے اپنی پسند سے شادی کی۔ خود تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا پھر کیوں اتنا وقت گزرنے کے باوجود وہ تمہارے ساتھ تعلق نہیں بنا سکا''۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے اس سے نہ مل رہی ہوتی تو اپنا اتنا انتہائی ذاتی مسئلہ کبھی اس سے نہ کہتی۔

''یہی سب کچھ تو میری الجھن بڑھا رہا ہے۔ خود سے ہاتھ بڑھا کر جھٹک دیا جائے تو اپنا آپ بڑا حقیر لگتا ہے''۔ رابیل نے لب کاٹے۔

''اس بات کو جذباتی ہو کر نہیں سوچو۔ ازلان کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہے اور تم تو خود ایک ڈاکٹر ہو۔ اس کے مسئلے کا منطقی حل تلاش کرو''۔ نغمانہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھتے تسلی دی۔

''تمہیں لگتا ہے ڈاکٹر چغتائی اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں''۔ اسے اچانک خیال آیا تھا۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے اگر وہ ڈائریکٹ ان تک پہنچ جائے تو سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔

''بالکل نہیں۔ ماہر نفسیات اپنے مریضوں کی کوئی بات کسی سے بھی شیئر نہیں کرتے۔ یہ پروفیشنل ایتھکس کا معاملہ ہے''۔ نغمانہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''تو پھر تم بتاؤ اس بات کا کیا حل ہو سکتا ہے۔ میری تو عقل بالکل کام نہیں کر رہی۔ خاص طور پہ کل رات سے۔ ازلان خواب میں اتنی بری طرح چلا رہے تھے اور اس کے بعد تو میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے۔ پہلے بھی دو تین بار ایسا ہو چکا ہے وہ اچانک مجھے اگنور کرنا شروع کر دیتے ہیں''۔ وہ شدید پریشان تھی۔ ایسا کب تک چلے گا۔ اس سے پوچھے بھی تو کیا اور کیسے جواب بھی پتی تلی کرتا تھا۔

''عام طور پر ایسے مریض بداعتمادی کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں پیار اور اعتماد سے ہی ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔ ڈائریکٹ پوچھنے پہ تو شاید وہ تمہیں کچھ بھی نہ بتائے الٹا ردعمل ہی ہوگا''۔ نغمانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر کچھ بتانا ہوتا تو ازلان پہلے ہی اسے بتا چکا تھا۔

''تم نے کہا وہ بار بار اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا۔ تم اپنی ساس سے کیوں بات نہیں کرتیں۔ ان سے پوچھو نا ان کے بیٹے کو کیا مسئلہ ہے''۔ نغمانہ نے ایک نئی راہ سجھائی۔ رابیل کے لیے اندھیرے میں جگنو کی طرح اس وقت تو یہی روشنی بہت تھی۔ اتنے دن میں پہلی بار اس نے کسی اور سے اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔ کچھ نئی باتوں میں ذہن الجھا تو بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے رابیل تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' مسز شاہ گھر میں داخل ہوئیں تو رابیل گم صم سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ ورکنگ لیڈی تھیں اور خاصی مصروف خاتون۔ ایک انٹرنیشنل لیول کی این جی او کی سرپرست تھیں اور ملکی و غیر ملکی بے شمار فلاحی کاموں میں سرگرم۔ ایسے میں گھر سے زیادہ ان کا وقت

دوسرے شہروں اور ملکوں میں گزرتا تھا۔ جب ازلان کا ایکسیڈنٹ ہوا ان دنوں بھی وہ امریکہ ایک چیرٹی پروگرام میں گئی ہوئی تھیں۔ جیسے انہوں نے کبھی ازلان کی ذاتیات میں مداخلت نہیں کی تھی کچھ اسی طرح ازلان بھی ان کی ایکٹیو لائف میں نہیں گھستا تھا۔

"جی ہاں اینڈ تھینکس ٹو یو۔ یہ سب آپ کی بدولت ہے۔" رابیل پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی ان کا لاپروا سا انداز دیکھ کر مزید جل گئی اور خود کو روک نہیں پائی۔

"یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم مجھ سے۔" وہ اس رویے پہ چونکیں۔

"وہی جو آپ ڈیزرو کرتی ہیں۔" اسے ان سے بات تو کرنی ہی تھی تو ابھی کیوں نہیں۔ کل رات سے اس کے کانوں میں ازلان کی التجائیں اس کا کراہنا تازیانے بجا رہا تھا۔ وہ گنگ سی رہ گئیں۔

"کیسی ماں ہیں آپ۔ بظاہر تو بڑی نفیس اور اونچے خیالات والی لگتی ہیں۔ سوشل ورک سے لوگوں کی زندگیوں میں بدلاؤ لانے کا عزم و جنون لیکن اپنے گھر سے بے پروا۔" وہ تیز لہجے میں بولی تو مسز شاہ سلگ کر صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"شٹ اپ۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔" ان کا دماغ گھوم گیا تھا رابیل کی اس بدتمیزی پہ۔

"اور آپ کی حد کیا تھی بیگم آسیہ طیب شاہ۔ اپنی اکلوتی اولاد کو ٹارچر کرنا۔ اس پہ جسمانی تشدد کرنا۔" رابیل نے ہذیانی انداز میں سوال کیا اور ان کا چہرہ پل بھر میں زرد پڑا۔

"ازلان کو خواب میں چلاتے سنا ہے میں نے۔ رو رو کر بھیک مانگ رہے تھے وہ۔۔۔ مما مجھے مت ماریں۔ آپ نے اپنی اولاد کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ کوئی ماں ایسا کیسے کر سکتی ہے اپنے بچے کے ساتھ۔" وہ صوفے پہ گرتی چلی گئیں۔ رابیل کہتی رہی۔

"ٹھیک کہا تم نے رابیل کوئی ماں کیسے کر سکتی ہے اتنا برا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں کوئی عورت کسی بھی بچے کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کر سکتی جو سب ازلان کے ساتھ اس کی سوتیلی ماں کرتی رہی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سوتیلی ماں؟" رابیل چونکی۔

"غلطی میری ہی ہے، تمہیں سب کچھ پہلے بتا دینا چاہیے تھا لیکن میں تو یہی سمجھتی رہی شاید اتنے سالوں کے طویل علاج کے بعد ازلان اس ٹراما سے باہر آچکا ہے۔ تم سے شادی کے بعد تو مجھے پورا یقین تھا وہ اپنے ماضی سے نکل چکا ہوگا لیکن میں غلط تھی۔" یہ کیسا انکشاف تھا جس نے رابیل کے پیروں تلے کی زمین نکال دی تھی۔

"تو کیا ازلان۔" وہ شرمندہ و حیران تھی۔

"ہاں رابیل ازلان میری سگی اولاد نہیں ہے۔" سر جھکائے دھیمی آواز میں انہوں نے رابیل پہ بم پھوڑا تھا۔

☆☆☆

یہ خزاں کی ایک دھند بھری شام تھی۔ ہمایوں کی طبیعت میں بہتری آ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق تو اسے کوئی بیماری نہیں تھی پر جسم دن بہ دن ناکارہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کم ہی اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا پر آج جی گھبرایا تو ہمت کر کے باہر چلا آیا۔ سفیان کے کمرے میں ضوفشاں کی موجودگی کی تصدیق ان دونوں کی آوازوں سے ہوئی تھی۔ غصہ بہت چھوٹی چیز تھی۔ اس کے اندر آتش فشاں ابل رہا تھا۔ دھوکا، تضحیک، ملال۔۔۔ جانے کتنے ہی جذبے اسے پاگل کر رہے تھے۔ اپنی پستول تھامے جنونیوں کی طرح وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ دونوں بے حیائی کی تصویر بنے اس کی ناک کے نیچے اسی کے مال پہ عیاشی کر رہے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس تو اسے ہو ہی چکا تھا پر شاید اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ اسے اچانک دیکھ کر وہ دونوں ایک پل کو چونکے پر اگلے ہی لمحے ڈھٹائی کے سب ریکارڈ توڑ کر ضوفشاں نے جس بے شرمی کا مظاہرہ کیا اس نے خود ہمایوں کا سر شرم سے جھکا دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اس فاحشہ کو جان سے مار دے۔ ہمایوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں جو سیدھی ضوفشاں کی

پسلیوں میں لگیں۔ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکی اور موقع پر ہلاک ہو گئی مگر سفیان نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ ہمایوں کے سامنے پول کھلنا اسے بدحواس کر پایا تھا نہ ضوفشاں کی موت نے اس کے اوسان خطا کیے تھے۔ ہمایوں کے مقابلے میں تو وہ خوب ہٹا کٹا تھا۔ ایک ہی جست میں اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہمایوں کو مغلظات بکتا وہ سیدھا ازلان کے کمرے میں پہنچا۔ بچے نے باپ کو جب سفیان کی گرفت میں دیکھا تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ سب کچھ تو کھل چکا تھا۔ ہمایوں کو اب ایک ہی طریقے سے بلیک میل کیا جا سکتا تھا اور وہ اس کا بیٹا تھا۔ سفیان نے کرسی پہ ہمایوں کو باندھا جو پہلے ہی ادھ موا ہو چکا تھا جبکہ بچہ اب اس کی گرفت میں تھا۔

''میرے بیٹے کو کچھ مت کہنا سفیان، تم جو چاہتے ہو میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں''۔ پستول اب سفیان کے ہاتھ میں تھا اور آٹھ سالہ ازلان اس کی گرفت میں چلا رہا تھا۔ ہمایوں بخت نے التجا کی۔ اس کی سانس بری طرح اکھڑ رہی تھی۔

''تمہارے پاس اب کچھ بچا ہی کہاں ہے ہمایوں بخت۔ سب کچھ حاصل کر چکا ہوں میں جو مجھے چاہیے تھا''۔ سفیان ہنسا۔

''تو پھر چھوڑ دو ازلان کو۔ میری اولاد سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں''۔ اس نے ہاتھ جوڑے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی سب سے قیمتی متاع کو تڑپتے دیکھنا بہت بڑا کرب تھا۔

''دشمنی تو تم سے بھی کوئی نہیں تھی میری۔ بس تمہاری دولت ہی تمہاری دشمن بن گئی اور اب تمہارے اس پلے کی۔ بڑی لمبی چوڑی جائداد اکٹھی کر رکھی ہے اس کے نام پر تم نے''۔ وہ تمسخر سے بولا۔

''کل تک کا وقت دیتا ہوں تمہیں۔ مجھے اس ساری پراپرٹی کا انتقال اپنے نام پہ چاہیے ورنہ اس پلے کا۔۔۔۔''۔ سفیان نے دھمکی دی۔

''ہو جائے گا۔ تم بس میرے بچے کو کچھ مت کہنا''۔ ہمایوں بے ساختہ بولا۔

''گڈ۔ کل تک ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ اس کے بعد تمہیں اپنی لاڈلی بیوی کے قتل کے الزام میں پھانسی بھی تو چڑھنا ہے''۔ پستول کی نالی بچے کی گردن میں چبھوتے اس نے سفاکی سے کہا اور پھر ہمایوں بخت کی کرسی کو ٹھوکر مارتے ازلان کو گھسیٹتا کمرے سے نکل گیا۔ پیچھے ہمایوں بخت تڑپتا رہا۔ خرابی صحت اور حالات دونوں نے ہی اس کی ہمت توڑ دی تھی۔

☆☆☆

انتہائی نگہداشت کے باہر سناٹا چھایا تھا۔ سوئی گرنے کی آواز پہ بھی دل دہل جاتا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ راہداری میں جائے نماز بچھائے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ دھیان اندر کی طرف جاتا تو دل گرفتگی اور بڑھ جاتی۔ زبان پہ ورد دل میں دعا کرتی وہ رنج والم کی تصویر بنی ہر آنے جانے والے کی توجہ بٹور رہی تھی۔ عمر شاید پینتیس کے قریب تھی۔ چہرے پہ بڑھتی عمر سے زیادہ تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ لباس و انداز سے وہ اچھی وضع دار خاتون لگتی تھی۔ بہت حسین نہیں پر سادہ اور معصوم تھی لیکن اس وقت شدید کرب سے دوچار تھی۔ کوئی بھی اس پل بتا سکتا تھا اس کا اندر موجود مریض سے بہت قریبی تعلق تھا۔ وہ کیا بتاتی اندر بستر مرگ پہ پڑے شخص سے اس کی سانسیں جڑی تھیں۔ وہ دروازہ تھا جس کے بغیر گھر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر کو سی سی یو سے نکلتے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مسز طیب سب کچھ تو آپ پہلے سے جانتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ ہے۔ آپریشن کے بعد بھی نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اب تو بس دعا ہی ہے''۔ آسیہ کے سوال پہ ڈاکٹر کا ناامیدی میں ڈوبا جواب آیا تھا۔

''ڈاکٹر ایک لیکن آپ نے تو کہا تھا آپریشن سے بہتری کا امکان ہے''۔ وہ تفکر سے بولی۔

''جی بالکل میں نے کہا تھا ففٹی ففٹی چانسز ہیں لیکن بائی آپسی کے بعد سے اب تک اس کی جڑیں اس تیزی سے پھیلی ہیں کہ اب اگر میں کچھ بھی کرتا تو اپنے

ہاتھوں مریض کو آپریشن ٹیبل پہ ہی ختم کر دیتا"۔ ڈاکٹر نے پہلے کی کہی بات دہرائی۔ آپریشن سے پہلے قوی امید کا دعوا کرنے کے باوجود اس کے شوہر کا آپریشن ناکام ہوا تھا۔ کل رات سے اس کی حالت کچھ ایسی بگڑی کہ سی سی یو وارڈ میں داخل کرنا پڑا۔

"آپ نے امریکن ڈاکٹر اسٹیفن کا ذکر کیا تھا"۔ آسیہ طیب شاہ نے امید بھری نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو اس شہر کا سب سے مہنگا، سب سے قابل سرجن تصور کیا جاتا تھا۔

"مسٹر شاہ کی رپورٹس آپ سے پہلے میں انہیں بھیج چکا ہوں۔ جواب وہاں سے بھی وہی آیا ہے پھر بھی اگر آپ چانس لینا چاہیں تو میں آپ کو روکوں گا نہیں۔ سچ تو یہ ہے پھیپھڑوں کے کینسر کا علاج پاکستان میں بھی اب جدید طریقے سے ہی کیا جا رہا ہے"۔ مایوسی شاید مقدر بن چکی تھی۔

"آئی ایم سوری مسز شاہ"۔ ڈاکٹر کے پاس اب حرف تسلی بھی نہیں تھے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوئی جہاں نالیوں میں جکڑے اس کے محبوب شوہر کا وجود ساکت پڑا تھا۔ وہ بہت دیر وہاں رک نہ سکی کہ جب بھی اسے دیکھتی زار و قطار رونے لگتی اور اندر موجود اسٹاف اسے باہر بھیج دیتے۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے پر نیند کو آنکھوں سے بغاوت کیے تو کئی دن ہو چکے تھے۔ آج بھی وہ سی سی یو کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے جائے نماز پہ سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی اپنی زندگی کا تجزیہ کر رہی تھی۔ طیب شاہ کی دس سالہ رفاقت میں اس نے ایک ایک پل آسودہ گزارا تھا۔ زندگی کو بھرپور انجوائے کیا تھا۔ قدرت نے اسے اولاد کا سکھ نہیں دیا تھا پر طیب شاہ کا ساتھ آسیہ کی اس کمی کو پورا کر گیا تھا۔ وہ اچھے متمول گھرانے کا فرد تھا پر اولاد نہ ہونے کے باوجود اس نے دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں تھا۔ آسیہ کے لیے طیب شاہ زندگی سے بڑھ کر تھا پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو ماہ پہلے طیب شاہ کو پھیپھڑوں کا کینسر تشخیص ہوا۔

فوری علاج اور ڈاکٹروں کی تسلی بخش باتوں کے باوجود آپریشن ناکام رہا۔ اللہ کی رضا کے آگے انسان ایسے ہی بے بس ہو جاتا ہے جیسے آسیہ طیب شاہ ہو گئی تھی۔ وہ تو امریکہ تک علاج کے لیے لے جانے پر راضی تھی لیکن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اگلی صبح اس سے بھی زیادہ دردناک تھی جب طیب شاہ کے کومہ میں جانے کی اطلاع آسیہ کی ہلکی سی امید بھی توڑ چکی تھی۔ یہ بہتر گھنٹے بہت قیمتی تھے۔

☆☆☆

گلفشاں سے سفیان اسے اپنے ساتھ بندی بنا کر لے کر نکلا تھا۔ وہ روتا بلکتا گاڑی میں بیٹھا تھا جبکہ سفیان وقفے وقفے سے اس پہ چیختا چلاتا کبھی دو ہاتھ بھی لگا دیتا۔ سفیان کو پتا تھا ازلان کی بدولت بقیہ جائداد کے کاغذات ہمایوں بخت بہت جلد دے دے گا۔ ضوفشاں کے بغیر بھی اس کا پلان شاندار رہا تھا۔ اس کی محبت میں ضوفشاں اب اتنی قربانی تو دے سکتی تھی۔ اپنی کامیابی پہ نہال ہوتا وہ جوش و خروش سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اتنی تسلی تھی لاغر ہمایوں بخت اپنی اکلوتی اولاد کی جان کی خاطر کبھی پولیس کو انوالو نہیں کرے گا اور وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔ اندھیرے میں تیزی سے موڑ کاٹتے اچانک گاڑی بے قابو ہوئی اور کھائی میں جا گری۔ یہ قسمت تھی کہ گاڑی الٹنے پہ ہاتھ پاؤں مارتا ازلان دروازہ کھلنے سے باہر گر پڑا جبکہ اس سے کچھ فاصلے پہ گاڑی سفیان سمیت دھماکے سے جل کر تباہ ہو گئی۔ خود ازلان شدید زخمی تھا۔ ریسکیو والے حادثے کی جگہ پہنچے تو زخموں سے چور ادھ موئے بچے کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ اسے مقامی اسپتال میں فوری شفٹ کیا گیا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے بچنے کی امید کم تھی پر جہاں انسان کی سوچ ختم ہوتی ہے وہیں قدرت اپنا آپ منواتی ہے۔

ازلان سے آسیہ طیب شاہ کی پہلی ملاقات سی سی یو میں ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے چیختے چلاتے ازلان کی آوازیں آسیہ کا دل دہلا رہی تھیں

''اسٹاف یہ بچہ کس کا ہے۔ بہت چیخ چلا رہا ہے''۔ آسیہ اپنے شوہر کو دیکھنے اندر آئی تو دھیمی آواز میں اسٹاف نرس سے پوچھ بیٹھی۔

''پتا نہیں جی بے چارہ کار ایکسیڈنٹ میں بڑا ہی بری طرح زخمی ہوا ہے۔ اللہ جانے بچے گا بھی یا نہیں''۔ نرس تاسف سے بولی۔

''میں ایک نظر دیکھ سکتی ہوں؟'' اپنے غم کا احساس ہو تو دوسروں کا دکھ بھی محسوس ہوتا ہے آسیہ اجازت پا کر اس سے ملنے چلی گئی۔ بچہ واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کے جسم پہ جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کا خون بہت بہہ چکا تھا مگر اس سب سے بڑھ کر وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ جب بھی ہوش میں آتا چیختا چلاتا اور کسی کو خود کو ہاتھ نہ لگانے دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے بچوں کے وارڈ میں رکھنے کے بجائے سی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا اس کے متعلق فی الوقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ دو روز بعد کوما کی حالت میں طیب شاہ کی موت بجلی بن کر آسیہ پہ گری تھی۔ اپنے غم سے نڈھال اسے وہ زخموں سے چور بچہ بھول چکا تھا جو کسی کے بھی ہاتھ لگانے پہ تڑپ کر چیخ و پکار کرتا اور رو کر التجائیں کرتا تھا۔

☆☆☆

آسیہ پچھلے چند سالوں سے ایک مقامی این جی او سے منسلک تھی جن کے شہر میں اولڈ ہاؤس اور یتیم خانے تھے۔ شاید یہ اولاد کی کمی کو پورا کرنے کا طریقہ تھا وہ ان یتیم بچوں کے پاس چلی جاتی۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ان کو تحائف دینا دل کو سکون دیتا تھا۔ ان دنوں تنہائی کاٹتی تھی اور تنہا رہنے کا عذاب راتوں کو سونے نہ دیتا تھا۔ وہ یتیم خانے چلی آئی جہاں ایک کونے میں گم صم ازلان بیٹھا تھا۔ حادثے کے بعد وہ بالکل خاموش تھا یہاں تک کہ پولیس اور ڈاکٹروں کو بھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔

تحقیقات اور شواہد کی بدولت پولیس نے دلان کا تعلق گلفشاں سے جوڑا۔ یہ بھی ایک دردناک خبر تھی کہ ہمایوں بخت جانبر نہ ہوسکا۔ گھر میں اس کی لاش ضوفشاں کے ساتھ پائی گئی۔ آسیہ نے اس سے بات چیت کی کوشش کی لیکن وہ اس کی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ ازلان سے اسے ہمدردی ہوئی تھی۔ اس نے ازلان کو گود لے لیا۔۔ آسیہ کا خیال تھا پیار اور توجہ سے ازلان کے رویے میں بہتری آئے گی پر یہ اس کی سوچ تھی۔ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا جو سالوں کے علاج اور اس کی پیار و توجہ کے بعد بس اتنا ہی نارمل ہوا کہ بات چیت کرنے لگا۔ پڑھائی کرنے لگا۔ وہ اب بھی کسی سے گھلتا ملتا نہ تھا نہ ہی کسی کو خود کو چھونے دیتا تھا۔

وہ ان کی زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا اور آسیہ کی توجہ اور محبت نے بہر حال اسے کافی حد تک بدلا۔ ازلان ایک بڑی جائداد کا مالک تھا۔ اسی جائداد کی بدولت اس کے دور کے چند رشتے داروں نے اس کی کسٹڈی فائل کی مگر آسیہ کی بے لوث محبت کے باعث عدالت کو ازلان کی کسٹڈی آسیہ کو سونپنی پڑی کیونکہ ایسا خود ازلان چاہتا تھا۔ عدالت اس کا ماہانہ خرچا اس کی بلوغت تک ہر ماہ آسیہ کو دیتی رہی جبکہ اس کی جائداد چند سال بعد اس کے بالغ ہونے پر اسے سونپ دی گئی پر اسے اس جائداد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے ایک بڑا حصہ آسیہ کی این جی او کو چیریٹی کر دیا۔

ماضی آج بھی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے خواب آج بھی اسے اذیت دیتے تھے۔

☆☆☆

رابیل کو اپنے ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔ ازلان کا سچ رابیل تک بڑے تکلیف دہ انداز میں پہنچا تھا۔ آسیہ طیب شاہ کی آنکھیں نم تھیں۔ رابیل نے ان سے معذرت کرنے کے بعد انہیں تسلی دی۔ یہ یقین دلایا کہ وہ ازلان کو ان تکلیف دہ لمحوں سے نکال لے گی جو آج تک اس کے درد کا باعث ہیں لیکن وہ خود بہت الجھ گئی تھی۔ اسے اب اندازہ ہوا ایمرجنسی میں پہلی بار ازلان نے اتنی شدت سے ردعمل کیوں کیا تھا۔ یقیناً وہ اس وقت ایک بار پھر وہی تکلیف محسوس کر رہا ہوگا جو سالوں پہلے اس پرانے

ایکسیڈنٹ کے وقت محسوس کی تھی۔ برسوں کے علاج نے اگر ازلان کو تکلیف اور خوف سے نہیں نکالا تھا تو پھر رابیل تنہا اپنی محبت کے آسرے کیا کر سکتی تھی۔ لیکن نہیں محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے جو بے یقینی کو یقین میں بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔

سچ جان کر وہ اور بھی الجھ گئی تھی۔ دل اتنا گھبرایا کہ گھر چلی آئی۔ یہ فطرت ہے انسان پریشانی کے لمحوں میں ماں باپ کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے۔ ان کی آواز باعثِ سکون ہوتی ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر اطمینان ملتا ہے۔ جو حالات چل رہے تھے تو رابیل بڑے صبر سے بیٹھی تھی کہ ازلان سے شادی کا فیصلہ سراسر اس کا ذاتی تھا۔ نہ بھی ہوتا تو اپنے گھر والوں کو کچھ بتا کر انہیں پریشان کرنا اسے منظور نہ تھا۔ کچھ دیر ماما بابا کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا آج رات یہیں رہنے کا ارادہ تھا۔ اپنی طرف سے تو اس نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنے والدین کو اپنی پریشانی کی بھنک نہ پڑنے دے لیکن سکندر حسین سے کچھ بھی چھپانا رابیل کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر ہنسی مذاق چلتا رہا اور وہ بڑے ضبط سے ان کے ساتھ ہنستی رہی۔

''تم خوش ہو؟'' ہلکی پھلکی باتوں کے بعد اچانک انہوں نے رابیل سے سوال کیا۔

''خوش ہوں''۔ اس نے نظریں چرائیں۔ وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ایسا لگتا ہے تقدیر سے کچھ زیادہ کی خواہش کرلی ہے۔ جتنا مل گیا ہے اسے سنبھالنے کے لیے دامن چھوٹا پڑ رہا ہے''۔ سکندر حسین مستقل اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اپنی بات کے اختتام پر رابیل نے سر اٹھایا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو روک نہیں پائی تھی۔

''میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا''۔ سکندر حسین نے دوسرا سوال نہیں کیا تھا۔

''میں بزدل نہیں ہوں بس پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ہارنے سے خوف آ رہا ہے''۔ آنسوؤں کو پلکوں پہ سمیٹتے اس نے لب بھینچے۔

''یعنی تم رشتوں کو مقابلہ سمجھتی ہو''۔ اتنا تو اسے یقین تھا سکندر حسین اس سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ انہوں نے ہمیشہ اولاد کو اپنی جنگ خود لڑنے کی سیکھ دی تھی۔

''مجھے ایک بات کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔ ہم جسے چاہتے ہیں جس کی پروا کرتے ہیں اسے یہ یقین کیسے دلایا جائے''۔ وہ انہیں کچھ بتا نہیں سکتی تھی پر اپنی الجھن تو شیئر کر سکتی تھی۔

''ظاہر ہے الفاظ اور رویے دونوں طرح سے''۔ سکندر حسین نے فی الفور جواب دیا۔

''تو کیا صبح شام اس بات کا ورد کرنے سے سامنے والا ہماری بات کا یقین کر لے گا۔ بے زار نہیں ہو جائے گا؟'' رابیل کے ذہن میں نعمانہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اسے ازلان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ اس کے مطابق محبت اعتماد کا دوسرا نام ہے۔ ازلان اس سے محبت کرتا تھا تو اس کی محبت کا یقین کیوں نہیں کرتا تھا۔

''میرا خیال ہے نہیں۔۔۔ لفظ بہت اہم ہوتے ہیں۔ فقط رویہ کافی نہیں ہوتا۔ دل کی بات زبان پہ لانا پڑتی ہے۔ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ اچھا لگتا ہے''۔ وہ خاموش بیٹھی ان کا منہ دیکھتی رہی۔

''نہیں سمجھیں''! سکندر حسین کے سوال پہ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھو جب تم چھوٹی تھی نا تو چاکلیٹ بہت شوق سے کھاتی تھی اور تمہاری ماما کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ پھر جب میں ان سے چھپ کر تمہیں روزانہ ایک چاکلیٹ لا کر دیتا تو تم آئی لو یو بابا کہہ کر میرے گلے لگ جاتی۔ جانتی ہو تم سے یہ اظہار سننے کے لیے ہی میں روزانہ وہ چاکلیٹ تمہیں لا کر دیتا تھا''۔ وہ بتاتے گئے رابیل کے چہرے پہ مسکراہٹ ابھری۔

''اولاد اور والدین کو محبتوں کے اظہار کی

ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے درمیان یہ عنصر فطرت کا پیدا کردہ ہے پھر بھی یہ اعتراف دل کو خوشی دیتا ہے"۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے رابیل کو عام سی بات سے بڑا سبق دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی اسے اپنے رشتے کو جیتنے کے لیے محبت کا راستہ اختیار کرنا تھا۔ خاموش رہ کر تماشا نہیں دیکھنا تھا آگے بڑھ کر ازلان کی زندگی میں اپنا آپ منوانا تھا۔

☆☆☆

رابیل اگلے دن بھی گھر نہ لوٹی۔ یہ ازلان کی برداشت کی حد تھی۔ اتنے دن اپنے جنون سے لڑتے وہ رابیل کی اندرونی کیفیت سے بے خبر نہیں تھا۔ جانتا تھا وہ بے چین ہے، پریشان ہے لیکن اسے تسلی یا دلاسا تو دور وہ تو اس سے نظریں ملانے کی جرات بھی نہیں رکھتا تھا۔ اسے خود پہ اختیار نہ تھا۔ خوف تھا کہ جان نہیں چھوڑتا تھا۔ بے چینی کے منڈلاتے سائے اس کے خواب ان دنوں پہلے سے شدید ہوتے جارہے تھے۔ وہ خود سے لڑتا تھک چکا تھا۔ پسپائی اختیار کرنا پر ہمت جواب دے جاتی۔ ایسے میں رابیل کا گھر سے بنا بتائے چلے جانا اسے پاگل کر گیا تھا۔ کئی بار چاہا کہ اسے کال کرے پر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ کس حق سے واپس بلائے۔ اسے دیا ہی کیا تھا آخر اس نے۔ ڈپریشن اتنا شدید تھا کہ وہ ان دنوں آفس بھی نہیں جارہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہے لیکن اچانک اسے سامنے دیکھ کر وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا تھا۔

"رابی پلیز مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا"۔ دو راتیں اس نے کمرے کی تنہائی میں وحشت سے جاگ کر کاٹیں۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی مار ڈالتا تھا۔

"میں آپ کو کیوں چھوڑوں گی ازلان اور کس لیے چھوڑوں گی۔ آپ جانتے ہیں میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں"۔ رابیل اس نیت سے کہاں گئی تھی۔ وہ تو بس اپنی الجھنوں میں کچھ وقت اکیلے رہ کر سوچنا چاہتی تھی۔ یہ دو دن اس نے ازلان کی کیفیت کو سمجھنے اور اس پہ ریسرچ کرنے میں گزارے۔ اس

دوران ازلان نے ایک بار بھی اسے کال نہ کی تو اسے شدید تکلیف ہوئی۔ کیا وہ اسے اتنی سی بھی اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن اب ازلان کی بے تابی نے اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کیا تھا۔

"پتا نہیں کیوں لیکن مجھے بڑا خوف آرہا ہے"۔ بے اختیار اس نے اسے سینے سے لگالیا۔ فاصلے بھی اسی نے بنائے تھے۔ ان فاصلوں کو کم بھی وہی کر رہا تھا۔

"اپنے نام کا مطلب جانتے ہیں۔ ازلان کا مطلب ہوتا ہے شیر۔۔۔ اور شیر بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا بلکہ سب اس کی طاقت سے ڈرتے ہیں"۔ اس کے سینے سے سر اٹھائے رابیل نے ازلان کی طرف دیکھا جہاں درد کے سائے لہرا رہے تھے۔

"میرا خوف تم ہو رابیل۔ شادی کے بعد تمہیں کبھی وہ مقام نہیں دے سکا جس کی تم حق دار تھی۔ ہمیشہ تمہیں خود سے پرے دھکیلتا رہا ہوں پر یقین جانو میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں تم مجھ سے بے زار نہ ہو جاؤ"۔ ازلان کے بازوؤں کی گرفت کچھ اور سخت ہوئی پر یہ باعثِ تکلیف نہ تھی بلکہ اس شکنجے میں راحت تھی۔

"بے زار انسان نہیں رویے کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے میں آپ کے رویے میں الجھ کر پچھلے دنوں بہت پریشان رہی ہوں۔ ایک مضبوط رشتہ ہونے کے باوجود ہم دریا کے دو کناروں کی طرح چلتے جا رہے ہیں۔ ساتھ تو ہیں مگر پاس نہیں لیکن یہ سوچ دل سے نکال دیں کہ ہم کبھی جدا ہوں گے"۔ وہ اس سے بات کر رہا تھا یہی بہت تھا۔ اس طرح رابیل کو بھی اپنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا تھا ورنہ اتنے دنوں سے تو فقط خاموشی تھی جس نے زندگی کو بوجھل کر رکھا تھا۔

"تم میری پریشانیوں کو نہیں سمجھتیں رابی۔ مجھے کچھ وقت دینا کہ تمہارا ہر شکوہ مٹا سکوں"۔ اسے دھیرے سے جدا کرتا وہ بیڈ پہ جا بیٹھا اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"پہلے واقعی نہیں سمجھتی تھی پر اب سب کچھ جان چکی ہوں۔ آپ سے بس یہی گلہ ہے مجھے یہ سب آپ نے نہیں بتایا"۔ رابیل اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ اس کا بازو تھامتے دھیمے لفظوں میں کہا تو ازلان نے بے یقینی سے اس کی سمت دیکھا۔

"میں ڈرتا تھا رابیل سچ جان کر کہیں تم مجھے چھوڑ نہ دو"۔ اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

"یہ خوف اپنے دل سے نکال دیں کہ میں آپ کے ماضی کی وجہ سے آپ کو چھوڑ کر جاؤں گی۔ آپ سے محبت کرتی ہوں ازلان اور محبت نہ کمزور ہوتی ہے نہ بے اعتبار"۔ رابیل نے پختہ لہجے میں کہا۔

"برسوں سے وہ بھیانک منظر میرے خوابوں کا حصہ ہیں۔ پاپا کی بے بسی، میری اذیت۔۔۔ کچھ بھی نہیں بھولتا"۔ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"بھولنا ہوگا ازلان۔۔۔ میری خاطر، میری محبت کی خاطر۔ ہماری خاطر"۔ رابیل اب پرانے درد کا قصہ دہرا کر اسے مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں کوشش کروں گا رابی۔ میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ کبھی ان لمحوں کو نہیں سوچوں گا جو ہماری زندگی میں تلخی کا باعث بنیں"۔ اس کا ہاتھ تھامے ازلان نے یقین دلایا۔

"ایک وعدہ اور کرنا ہوگا؟"

"وہ کیا؟"

"نہ تو مجھ سے بدگمان ہوں گے اور نہ مجھ سے محبت کرنا کم کریں گے"۔ وہ مسکرایا۔

"مر تو سکتا ہوں لیکن تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا رابیل۔ تم میری زندگی میں روشنی کی کرن بن کر آئی ہو۔ دور جاتی ہو تو وجود اندھیروں میں ڈوبنے لگتا ہے"۔ اس کے دودھیا گالوں کو چھوتے ازلان نے اپنے دل کا حال اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"اندھیرا چھٹ گیا ہے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھیں کتنی روشن صبح ہے۔ اجلی اور پاکیزہ۔۔۔ ہماری زندگی کی نئی شروعات بھی کچھ ایسی ہی ہونی

چاہیے"۔ کھڑکی سے چھن کر آتی سورج کی کرنیں رابیل کے چہرے پہ سات رنگ بکھیر رہی تھیں۔ مسکرا کر ازلان نے اس کے ماتھے پہ نرم بوسہ دیا اور سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

سیاہ کار ڈرائیو وے پہ آ کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے چستی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تھا۔ اپنا ہینڈ بیگ تھامے وہ سستی سے گاڑی سے اتری تھی۔ سیاہ سینڈل میں مقید اپنے دودھیا پاؤں سے چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اٹھاتی وہ گھر میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ لان سے آتی چند مانوس آوازوں پہ چونک کر اس نے بے اختیار قدم لان کی طرف بڑھا دیئے۔

بہار کے اولین دنوں میں اب سہ پہر میں بہت زیادہ خنکی نہ تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے روشن تھا اور وہ اپنی مارننگ شفٹ مکمل کر کے تھکی ہاری گھر لوٹی تھی۔ پتھریلی پگڈنڈی سے ہو کر وہ لان کے اس حصے کی طرف چلی گئی جہاں سے ان دونوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہاں پہنچ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" دونوں ہاتھ کمر پہ ٹکائے اس نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"ماما ہم ٹری (درخت) لگا رہے ہیں"۔ تین سالہ آریان کے دونوں ہاتھ گیلی مٹی میں لتھڑے تھے۔ کپڑے بھی اس نے اسی حساب سے میلے کچیلے کر رکھے تھے۔ بے اختیار اس نے ہاتھ سر پہ مارا۔

"آپ اسے روکنے کے بجائے خود بھی بچے بنے ہوئے ہیں"۔ اس نے شکوہ کیا تھا۔ ازلان نے مسکراتے ہوئے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر آریان کی مدد کرنے لگا جو ایک ننھا سا پودا لان میں لگا کر اب اسے شاور کین سے پانی دے رہا تھا۔

"تم بھول رہی ہو یہ تمہاری طرح میری کم ہی سنتا ہے"۔ اس نے پہلے اپنے بیٹے کے ہاتھ دھلائے پھر خود ہاتھ اچھی طرح دھوتا بیلچہ اور شاور کین وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے بگاڑا کس نے ہے"۔ رابیل نے منہ بناتے نیچے جھک کر آریان کی کمر پہ ہلکی سی دھپ لگائی اور پھر آگے بڑھ اس کے نرم سفید گال پہ بوسہ دیا جو دھوپ کی تیزی سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ ننھے ننھے قدموں سے دوڑتا گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ رابیل جانتی تھی وہ اب اگلا آدھا گھنٹہ باتھ ٹب میں گزارنے والا ہے۔

آئے دن اسے کوئی نا کوئی نیا شوق سوار رہتا تھا۔ ان دنوں اس کا کریز باغبانی تھا جو اس عمر کے بچوں کے مطابق ہرگز نہیں تھا لیکن لان میں مالی کو کام کرتے دیکھ کر اسے بھی اپنے ہاتھ سے پودے لگانے کا شوق ہوا تھا۔ روز مالی کوئی نیا پودا لے آتا جو آریان کے ہاتھوں لگوایا جاتا۔ ازلان بھی اکثر سب کام چھوڑ کر بیٹے کے شغل میں شامل ہو جاتا۔

"ظاہری بات ہے میں نے ــــــ جیسے تمہیں بگاڑا تھا"۔ ازلان نے پیچھے سے آ کر اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیا۔

"آپ کی کون سی بات نہیں مانتی میں"؟ وہ دونوں اب پتھریلی پگڈنڈی پہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"کب سے کہہ رہا ہوں چھوڑ دو یہ جاب، خواہ مخواہ اپنے آپ کو تھکاتی رہتی ہو"۔ وہ خوش گوار موڈ میں بولا۔

"ازلان میں ایک ڈاکٹر ہوں، یہ میرا کام ہی نہیں میرا پیشن ہے۔ گھر بیٹھ کر کیا کروں گی؟" رابیل چلتے چلتے رک کر اس کی طرف دیکھنے



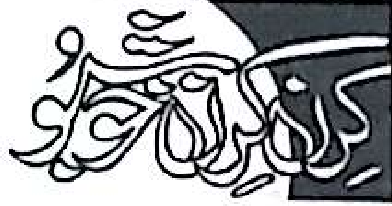
دیمک زدہ محبت

صائمہ اکرم چوہدری

لگی اور سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔
"میں ہوں نا مریضِ عشق ، میرا علاج کرنا"۔اس نے شرارت سے رابیل کے کان کے پاس سرگوشی کی۔
"میرے خیال میں میرے علاج سے آپ کا کیس بگڑ گیا ہے۔آپ کسی دوسرے ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کرتے؟" اس کی پولو شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے رابیل نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا تھا۔
"عشق اور علاج میں توحید کا قائل ہوں میں۔ بار بار ڈاکٹر بدلنا افورڈ نہیں کرسکتا"۔وہ بے ساختہ کہتا اس بار رابیل کو مسکرانے پہ مجبور کر گیا تھا۔
"کیا بات ہے جناب آج بڑے رومانٹک موڈ میں ہیں۔خیر تو ہے"۔ازلان نے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ موڑا۔وہ اب اس کی پشت پہ کھڑا تھا۔جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک ساٹن باکس نکالا۔اندر ایک ڈائمنڈ پینڈنٹ وائٹ گولڈ چین کے ساتھ تھا۔
"کل آپ کی قید میں پورے پانچ سال ہوجائیں گے"۔رابیل کے گلے میں پہناتے اس نے بہت محبت سے کہا۔
"وہ تو کل ہوں گے نا، یہ تحفہ اتنی جلدی کس خوشی میں دیا جارہا ہے"۔پینڈنٹ کو انگلی سے چھو کر اس نے چہرہ موڑ کر ازلان کی طرف دیکھا تھا۔
"رات کی فلائٹ ہے میری، ایک ویک کے لیے یو ایس جارہا ہوں۔اینورسری ڈنر واپسی تک ادھار رہا"۔وہ اب سمجھی تھی ازلان آج جلدی گھر کیسے چلا آیا تھا۔ورنہ تو اس کی واپسی ہمیشہ شام کو ہوتی تھی۔
"ایک تو آپ کے پلانز بھی آن دا اسپاٹ (موقع پر) ہوتے ہیں۔کال کرکے بتا نہیں سکتے تھے مجھے"۔وہ ایک دم اداس ہوگئی تھی۔
"فون پہ بتا دیتا تو تمہارے چہرے پہ اداسی کا یہ رنگ کیسے دیکھ پاتا"۔اس نے رابیل کے گال کو نرمی سے چھوا۔
"یعنی میری اداسی خوشی دیتی ہے"۔وہ خفگی سے بولی۔
"اونہوں۔۔۔اس اداسی کی وجہ سکون دیتی ہے۔اچھا لگتا ہے جب تم مجھ سے دوری کا سوچ کر پریشان ہوتی ہے"۔اپنا ہاتھ اس کے کندھے پہ حمائل کیے وہ اب اس کے ساتھ چلتا لان کی دوسری جانب نکل گیا تھا۔
"بی کاز آئی لو یو اینڈ آئی ریئلی مس یو"۔سبز گھاس کے تختوں کے گرد سر اٹھائے موسمی پھول قطار در قطار کھلے بہار کا پیغام دے رہے تھے۔کچھ عرصہ پہلے یہ بہاران دونوں کی زندگی میں بھی دبے قدموں داخل ہوئی تھی۔بے یقینی اور اذیت کے اس سفر کا خاتمہ ہوا تھا جو سالوں سے ازلان کی روح کو جکڑے ہوئے تھا۔
شروع کا کچھ عرصہ رابیل کے لیے کسی امتحان نہ تھا لیکن یہ ازلان کی محبت تھی جو وہ مایوس ہوئی تھی نہ اس نے ہمت ہاری تھی۔وہ عورت کے ظلم کا شکار، خوف اور جسمانی تکلیف سے لڑتا بے یقینی کی جس منزل پہ کھڑا تھا وہاں سے اسے رابیل ہی واپس لاسکتی تھی کیونکہ ایک وہی تھی جس پہ ازلان خود سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔اس کی محبت اور یقین کا رابیل نے بھرم رکھا تھا۔اپنی وفاداری اور محبت سے ازلان کی زندگی میں جگہ بنائی تھی۔وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے اس یقین دہانی کی ضرورت آج بھی رابیل کو وقتاً فوقتاً پڑتی تھی۔وہ جانتی تھی یہ اقرار ازلان کے دل کی گرہیں کھولنے میں کتنا مددگار ہے۔اس کے بغیر کبھی کبھی وہ بدگمانی کے دریا میں غوطے کھانے لگتا تھا۔رابیل اسے بڑی مشقت سے وہاں سے نکال کر لائی تھی جبکہ باقی کا کام آریان کی پیدائش نے آسان کردیا تھا۔
رابیل اور آریان، اپنی کل کائنات کے ساتھ آج ازلان بخت اپنے بخت کا سکندر تھا۔وہ اس دنیا کا سب سے پرسکون اور خوش انسان تھا جس کی زندگی کا مدار اس کی جان سے پیاری بیوی اور لاڈلا بچہ تھا۔

☆☆

شعاع عمیر



اللہ ناپسند کرتا ہے

☆ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔(البقرہ:110)

☆ اللہ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔(البقرہ:205)

☆ اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گناہ گار سے محبت نہیں کرتا۔(البقرہ:215)

☆ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا۔(النسا:36)

☆ یقیناً دغا باز، گناہ گار اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا۔(النسا:107)

☆ اللہ تعالیٰ فسادیوں سے محبت نہیں کرتا۔ (المائدہ:64)

☆ بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(الاعراف:31)

☆ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔(الانفعال:58)

دلوں کا زنگ کیسے دور ہو

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
دلوں میں زنگ لگتا ہے جیسے کہ لوہے میں جب پانی لگ جاتا ہے، تو پوچھا گیا کیسے دور ہوگا، فرمایا۔''موت کی کثرت سے یاد اور قرآن پاک کی تلاوت سے۔''
(کنز العمال)

اگر میں ایسا کر لیتا.....تو ایسا ہو جاتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔''اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نہ کہو۔اگر میں ایسا کر لیتا تو ایسا ہو جاتا، البتہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر یوں ہی تھی اور انہوں نے جو چاہا کیا، کیونکہ ''اگر'' (کا لفظ) شیطان کے کام کا دروازہ کھول دیتا ہے۔
(مسلم......منتخب احادیث)

چمکتے موتی

☆ مکار اور بد خلق جنت میں داخل نہ ہوگا۔
(حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم ہے۔
(حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ بعض اوقات جرم معاف کرنا، مجرموں کو زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے۔نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کر دیتا ہے۔
(حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد

مسلمان سائنس دان

☆ دنیا میں سب سے پہلا ''کیمرہ'' ایجاد کرنے والا۔''ابن الہیثم''

☆ آپریشن سے قبل مریض کو بے ہوش کرنے کا طریقہ متعارف کرنے والا۔(زکریا الرازی)

☆ ادویات بنانے کے علم کو دنیا میں سب سے پہلے متعارف کرنے والا۔(ابن سینا)

☆ مصنوعی دانت لگانے کا طریقہ متعارف کروانے والا۔(ابوالقاسم الزہروی)

☆ مریضوں کو دی جانے والی ادویات کی درست مقدار کا تعین کرنے والا۔(یعقوب الکندی)

شازیہ ہاشم میواتی...... کھڈیا خاص قصور

قائداعظم کی شگفتہ مزاجی

1938ء میں چوہدری علی محمد غلام کا ایک مضمون روزنامہ ''احسان'' میں قائداعظم کے بارے میں شائع ہوا۔ اس میں ایک بات لکھی تھی کہ ''قائداعظم کبھی لوگوں کو اپنے ہاں سماجی دعوت پر مدعو نہیں کرتے۔'' جب اس مضمون کے بارے میں قائداعظم کو خبر ہوئی تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے، میں عوام تک ان کے معدوں کے حوالے سے نہیں پہنچنا چاہتا ہوں۔''

نوشین اقبال نوشی...... گاؤں بدرجان

مائی

وکیل نے گواہ پر جرح شروع، گواہ قصبے کی سب سے قدیمی مائی تھی، وکیل، بھرپور اعتماد سے مائی کی طرف بڑھا اور اس سے پوچھا۔ ''مائی بشیراں، کیا تم مجھے جانتی ہو؟''

مائی بشیراں! ''ہاں شفیق پتر! میں تمہیں اس وقت سے اچھی طرح جانتی ہوں جب تک تم ایک بچے تھے اور سچ پوچھو تو تم نے مجھے شدید مایوس کیا ہے۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ لڑائیاں کرواتے ہو، اپنی بیوی کو دھوکا دیتے، طوائفوں کے پاس بھی جاتے ہو۔ تم لوگوں کو استعمال کر کے پھینک دیتے ہو اور پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے نہیں تھکتے۔ شراب پیتے ہو اور جوا کھیلتے ہو۔ ہاں...... ہاں...... میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

وکیل ہکا بکا رہ گیا اور گھبراہٹ میں وکیل دفاع کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''مائی بشیراں تم اس شخص کو بھی جانتی ہو؟''

مائی بشیراں! ''اور نہیں تو کیا جیسے میں عبدالغفور کو نہیں جانتی؟ ارے اسے تو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب یہ ڈائپر میں گھومتا تھا اور سارا محلہ ناک پر ہاتھ رکھ کر اس سے دور بھاگتا تھا۔ یہ یہاں کا سست ترین بندہ ہے اور ہر ایک کی برائی ہی کرتا ہے اور اوپر سے ہیرو نچی بھی ہے۔ اور شہر کا سب سے نکما اور ناکام وکیل یہ ہی ہے۔ چار بندیوں سے اس کا افیئر چل رہا ہے۔ جن میں سے ایک تمہاری بیوی ہے۔ ہاں میں اس بندے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

جج نے دونوں وکیلوں کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے بولا: ''اگر تم دونوں احمقوں میں سے کسی نے مائی بشیراں سے یہ پوچھا کہ وہ مجھے جانتی ہے تو دونوں کو پھانسی دے دوں گا۔''

مقدس آصف...... رائے ونڈ ضلع لاہور

شاہ حسین

دنیا طالب مطلب دی وو! سچ سن دو فقیرا
مطبل آوے مطبل جاوے، مطبل پوجے گورپیرا
مطبل پہناوے، مطبل کھلاوے، مطبل پلاوے نیرا
کہے حسین جن مطبل چھوڑیا، سو میرن سر میرا

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

کچھ پھول چنے ہیں لفظوں کے

☆ حرص سے روزی نہیں بڑھتی، لیکن انسان کی قدر گھٹ جاتی ہے۔

☆ نیک آدمی جب علم سیکھتا ہے تو انکساری سے جھک جاتا ہے اور بدفطرت جب علم سیکھتا ہے تو تکبر سے اکڑ جاتا ہے۔

☆ دل میں اترنے کے لیے سیڑھیوں کی نہیں بلکہ اچھے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ پرخلوص اور سچا شخص کبھی سچائی اور خلوص کی قسمیں نہیں کھاتا۔

☆ ساری دنیا تجھے اپنے فائدے کے لیے چاہتی ہے، صرف ایک اللہ ہی جو تجھے تیرے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔

حافظ رملہ مشتاق...... حاصل پور

قول

قول ایک سواری ہے، جس پر سوار ہو کر ہم عمل

کی منزل کے کنارے پر پہنچتے ہیں، لیکن ہم کرتے یوں ہیں کہ عمل کے کنارے پہنچ کے قول کی کشتی کی سواری کو نہیں چھوڑتے اور اس میں سوار ہی رہتے ہیں اور عمل کی منزل کا کنارہ ہمارے سامنے آس پاس ہی گھومتا رہتا ہے۔

(اشفاق احمد)

مقدس آصف......رائے ونڈ ضلع لاہور

ہارون الرشید کا واقعہ

ایک ایک مرتبہ ہارون الرشید شکار کھیلنے کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے ایک سفید مائل باز کو ہوا میں اڑا دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اڑتا رہا، پھر نظروں سے بھی اوجھل ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ایک پنجے میں مچھلی لے کر اتر آیا۔ ہارون الرشید نے اس مچھلی کے بارے میں علما سے پوچھا کہ "آیا اس کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس جانور کی حقیقت کیا ہے۔" تو مقاتل نے جواب دیا۔ "حضور المومنین آپ کے جد امجد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہم سے روایت بیان کی ہے کہ فضاؤں میں مختلف قسم کی مخلوق رہتی ہے۔ بعض ان میں سے ایسے سفید قسم کے جانور ہوتے ہیں جن سے مچھلی کی شکل کے بچے پیدا ہوتے ہیں جن کے بازو تو ہوتے ہیں، لیکن پر نہیں ہوتے۔" اس کے بعد حضرت مقاتل نے اس کے کھانے کی اجازت دی تو اس جانور کا احترام کیا گیا۔

(حیاۃ الحیوان)

فاخرہ بتول......موڑہ دھمیال

ابن رشد کے اقوال

☆ اسلام کا سب سے بڑا دشمن وہ جاہل ہے جو لوگوں پر کفر کے فتوے لگاتا پھرے۔

☆ اگر آپ جاہلوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں تو ہر باطل کو مذہبی لبادے میں پیش کریں۔

☆ یہ ممکن نہیں کہ اللہ ہمیں عقل دے، پھر اس عقل کے خلاف شریعت نازل کرے۔

☆ مذہب کی تجارت جاہل معاشروں میں رائج ہوتی ہے۔

اقرا کنول......سکرنڈ

برنارڈ شاہ نے کہا

دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام ایسا نہیں جو انگریز نہ کرتے ہوں، لیکن آپ انہیں کبھی غلطی پر نہیں پائیں گے۔ جب وہ آپ سے جنگ کرتے ہیں تو وطن پرستی کا اصول ان کے سامنے ہوتا ہے، وہ آپ کو لوٹتے ہیں تو کاروباری اصول پیش نظر رکھتے ہیں اور کسی کو غلام بناتے ہیں تو سلطنت کی توسیع کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔

اقرا عزیز......گاؤں دریا خان جلبانی

دسمبر جا رہا ہے

دسمبر جا رہا ہے
اور نئے سندیسے دے رہا ہے
بہت سے وعدوں کے
ٹوٹ جانے کے
کچھ نئے رشتوں کی
چاہتوں میں لپٹی بارشوں کے
لیکن دہلیز پر سوالی بنا
پھر نیا سال آموجود ہے
کسی قرض خواہ کی طرح
تقاضے کی چادر اوڑھے
لیکن زید میرے ہاتھ پھر خالی ہیں

ہانیہ عمران......گجرات

☆☆

بشریٰ محمود



دانیہ عامر، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

آخری چند دن دسمبر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے میں
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں
رفتگاں کے بکھرتے سالوں کی
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے
فون کی ڈائری کے صفحوں سے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے
جن سے مربوط بے نوا گھنٹی
اب فقط میرے دل میں بجتی ہے
کس قدر پیارے پیارے ناموں پر
رینگتی بدنما لکیریں سی
میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں
دوریاں دائرے بناتی ہیں
دھیان کی سیڑھیوں سے کیا کیا عکس
مشعلیں درد کی جلاتے ہیں
ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں
حادثے کے مقام پر جیسے
خون کے سوکھے نشانوں پر
چاک کی لائنیں لگاتے ہیں
ہر دسمبر کے آخری دن میں
ہر برس کی طرح اب بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
کیا خبر اس برس کے آخر تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے
کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں
گرد ماضی سے اٹ گئے ہوں گے
خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں
کتنے طوفان سمٹ گئے ہوں گے
ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں
ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے

رنگ کی روشنی میں کھونا ہے
اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہوئی
ڈائری دوست دیکھتے ہوں گے
ان کی آنکھوں کے خاکدانوں میں
ایک صحرا سا پھیلتا ہوگا
اور کچھ بے نشاں صفحوں سے
نام میرا بھی کٹ گیا ہوگا

یاسمین کنول، کی ڈائری میں تحریر

جگر مراد آبادی کی غزل

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہمسائیگی سے ملتا ہے

عابدہ مغل، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی غزل

وہ عکسِ موجۂ گل تھا، چمن چمن میں رہا
وہ رنگ رنگ میں اترا، کرن کرن میں رہا

وہ نام حاصلِ فن ہو کے میرے فن میں رہا
کہ روح بن کے مری سوچ کے بدن میں رہا

سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل، کہ سدا اس کی انجمن میں رہا

وہ شہر والوں کے آگے کہیں مہذب تھا
وہ ایک شخص جو شہروں سے دور بن میں رہا

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا

ثناء شہزاد کی ڈائری میں تحریر
فرحت ندیم ہمایوں کی غزل

نئے مزاج کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں
ہم اپنے آپ کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں

قبولِ ترکِ تعلق نہیں ہے لیکن ہم
تمہارے حکم کی تعمیل کرنا چاہتے ہیں

عدو کے فیل نہ بڑھا دیں کہیں یہ کعبۂ دل
سو ہم دعائے ابابیل کرنا چاہتے ہیں

ہمارے جلنے سے ملتی ہے روشنی تم کو
تو روشن اب یہی قندیل کرنا چاہتے ہیں

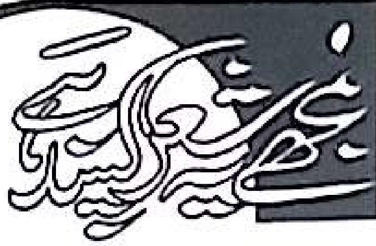
جو ان کی کوئی بھی تعبیر پا نہیں سکتے
ہم ایسے خوابوں کو تحلیل کرنا چاہتے ہیں

کتابِ زیست میں مشکل ہے بابِ عشق بہم
ہم ایسے باب کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں

ثمرہ عاقب، کی ڈائری میں تحریر
عید میر کی نظم

دل جب سے درد میں بوجھل ہے
میں ہر اک غم کو سہتی ہوں
تم پیار کے نغمے گاتے ہو
میں دکھ کی کتھا پڑھتی ہوں
تم فخر ہو جلنے والوں کا
میں دردِ نگر کی باسی ہوں
تم جگ کے ناز اٹھاتے ہو
میں خود سے شکوہ کرتی ہوں
میں دشت کا پیاسا ساون ہوں
نہ جانے جو کب برسے گا
تم ہر اک پل میں جیتے ہو
میں لمحہ لمحہ مرتی ہوں
جو محو ہو میری یادوں میں
پر تم نے کیا یہ سوچا ہے
تم پیار جو مجھ سے کرتے ہو
کیا میں بھی تم سے کرتی ہوں

شگفتہ سلیمان



نادیہ طوبیٰ ——— گجرات

ہلکی ہلکی سرد ہوا، ذرا ذرا سا درد دل
انداز اچھا ہے اے دسمبر تیرے آنے کا

صدف عمران ——— کراچی

سرد ہوائیں کیا چلیں میرے شہر میں
ہر طرف یادوں کا دسمبر بکھر گیا

عابدہ مغل ——— مانسہرہ

چاند بھی تنہا، رات بھی تنہا اور تنہا میری ذات ہے
پھر لوٹ کے وہ یاد آیا عجیب دسمبر کی یہ رات ہے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

یہ بارش، یہ سرد ہوا، یہ ہجر کا عالم
گمان ہوتا ہے اس بار دسمبر مار ہی ڈالے گا

ندا طارق ——— فیصل آباد

چاند رات، ڈھلتی شام، پت جھڑ اور دسمبر
سبھی اک قیامت ہیں، انتظار کے ماروں پر

ناہید وحید شہزاد ——— گرین سٹی

کیوں ہر بات پہ کوستے ہیں لوگ دسمبر کو
کیا دسمبر نے کہا تھا !! محبت کرو

نمرہ اقرا ——— کراچی

کہا تھا میرے ہمدم نے، ملیں گے دسمبر میں
لوٹ آؤ کہ میری طرح دسمبر بھی تھوڑا رہ گیا ہے

ناہید راشد ——— ملیر کراچی

پھر اس سرد موسم میں ذرا نہ چین سے سوئیں گے
دسمبر پھر سے آیا ہے، پھر سے مل کے روئیں گے

ثنا خان ——— کوئٹہ

گزر جاتا ہے سارا سال یوں تو
نہیں کٹتا مگر تنہا دسمبر

ارم کمال ——— فیصل آباد

وہ کہتی ہے سنو جاناں محبت موم کا گھر ہے
تپش کچھ بدگمانی کی کہیں پگھلا نہ دے اس کو
میں کہتا ہوں کہ جب دل میں ذرا بھی بدگمانی ہو
وہاں کچھ اور ہو تو ہو محبت ہو نہیں سکتی

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

میری آوارگی میں کچھ دخل تمہارا بھی ہے محسن
جب یاد تمہاری آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ثمینہ اکرم ——— کراچی

یونہی بے سبب پکارا کیجیے
کچھ تو تعلق کا گمان ہوتا ہے

امبرین راشد ——— کراچی

کلیجے کرب سہتے سہتے چھلنی ہو چکے ہیں !
مگر اب کیا کریں ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں
ہمارے سامنے ہے عشق و الفت کو اٹھا لے
یہ قصے ہم تک آتے آتے ردی ہو چکے ہیں

یاسمین کنول ——— پسرور

اسے ہی کہتے ہیں شاید نصیب کا لکھا
ہم حیات میں وہ چارہ گر نہ ہو پائے

نغمہ نور ——— روہڑی

ہے گزارنا مجھے وقت کو ہے، سنوارنا مجھے بخت کو ہے
کبھی خوف ہے مجھے موت کا، کبھی زندگی کا وبال ہے
وہ چلا گیا مجھے چھوڑ کر مگر اپنی یاد بھی دے گیا
میں کھڑی ہوں کیسے مقام پر، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

ذکیہ سلطانہ ——— حیدر آباد

خواب آنکھوں میں پرونے کی اجازت دے دے
اے شب غم مجھے سونے کی اجازت دے دے
یا سلیقے سے نبھا رسم رفاقت مجھ سے
یا کسی اور کا ہونے کی اجازت دے دے

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

نصیب

نصیب ایک ایسی چیز ہے جس کے آگے بڑے بڑے عقل مند اور حسین و جمیل لوگ ہار جاتے ہیں مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں نصیب ایک جیتے جاگتے انسان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے جھلسا دیتا ہے اور لوگ اس نصیب کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ نصیب عقل مند کو بے عقل بنا دیتا ہے اور خوب صورت کو بد صورت اس نصیب کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا یہ انسان کو کبھی ساتویں آسمان سے زمین پہ لے آتا ہے اور کبھی زمین سے انسان کو ساتویں آسمان پہ پہنچا دیتا ہے یہ ایک معمہ ہے نا سمجھ میں آنے والا یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جسے آج تک کوئی حل نہیں کر سکا انسان اس کو جتنا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے۔ (در ثمن بلال۔ابھی بچھڑنے کے دن نہیں تھے)

میمونہ عارف ..... نواب شاہ

"کورا"

ہم کتنوں سے محبت کرنے کے قابل ہو چکے ہیں اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم کتنوں سے نفرت کر رہے ہیں انسان محبت میں "کورا" ہو نہ ہو نفرت میں "کورا" ضرور ہونا چاہیے۔ کوئی نقطہ کوئی نشان نہیں ہونا چاہیے اس جذبے کے نام پر۔ (سمیرا حمید۔یارم)

حافظہ رملہ مشتاق۔حاصل پور

خودداری

"مگر انسان پہ ہر وقت ایک سا فیز نہیں رہتا میرے بچے! وقت بدلتا ہے مسئلے بھی بدلتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان ایسی سچویشن میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے وہ پہلے کبھی نہیں گزرا ہوتا۔ تب اسے چاہیے کہ اپنے مسئلے کا حل کسی سے پوچھ لے۔ انسان کو صرف تب اپنے پرابلمز شیئر کرنے چاہئیں جب اس کو واقعی اپنے پاس سے ان کا حل نہ ملے۔ کوئی ایک دوست ایک ٹیچر یا پھر کوئی اجنبی، کسی ایک بندے کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا جو واقعتاً "تواصو بالصبر" کرے۔ ہاں لیکن ایک بات یاد رکھیں۔ اس شخص کو کبھی بھی اپنی بیساکھی نہ بنائیں۔ آپ کو ہر کچھ دن بعد کسی کے کندھے پہ رونے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ دینے والے ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے کہ ہم تسلی دینے والے بنیں "تواصو بالصبر" صبر کی تلقین دینے کا نام ہوتا ہے ہر وقت لیتے رہنے کا نہیں۔ (جنت کے پتے ..... نمرہ احمد)

اقرا عزیز ..... گاؤں دریاں خاں جلبانی

احساس جدائی

پیروں کے نیچے سے زمین کس طرح کھنچتی ہے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ چند وجود جنہیں آپ روز دیکھتے ہیں روز ان سے بات کرتے ہیں ان کے کھونے کا احساس آپ کی روح کو کس طرح اندر تک خالی کر دیتا ہے۔ (مریم ماہ منیر ..... ہوا میں ڈولتی خوشبو کی صورت)

سمیرا یاسمین۔۔۔گجرات

بڑی عمر کی عورت

عورت اس لیے شادی کرتی ہے کہ تعریف کرنے کے لیے ایک بندہ مل جائے اور مرد اس لیے شادی کرتا ہے کہ تعریف کے بغیر عورت مل جائے۔

بڑی عمر کی عورت سے شادی کر کے آپ دنیا کے ان خوش نصیب خاوندوں میں سے ہوں گے جن کی ساس نہیں ہوتی ورنہ جب تک سانس تب تک ساس۔ پھر آپ کو بیوی کا حکم مانتے ہوئے شرم بھی نہیں آئے گی کیونکہ حکم ہے بڑوں کی حکم عدولی نہ کرو۔ وہ صبح جلدی اٹھے گی کہیں آپ اسے بغیر میک کے نہ دیکھ لیں۔ وہ اگر آپ کا مقابلہ کرے گی تو سابقہ شوہر سے، جب کہ چھوٹی عمر کی بیوی تو آئندہ شوہر سے کرے گی۔

دنیا کی وہ عورت جسے آپ ساری زندگی متاثر نہیں کر سکتے وہ بیوی ہے اور وہ عورت جسے آپ چند منٹوں میں متاثر کر سکتے ہیں وہ بھی بیوی ہے مگر دوسرے کی۔ (ڈاکٹر یونس بٹ...... شیطانیاں)

اقراء جٹ...... منچن آباد

طاقت

سنو! جس طاقت کو تم غلط سمجھتے ہو وہ صرف خدا کی طاقت ہے، جو ہمیں اور تمہیں طاقت عطا کر کے رحم کرنا سکھاتی ہے۔ طاقت کا صحیح مظاہرہ یہ نہیں کہ تم کمزوروں کو مسل دو بلکہ طاقت کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے نفس سے جنگ کرتے ہیں۔ اپنے اندر بپھرے ہوئے وحشی کو ابھرنے نہیں دیتے جب تک افراد کی داخلی تنظیم، اس نظریے کے تحت نہ ہوگی، بہتر سے بہتر نظام حیات بھی دیرپا نہ ثابت ہو سکے گا۔ تم آج ایک نظام سے اکتا کر دوسرے نظام کی بنیادیں رکھتے ہو مگر کل وہ بھی ڈھیر ہو جائے گا کیونکہ بنیاد اس پرانی زمین پر رکھ رہے ہو جس کے نیچے آتش فشاں ہوتے ہیں۔ پہلے اس آتش فشاں کو ٹھنڈا کرو۔ (ابن صفی...... جہنم کا شعلہ)

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

اماں

اماں خط لکھتی تو نیچے اپنا نام نہیں لکھتی تھی...... اس کا نام صغریٰ تھا۔

میں پوچھتا۔ ''اماں تو اپنا نام کیوں نہیں لکھتی؟''

اماں کہتی۔ ''صغریٰ تو چند ایک سال کے لیے جئی تھی، پھر تو پیدا ہو گیا تو صغریٰ ختم ہو گئی۔ والدہ ممتاز بن گئی...... پھر ساری زندگی وہ تیرے لیے جئی، خود کے لیے نہیں......'' ساری زندگی وہ والدہ ممتاز رہی۔ (ممتاز مفتی)

فائزہ بھٹی...... پتوکی

مشابہت

ہر انسان جو دنیا میں ہے وہ کسی نہ کسی چوپائے، دوپائے، رینگنے والے، تیرنے والے، اڑنے والے جانور کی جبلت پر پیدا ہوا ہے۔ جہاں پر انسان اشرف المخلوقات ہے وہیں اپنی مخصوص حیوانی جبلت کی بنا پہ افضل اور اسفل رجحانات کا حامل بھی ہے۔ انسان تمام عمر اپنے اسی جبلی تقاضوں کے مطابق عمل پیرا رہنے پر مجبور ہے۔ اس کی یہ اچھی بری، سعد نحس، جبلی خصلت اس کی سوچ بچار فیصلوں اور روزمرہ کے دیگر عوامل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کوئی شیر ہے تو کوئی محض گیدڑ، کوئی لومڑ کی خصلت رکھتا ہے تو کوئی ہرن کی مانند بھولا بھالا۔ کوئی ناشکرا تو کوئی کبوتر ہے اور بالکل اسی طرح کوئی مچھلی، مینڈک، گدھ، الو اور کوئی بکری کی طرح بزدل۔ (یحییٰ خان...... پیا کا رنگ کالا)

عابدہ مغل...... مانسہرہ

عورت کی ضرورت

مرد کی محبت کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وقت کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے اس کے معاملے میں اعلا ظرف نہیں ہوتا، اور اگر اسے عورت کے کردار پر شک ہو جائے تو وہ اسے محبت تو دیتا ہے، لیکن عزت نہیں...... حالانکہ عورت کے لیے محبت سے زیادہ عزت زیادہ قیمتی شے ہے۔ (صائمہ اکرم چوہدری...... نارسائی)

ملیحہ زہرہ...... کراچی

روبینہ شریف

مسکراتی کرنیں

صنعت کار

ایک صنعت کار نے کسی غریب آدمی کی مرغی چرالی۔اس کی بیوی نے کہا۔

''یہ کیا احمقانہ حرکت کی ہے آپ نے؟''

صنعت کار بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اپنے بزنس کا آغاز لوگوں کی مرغیاں چرانے سے کیا تھا۔جس فن نے مجھے اتنا بڑا صنعت کار بنا دیا میں اسے کبھی فراموش کر دینا مناسب نہیں سمجھتا۔کبھی کبھی پریکٹس کرلیا کرتا ہوں۔''

اقراء ممتاز ...... سرگودھا

وجہ

استاد:۔''طاہر تم آج اتنی لیٹ کیوں آئے؟''

طاہر:۔''سر میرے امی ابو لڑ رہے تھے۔''

استاد:۔''لڑ امی ابو رہے تھے تو لیٹ تم کیوں آئے؟''

طاہر:۔''سر میرے ایک پاؤں کا جوتا امی کے ہاتھ میں تھا دوسرے پاؤں کا جوتا ابو کے ہاتھ میں۔''

اقراء جٹ ...... منچن آباد

دعوت

ایک کنجوس نے اپنے دوست کو کھانے کی دعوت دی۔دستر خوان پر صرف ابلے ہوئے سفید چاول کی ایک پلیٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔جیسے ہی انہوں نے کھانا شروع کیا، اندر سے کنجوس کی بیوی نے آواز دی۔

''کیا میں مرغی لے آؤں۔''

شوہر نے جواب دیا۔''نہیں! ابھی ہم چاول کھا رہے ہیں تھوڑا صبر کرو۔''

مہمان کہنے لگا۔''جب لا رہی ہے، تو اسے مرغی لے آنے دو۔''

کنجوس آدمی خاموش ہی رہا اور کوئی بھی جواب نہ دیا۔دس منٹ گزرنے کے بعد اس کی بیوی نے دوبارہ پوچھا۔''مرغی لے آؤں۔''

اس نے ایک بار پھر وہی جواب دیا۔''نہیں! تھوڑا انتظار کرلو۔''

کچھ دیر بعد بیوی کو آواز دی۔ ''اب مرغی لے آؤ۔''

مہمان دل میں خوش ہو گیا کہ بے مزا چاول کے بعد اب مزے کی مرغی تو کھانا نصیب میں ہے۔

جوں ہی کنجوس کی بیوی مرغی سے لے کر آئی تو مہمان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ زندہ مرغی لے کر آئی تھی جسے دستر خوان پر باقی گرے چاول کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

عشال منیر ...... کراچی

دور اندیش

ایک عورت نے مصور سے اپنا پورٹریٹ بنوایا، پھر کچھ سوچ کر مصور سے کہا گلے میں نولکھا ہار بھی پہنا دو۔

تصویر بنانے کے بعد مصور نے پوچھا''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

عورت''اگر میں مرگئی تو یہ دوسری شادی کرلیں گے۔نئی والی آئے گی تو یہ ہار ڈھونڈے گی اور جب یہ ہار نہیں ملے گا تو دونوں میں جھگڑا ہوگا، تب میری روح کو بہت سکون ملے گا۔''

عشا سہیل ...... سلانوالی

ایک اور

ایک جگہ سات ملنگ سات چٹائیوں پر لیٹے

تھے۔ ایک آدمی آیا اور سب سے بڑے ملنگ کو کہنے لگا۔

''بابا جی میری بیوی بہت لڑاکا ہے کوئی حل بتائیں۔''

اس ملنگ نے سب سے چھوٹے ملنگ کو آواز دی۔

''چھوٹو ایک چٹائی اور بچھا دے۔''

حبا زبیر...... کراچی

ہم زبان

گل خان ایئر ہوسٹس سے ''تمہاری شکل ہماری بیوی سے ملتی ہے۔''

ایئر ہوسٹس: ''بکواس بند کرو!''

گل خان: ''ماشااللہ زبان بھی ملتی ہے۔''

وہم

ٹیچر: ''ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں کی کوئی مثال دیں۔ جیسے کہ...... میں خوب صورت تھی۔ خوب صورت ہوں اور خوب صورت رہوں گی۔''

بچہ: ''مس آپ کو وہم تھا، وہم ہے، اور وہم رہے گا۔''

نفرت کی نگاہ

مولوی صاحب ٹی وی پر فیشن شو دیکھ رہے تھے ساتھ بیٹھا آدمی، ''مولوی صاحب آپ بھی......!''

مولوی صاحب ''یقین مانو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں......''

ثمینہ اکرم...... لیاری کراچی

شاعر حضرات کہیں جسے

دو آدمی ایک راستے پر اندھا دھند بھاگ رہے تھے وہ دونوں بھاگتے بھاگتے ایک گاؤں سے گزرے تو گاؤں کے ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو پکڑا، جو پہلے آدمی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اسے کہا۔ ''تم کیوں اس آدمی کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔'' تو اس نے جواب دیا۔

''یہ جو بھاگ رہا ہے یہ بھی شاعر ہے میں بھی شاعر ہوں پہلے اس نے مجھے اپنی غزل سنائی میں نے سنی اب جب میری سنانے کی باری آئی ہے تو یہ بھاگ رہا ہے۔''

اقراء عزیز...... گاؤں دریا خان جلبانی

افسوس

ایک صاحب کو اداس بیٹھے دیکھ کر ایک جاننے والے نے اداسی کا سبب پوچھا۔ صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

''میرا ایک پرانا دوست میری بیوی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔'' جاننے والے نے افسوس سے کہا۔

''مجھے تو کل سے اپنے دوست کی حالت پر رونا آرہا ہے۔'' اس نے پھر آہ بھر کر کہا۔

وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے اپنے بے حد موٹے دوست سے کہا۔ ''میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم جیسے آدمی عام طور پر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں بڑی سے بڑی نا معقول اور ناگوار بات کو بھی ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ بڑی بات ہے۔''

''اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے لیے لڑنا اور بھاگنا دونوں ہی مشکل کام ہوتے ہیں۔'' موٹے دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

سرپرائز

ایک نرس جڑواں بچے لے آئی اور پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

''پروفیسر صاحب دیکھیے، آپ کے بچے کتنے پیارے ہیں۔''

پروفیسر صاحب نے افق پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''سسٹر! میری بیوی سے اس بات کا ذکر مت کرنا، میں اسے یہ خوش خبری خود سنانا چاہتا ہوں۔''

سعدیہ...... قائداعظم یونی

☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



ذوالقرنین



افشین ناز۔۔۔ ماتلی

س: ''نین بھائی! سچ کڑوا ہے تو جھوٹ؟''

ج: ''صاف امرت۔''

راشدہ پروین ناز۔۔۔ گجرات

س: ''ہر کوئی اپنا بدلہ دوسروں سے کیوں لینا چاہتا ہے۔ نسل در نسل یہ روایت چلی آرہی ہے کہ ایک فرد اپنے ساتھ ہونے والے زیادتیوں کا بدلہ دوسرے فرد سے لینا چاہتا ہے۔ کیوں! آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

ج: ''یقین جانیے۔ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔''

افشاں بیگ۔۔۔ کراچی

س: ''بیوی کے سر پر بھوت کب سوار ہوتا ہے؟''

ج: ''یہ سوال کسی بیوی والے سے پوچھیں۔''

ناہید عباس۔۔۔ کراچی

س: ''آج آپ کی ذہانت کا امتحان ہو جائے جلدی سے بتایئے کہ وہ کون سا جانور ہے جسے پیدا ہونے سے پہلے کھایا بھی جاتا ہے؟''

ج: ''آپ سے کس نے کہا میں ذہین ہوں' پہلی بات' دوسری بات کیا یہ کالم پہیلیوں کے لیے ہے۔''

صبا عمران۔۔۔ کراچی

س: ''آج کل جھوٹ عورت زیادہ بولتی ہے یا مرد؟''

ج: ''یہ تو ضرورت کا معاملہ ہے جہاں ضرورت پڑ جائے جسے۔''

شاکرہ۔۔۔ لاہور

س: ''نین بھیا! یادیں دل کے اندر زخم کیوں بنا دیتی ہیں؟''

ج ''مرہم بھی تو رکھ دیتا ہے وقت۔''

عمرانہ اعجاز۔۔۔ نارووال

س: ''ذوقی بھائی! کہیں آپ ابراہیم ذوق کے خاندان سے تو نہیں؟''

ج: ''تمہیں میرے شجرہ نسب سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی۔''

فریدہ خان۔۔۔ کراچی

س: ''ذوالقرنین بھیا! لوگ عید بقر عید پر ہی کیوں گلے ملتے ہیں؟ باقی دن کس شمار میں جاتے ہیں؟''

ج: ''شکر کریں اس پر بھی مل لیتے ہیں۔''

☆☆

ملیحہ کرن

ہائے میرے سلام

اقراء جٹ ...... منچن آباد

نومبر کا کرن دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا مدیرہ جی کی دلکش باتیں سنیں، حمد و نعت سے روح و قلب کو اسیر کیا۔ انٹرویو، سید علی حسن، اویس انجم، سونیا مشال اور اشا نیرز بردست رہا!!

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت جی اسٹارٹ تو زبردست لیا ہے آئی ہوپ مزید بھی اسی طرح شاندار و جاندار رہے گا!! ''من مورکھ'' حوریہ بھی محبت کے جال میں انٹری دے رہی ہے زبردست نیکسٹ قسط کا شدت سے انتظار ہے۔''رلپنزل'' تنزیلہ ریاض بہت بہت مبارک ہو ناول مکمل ہونے پر!! پھر سے دھماکا دار انٹری دیں جی۔''مہجور نشیمن'' مصباح جی روائیہ پر اتنا گھناؤنا الزام لگا تھا یہ راز تو اب آپ نے پرت در پرت کھولا ہے دل ہی ہول گیا۔''مجھے جینے کا حق دو'' ریحانہ آفتاب کیا الفاظ تھے کیا جملے تھے کیا تحریر تھی کمال تھی''ونڈرفل!! پائل چوڑی'' حمیرا نوشین جی ونڈرفل کیا انکشاف محبت، محبت تھا ہاہا!''بہار منتظر ہے'' حیا بخاری ونڈرفل سپرہٹ تحریر''آواز دو'' منعم ملک کیا تحریر تھی۔ کیا منظر قلمبند تھے نائس! افسانے تمام بہت بہت اچھے لگے۔''دس کا نوٹ'' شینہ گل سبق آموز تحریر! ''پیوند زدہ'' یاسمین جی زبردست''ایک پل'' مزل سلیم ویلڈن ''دل بے رحم'' لیشریٰ رلا دیا۔

مستقل سلسلے تمام اچھے لگتے ہیں۔''چکن کڑاہی'' اور سادہ بریانی کی ریسپی بھی کرن کے دسترخوان میں بتا دیں۔

ج: پیاری اقرا کرن کی محفل میں شریک ہونے کا شکریہ۔ چکن کڑاہی اور سادہ بریانی کی تراکیب''کرن کے دسترخوان'' میں شائع کی جا چکی ہیں آپ کی فرمائش پر پھر دوبارہ کر دیں گے۔ پیاری بہن اپنی کہانی کا معلوم کرنے کے لیے آفس کے نمبر پر رابطہ کیجیے۔

نوال گوندل ...... گجرانوالہ

''مہجور نشیمن'' کی کہانی نے ایک حصار سا باندھ دیا ہے کردار بہت جان دار ہیں اور بہت زیادہ فطری۔ مقام حیرت یہ ہے کہ مصنفہ نئی ہیں لیکن قلم پر گرفت کسی منجھے ہوئے قفص کی لگتی ہے۔ ایک لفظ جسے کہتے ہیں اسٹینڈنگ اویشن یعنی کھڑے ہو کر سلام اللہ! مصباح جی کا قلم آباد رکھے۔ آمین! جس سے اتنے خوب صورت رنگ بکھرتے ہیں۔''من مورکھ کی بات نہ مانو'' آسیہ مرزا کی تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ دل چاہتا ہے حوریہ کو سامنے بیٹھا کر سمجھا دوں کاش وہ اپنے بیٹے کے حق میں بہترین فیصلہ کر پائے۔ ناولٹ اس بار دو تھے دونوں بہت اچھے لگے۔ ناولز بھی پورے نمبر لے گئے۔

ج: پیاری نوال، مہجور نشیمن کی تعریف اس خط کے ذریعے مصباح تک پہنچ رہی ہے۔ کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران آمنہ رئیس ---- گجرات

نومبر کا کرن مجھے 15 کو ملا سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ''میری بھی سنیے'' سونیا مشال کی ملاقات اچھی رہی۔''آواز کی دنیا'' کسی زمانے میں ہم بھی بڑا سنا کرتے ہیں۔ گجرات F.M.100 پہ سب سے پہلے''رلپنزل'' کو پڑھا واہ تنزیلہ جی! ہم سب نے اپنے اپنے قیاس کے ہارسز خوب دوڑائے مگر اینڈ آپ نے اپنی مرضی کا ہی کیا۔ جہاں شہرین کی موت کا دکھ سہا وہاں نیناں اور سمیع کا ملاپ دلی خوشی کا باعث بنا۔ جی ایک اور خوب صورت یاد ''رلپنزل'' کی صورت ہمارے دلوں میں نقش ہو گئی۔ بہت بہت شکریہ رائٹر جی! پلیز اب کسی اور ناول کے ساتھ جلد انٹری دیجیے گا۔

''من مورکھ'' بھی ٹھیک رہا اس ماہ۔ بابر تہ دل سے ایک اچھا انسان بن گیا ہے تو پلیز حوریہ کے دل کو بھی موم کر دیں۔ اب ناول کو ختم ہونا چاہیے مجھے نہیں لگتا ہے۔ رائٹر اس میں کیا نیا ٹوئسٹ لا سکتی ہیں۔ اس

سے پہلے کہ بورنگ کی آوازیں شروع ہو جائیں کسی ہپی اینڈ پہ اختتام کردیں۔

تینوں مکمل ناولز میں اس ماہ "مہجور نشیمن" نمبرون رہا۔ ہمارے ذہن تو اذلان اور رو ملیحہ کے گرد ہی گھومتے رہے۔ یہاں کہانی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ خیر اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار لگ گیا ہے۔ "مجھے جینے کا حق دو، ریحانہ جی ویلڈن! اتنا اچھا ناول لکھا آپ نے ساویہ کی موت کا دلی افسوس ہوا۔ پتا نہیں کیوں دو باوفا لوگوں کو ملنے نہیں دیا جاتا۔ "میری پائل چوڑی کھنکے" یہ ناول بھی پسندیدگی کی سند حاصل کر گیا۔ ویسے کہیں کہیں کرداروں کی اوور ایکٹنگ اچھی لگی نہیں پھر بھی طنز و مزاح نے پورا ناول پڑھنے پر مجبور کر ہی دیا خالہ درباری کا کردار بھی بھایا ویسے ایسے لوگ اب نایاب ہیں۔

حیا بخاری صاحبہ کا ناولٹ "بہار منتظر ہے" اچھا تھا۔ گلالئی کافی شہرت حاصل کرتی ہے نام سباعون کے کیا معنی ہیں۔

"آواز دو" ایک روایتی سی اسٹوری لگی افسانے چاروں اچھے اور سبق آموز تھے۔ میرا خط لاسٹ میں شامل کرنے کی وجہ جان سکتی ہوں۔ شاید بہت لیٹ ملتا ہے کیا۔

ج: پیاری فوزیہ! آپ ہماری مستقل قارئین میں سے ہیں۔ اور تقریباً ہر سلسلے میں آپ کا نام بھی شامل ہوتا ہے تو آپ ہمیں اور بھی زیادہ عزیز ہیں کہ نہ صرف کرن پڑھتی ہیں بلکہ اس کے ہر سلسلے میں دل سے شامل ہوتی ہیں۔ "سباعون" کے معنی "صبح کی کرن" ہے۔ آپ کا خط آخر میں لگنے کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی بہنوں کے خط جب کمپوزر کو دیتے ہیں تو ان کی مرضی ہوتی ہے کہ کسی بھی نمبر پر لگا دیں اور اس سے مطلب بالکل بھی یہ نہیں ہے کہ آپ کے خط کی اہمیت کم ہوتی ہے ہماری نظر میں۔

ثناء شہزاد ...... کراچی

نومبر کا شمارہ اس بار تو دس تاریخ کو ہی مل گیا تو میری تو حیرت کی اور خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ حمد و نعت پڑھ کر دل و دماغ کو معطر کیا۔ اداریہ پڑھا رومی انشاء کی جواں موت کا بہت صدمہ ہوا ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ سب سے پہلے "رلپنزل" پڑھا شہرین کی موت نے دکھی کر دیا مگر سمیع اور نینا کے تعلقات بہتر ہو گئے، اچھا لگا۔ اس کہانی سے ہمارا ساتھ دو ڈھائی سال تک رہا تنزیلہ جی نے رلایا بھی ہنسایا بھی۔ اتنا اچھا ناول لکھنے پر تہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" پلیز آسیہ جی اب بابر کے من کی مراد اسے دے دیں۔

نگہت عبداللہ کا ناول بھی زبردست ہو گا اب یہ تو آگے چل کر پتا چلے گا۔ "پیوند زدہ" یاسمین نشاط نے بہت اچھا لکھا۔ شبینہ گل نے "دس کے نوٹ" میں اچھا سبق دیا" وہ ایک پل" مزمل سلیم کیا خوب لکھا۔ "دل بے رحم" حنا بشریٰ کا واقعی بہت بے رحم لگا۔ منعم ملک اور حیا بخاری دونوں نے عمدہ لکھا۔ ریحانہ آفتاب نے بلاشبہ بہت زبردست لکھا مگر اینڈ میں رلا دیا۔ "پائل چوڑی" حمیرا نوشین کی بہت بہت پسند آئی۔ تمام مستقل سلسلے بہترین تھے۔

ج: پیاری ثناء! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

انوش ابصار ..... قائداعظم یونی ورسٹی

جیسے ہی مجھے کرن ملا یقین کریں میرا چہرا جگمگا کر لائٹیں مارنے لگا۔ مجھے دو کہانیوں کا بے حد و بے حساب انتظار تھا۔ سب سے پہلے "رلپنزل" کی آخری قسط پڑھی کیا کہنے تنزیلہ جی! آپ نے میدان مار لیا، جی چاہا بھنگڑے ڈالوں اینڈ حسب منشا جو ہوا۔ ہائے مصباح جی ہمارا دل دھڑ دھڑ کر کے پھٹ ہی نہ جائے ضبل ایسے کیسے کر سکتا ہے وہ کیوں نہیں سمجھ رہا روائیہ کو۔ ہائے کہانی نے کیسا موڑ کاٹا، دل کٹ کر رہ گیا۔

یاسمین نشاط اب ذرا آنے لگی ہیں پہلے تو یک لخت غائب ہی ہو گئی تھیں ان کا افسانہ "پیوند زدہ" سب سے بیسٹ تھا بالکل یاسمین نشاط کی طرح۔ ریحانہ آفتاب کا مکمل ناول "مجھے جینے کا حق دو" اچھی کاوش تھی ساویہ پر رہ رہ کر ترس آتا رہا۔

نگہت عبداللہ کا نیا شروع ہونے والا ناول تو ابھی اسٹارٹ ہوا ہے، پہلی قسط تو سر لگی۔ حمیرا نوشین کا ناول بھی اچھا لگا ہلکا پھلکا سا تھا۔ ناولٹ میں، "آواز دو" منعم ملک نے خوب دل لگا کر لکھا۔

ج: پیاری انوش! "کرن" کی پسندیدگی کا بے حد

شکریہ!

انیلا نورین ...... بورے والا

نگہت عبداللہ کی ہر تحریر کی طرح یہ تحریر بھی اچھی لگ رہی ہے مکمل ناول بھی بہت اچھے تھے۔ افسانے سارے ٹاپ کلاس لگے۔ خاص کر منعم ملک کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ حیا بخاری نے بھی اچھا لکھا اور ہاں میں کرن کتاب کے لیے پیغام بھیج رہی ہوں ضرور لگا دیجیے گا۔

ج: پیاری انیلا! لگتا ہے بہت جلدی جلدی خط لکھا ہے وہ بھی بہت مختصر۔ امید ہے آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہوں گی۔ آپ کا پیغام لگا دیا گیا ہے۔

عشا سہیل ...... سلانوالی

مصباح علی ایک شاہکار تخلیق کر رہی ہیں۔ شاباش بہت سی محبت مصباح علی سید کے نام۔ ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' آسیہ مرزا کی کہانی میں ٹوئسٹ کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے بات جوں کی توں اپنی جگہ اڑی ہوئی ہے۔ مکمل ناول میں ریحانہ آفتاب اور حمیرا نوشین دونوں رائٹرز نے اپنی اپنی محنت دکھائی۔ ''بہار منتظر ہے'' میں حیا بخاری نے پہاڑوں کی خوب منظر نگاری کی کہانی بہت اعلا لگی۔ ''آواز دو'' بھی اچھا ناولٹ تھا۔ منعم ملک کا افسانوں میں ''دس کا نوٹ'' اور ''ایک پل'' زیادہ پسند آئے۔ باقی دونوں بھی اچھے تھے۔ میں نے ایک ٹیسٹ دینا ہے اسکالرشپ کے لیے دعا کرنا کامیاب ہو جاؤں۔

ج: پیاری عشا! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ٹیسٹ میں کامیابی عطا کرے آمین۔

عمارہ ...... گجرات

سرورق پر پیاری سی ماڈل کا کلوز اپ بہت اچھا لگا خاص کر ترچھی آنکھوں سے تکنے کا انداز ویلڈن اور پھر دوڑ لگائی موسٹ فیورٹ ناول ''مہجور نشیمن'' کی طرف۔ زینب نے جو کچھ آئمہ کو بتایا اس میں روائیہ کا کیا قصور!۔ مصباح علی سید سے ایک بات تو پوچھیں حنبل دس ماہ بعد آ رہا ہے۔ جبکہ بچے کی پیدائش کا ٹائم پریڈ تو عموماً نو ماہ ہوتا ہے پھر یہ...... پلیز کنفیوژن دور کریں مصباح جی۔

تنزیلہ ریاض نے ''راپنزل'' کا اینڈ اطمینان بھرا کیا۔ نینا کے لیے دل بہت خوش ہے البتہ شہرین کے لیے دل بہت اداس۔ افسانے سارے ٹھیک تھے۔ ویسے ہارٹ ٹچنگ مجھے ''دل بے رحم'' حنا بشریٰ کا لگا۔ بہت ہی دل سے لکھی گئی تحریر گڈ۔ مکمل ناول میں حمیرا نوشین کی کہانی اچھی لگی۔

ج: عمارہ جی! آپ نے جو ہم سے سوال پوچھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ گائنی کے بہت پیچیدہ مسائل ہوتے ہیں ضروری نہیں ہر خاتون کا پریگننسی پریڈ نو ماہ میں پورا ہو جائے، دس ماہ تو عام سی بات ہے بلکہ تحریری ریسرچ یہ ایک سال سے اوپر کی پریگننسی ثابت کر چکی ہے۔ مصباح، بات بہت تحقیق سے لکھتی ہیں۔ ادارے کو اس کے درست شواہد مل جاتے ہیں۔ بات پری میچور بچی کی ہے تو وہ آپ کو اگلی اقساط میں واضح ہو جائے گا۔ آئندہ بھی آپ کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔

شازیہ ہاشم میواتی .... قصور

اداریہ پڑھا تو اک مسرت کی لہر دوڑ گئی! نگہت عبداللہ کی آمد پر...... مگر جب آگے پہنچی تو رومی انشا کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا ہر انسان نے اس دنیا سے جانا ہے اللہ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین) حمد و نعت سے دل کو جلا بخشی ''مقابل ہے آئینہ'' ضرور پڑھتی ہوں۔ آگے دوڑ لگائی ''راپنزل'' کی جانب واہ ڈیئر رائٹر تنزیلہ بہت بہت مبارک ناول کے اختتامی سفر پر مجھے ''کوئین'' بہت اچھی لگی اور شکر ہے کہ سمیع نے بھی کوئین کی محبت کو اپنے شعور میں جگہ دے دی۔

''بہار منتظر'' حیا بخاری کی تحریر انفرادیت لیے ہوئے تھے اور خاص طور پر منظر کشی بہت اچھی تھی درون نام اور سباعون دونوں اچھے لگے۔ سباعون کو اس کے غرور کی سزا مل گئی۔ ''پیوندزدہ'' پڑھ کر بے اختیار نگاہیں معاشرے کا ایکسرے کرنے لگیں تو پتا چلا کہ آج کل یہ برائی تو کامن ہوتی جا رہی ہے۔ باقی رسالہ بے پناہ مصروفیت کی بنا پر زیر مطالعہ ہے۔

ج: پیاری شازیہ! بے حد شکریہ کے آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود کرن کے لیے وقت نکالا اور

اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

ثنا ذوالفقار ---- نورے والی رحیم یار خان

کرن کا شمارہ 14 تاریخ کو ملا حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد "میری بھی سنیئے" میں سونیا مشال کے بارے میں پڑھا "مقابل ہے آئینہ" میں اشا خیر نے اپنے نام کی طرح جواب بھی بہت اچھے دیے۔

"ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ نے شروع تو اچھا کیا ہے آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔ "من مورکھ" میں مجھے بالکل مزا نہیں آرہا۔ کہانی رکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پلیز کہانی کو جلدی آگے بڑھائیں۔

ناولٹ "بہار منتظر ہے" اور "آواز دو" کچھ خاص اچھے نہیں لگے۔ بس ٹھیک ہی تھے۔ "مہجور نشین" مصباح علی نے اس مرتبہ بھی بہت اچھا لکھا لیکن صفحات بہت تھوڑے تھے۔

افسانہ "دس کا نوٹ" "شکر گزاری کی داستان" بے شک جو کچھ ہم کسی کو دیتے ہیں اللہ ہمیں اس سے بڑھ کر واپس کرتا ہے آسانی دیں گے تو آسانی۔ تکلیف دیں گے تو تکلیف۔ ناول "مجھے جینے کا حق دو" اویز کچھ زیادہ ہی جنونی تھا۔ آخر میں جب سب ٹھیک ہوگیا تھا تو سادیہ کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔ "پائل چوڑی" اچھی تحریر تھی۔ خالہ درباری کا کردار بہت اچھا لگا۔ "دس کا نوٹ" کے علاوہ باقی افسانے بھی بہترین تھے۔

ج: پیاری ثنا! کرن پر تبصرہ کرنے کا شکریہ امید ہے آئندہ بھی اپنے رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

سونیا ربانی ---- موڑہ دھمیال

بہت مصروف ہوں۔ مگر دو پل نکال ہی لیے، میری ساس امی عمرہ کر کے آئی ہیں۔ تو خیر سے لوگوں کا آنا جانا لگا ہے۔ میں پورا کرن نہیں پڑھ پائی ہوں۔ اس ماہ کی جو تحریر مجھے اچھی لگی جو میں نے پڑھی وہ تھی شبینہ گل کی "دس کا نوٹ" بہت ہی پیاری تحریر تھی۔ سچ سچ کئی بار ایسا ہوا ہے میرے ساتھ کہ جو ہاتھ پھیلائے اس کے ہاتھ پہ جو پاس ہے رکھ دو۔ تو بدلے میں آپ کو اللہ ضرور دیتا ہے۔

ج: پیاری سونیا! ہماری طرف سے بھی آپ کی ساس امی کو عمرے کی مبارک ہو۔ بہت شکریہ کہ معروفیت کے باوجود آپ نے "کرن" کے لیے وقت نکالا۔

مقدس آصف ---- رائیونڈ ضلع لاہور

نومبر کا شمارہ 13 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے چھلانگ لگائی اپنے پسندیدہ "ناول مہجور نشین" پہ۔ پلیز مصباح جی ہاتھ ہولا رکھیں حنبل اور روائیہ پہ۔ کیسے آئمہ نے بدلہ لیا۔ اس ناول میں سسپنس بہت زیادہ ہے اب پتا نہیں اگلی قسط میں مصباح جی کیا کرتی ہیں۔ "من مورکھ" کی بات نہ کرنا تو زیادتی ہوگی۔ پلیز اب حوریہ کو عقل دیجیے کہ وہ حازم کو بھلا کر بابر کا ہاتھ تھام لے۔ یاسمین نشاط نے بہت اچھے موضوع پہ لکھا "راپنزل" آخر اختتام پذیر ہوا۔ ایک قسط اور لکھ دیتیں سمیع اور کونین کی پیار بھری نوک جھوک سے بھرپور اینڈ پہ تو رائٹر صاحبہ نے ناول زیادہ جلدی سمیٹ دیا۔ ریحانہ آفتاب کا مکمل ناول زبردست۔ "بہار منتظر ہے" میں کردار و اور کرداروں کے نام زبردست لگے۔ گلالئی نے بہت اچھا فیصلہ کیا جو اس نے داوران کو چنا۔ حمیرا نوشین کی ہلکی پھلکی تحریر مزا دے گئی۔ افسانے اس بار سارے ہی زبردست "دس کا نوٹ" اور "اک پل" دونوں ٹاپ پر رہے۔ علی حسن میرا پیارا ساڑھے چار سال کا بیٹا ہر بار کرن شعاع اور خواتین اپنے پاپا کے ساتھ جا کر میرے لیے لے کر آتا ہے اسے کرن بہت پسند ہے کیونکہ اس کے ساتھ کرن کتاب ہوتی ہے اور نواب جی کہتے ہیں "مما! یہ آنٹی نے میرے لیے بھیجی ہے میں اسے پڑھوں گا" اور اسکول بیگ میں ڈال لیتا ہے۔ بیٹے کی وجہ سے تینوں رسالے ٹائم پہ مل جاتے ہیں۔

ج: پیاری بہن مقدس! آپ نے کرن کی کہانیوں پر بہت اچھا تبصرہ کیا امید ہے آئندہ بھی اپنے رائے کا اظہار کیا کریں گی اور علی حسن کو ہماری طرف سے بہت پیار۔

میمونہ عارفہ ---- نواب شاہ

کرن ڈائجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے وجہ مصباح علی کا ناول "مہجور نشین" سچ کہوں تو اس سے پہلے بھی بہت سے ناول پسند آئے لیکن خط لکھنے کا کسی ناول کو پڑھ کر نہ سوچا اس ناول کی ہر قسط کو پڑھ کر سوچتی ہوں کہ خط لکھوں

لیکن پھر رک جاتی کہ اس کے اختتام پہ لکھوں گی۔ مگر جی نومبر کے شمارے میں موجود قسط کو پڑھ کر وہ دل کی دنیا تہ و بالا ہوئی کہ بس بیان سے باہر ہے۔ مصباح جی! آپ سے ایک گزارش ہے کہ پلیز روائیہ کو تھوڑی سی عقل دیں وہ جلد مان جائے بے شک اس کو دیا گیا دکھ بہت بڑا ہے۔

اس ناول میں مصباح علی نے اپنے قارئین کو جو سمجھانے کی کوشش کی ہے مجھے بہت پسند آیا ان کا انداز اور میں ام مریم پشاور سے اتفاق کرتی ہوں انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ناول کے اختتام پہ مصباح علی کا انٹرویو رکھیں واقعی ان سے بہت کچھ پوچھنا ہے ہمیں اور مصباح جی آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کے بہت دکھ ہوا ڈھیروں ڈھیروں دعائیں بھی کیں آپ کے لیے ''راپنزل'' کا اینڈ تنزیلہ ریاض نے بہت اچھا کیا تنزیلہ جی! بہت بہت مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پہ آسیہ مرزا جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ بھی واقعی مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ بنت سحر کیوں نہیں لکھ رہیں آج کل ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے آپ کو میرا تبصرہ یقیناً ادھورا سا لگے گا دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ اگلے مہینے میرے B.A فائنل کے ایگزیم ہیں جس کی وجہ سے میں ابھی پورا ڈائجسٹ نہیں پڑھ پائی۔

ج: پیاری میمونہ! اس خط کے ذریعے مصباح علی تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔ شکر اللہ کا مصباح علی اب بالکل ٹھیک ہیں۔ بنت سحر تک بھی آپ کا پیغام پہنچ گیا ہوگا۔ ہمیں امید ہے آپ اپنے ایگزیم کے بعد مکمل تبصرے کے ساتھ کرن کی محفل میں شریک ہوں گی۔

یاسمین اقبال ...... لاہور

میں کرن کی بہت پرانی اور خاموش قاری ہوں۔

اس امید پر کرن میں بھی حاضر ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ کرن کی محفل کے کسی کونے میں جگہ دیں گی۔ پہلی مرتبہ آئی ہوں ضرور ویلکم کریں گی۔

میں لکھنے کے بارے میں بہت ست ہوں۔

مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے، ابھی اس ماہ کا کرن موصول نہیں ہوا ان شاءاللہ جلد ہی بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

مجھے کرن کے سب ہی سلسلے بہت پسند ہیں۔ میں ہر ڈائجسٹ کا خطوط والا حصہ سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ میں بے شک حصہ دار نہیں ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے میں بھی ان بہنوں کی محفل میں موجود ہوں۔ مجھے سب بہنوں کی خیریت جان کر اور تبصرے پڑھ کر خوشی ہوتی ہے اور ان پہ رشک آتا ہے وہ کیسے ہر ماہ اتنے مزے مزے کے خط لکھتی ہیں۔

ج: پیاری بہن یاسمین! آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ کو کسی کونے میں جگہ دی جائے گی کرن آپ بہنوں کی وجہ سے ہی جگمگاتا ہے آپ اپنی سستی کو خیر باد بولیں اور ہر ماہ کرن کی محفل کا حصہ بن جائیں۔

فائزہ بھٹی ...... پتوکی

شکریہ شکریہ بہت شکریہ اس بار کا کرن ہمیں بذریعہ ڈاک 15 تاریخ کو ملا۔ نومبر کا ہی نہیں اکتوبر کا بھی اسی دن ملا...... ان کو بھی دکھایا جو شکوک کا شکار تھے۔ خاص طور پر ابو کو دکھایا تاکہ آئندہ وہ میرا خط پوسٹ کرنے سے انکار نہ کریں۔

نیم باز نشیلی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی لڑکی اچھی لگی۔ حمد و نعت کے بعد ''من مورکھ کی بات'' پر پڑاؤ ڈالا ...... حور یہ مان لو، تم کمزور پڑتی جا رہی ہو۔ ''راپنزل'' اچھی رہا...... نینا مبارک ہو۔ ایک اچھی کہانی اختتام پذیر ہوئی، تنزیلہ ریاض مبارک ہو۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کی کہانی کا آغاز تو اچھا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

''مجھے جینے کا حق دو'' بہت اچھا ناول پڑھ کر مزا آ گیا۔ ریحانہ آفتاب اچھا لکھا آپ کے بعض الفاظ اور مکالے تو ''ٹھاہ'' کر کے دل میں لگے پنجابی شاعری نے تو میدان مار لیا۔ اختتام تھوڑا اداس کرنے والا تھا۔ پھر بھی قبول ہے۔ دیکھا دیکھا میں یہی کہتی تھی یہی ہونا تھا۔ روائیہ تمہیں کتنا بولا کہ جنبل کو بتا دو مگر اور کرو جغتائی صاحب پر اندھا اعتماد، مصباح ڈیئر اچھا کرنا......

''پائل چوڑی'' نارمل کہانی، نہ ہائے نہ لو...... ''میری بھی سنیئے'' سونیا مشال، اچھا کام کر رہی ہو۔ ''آواز کی دنیا ہے'' ہمارے پسندیدہ آر جے کو بلوائیں تو مانیں آپ کو ''مقابل ہے آئینہ'' اشا خیر، اشا کا معنی بھی بتا دو۔

ج: پیاری فائزہ! اب یقین آ گیا کہ ادارے والے صرف کہتے نہیں عمل بھی کرتے ہیں آپ بہنوں سے درخواست ہے کہ'' کچن اور آپ'' میں اپنا ایڈریس ضرور لکھا کریں تا کہ ڈائجسٹ بھیجنے میں آسانی ہو۔ فائزہ جی آپ اپنے پسندیدہ آرٹسٹ کا نام بتایئے ضرور ان کا بھی انٹرویو کیا جائے گا۔ اشا کا مطلب ''طلوع صبح'' ہے۔

اقرا ممتاز...... سرگودھا

اس دفعہ کرن 15 نومبر کی شام کو امی لے کر آئی تو دل خوش ہو گیا۔

''انٹرویو میں سید علی حسن کو جانا'' آواز کی دنیا سے''

''میری بھی سینے'' سونیا مشال۔ یہ بھی اپنی باتیں سنانے بیٹھی تھیں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں ''اشاخیر'' واقعی مقابل کرنے کے لیے ہی بیٹھی تھی۔

نگہت عبداللہ کا نام دیکھ کر خوش ہو گیا'' ہوائیں رُخ بدل گئیں'' پہلی قسط میں ہی ہمیں ہوائیں رخ بدلتی نظر آئیں۔ ریکا نے خیر سے کہانی میں انٹری ماری تو شہرینہ تو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی رہے کیونکہ ریکا کے ہوتے ہوئے حمزہ تو شہرینہ کو ملنے سے رہا۔

''من مورکھ'' حوریہ اور بابر کا ملاپ دور نہیں۔ اگر لگن بچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔

''مہجور نشیمن'' اس کہانی نے کیا کایا پلٹی ہے۔ مصباح علی نے تو ہمیں گھما ہی ڈالا۔

''مجھے جینے کا حق دو'' کیا زبردست اسٹوری تھی۔ ساویہ اور اویز یوسف کی محبت دیکھ کر ہم تو کانپ اٹھے۔ ایسا طوفانی عشق۔ اس کہانی نے کہیں مسکرانے پر مجبور کیا تو کہیں آنکھیں نمکین ہو گئی۔

''میری پائل چوڑی کھنکے'' حمیرا نوشین کی اچھی کاوش تھی۔

ناولٹ'' بہار منتظر ہے'' سباعون نے گلالئی سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ درون کے معنی کیا ہے؟ ہماری رائٹر پتا نہیں نام کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہیں۔ کیا کوئی پرائمری پاس لڑکی گلالئی جیسی ذہین ہو سکتی ہے؟

''آواز دو'' اچھی اسٹوری تھی۔ ناولٹ ''دل بے رحم'' حسن نے اچھا نہیں کیا سارہ کے ساتھ۔

ج: پیاری اقرا ممتاز جی آپ تو ہماری مستقل قاری ہیں ہر ماہ آپ اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں شکریہ ''بہار منتظر میں'' پرائمری پاس لڑکی اپنے مطالعے اور محنت کی وجہ سے اونچے مقام تک پہنچتی ہے۔ درون کے معنی ہیں۔ بڑے دل والا، ظرف والا۔

غزالہ بھٹی...... نا معلوم

خوب صورت سرورق سے سجا کرن ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔ '' حمد باری تعالیٰ'' اور'' نعت رسول مقبول '' سے روشنی اور ہدایت حاصل کر کے اگلے صفحے پہ پہنچے حسن علی سے ملاقات اچھی لگی اور سونیا مشال بہت ٹیلنٹڈ اداکارہ ہیں۔ نگہت عبداللہ میری فیورٹ رائٹر ہیں ان سے بہت سی امیدیں ہیں اور ان شاء اللہ پوری اتریں گی۔ یاسمین نشاط کی'' پیوند زدہ'' کیا کیا یاد دلا گئی ہم بھی اس دور سے گزرے ہیں۔ مگر شوہر نہیں سسرال والوں کے دیے زخم تھے۔'' مجھے جینے کا حق دو'' اچھی تحریر تھی۔

''دس کا نوٹ''، شبینہ گل نے بھولے ہوئے سبق یاد دلا دیے واقعی اگر ہم زندگی اسلام کے مطابق گزاریں تو کبھی پریشانیاں نہیں آئیں گی۔'' حیا بخاری'' نے کیا خوب لکھا محنت مسلسل محنت انسان کو کامیابیوں سے ضرور ہمکنار کرتی ہے۔'' رانپزل'' کا اختتام اچھا رہا۔ مصباح علی سید'' مہجور نشیمن'' بہت خوب صورت انداز میں آسٹریلیا کی سیر کروائی۔ ناول بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آسیہ مرزا کی'' من مورکھ کی بات نہ مانو'' مگر اب حوریہ کو بابر کی بات مان لینی چاہیے۔ بہت بڑا میسج ہے پڑھنے والوں کے لیے غلطی کر کے اسے مان لینا اور پھر اس کا مداوا کرنا۔ آسیہ مرزا نے بہت محنت سے ناول مکمل کیا ڈھیروں دعائیں اور مبارک باد۔

ج: پیاری غزالہ! کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

☆☆